رکھیل

SohniDigest.Com

ریاض عاقب کوہلر

ناول

ریاض عاقب کوہلر

رکھیل

"ہائے ہائے....." بشریٰ خاتون اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ "آگ لگے تیری صورت کو.....تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مرگئی ڈائن۔ کھا گئی ہے اپنے اکلوتے بھائی کو، ہائے اور ربا! مجھے پتا ہوتا تو پیدا ہوتے ہی تمھارا گلا گھونٹ دیتی۔ تمھیں زندہ درگور کر دیتی۔ ہائے میرا بھولا بھولا شہزادہ..... ہائے ہائے....." اس کی سینہ کوبی اور آہ وزاری جاری رہی۔

وہ بھی گھر کے ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی خاموشی سے روتی رہی۔ ماں تو اسے کوس کر، برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ وہ کسے کوستی، کس کو برا بھلا کہتی۔ اگر ماں کا اکلوتا بیٹا قتل ہوا تھا تو وہ اس کا بھی تو اکلوتا بھائی تھا۔ اور اس نے کون سا کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں یا کسی سے ناجائز تعلقات رکھے تھے جو وہ شرمندہ ہوتی۔ وہ تو خود ایک عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس دور میں بھی کراچی جیسے شہر میں جنگل کا قانون رائج تھا۔ ایک غنڈے کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر کسی لڑکی کی زندگی اجیرن کر دے، اسے ہر وقت چھیڑتا رہے اور احتجاج کرنے پر اس کے بھائی کو بھی قتل کر دے۔ دلاور شیخ نے یہی تو کیا ہوا تھا ان کے ساتھ۔ سر بازار اسے روک کر وہ بیانگ دہل کہتا تھا۔

”بی اے کرلے بے بی، پھر تمھیں میری بیوی بننا ہے۔اور اگر اس سے پہلے کوئی رشتہ لے کر تمھارے گھر آ گیا تو خود تو جان سے جائے گا ہی تمھارے بی اے کرنے میں بھی رکاوٹ ڈال دے گا۔“

وہ اس کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتی تھی۔بس خوف سے لرزتی کانپتی ماں کی گود میں پناہ لینے گھر کو دوڑ پڑتی۔بارہویں کلاس کی لڑکی کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے، پھر باپ کا سایا سر پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود کو اور بھی غیر محفوظ محسوس کرتی۔دلاور شیخ کا تو نام ہی خوف کی علامت تھا۔دکان دار باقاعدگی سے اسے بھتا دیا کرتے۔چوں چراں کرنے والے کی بوری میں بند لاش سڑک کے کنارے پڑی ملتی، کسی گندے نالے میں ڈوبی ملتی یا ساحل سمندر پر اپنی تقدیر پر نوحہ خواں نظر آتی۔پولیس والوں کو بھی اپنے گھر والے اور نوکری عزیز تھی۔اسی لیے تو جب وہ ماں کو لے کر تھانیدار کے پاس گئی تو اس نے پوری توجہ سے اس کی بات سن کر کہا تھا۔”فکر نہ کرو مائی ہم اس سے بات کر لیتے ہیں۔مگر بہتر یہی ہوگا کہ تم لوگ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ، وہ ایک طاقت ور شخص ہے اور اس کی پشت پر ایک بااثر شخص موجود ہے جس کا وہ کافی لاڈلا ہے۔“

قانون کا محافظ انھیں ایسا مشورہ دے کر گویا باور کرا رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں بے بس تھا۔ورنہ پولیس والے مجرموں سے بات چیت نہیں کیا کرتے ان کی سرکوبی کرتے ہیں۔یہاں تھانے دار کہہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرلے گا، گویا اس کی منت سماجت کرے گا۔اور ایسے لوگ منت سماجت سے نرم نہیں پڑا کرتے۔جس کے ہاتھ میں اختیار آ جائے وہ خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔اسی اختیار نے فرعون و نمرود سے خدائی کا دعویٰ کروایا، اسی اختیار نے شداد کو اللہ پاک کے مقابل لا کھڑا کیا، اسی اختیار نے ابوجہل کو اپنی جہالت پر ثابت قدم رکھا اور یہی وہ اختیار ہے جس کی وجہ سے آج امریکہ نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔جس درجے کا اختیار ہو اس درجے کی من مانی کی جاتی ہے۔کہاوت ہے کہ موچی کو اختیار ملا اور اس نے چمڑے کا سکہ جاری کر دیا تھا۔دلاور شیخ کے پاس بھی ایک بااثر شخصیت کی چمچہ گیری کے باعث اتنا اختیار آ گیا تھا وہ ایک غریب لڑکی کی زندگی اجیرن کر سکتا تھا۔جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ خوب صورت تھی.....یہی خوب صورتی اگر صاحب اختیار اور امراء کے گھر جنم لے تو باعثِ رعب بن جاتی ہے اور اگر غریب کے گھر جنم لے تو تماشا اور دیکھنے کی چیز۔بہ قول شاعر

.....

اچھی صورت بھی کیا بری شئے ہے

جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

اگر وہ معمولی شکل یا قبول صورت ہوتی تو اسے ان حالات کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ محلے کے آوارہ لڑکوں کو اس سے عشق کا شوق چرایا تو اسکول کے لڑکے بھی آہیں بھرتے نظر آئے اور جب دلاور شیخ جیسے غنڈے کی نظر پڑی تو تمام اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ وہ ایک باحیا، باعزت اور خوددار لڑکی تھی۔ اسے نہ تو محلے کے آوارہ لڑکوں کی پروا تھی اور نہ اسکول میں موجود عشاق کی۔

بے نیازی، بے دھیانی اور خاموشی سے کام لے کر ایک شریف لڑکی ایسے بے غیرتوں کو اپنے کام سے کام رکھنے پر مجبور کر سکتی ہے..... یوں بھی بھونکنے والا کاٹا نہیں کرتے۔ اور شریف لڑکیوں کو چھیڑنے والے آوارہ سگ ہی کی طرح تو ہوتے ہیں جن کا کام ہی بھونکنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے کاٹنے والا کتا ٹکرا گیا تھا۔ دلاور شیخ اس محلے، بلکہ آس پاس کے دو تین محلوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہاں کے لوگ اس کے منہ لگنے سے گریز کیا کرتے۔ کیوں کہ ایسے غنڈوں کے خلاف نہ تو پولیس میں کوئی شنوائی ہوتی ہے اور نہ کوئی عدالت ہی انصاف مہیا کر سکتی ہے۔ کرائے کے وکیل، کرائے کے گواہ اور خریدے ہوئے جج بھلا غریبوں کی کیا مدد کریں گے۔ اس کی ماں بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی وہ دلاور شیخ کے اختیار سے بھی واقف تھی۔ رہی سہی کسر تھانے دار کی باتوں نے پوری کر دی تھی۔ اس لیے اس نے حتی الوسع یہ بات اپنے جوان بیٹے سے چھپائے رکھی..... مگر کب تک ایک دن جب وہ روتی لرزتی کانپتی گھر میں داخل ہوئی تو بڑا بھائی مزدوری نہ ملنے کے باعث پہلے سے گھر میں موجود نظر آیا۔ وہ گھروں میں رنگ و روغن کا کام کرتا تھا۔ چھوٹی اور لاڈلی بہن کی حالت دیکھتے ہی تڑپ اٹھا۔

وہ بھی ایک غیر مرد کی بے ہودہ گفتگو سن کر غصے اور خوف سے کھولتی ہوئی گھر پہنچی تھی۔ ماں کی آنکھوں کے اشارے سمجھے بغیر اس نے روتے ہوئے ساری بات بھائی کے سامنے اگل دی.....

"بھیا!..... وہ کمینہ مجھے روزانہ تنگ کرتا ہے۔ کبھی کالج کے دروازے پر روک لیتا ہے، کبھی گلی کی نکڑ پر اور کبھی بازار میں..... بے ہودہ اور گندی گندی باتیں کرتا ہے..... فلمی ہیرو کی طرح بڑھکیں مار کر محبت کا اظہار کرتا

ہے۔ کہتا ہے میرے بی اے کرتے ہی زبردستی مجھ سے شادی کرلے گا، اور اگر اس سے پہلے میرا رشتہ لے کر کوئی آیا تو اسے جان سے مار کر اسی وقت مجھے بیوی بنالے گا۔"

"کون ہے وہ بدبخت۔" اس کا بھائی شاہ نواز غصے میں کانپتا ہوا چارپائی سے کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولا..... "جب تک میں زندہ ہوں میری گڑیا کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو وہ آنکھ جسم کا حصہ نہیں رہے گی۔"

"دلاور شیخ....." اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اس غنڈے کا نام لیا۔

شاہ نواز فوراً گھر سے باہر نکل گیا۔ ماں نے اسے روکنے کی بڑی کوشش کی مگر بیٹیوں کی طرح لاڈلی بہن کی آنکھوں میں نظر آنے والے آنسو دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہاں سے وہ بھاگتے ہوئے دلاور شیخ کے اڈے پر پہنچا تھا۔ مگر واپسی پر اسے ایک ہمدرد رکشے والا لے کر آیا تھا۔ دلاور شیخ کے اڈے کے سامنے اس کی بے یارومددگار پڑی لاش کو اس ڈرائیور نے اس لیے رکشے میں ڈالنے کی ہمت کی تھی وہ ان کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔

دو تین گھنٹے پہلے بہن کو چھیڑنے والے کو عبرت کا نمونہ بنانے کا دعوے دار۔ دلاور شیخ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا البتہ اپنی جان دے کر کم از کم بے غیرتی کی زندگی جینے سے بچ گیا تھا۔

اکلوتے بیٹے کی لاش دیکھ کر اس کی ماں پاگلوں کی طرح بس اسے ہی کوستی رہی۔ اس کے علاوہ اس بے چاری کے بس میں تھا ہی کیا..... "تناوش تو پیدا ہی کیوں ہوئی..... میں نے تیرے منہ پر تیزاب کیوں نہ پھینکا..... ارے تیرے چہرے پر چیچک ہی نکل آتی تو میرا گبھرو بیٹا تو مجھے چھوڑ کر نہ جاتا....." اس کی ماں کا مجذوبانہ واویلا جاری رہا۔ محلے کی دو تین بوڑھی عورتیں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں، مگر جوان بیٹے کی موت کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا کہ وہ کسی کی بات سمجھنے کے قابل ہوتی، روتی سینہ کوبی کرتی وہ کسی بات نہیں سن رہی تھی۔

تناوش کے اندر نفرت کا ایسا آلاؤ روشن تھا جو ہر چیز کو بھسم کردینے پر تلا تھا۔ باپ جیسے بھائی کی موت اسے بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ گھٹنوں میں سر دیے بس اپنے پروردگار سے شکوہ کناں رہی۔ کبھی کبھی وہ خودکشی کا سوچنے لگتی کہ اس کے مرنے کے بعد کم از کم اس کی ماں کو تو سکون آجائے گا۔ مگر خود کو حرام موت کے حوالے کرکے اور اپنی آخرت برباد کرکے اسے کیا ملتا۔ دلاور شیخ تو اسی طرح دندناتا پھرتا۔ اس کے بعد کسی اور غریب لڑکی کی عزت

کے درپے ہو جاتا، جبکہ وہ اسے عبرت ناک موت مارنا چاہتی تھی۔ کوئی ایسا طریقہ ہوتا کہ وہ اسے اپنے سامنے ایڑیاں رگڑتے دیکھ سکتی، مگر یہ ناممکن تھا۔ نہ تو قانون کے پاس اتنی طاقت تھی کہ دلاور شیخ پر ہاتھ ڈال سکتا اور نہ کوئی ایسا تھا جو دلاور شیخ کو ہلاک تو کیا صرف انھیں ہی دلاور کے شر سے بچا سکتا۔

جنازہ اٹھا اور ماں بیٹیاں تڑپ تڑپ کر غش کھا کر گر پڑیں۔ محلے کی عورتوں نے بڑی مشکل سے انھیں سنبھالا تھا۔ ہوش میں آ کر بشریٰ خاتون کا واویلا پھر شروع ہو گیا اور تناوش گھٹنوں میں سر دے کر دوبارہ اللہ پاک سے شکوہ شکایت کرنے لگی۔ اس کے علاوہ ان کے بس میں بھی تو کچھ نہیں تھا۔ رات کے گہرا ہوتے ہی محلے والیاں آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگیں۔ ایک ہمدردان کے لیے کھانا لے آیا مگر ماں بیٹی نے کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجبوراً کھانا وہیں رکھ کر وہ بھی تسلی کے چند بول ضائع کر کے رخصت ہو گیا۔

رات گئے ماں کی ممتا نے جوش مارا اور بشریٰ خاتون نے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تناوش کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اسے بے تحاشا چومتے ہوئے وہ روتی گئی۔

"میری گڑیا، میری لاڈلی شہزادی، میری چندا..... بس کرو نہ رو، تمھاری ماں زندہ ہے اب تک....."

ماں کی شفقت پا کر وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ بشریٰ خاتون اسے مناتی رہی دلاسے دیتی رہی۔ وہ ماں کی لاڈلی ہی تو تھی۔ اور بھائی کی موت میں اس کا کوئی قصور بھی تو نہیں تھا۔ نہ تو اس نے اپنی صورت خود بنائی تھی اور نہ کسی کے ساتھ کوئی ایسا تعلق رکھا تھا کہ اسے موردالزام ٹھہرایا جاتا۔

ماں بیٹی ایک دوسرے لپٹے روتی رہیں اور مالک ارض و سماء یہ سب کچھ تحمل سے دیکھتا رہا۔ کیوں کہ عزت و جلال کے مالک نے دنیا کو دارالعمل بنایا ہے دارالجزا نہیں بنایا۔ اگر دنیا کو بدلے کی جگہ بنا دیتا تو اب تک دلاور شیخ کی بوٹیاں چیل کوؤں نے کھالی ہوتیں۔ اس کے پاس کس چیز کی دیر تھی۔ وہ تو بس "کن" کہتا ہے اور سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ذات بابرکات نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کیا ہے اور اس سے پہلے وہ کام نہیں ہو سکتا۔ برے کام کا نتیجہ برا ہوا کرتا ہے مگر اس نتیجے نے ظاہر کب ہونا ہے یہ اس مالک ہی کو معلوم ہے۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن تعزیت کے لیے آنے والی عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ پڑوسیوں کی بیٹھک میں مردوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ چونکہ وہاں بیٹھنے کے لیے گھر کا کوئی مرد موجود نہیں تھا اس لیے جاننے والے خود بشریٰ خاتون کے پاس آ کر تعزیتی کلمات کہتے رہے۔

محلے کی مسجد کا امام مولوی محبوب الٰہی بھی تعزیت کرنے آیا تھا۔ تناوش کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس نے تسلی بھرے کلمات کہے، اللہ پاک کی رضا میں راضی رہنے کے فوائد پر روشنی ڈالی اور آخر میں بشریٰ خاتون کو مخاطب کر کے مشورہ دینے لگا۔

"بشریٰ بہن!..... یہ موقع ایسی بات کرنے کا تو نہیں ہے، لیکن بہتر ہوگا اگر کسی میڈیا کے نمائندے سے مل کر اسے اپنے مسئلے آگاہ کرو تو شاید اس بدبخت سے تناوش بیٹی کی جان چھوٹ جائے۔ اگر میڈیا پر یہ خبر چل پڑی تو یقیناً کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ میں بھی کوشش تو کروں گا اگر محلے والوں نے ساتھ دیا تو ہم باقاعدہ احتجاج کریں گے تاکہ کسی طرح صاحبانِ اقتدار تک یہ بات پہنچ جائے۔"

مولوی صاحب کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ انتقام میں جلی بھنی بشریٰ اگلے ہی دن ایک میڈیا آفس پہنچ گئی تھی۔ آفس سے باہر ہی اسے ایک بندو ویگن مل گئی۔ وہ خبروں کی تلاش میں کہیں جا رہے تھے۔ اس کی بات سن کر میڈیا کا نمائندہ بڑے جوش سے اس کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ مگر گھر پہنچنے پر ایک حیرت ان کی منتظر تھی۔ دلاور شیخ اپنے گرگوں کے ساتھ وہاں پہلے سے کھڑا تھا۔ اسے کسی نے یہ خبر پہنچا دی تھی کہ مولوی صاحب کے کہنے پر بشریٰ خاتون میڈیا سے رابطہ کرنے نکل پڑی ہے۔

بشریٰ کو دو تین ننگی گالیاں بکنے کے بعد دلاور شیخ اپنے گرگوں کے ساتھ میڈیا والوں پر پل پڑا۔ وہ تین آدمی تھے، ڈرائیور، کیمرہ مین اور رپورٹر۔ ان تینوں کو کھینچ کر دلاور کے غنڈے ساتھی ویگن سے باہر لے آئے.....

"تو تم میں سے کتنوں کی باجیاں کالج اسکول جاتی ہیں۔" انھیں ایک قطار میں کھڑا کر کے دلاور کی زبان غلاظت اگلنے لگی۔

رپورٹر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "دیکھیں جناب!..... آپ اچھا نہیں کر رہے ہم عوام کے خدمت گار ہیں اور ....."

"ایسی کی تیسی تمھاری خدمت کی۔" دلاور نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

دلاور کا بھاری تھپڑ کھا کر اس نے ایک جانب منہ کر کے خون تھوکا اور سر جھکا لیا۔

یہ پہلی بار ہے کہ میں فقط تنبیہ کر رہا ہوں، اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی اس گھر یا گھر والوں کے قریب پھٹکتا نظر آیا اس کی شلوار اتار اس کے سر پر باندھ دوں گا.....اور اس کے گھر کی خواتین کے جسم پر شلوار تو کیا قمیص بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"غلطی ہوگئی مائی باپ!" ڈرائیور نے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ باندھ دیے۔

دلاور شیخ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، جنھوں نے ان کی گاڑی کے شیشے توڑ کر ان کا کیمرہ بھی توڑ دیا۔

اس وقت کراچی کے حالات واقعی جنگل جیسے تھے۔ رینجرز وغیرہ کا آپریشن ابھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ ایک دو سیاسی جماعت کے غنڈوں نے پورے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ لوگ اتنے ڈرے سہمے ہوئے تھے کہ ایک حواس باختہ شخص کی بکواس کو کئی کئی گھنٹے تک سر جھکا کر سنتے رہتے۔ وہ احمق جسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا بکواس کر رہا ہے لیکن لوگوں کے پاس احتجاج کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

میڈیا والوں کا بس بھی انھی کمزوروں پر چلتا ہے جو اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بڑی مچھلیوں کے خلاف وہ بھی زبان نہیں کھول سکتے۔ کراچی میں ملنے والی ہر بوری بند لاش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، بھتا وصول کرنے والے کون ہیں، ٹارگٹ کلرز کا تعلق کس لابی سے ہے۔ یہ اور ان جیسے بہت سارے سوالوں کے جوابات معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ان سب کو نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یوں بھی میڈیا کا اصل مقصد پاکستان میں انتشار پھیلانا، بدانتظامی اور بدنظمی ظاہر کرنا، اسلام کو بدنام کرنا اور لبرل ازم کی تشہیر و تعریف کرنا ہی تو ہے۔

میڈیا والوں کے بھاگتے ہی دلاور شیخ ان کے گھر گھس گیا۔ بدقسمتی سے مولوی محبوب الٰہی وہاں موجود تھا۔

"بزرگو!.....سنا ہے میرے خلاف کوئی محاذ کھول رہے ہو۔" باریش عمر رسیدہ مولوی کے سامنے کھڑے ہو کر دلاور شیخ نے گھٹیا لہجے میں کہا۔ تناوش اس وقت زمین پر بچھی دری پر بیٹھی نفرت بھری نگاہوں سے اس کریہہ

الشکل شخص کو گھور رہی تھی۔ جو اس کے لیے مبغوض ترین شخص تھا۔ دن میں جانے وہ کتنی بار اس پر لعنت بھیجا کرتی ۔اسے دردناک موت کے حوالے کرنا تناوش کی ایسی خواہش تھی کہ جس کے بعد ہی اس کی زندگی میں کسی دوسری خواہش کا نمبر آتا تھا۔

"دلاور!.....اللہ کے غضب سے ڈرو، کیوں اس یتیم بے سہارا بچی کے پیچھے پڑا ہے۔"

"تو ان کا ماما لگتا ہے سالے!" اس کی سفید داڑھی سے پکڑ کے دلاور نے کھینچ کر زمین پر پٹخا۔

تناوش سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ وہ بھاگ کر مولوی صاحب کے قریب پہنچی۔

"تم جیسے بہادر بس کمزوروں ہی پر ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔" غصے بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ مولوی صاحب کو سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

"ہاہاہا....." دلاور نے مکروہ انداز میں قہقہہ لایا۔ "تو کوئی طاقت ور ڈھونڈ کر لے آؤ بے بی!..... یہاں تو سب ہی دلاور شیخ سے کمزور ہیں۔"

"اللہ پاک تو کمزور نہیں ہے دلاور!" مولوی محبوب الٰہی نے غم و غصے سے کانپتے ہوئے اسے سب سے طاقت ور ذات کا حوالہ دیا۔

"تو میں کون سا اللہ پاک کے ساتھ لڑ رہا ہوں۔ میں بھی تو تم جیسے کیڑے مکوڑوں سے مخاطب ہوں۔"

"اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے دلاور۔" مولوی محبوب الٰہی نے اسے اللہ پاک کے غضب سے ڈرایا۔

"سن بے مولوی!..... یہ وعظ مسجد میں بیٹھ کر سنانا میں یہاں تیرا وعظ سننے نہیں آیا۔ اور یاد رکھنا اگر اس کے بعد میرے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے کالے برقعے والی کو گھر بٹھا لینا..... شاید نہم کلاس میں ہے۔ شکل کا تو پتا نہیں مگر چال دیکھ کر لگتا ہے وہ بھی میرے ہونے والی بیگم کی طرح ہی ہوگی۔" دلاور شیخ نے غلیظ انداز میں مولوی صاحب کو اس کی بیٹی کا حوالہ دے کر دھمکی دی۔

"تجھے اللہ پوچھے گا دلاور!..... تم پر ضرور اللہ پاک کا غضب ہوگا۔" آنسو بہاتے ہوئے محبوب الٰہی وہاں سے سر جھکا کر چل پڑا۔ اپنی معصوم بیٹی کا نام ایک غلیظ غنڈے کے ہونٹوں سے سن کر اس کی ہمت جواب دے گئی

تھی۔ گاؤں والوں نے پہلے ہی دلاور شیخ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بھرے پرے محلے میں سیکڑوں کی تعداد میں جوان مرد موجود تھے اور ان پر دلاور شیخ چند غنڈوں کی مدد سے حکومت کر رہا تھا، کیوں کہ وہ اکٹھے نہیں تھے، سب کے اپنے غم اور اپنی ترجیحات تھیں۔ مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ ایک مسلمان کا دکھ درد، سب کا دکھ درد ہوتا ہے۔ مگر یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ بشریٰ خاتون کے گھر پر آنے والی مصیبت کو اسی نے جھیلنا تھا۔ اگر اس ایک کی مصیبت کے خلاف تمام محلہ ایکا کر کے دلاور شیخ کے سامنے آجاتا تو وہ ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن بشریٰ کے لیے دوسرا کوئی بھی اپنی پرسکون زندگی میں زہر نہیں گھولنا چاہتا تھا۔ ایک غریب مولوی نے لوگوں کو اکٹھا کرنے کی جرات کی اور اسے سب لوگوں کے سامنے تماشا بنا دیا گیا۔ مولوی صاحب کی بیٹی کو پڑنے والی دھمکی محلے بھر کے والدین کی جوان بیٹیوں کو دھمکی تھی۔ جو شخص مولوی محبوب الٰہی جیسے سفید ریش اور باعزت شخص کے ساتھ اتنے گھٹیا انداز سے پیش آسکتا تھا اس کا سلوک عام لوگوں کے ساتھ کیسا ہوتا۔

"ابے مولوی!..... آخری بات سنتا جا..... میں جانتا ہوں کہ تم کیوں ماں بیٹی کی مدد کرنے پر ادھار کھائے ہوئے ہو، بشریٰ خاتون ابھی تک خوب صورت ہے اور تمھاری کافی عرصے سے بے چاری بیوہ پر نظر ہے، تم بھی کچھ خدا کا خوف کھاؤ۔ تمھیں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ اگر زیادہ جوانی چڑھی ہے تو اس سے شادی کر لو جیسے میں اس کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہوں۔" دلاور شیخ اپنے غلیظ ہونٹوں سے غلاظت ہی اگل سکتا تھا۔ مولوی محبوب الٰہی کے پاس اس کی گندی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ غم و غصے اور دلاور کے توہین آمیز سلوک سے لرزتا کانپتا ان کے گھر سے نکل گیا۔

"یہ باقی لوگ کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہیں، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ وہاں موجود باقی لوگوں پر برس پڑا۔ تمام کان دبائے ہوئے ان کے گھر سے نکل گئے تھے۔

"سن لے بڑھیا!..... تیرے عاشق کو تو اس کی اوقات یاد دلا دی ہے، آئندہ تم بھی ذرا ہوش میں رہنا یہ نہ ہو مجھے شادی سے پہلے ہی تمھاری بیٹی سے سہاگ رات منانا پڑے۔" اس کی بات سن کر اس کے آدمیوں نے گھٹیا انداز میں قہقہہ لگایا تھا۔

بشریٰ خاتون وہ ذلت آمیز باتیں سن کر بس دل ہی دل میں اللہ پاک کو پکار کر رہ گئی۔اس کی نم آلود آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس کے لیے بھائی کا غم اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ جلدی زائل ہو جاتا مگر زندگی کسی کے غم اور دکھ کی وجہ سے رکا نہیں کرتی۔یہ تو بہتے دریا کی صورت ہر دم رواں دواں رہتی ہے۔نہ تو خوشی کے انبار اس کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں اور نہ غم کے پہاڑ اس کا راستہ روک سکتے ہیں۔زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی۔اس نے دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا تھا۔کالج ان کے گھر سے ڈیڑھ دو کلو میٹر دور تھا اور وہ یہ سارا راستہ پیدل ہی طے کیا کرتی تھی۔نہ تو اس کے پاس رکشے کا کرایہ ہوتا اور نہ بس کا۔پہلے تو بھائی کی وجہ سے ان کی گزر بسر ہو جایا کرتی اب تو وہ بھی نہیں رہا تھا۔

اس کا باپ ایک سرکاری محکمے سے ریٹائرڈ ہوا تھا اس کی محدود پنشن سے گھر کا گزارا نہیں چل سکتا تھا۔بیٹے کی ناگہانی وفات کے بعد بشریٰ خاتون نے محلے کے متمول افراد کے ہاں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔دو تین گھروں کے برتن بھانڈے دھو کر اور گھر کی جھاڑو پونچھ کر کے اسے اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیل سکیں۔

تناوش کو تعلیم جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا،وہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی لیکن ماں بیٹی کو دلاور شیخ کی دھمکی کھائے جا رہی تھی۔اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ اگر اس نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ورنہ وہ اپنی بیوی کو بی اے پاس دیکھنے کا متمنی تھا اور بی اے کرنے تک وہ اس مصیبت سے جان چھڑائے رکھنا چاہتی تھی۔اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی ماں بھی اس حق میں نہیں تھی کہ وہ لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھا کرے۔یوں بھی اس کی شکل وصورت ایسی تھی کہ گھر میں موجود مردوں کی نیت خراب ہوتے دیر نہ لگتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی کہ گھر سے کہیں بھاگ جائے،مگر اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس کی آنکھیں کھول دیتی کہ آخر کو وہ جائے گی کہاں۔اور پھر ایک دلاور شیخ سے جان چھڑا کر شاید اسے کتنے دلاوروں کو بھگتنا پڑے۔اس

کی ماں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن تھوڑے مختلف انداز میں۔اس نے گھر بیچ کر اپنی بیٹی کے ساتھ بھاگ جانے کا سوچا۔جن گھروں میں وہ کام کرتی تھی ان میں سے ایک ہمدرد شخص حاجی منظور کو اعتماد میں لے کر اس نے یہ درخواست کردی کہ ان کے گھر کے لیے کوئی گاہک ڈھونڈ لائے۔

حاجی منظور بھی دلاور شیخ سے خوفزدہ تھا،لیکن یہ کام کوئی اتنا خطرے والا نہیں تھا کہ وہ صاف انکار کردیتا۔

''ٹھیک ہے بشریٰ بہن!.....میں کوشش کروں گا۔''اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حامی بھرلی۔

تین دنوں بعد اس نے بشریٰ کو بتایا کہ اس نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے بات کرلی تھی اور وہ کسی بھی وقت ان کے گھر چکر لگا سکتا تھا۔

بشریٰ نے حاجی منظور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔''حاجی صاحب!.....اگر ہوسکے تو پراپرٹی ڈیلر کو یہ بتا دیں کہ وہ سہ پہر کے وقت تشریف لائے کہ اسی وقت میں گھر میں موجود ہوتی ہوں۔

''ٹھیک ہے بہن!''حاجی منظور اسی وقت موبائل فون نکال کر پراپرٹی ڈیلر کو یہ بات بتانے لگا۔

پراپرٹی ڈیلر اسی دن ان کے گھر آگیا تھا۔گھر کو اچھی طرح دیکھ کر اس نے جو قیمت لگائی وہ ان کی امیدوں سے کہیں کم تھی۔

''میں اس گھر کے دس لاکھ روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''نامعلوم اسے ان کی مجبوری کے بارے معلوم ہوگیا تھا یا یونہی ماں بیٹی کو بے وقوف جان کر وہ کوڑیوں کے مول ان کا گھر ہتھیانا چاہتا تھا۔

بشریٰ خاتون لجاجت سے بولی۔''بھائی جان!.....ہم غریب ماں بیٹی کا یہی ایک ٹھکانہ ہے اور اسے بیچ کر ہم اپنے سر چھپانے کے لیے کوئی اور جگہ دیکھیں گے،خدارا اتنی کم قیمت نہ لگائیں کہ ہم ایک کمرے کا کوارٹر بھی نہ خرید سکیں۔''

وہ کاروباری لہجے میں بولا۔''بہن جی!.....بارہ مرلے کے مکان کی کیا قیمت لگاؤں؟''

''بھائی یہ قیمت تو اس زمین کی بھی نہیں ہے،جبکہ اس پر دو پختہ کمرے برآمدہ،باورچی خانہ وغیرہ بھی بنا ہوا ہے۔''

''دیکھیں بہن جی!.....آخری اور حتمی بات کروں گا اگر پسند نہ آئے تو کسی اور کو بلوا لینا.....بارہ لاکھ روپے

دوں گا۔"

"بھائی جان!.....ہم غریبوں کا کوئی نہیں ہے۔اگر آپ نے اونے پونے میں یہ گھر خرید بھی لیا تو ایک دن اللہ پاک کو جان دینا ہے۔" بشریٰ خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔محبوب شوہر کا آبائی گھر بیچتے ہوئے اس کا کلیجہ حلق کو آ رہا تھا اور پھر خریدار اس کے دام ایسے لگا رہا تھا جیسے وہ کوئی جھونپڑی ہی تو ہو۔

"بہن جی!.....یہ میرا کاروبار ہے، چند ٹکے میں نے بھی کمانا ہوتے ہیں، اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو آپ نہ بیچیں یوں مجھے آخرت کی دھمکیاں تو نہ دیں، میں آپ سے چھین تھوڑی رہا ہوں۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا بھائی جان!" بشریٰ خفیف سی ہو گئی تھی۔

اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔"اچھا ٹھیک ہے بہن جی!..... پندرہ لاکھ دے دوں گا۔"

"بھائی جان!.....ہم ماں بیٹی کو کوئی اندازہ نہیں ہے، میں کل حاجی صاحب سے معلوم کر کے آپ کو بتا دوں گی۔" بشریٰ خاتون اتنی بچی تو نہیں تھی کہ فوراً ہاں کر دیتی۔دس لاکھ سے بات شروع کرنے والا اگر پندرہ لاکھ تک کی آفر کر سکتا تھا تو یقیناً حاجی صاحب کے درمیان میں آنے کی وجہ سے کچھ مزید رقم بڑھا دیتا۔

"ٹھیک ہے بہن جی!.....آپ حاجی صاحب سے پوچھ لیں اور پھر جو فیصلہ ہو مجھے اس نمبر پر بتا دینا۔" اس نے اپنا تعارفی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

کارڈ لے کر بشریٰ نے کہا۔"بھائی جان!.....آپ چائے تو پی کر جائیں نا؟"

"نہیں بہن پھر کبھی سہی۔" کہہ کر وہ ان کے گھر سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن بشریٰ خاتون نے حاجی منظور سے گھر کی بابت مشورہ لیا۔

حاجی منظر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔"بہن!.....مجھے کوئی خاص اندازہ تو نہیں ہے، لیکن پندرہ لاکھ مناسب رقم ہی ہے۔اور یوں بھی آپ کے جو حالات ہیں ان کے مطابق اس رقم کو غنیمت سمجھو.....جان اور عزت سے بڑھ کر نہ مال و دولت ہوتا ہے اور نہ زمین جائیداد۔"

''ٹھیک کہہ رہیں بھائی جان!'' بشریٰ نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا۔

گھر واپسی پر اس نے تناوش کو پراپرٹی ڈیلر سے بات کرنے کو کہا..... وہ اپنے موبائل سے پراپرٹی ڈیلر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ چند گھنٹیوں کے بعد ہی اس کی سہمی ہوئی ہیلو ابھری۔

''ہیلو انکل!..... میں بشریٰ بی بی کی بیٹی بات کر رہی ہوں، کل آپ ہمارا مکان دیکھنے آئے تھے نا.....'' تناوش کا تعارف بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس نے حیرانی بھرے انداز میں موبائل کو کان سے ہٹا کر دیکھا اور دوبارہ کال ملانے لگی۔ گھنٹی کے جاتے ہی نمبر مصروف کر دیا گیا تھا۔

تناوش نے کارڈ پر اس نمبر کو بہ غور پڑھا کہ کہیں وہ غلط نمبر تو نہیں ملا رہی، مگر نمبر میں کوئی غلطی نہیں تھی، وہ دوبارہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس مرتبہ پہلی ہی گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رسیور سے ڈری سہمی ہوئی آواز برآمد ہوئی.....

''مس، آپ کیوں مجھے بار بار کال کر رہی ہیں، خدا کے واسطے مجھ سے رابطہ نہ کرو۔ میری توبہ، میں نے آپ کا گھر نہیں خریدنا۔''

''چچا جان!..... کیا ہوا ہے؟''

''آپ کو معلوم نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے۔'' وہ غم و غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

''شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے بے ربط ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے دامن امید دراز کیا۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے بی بی جی!..... دلاور شیخ نامی غنڈے کے آدمیوں نے مجھے مارنے پیٹنے کے ساتھ دھمکیاں بھی دی ہیں کہ اگر میں نے آپ کا گھر خریدا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں معذرت خواہ ہوں محترمہ!..... اور امید ہے اب آپ مجھے کال نہیں کریں گی۔'' یہ کہتے ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی!'' بات چیت ختم ہوتے ہی اس کی ماں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''امی جان!..... اس خبیث تک ہمارے گھر بیچنے کی بات پہنچ گئی ہے، اس لعنتی کے گرگوں نے بے چارے

پراپرٹی ڈیلر کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے اور ہمارا گھر خریدنے سے منع کر دیا ہے۔"

"پتا نہیں اس موذی سے کب جان چھوٹے گی، یا اللہ پاک!.....اس بد بخت کے شر سے ہمیں پناہ دے۔" بشریٰ دونوں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑانے لگی۔ ان کی نظریں سارے دنیاوی سہاروں سے ہٹ کر آخری اور یقینی سہارے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن اس نے پھر حاجی منظور سے بات کی تھی.....

حاجی منظور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے دکھی لہجے میں بولا۔ "میری بہن، میں بے بس اور مجبور ہوں۔ اس غنڈے کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کے لیے پراپرٹی ڈیلر سے میں نے بات کی تھی۔ کل شام کو اس کا ایک آدمی میرے گھر یہ بتانے آیا تھا کہ یہ میری پہلی اور آخری غلطی تھی، اس کے بعد میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ کہ اگر میں آپ لوگوں کا زیادہ ہی ہمدرد ہوں تو اپنی بیٹی کو دلاور شیخ کے پاس بھیج دوں تاکہ وہ تناوش بیٹی سے دست بردار ہونے کے بارے سوچ سکے۔"

بشریٰ صرف حاجی منظور نہیں تمام محلے والوں کی مجبوریاں جانتی تھی۔ ہر آدمی پہلے اپنے گھر کا سوچتا ہے اس کے بعد کسی دوسرے کا نمبر آتا ہے۔ یقیناً اپنے پاؤں کا کانٹا دوسرے کے برچھا لگنے سے بھی زیادہ اذیت دیتا ہے۔ اس کے دکھ درد سے زیادہ محلے والوں کو اپنے گھر بار اور اپنی بہنوں، بیٹیوں کی فکر تھی۔ وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ آج اگر بشریٰ خاتون کی بیٹی پر ایک موذی آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا تو اگلا نمبر ان کی بہن بیٹی کا بھی آ سکتا تھا۔ جس درندے کو انسانی خون کا چسکا لگ جائے وہ بھرے پرے گاؤں پر شب خون مارنے سے نہیں چوکتا۔ اس سے بچنے کے لیے گھر کے دروازے بند کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ سب کو مل کر اس کا مقابلہ کر کے اسے فنا کر دینے سے مسئلہ حل ہوتا ہے۔ یہاں دلاور جیسے درندے سے بچنے کے لیے تمام اپنے گھروں کی کنڈیاں لگانے پر اکتفا کر رہے تھے۔

بشریٰ خاموشی سے گھر لوٹ آئی۔ اس کا یہ منصوبہ بھی ناکام گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کے بھائی کو مرے ہوئے مہینا ہونے کو تھا کہ ایک رات مولوی محبوب الٰہی عشاء کی نماز کے بعد چھپتا ہوا ان کے گھر آیا۔ ماں بیٹی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ دلاور کی اتنی سخت دھمکی کے باوجود وہ ان کی مدد کرنے باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ بشریٰ خاتون کو مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

"بشریٰ بہن!..... بہتر یہی ہوگا کہ جلد سے جلد تناوش بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو ورنہ اس بدبخت خبیث سے کوئی بعید نہیں کہ کب کوئی گھٹیا حرکت کر گزرے۔"

"بھائی جان!..... میں بھی تو یہی چاہتی ہوں، مگر ایسا کون ہوگا جو میری بیٹی کا ہاتھ تھام لے۔ یقین مانو میں اپنی شہزادیوں کی طرح بیٹی کو کسی شریف آدمی کی دوسری بیوی بنانے پر بھی تیار ہوں مگر کوئی شریف آدمی حامی تو بھرے۔"

"بہن!..... یہ کام چوری چھپے کرنے والا ہے، اگر راتوں رات ہم تناوش بیٹی کا نکاح کسی سے پڑھا کر اسے رخصت کر دیں تو اس بدبخت کو کیا معلوم ہوگا؟"

"یقین مانیں بھائی جان!..... میں تو بیٹی کے ساتھ یہ گھر بیچ کر کہیں بھاگنے کا منصوبہ سوچے بیٹھی تھی، مگر اس موذی کے گرگے گھر خریدنے والے کو زدوکوب کرنے سے بھی باز نہ آئے۔ وہ ہمارے گھر کی نگرانی کروا رہا ہے۔"

بشریٰ کی بات سنتے ہی مولوی صاحب کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ "کہیں وہ اس وقت بھی گھر کی نگرانی نہ کر رہے ہوں؟"

"کوئی پتا نہیں ان موذیوں کا بھائی صاحب۔" دلاور شیخ کو کوستے ہوئے بشریٰ کی آواز بھرا گئی تھی۔ "ہمارے تو نصیب ہی کھوٹے تھے جو اس بدبخت نے میری معصوم بیٹی پر اپنی گندی نظر رکھ لی۔"

"اللہ پاک، بہتر کرے گا میری بہن!..... آزمائشیں اسی ذات کی طرف سے نازل ہوتی ہیں، لیکن یاد رکھنا وہ کسی آزمائش میں اپنے بندے کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ ہر فرعون کے لیے اس نے موسیٰ بنایا ہے۔ دلاور بھی زیادہ دن اپنی من مانی نہیں کر سکے گا۔"

"اگر میری بیٹی کی بربادی کے بعد یہ موذی اپنے انجام کو پہنچا بھی تو مجھے کیا حاصل؟"

"پریشان نہیں ہوتے میری بہن، اللہ پاک ضرور کوئی سبب پیدا کرے گا۔"

”ہمارا سبب تو آپ ہی ہیں بھائی جان!.....آپ کے علاوہ تو کوئی ہمیں اکیلے میں بھی تسلی نہیں دیتا۔“ بشریٰ کے لہجے میں شکر گزاری کا گہرا احساس پوشیدہ تھا۔

”میں تو ایک ناکارہ سا بندہ ہوں بہن، کاش میں تناوش بیٹی کو اس بدبخت سے چھٹکارا دلا سکتا۔“

اس مرتبہ بشریٰ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ مولوی صاحب چند لمحے مزید وہاں بیٹھا اور پھر تناوش کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر رخصت ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن ایک روح فرسا خبر ان کی منتظر تھی۔ رات کو مولوی صاحب کو کچھ آدمیوں نے بہت بے دردی سے پیٹا تھا۔ اس کا لہولہان جسم مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پڑا تھا۔ اس پر سب سے پہلے بوڑھے بابا کرم دین کی نظر پڑی تھی جو تہجد کی نماز کے لیے باقاعدگی سے مسجد جایا کرتے تھے۔ پہلی نظر میں تو انھوں نے سمجھا کوئی لاش پڑی ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں مولوی صاحب کے معزز چہرے کو پہچاننے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

جائزہ لینے پر انھیں مولوی صاحب کی نبض چلتی نظر آئی۔ بوڑھے کرم دین میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مولوی صاحب کو اکیلے اٹھا سکتے۔ انھوں نے قریبی گھر کے دروازے پر دستک دی۔ مسجد کے پڑوس میں رہنے والے جہانگیر کے مولوی صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس نے فوراً کار نکالی اور وہ دونوں مل کر مولوی صاحب کو نزدیکی ہسپتال لے گئے۔ بڑی مشکل سے ایمرجنسی میں بیٹھا ڈاکٹر مولوی صاحب کو دیکھنے پر آمادہ ہوا تھا۔ مولوی صاحب کی نبض بہت دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

جس وقت بشریٰ خاتون تک یہ بات پہنچی اس وقت مولوی صاحب خطرے کی حدود سے تو نکل گئے تھے، لیکن انھیں ابھی تک ہسپتال سے ڈسچارج نہیں کیا گیا تھا۔ مجرموں کو اچھی طرح پہچاننے کے باوجود مولوی صاحب نے رپورٹ درج کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ پولیس کی کارکردگی سے اچھی طرح سے واقف تھے۔

تمام محلے والوں کو بھی معلوم تھا کہ مولوی صاحب کو اس حال تک پہنچانے والی شخصیت کون سی ہے۔ مولوی صاحب کے انجام نے انھیں مزید محتاط بنا دیا تھا۔ اس سے پہلے اگر کسی کے دل میں تناوش اور اس کی ماں کے لیے

ہمدردی کا جذبہ رینگ بھی رہا تھا تو مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر وہ جذبہ اپنی موت آپ مر گیا تھا۔

بشریٰ، تناوش کو ساتھ لے کر مولوی صاحب کو ملنے ہسپتال گئی تھی۔ انھیں دیکھ کر مولوی صاحب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"معذرت خواہ ہوں بہن!..... میں آپ کے معیار پر پورا نہ اتر سکا، میں تناوش بیٹی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔"

"اللہ پاک آپ کو دنیا اور آخرت کی کامیابی عطا کرے مولوی صاحب!..... آپ کی اس حالت کی ذمہ دار بھی ہم ماں بیٹی ہیں۔ ہمیں معاف کر دینا۔" بشریٰ خاتون گلوگیر ہونے لگی تھی۔

"پریشان نہ ہوں میری بہن!..... میں اللہ پاک کی ذات سے مایوس نہیں ہوں، اللہ پاک کوئی بہتر سبب نکالے گا۔ اس کے پاس دیر ضرور ہے، اندھیر نہیں ہے۔"

بشریٰ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "کہیں یہ دیر حشر کے میدان تک طول نہ کھینچ جائے۔"

اور مولوی صاحب اس کی بات کا جواب دیے بغیر ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ اللہ پاک کے کاموں میں چھپی تاخیر کی حکمتیں جاننا کسی انسان کے بس سے باہر ہے۔

☆.....☆.....☆

ہفتے دس دن بعد مولوی محبوب الٰہی صحت یاب ہو کر گھر آ گیا تھا۔ لیکن اب اس میں اتنی ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ دلاور شیخ کا مقابلہ کر سکتا۔ محلے والوں نے اس کام میں کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ انھی دنوں تناوش کو ماں کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی محبوب الٰہی وہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور جانے کی کوشش میں ہیں۔ ان جیسے مخلص انسان کے محلے سے چلے جانے کے خیال نے تناوش کو اداس کر دیا تھا، مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔

مولوی صاحب اپنے مکان کے لیے کوئی مناسب خریدار ڈھونڈ رہے تھے اس کے بعد انھوں نے چلے جانا تھا۔ مولوی صاحب جیسے مخلص اور نیک شخص کو صرف اس وجہ سے محلہ چھوڑنا پڑ رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی کی مدد نہیں کر پائے تھے۔ اور آنے والے دنوں میں دلاور شیخ کی مزید خباثتوں سے آنکھیں چرانے کے لیے وہ اپنا آبائی گھر

چھوڑنے پر تیار ہو گئے تھے۔ محلے کے کافی بزرگوں نے دبے لفظوں میں مولوی صاحب کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن جو لوگ ایک غنڈے کے خلاف مولوی صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے نہیں ہوئے تھے وہ اپنی بات منوانے کے مجاز نہیں تھے۔ ماں کے منہ سے مولوی صاحب کے جانے کی خبر سن کر وہ ساری رات سو نہیں پائی تھی۔

اگلے دن وہ اپنے کالج کے گیٹ کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے دماغ میں عجیب طرح کی حسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ کالج جانے یا پڑھائی کرنے پر اس کا دل بالکل بھی مائل نہیں ہو رہا تھا۔ زندگی میں نہ تو اسے سکون کی کوئی رمق نظر آ رہی تھی اور نہ خوشی کی کوئی جھلک۔ وہ زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی، اس عمر میں ایک لڑکی کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کا گہرا احساس پنپ رہا ہوتا ہے۔ ایک جانا انجانا محبوب ہر وقت اس کی سوچوں میں بسا اسے سہانے سپنوں میں کھویا رکھتا ہے۔ اس کی تو شکل وصورت بھی ایسی تھی کہ کئی چاہنے والے اس کے لیے دل کے دروازے وا رکھتے۔ اتنے کہ اس سے چناؤ مشکل ہو جاتا۔ مگر کسی کی ایسی جسارت سے پہلے ہی ایک غلیظ، کمینے اور گھٹیا شخص نے اس پر اپنا ظالمانہ تصرف جما لیا تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی اس کی قید میں تھی۔ اس سے جان چھڑانے کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں۔

وہ کراچی کی تیز رفتار سرگرمیوں کو دیکھتی ہوئی کندھے پر کتابوں کا بیگ لٹکائے خاموشی سے آگے بڑھتی رہی۔ اس کے دائیں بائیں زندگی پوری قوت کے ساتھ رواں دواں تھی جبکہ اس کی مثال زندگی کے اس بہتے دریا میں کسی لاش کی سی تھی۔ خوشی اور غم کے احساسات کا تصور وہ کھو چکی تھی۔ ایک نفرت کا جذبہ تھا جس کے زیر اثر وہ زندگی سے چمٹی ہوئی تھی۔ دلاور شیخ کی عبرت ناک موت ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا، سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑی خوشی تھی۔ دلاور شیخ کی بیوی بننے سے موت کو گلے لگا لینا کئی گنا زیادہ آسان تھا۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ اس موذی کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپتے ہوا مرتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس خوش کن منظر کو دیکھنے کے لیے وہ کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔ مگر ہر وقت اسی سوچ میں کھوئے رہنے کے باوجود اسے کوئی مناسب حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس خواہش کو کیسے پورا کر پاتی۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا جس سے وہ اس ذلیل کا غلیظ سر اپنے ہاتھوں سے اس کے تن سے جدا کر دیتی۔

وہ اپنے کالج سے کافی آگے آچکی تھی۔ کپڑوں کے ایک بازار میں گھس کر وہ مختلف دکانوں کے آگے لٹکے خوب صورت لباس دیکھنے لگی۔ پلاسٹک کے مجسموں کو ایسے عجیب وغریب لباس پہنائے گئے تھے جو اس نے خود تو کیا کسی اور عورت کے بدن پر بھی نہیں دیکھے تھے۔ کپڑوں کی مارکیٹ سے نکل کر وہ جوتوں کی مارکیٹ میں گھس گئی۔ دکانوں کے سامنے سے آہستہ روی سے گزرتے ہوئے وہ حسرت ناک نگاہوں سے ان قیمتی جوتوں کو دیکھتی رہی جو اس کی قوت خرید سے کہیں باہر تھے۔ اپنے پاؤں کی طرف نظر دوڑانے پر اسے وہی پرانے جوتے نظر آئے جو وہ پچھلے دو سال سے پہنتی چلی آرہی تھی۔ کثرت استعمال سے جوتوں کے تلوے گھس گئے تھے۔ ان کی اوپری چمک دمک بھی بس پالش کی مرہون منت تھی۔

اس بازار سے نکل کر وہ سبزی بازار میں گھس گئی۔ ریڑھیوں اور سٹالوں پر سجے مختلف اقسام کے عمدہ پھل اس کی اشتہا بڑھانے لگے۔ بہت سارے پھلوں کا تو اسے ذائقہ تک معلوم نہیں تھا کہ کبھی چکھنے کا اتفاق جو نہیں ہوا تھا۔ سبزی بازار کا اختتام نسبتاً چوڑے بازار میں ہوا جہاں ہر قسم کا سامان سجا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ ماحول میں کھوئی خالی ذہنی سے آگے بڑھتی رہی۔ اس بازار کے بعد بڑی سڑک کی شروعات ہوگئی تھی جس کے جوانب میں بڑی عمارتیں، کمرشل پلازے اور خوب صورت ہوٹل نظر آرہے تھے۔ ہوٹلوں کی پارکنگ میں نظر آنے والے رش سے اس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ جیب سے اپنا سستا سا موبائل فون نکال کر اس نے وقت دیکھا، ڈیڑھ بج رہے تھے۔ اسے اچانک بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس کے لنچ بکس میں رات کی باسی دال کے بنے ہوئے پراٹھے موجود تھے، مگر اسے ایسی مناسب جگہ نظر نہ آئی جہاں بیٹھ کر وہ پیٹ پوجا کر سکتی۔

کسی مناسب جگہ کو ڈھونڈنے کے لیے اس نے قدموں کی رفتار بڑھا دی تھی۔ اس وقت وہ ایک بڑے ہوٹل کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ سیاہ رنگ کی خوب صورت کار میں، سفید رنگ کا سوٹ پہنے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھ رہا تھا۔ اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ ایک باوردی پولیس والے نے کھولا تھا۔ یقیناً وہ کوئی بااختیار شخص تھا جس کے لیے پولیس کا باوردی شخص دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کے کار میں بیٹھتے ہی پولیس والا کار کے عقب میں موجود پولیس جیپ میں بیٹھ گیا، جس میں اس کے علاوہ تین اور باوردی پولیس والے بھی ہتھیاروں سے مسلح بیٹھے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اس کے محافظ تھے۔

”کیا یہ اتنا با اختیار ہوگا کہ مجھے دلاور شیخ کے شر سے نجات دلا سکے۔“ ایک امکانی سوچ اس کے دماغ میں ابھری۔ وہ اسے روکنے کے خیال سے چوڑی روش کے قریب ہوگئی۔

”نہ جانے میرے اشارے پر رکے گا بھی کہ نہیں۔“ یہ سوچ ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر اس سے پہلے ہی اس کے کانوں میں بریکوں کی تیز چرچراہٹ گونجی، اس نے بے ساختہ اس جانب نگاہیں گھمائیں ایک کالے رنگ کی مرسڈیز نے چوڑی روش کے سامنے رک کر آنے والی گاڑی کا راستہ روک دیا تھا۔

مرسڈیز کے پیچھے دو کھلی چھت والی جیپیں بھی موجود تھیں۔ دونوں جیپوں میں تین تین افراد سوار تھے۔ مرسڈیز رکتے ہی جیپ سے ایک مسلح شخص پھرتی سے اترا اور مرسڈیز کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

”اب نہ جانے اس میں کون سوار ہے اور کیا یہ سفید لباس والے سے بھی زیادہ با اختیار ہوگا۔“ اس کی محدود سوچیں ان دونوں گاڑیوں میں سوار شخصیتوں کی طاقت کا اندازہ لگانے لگیں۔ مرسڈیز کے کھلے دروازے سے کالی پتلون میں ملبوس ایک ٹانگ نمودار ہوئی۔ جس کے پاؤں میں چمکتا ہوا سیاہ رنگ کا عمدہ بوٹ چمک رہا تھا۔ اور پھر بڑے انداز سے وہ مکمل ہی کار سے باہر آ گیا۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ چوڑی چھاتی، اندر کی طرف گھسا ہوا پیٹ اسے کوئی منجھا ہوا ریسلر ظاہر کر رہا تھا۔ کار سے باہر آتے ہی اس نے کوٹ کے سامنے والے دو بٹن بند کیے، آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر جیب میں ڈالا اور دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی موٹی بھوری آنکھوں میں عجیب قسم کی بے رحمی ہویدا تھی۔ چوڑی پیشانی، گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، اٹھی ہوئی باریک ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر موجود نفاست سے ترشی ہوئی مونچھیں اور تین چار دن کی بڑھی ہوئی شیو۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہونے کے باوجود مجموعی طور پر اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی کہ تناوش کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔

اس نے ایک سرسری نگاہ تناوش پر ڈالی اور پھر کار کا دروازہ کھولنے والے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس نے جلدی سے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر اس کے سامنے پکڑ لی۔

ایک سگریٹ نکال کر اس نے باریک ہونٹوں میں پکڑی۔ سگریٹ پیش کرنے والے نے لائیٹر جلا کر

سگریٹ سلگائی اور پیچھے ہو گیا۔

وہ سگریٹ کا لمبا کش بھر کر بے تاثر چہرہ لیے ہوٹل سے نکلنے والی کار کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے تناوش جھرجھری لیتے ہوئے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئی جس سے مدد مانگنے کے لیے وہ اس راستے کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بھی کار سے باہر آ گیا تھا مگر اس حال میں کہ اس کی ٹانگوں میں ہونے والی لرزش تناوش کو بھی نظر آ رہی تھی۔

''تو جسٹس ظہیر امجد صاحب!..... آخر آپ سے ملاقات ہو ہی گئی۔'' مرسڈیز سے برآمد ہونے والی شخصیت کی آواز بھی اس کی جسامت کی طرح بھاری اور پر رعب تھی۔

جسٹس ظہیر امجد نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کے حلق سے منمناتی آواز برآمد ہوئی۔ ''کک..... کبیر دادا..... کیسے ہیں آپ۔''

''آپ نے حال پوچھ لیا، اب کافی بہتر محسوس کرنے لگا ہوں۔'' کبیر دادا کی آواز میں چھپا طنز جسٹس ظہیر امجد کو لرزا گیا تھا۔ تناوش وہاں کھڑی خود کو عجیب سا محسوس کرنے لگی تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی نے بھی اس کے یوں کھڑے ہونے کو اہمیت نہیں دی تھی۔

''کک..... کبیر دادا!..... مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے کیا؟'' جسٹس ظہیر امجد نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''سنا ہے آپ ہمارے ایک خدمت گار کو پھانسی کی سزا سنانے والے ہیں اور اسی وجہ سے اس کے کیس کا فیصلہ مسلسل التوا کا شکار ہو رہا ہے۔''

''نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مم..... میں تو بس اس کی بے گناہی کے لیے کسی مناسب ثبوت کا منتظر ہوں اس وجہ سے فیصلے میں تھوڑی تاخیر ہو گئی ہے۔''

کبیر دادا نے استہزائی انداز میں ہنستے ہوئے اپنا پاؤں اس کی کار کے بونٹ پر رکھا۔ ''وہ کبیر دادا کا آدمی ہے۔ اس کی بے گناہی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔''

''بب..... بالکل..... جناب..... آپ صحیح فرما رہے ہیں۔'' خوف سے جسٹس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

''ہونہہ!..... ویسے اتنے ہی سمجھ دار ہو یا مجھے دیکھ کر عقل آ گئی ہے۔''

''نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کبیر دادا۔'' وہ خشک ہوتے ہونٹوں کو تر کرنے لگا۔

کبیر دادا نے ہاتھ میں سلگتی سگریٹ کی راکھ، اپنے بونٹ پر رکھے بوٹ پر جھاڑی اور پھر افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتا ہوا جسٹس امجد ظہیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اُفوہ!..... یار دیکھو پھر بوٹ کی پالش خراب کر بیٹھا ہوں۔ آپ کے پاس رومال تو ہوگا۔''

''جج..... جی، جی۔'' چہرے پر بے بسی کے تاثرات سجائے جسٹس ظہیر امجد نے جیب سے رومال نکالا اور قریب ہو کر کبیر دادا کے بوٹ پر پڑی سگریٹ کی راکھ صاف کر دی۔

کبیر دادا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری..... ''پرسوں شام کو میں اپنے آدمی کی رہائی پر گھر پر پارٹی دے رہا ہوں..... ضرور تشریف لائیے گا۔''

''جی ضرور۔'' جسٹس ظہیر نے اثبات میں سر ہلایا اور کبیر دادا واپس اپنی کار کی جانب مڑ گیا۔ اس کی سرسری نگاہ دوبارہ تناوش پر پڑی۔ کار کے دروازے کے پاس رکتے ہوئے وہ خفت اور ذلت کے ملے جلے احساس میں مبتلا جسٹس سے پوچھنے لگا۔

''یہ لڑکی تمھاری بیٹی تو نہیں ہے۔'' اس نے تناوش کی طرف اشارہ کیا اور پھر جسٹس کا جواب سنے بغیر کار میں بیٹھ گیا۔ پہلے والے آدمی ہی نے کار کا دروازہ بند کیا اور بھاگ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ مرسڈیز ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تناوش کی نگاہیں مرسڈیز ہی پر گڑی رہ گئی تھیں۔ اس کی نمبر پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر بھی اتنا عجیب تھا کہ اسے فوراً یاد ہو گیا تھا K-302۔

جب تک وہ قیمتی کار نظر آتی رہی تناوش اسی طرف متوجہ رہی تھی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ جسٹس کی طرف متوجہ ہوئی جو مضمحل انداز میں کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اس کے محافظوں نے اس دوران جیپ سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تناوش کی نگاہ کافی دیر بعد وردی میں ملبوس ان سورماؤں کی طرف اٹھی اور ان کے خوف سے پیلے پڑتے چہرے دیکھ کر تناوش کے دل میں کبیر دادا کا مزید رعب بیٹھ گیا تھا۔

''کیا دلاور شیخ بھی اس سے اسی طرح خوف زدہ ہوگا۔'' اس کے دماغ میں امید افزا سوچ ابھری۔

''یقیناً، وہ سڑک چھاپ اسے دیکھ کر اپنی شلوار گیلی ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔'' دلاور شیخ کی نفرت سے بھرے دل میں خوش کن خیال اجاگر ہوا۔

"مگر اسے کیا ضرورت کہ میرے جیسی عام لڑکی کے لیے اپنا وقت برباد کرتا پھرے۔ ہم جیسے کیڑے مکوڑے اتنی اہمیت کے حامل تو نہیں ہوتے کہ ان کی خاطر بھی کسی کو جسٹس ظہیر امجد کی طرح سر راہ روک کر دو تین منٹ کی پوچھ گچھ ہی کر لی جائے۔

سر جھٹک کر وہ چوڑی روش کو عبور کر کے آگے بڑھ گئی۔ جسٹس کی کار وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ اب اس کا دماغ دائیں بائیں کے مناظر کے بہ بجائے کبیر دادا کی پر رعب شخصیت کو سوچ رہا تھا۔ اس کی شکل وصورت، چشمہ لگانے کا انداز، دراز قامت، کسرتی جسم، قیمتی لباس، بات کرنے کا پر اعتماد اور جچا تلا انداز..... اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیوں اسے اتنا اچھا اور اپنا اپنا لگا تھا۔

اس کی سوچوں میں کار کے تیز ہارن نے خلل ڈالا تھا۔ اس نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا، بے خیالی میں وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آ گئی تھی۔ وہ جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ گئی، کبیر دادا کی شخصیت ایک بار پھر اس کی سوچوں پر حملہ آور ہوئی مگر زور سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے ٹریفک کی روانی پر نظریں گاڑ لیں۔ کبیر دادا کی طلسماتی شخصیت کی حیثیت خوابوں اور سپنوں کے تصوراتی شہزادے کی سی تھی، ایک ایسا شہزادہ جو فاتح فوج کی قیادت کرتا ہوا وطن واپس لوٹے اور پورا شہر اسے دیکھنے اور اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ٹوٹا پڑ رہا اور وہ ایک عام راہگیر کی طرح دور کھڑی اسے حسرت بھری نگاہوں سے تکنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتی ہو۔

اسکولوں اور کالجوں کی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے رکشوں، بسوں اور ویگنوں میں مختلف عمر کے بچے بچیاں بھرے ہوئے گھر کی جانب روانہ دکھائی دے رہے تھے۔ موٹر سائیکلوں اور کاروں کے اندر بھی اسکول کالج کے طلبہ ہی بھرے نظر آ رہے تھے۔ اس نے گھر واپسی کا سوچا اسی لمحے اسے دوبارہ زور کی بھوک کا احساس ہوا۔ دائیں بائیں نظریں دوڑانے پر اسے کچھ فاصلے پر ایک پارک نظر آیا۔ سستی سے پاؤں گھسیٹتی وہ پارک کی جانب بڑھ گئی۔ صبح سے مسلسل چلنے کی وجہ سے اسے سخت قسم کی تھکن محسوس ہو رہی تھی، مگر اس کی جیب میں اتنے پیسے موجود نہیں تھے کہ ٹیکسی یا رکشا کرا کر گھر کا رخ کر سکتی۔

پارک کی سنگی بینچ پر بیٹھ کر وہ کندھے سے لٹکا اسکول بیگ گود میں رکھ کر کھولنے لگی۔ وہ پلاسٹک کے ایک ڈبے ہی میں دوپہر کا کھانا ڈال کر لایا کرتی، وہی اس کا لنچ بکس تھا۔

ڈبے کا اوپری ڈھکن ہٹا کر اس نے ٹھنڈے ہوئے پراٹھوں سے ایک نوالہ توڑا اور رغبت سے چبانے لگی ۔شدید قسم کی بھوک میں وہ پراٹھے کسی مرغن غذا سے کم ذائقہ نہیں دے رہے تھے ۔تھوڑی دیر میں وہ دونوں پراٹھے چٹ کر گئی تھی ۔لنچ بکس واپس بیگ میں ڈال کر وہ پارک کے کونے میں لگے الیکٹرک واٹر کولر کی طرف بڑھ گئی ۔جس پر زنجیر سے بندھا ایک سلور کا گلاس موجود تھا۔دو گلاس پانی کے معدے میں انڈیل کر وہ دوبارہ بینچ کے پاس آ کر ستانے بیٹھ گئی ۔کھانا کھانے کے بعد اسے ایک دم تھکن محسوس ہونے لگی تھی ۔اس کا دل کر رہا تھا کہ وہیں لمبی تان کر سو جائے ۔مگر پھر گھر واپسی کے خیال نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔پاؤں گھسیٹتی ہوئی وہ پارک سے باہر آئی اور واپسی کے رستے پر گامزن ہو گئی۔

اس وقت وہ پرشکوہ اور دیدہ زیب کوٹھیوں کے سامنے سے گزر رہی تھی جب اس کی نظر سفید گلاب کے پودے پر پڑی جو پھولوں سے اٹا پڑا تھا۔وہ پودا کوٹھی اور سڑک کو ملانے والی سیمنٹ کی پختہ روش کے ساتھ بنی کیاری میں لگا تھا۔سفید گلاب ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے۔وہ ایک پھول کے قریب ناک لے جا کر اس کی بھینی بھینی خوشبو اپنے اندر اتارنے لگی ۔خوشبو سونگھتے ہوئے اچانک اس کی سماعتوں میں بریکوں کی چرچراہٹ گونجی ۔اس نے نظریں اٹھائیں ،ایک گاڑی تیز رفتاری سے سڑک سے سمینٹ کی پختہ روش کی طرف مڑ رہی تھی۔

اور پھر گاڑی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں ۔وہ کبیر دادا والی مرسڈیز ہی تھی ۔اس کے عقب میں دو جیپیں موجود تھیں ۔مزید تصدیق کے لیے اس کی آنکھوں نے گیٹ کے سامنے ایک لمحہ کے لیے رکنے والی مرسڈیز کی نمبر پلیٹ پڑھی ۔K-302 پڑھتے ہی وہ بت بنی کار اور جیپوں کو گیٹ کے اندر داخل ہوتا دیکھتی رہی ۔سفید گلاب کی خوشبو سونگھنا اسے بھول گیا تھا۔

گاڑیوں کے اندر جاتے ہی گیٹ بند ہو گیا تھا مگر وہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے گیٹ کو دیکھتی رہی اور پھر اس کے اندر ایک خاص جذبے نے سر ابھارا اور وہ گیٹ کی طرف چل پڑی۔

وہ گیٹ سے دس بارہ قدم دور ہی تھی کہ سلیٹی رنگ کی وردی میں ملبوس ایک چوکیدار گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھول کر برآمد ہوا۔

''لڑکی!..... گیٹ کے نزدیک آنا منع ہے۔'' اس نے دور ہی سے اسے متنبہ کیا۔

وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ ''ہاں مگر اندر جانا تو منع نہیں ہے نا۔''

''بھاگ جاؤ۔'' اس مرتبہ چوکیدار نے اسے غصے بھرے لہجے میں ڈانٹا تھا۔

''میں کبیر دادا کی دوست ہوں، یقیناً مجھے بھگانا تمھارے لیے سود مند نہیں رہے گا۔'' اس کا پر اعتماد انداز برقرار رہا وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے منہ سے کبیر دادا کا نام سن کر چوکیدار چونک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر شکوک بھری پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔ ''تم ہوش میں تو ہو نا۔'' ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

وہ مسکرائی۔ ''نشہ تو میں نہیں کرتی۔''

''لڑکی!..... یہ ایڈونچر تمھیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔'' چوکیدار آخری دم تک اسے نصیحت کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''نہ میں نشے میں ہوں، نہ مذاق کر رہی ہوں اور نہ مجھے کسی ایڈونچر کا شوق چرایا ہے۔ آپ کبیر دادا کو اطلاع دو کہ اس کی دوست تناوش رفیق اسے ملنے آئی ہے۔''

اس کے بااعتماد انداز پر چوکیدار اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ بولی۔

''دیکھو اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو جو کچھ ہوگا مجھے ہی بھگتنا پڑے گا اور اگر میں سچی ہوں تو یقیناً میرے واپس جانے کی خبر کبیر دادا کو برداشت نہیں ہوگی۔ اس کی دوست کو گیٹ سے واپس بھیج دینے والے چوکیدار کے ساتھ وہ کیا سلوک کرے گا اس کا اندازہ لگانا شاید آپ کے لیے مشکل نہ ہو۔''

اس مرتبہ اس کی دھمکی کام کر گئی تھی۔ چوکیدار واپس گیٹ کے اندر گیا اور انٹرکام اٹھا کر کسی سے پوچھنے لگا۔

''اندر آجائیں۔'' دو منٹ بعد اس نے تناوش کو اندر آنے کا کہا۔

وہ ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔ چوکیدار نے اس کے بیگ کی تلاشی لی، میٹل ڈیٹیکٹر اس کے جسم کے گرد گھمایا کر اس کے پاس کسی ہتھیار وغیرہ کی غیر موجودگی کو یقینی بنایا اور اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

وہ محل نما کوٹھی تھی۔ گیٹ سے اندرونی عمارت تک سیمنٹ کا پختہ راستہ بنا تھا جو اندرونی عمارت کے قریب جا کر بائیں جانب مڑ کر گیراج تک پہنچتا تھا۔ پختہ رستے کے دونوں جانب خوش نما پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں۔ کیاریوں سے متصل اسٹریلین گھاس کے خوشنما قطعے تھے۔ کوٹھی کی بیرونی دیوار کے ساتھ سرو، ایرکیریا اور بوتل پام کے درخت لگے تھے۔ گھاس کے وسیع قطعے کے بیچوں بیچ شیر ببر کا ایک مجسمہ نصب تھا اور اس کے چاروں جانب دائرے میں فوارے نصب تھے جن کا پانی شیر کے اوپر ایک جال سا بنا رہا تھا۔

ایک سرسری نظر سے کوٹھی کا جائزہ لے کر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اندرونی عمارت کے قریب پہنچتے ہی تھری پیس میں ملبوس ایک جوان سال آدمی باہر نکلا۔ اور اس سے کوئی سوال پوچھے بغیر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائینگ روم میں دبیز قالین بچھا تھا۔ دیواروں پر جنگل کے بادشاہ کے شکار کرنے کی مختلف تصاویر لگی تھیں، کسی جگہ پر شیر نے ہرن کو منہ میں دبایا ہوا تھا، کہیں بیل کے اوپر سوار تھا، کہیں بارسنگھے کو جکڑا ہوا تھا اور کہیں ہاتھی اور زرافے جیسے عظیم الجثہ جانور پر جھپٹ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ شیر ببر گھر کے مالک کا پسندیدہ درندہ تھا۔

''جی مس!..... آپ نے کس سلسلے میں کبیر دادا کو ملنا ہے۔'' اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بہ ظاہر مودب انداز میں پوچھا۔ مگر تناوش کو اس کے لہجے میں استہزاء کا عنصر نمایاں نظر آ رہا تھا۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''میں کبیر دادا کی دوست ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ آپ اصل بات سے پردہ اٹھا دو، شاید تمھیں جسٹس ظہیر امجد نے بھیجا ہے۔'' اس نے اندازہ ظاہر کیا۔

''نن..... نہیں..... میں خود آئی ہوں۔'' وہ ہکلا گئی تھی۔

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو، یہ کبیر دادا کے آرام کا وقت ہے اور اس وقت وہ کسی سے ملنا گوارا نہیں کرتا۔ جھوٹ بول کر آپ اپنے لیے تو سختی بنائیں گی ہی، مجھے بھی جھاڑ پلوا دیں گی۔''

''دیکھیں..... آپ کبیر دادا کو بتا دیں کہ اس کی دوست تناوش رفیق آئی ہے، نہیں تو میں واپس چلی جاتی ہوں، پھر خود ہی انھیں جواب دیتے رہنا۔'' اس مرتبہ وہ اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب رہی تھی

۔یوں بھی کبیر دادا کے اتنے قریب آ کر اس سے ملے بغیر لوٹ جانا بزدلی ہوتی۔ دلاور شیخ کو انجام تک پہنچانے کا یہ آخری موقع تھا۔ گو اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ کبیر دادا جیسا سوٹڈ بوٹڈ غنڈہ کسی لڑکی کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا تھا لیکن دلاور شیخ کی نفرت اور دشمنی نے اس کے دل و دماغ سے ہر خوف اور ڈر نکال دیا تھا۔

''دیکھو لڑکی!.....تم بہت بڑا دعوا کر رہی ہو، جہاں تک میرے علم میں ہے کبیر دادا لڑکیوں سے ایک رات سے زیادہ کا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا۔'' اسے تناوش کی بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور جو کچھ اس نے کہا وہ سن کر تناوش کا چہرہ بھی حیا سے لال ہو گیا تھا مگر وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں.....آپ جانیں اور آپ کا دادا۔'' اس نے آخری چال چلی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''ایک منٹ مس!'' اسے رکنے کا کہہ کر وہ بادل نخواستہ لکڑی کے منقش دروازے کی طرف بڑھا۔ اور جھجکتے ہوئے دروازے کے اوپر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ تناوش کو اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ کبیر دادا کا رعب ہی تھا کہ اس کے خاص بندے کی بھی ڈر کے مارے یہ حالت ہو رہی تھی۔

لمحہ بھر بعد ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، وہ قمیص اتار چکا تھا اور بے بازو کی سفید بنیان، پتلون اور ہوائی چپلوں میں وہ دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر حیرانی کے اثرات تھے۔

خدمت گار نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''باس!.....آپ کی دوست ملنے پر اصرار کر رہی تھی۔''

''میری دوست.....؟'' اس کے لہجے میں شامل حیرانی تناوش کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے صوفے پر بیٹھی تناوش کی طرف دیکھا جو اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

''جج.....جی.....یہ لڑکی کہہ رہی تھی کہ.....'' اس نے ہکلاتے ہوئے بات پوری کرنا چاہی، مگر اس سے پہلے کبیر دادا کا ہاتھ گھوما وہ کولہوں کے بل نیچے جا گرا تھا۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ دروازہ بند کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے زبان کے بجائے سمجھانے کا جو طریقہ استعمال کیا تھا وہ زبان سے کئی گنا موثر اور سمجھ میں آنے والا تھا۔ مگر تناوش اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی وہ ہمت کرتے ہوئے با آواز بلند بولی۔

”کبیر دادا!.....مجھ سے بات کیے بغیر آپ نہیں جا سکتے۔“

اس کی بات پر کبیر دادا کو جھٹکا سا لگا تھا۔ دروازہ بند کرنے کا ارادہ تبدیل کرتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا، اس مرتبہ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار نمایاں تھے۔

”تمھیں شاید اس ٹٹ پونجیے جسٹس نے بھیجا ہے۔“ کمرے سے باہر آ کر وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ نرم و نازک چھوئی موئی لڑکی اس کے سامنے یوں نظر آ رہی تھی جیسے شیر کے سامنے خرگوش دکھتا ہے۔

”میں ذاتی کام سے آئی ہوں۔“ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے کبیر دادا کی آنکھوں میں جھانکا، اس کے لیے اسے اپنا سر کافی اوپر اٹھانا پڑا تھا۔

”شہر بھر میں تمھیں میں ہی سوشل ورکر نظر آیا ہوں۔“ طنزیہ لہجے میں کہہ کر وہ پیچھے مڑا۔

”بات سن لینے میں ہرج ہی کیا ہے، شاید آپ کو بھی کوئی فائدہ نظر آ جائے۔“

گہرا سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تمھارے پاس دو منٹ ہیں، جس میں سے پانچ سیکنڈ گزر چکے ہیں۔“ اس نے کلائی پر بندھی سنہرے ڈائل کی قیمتی گھڑی آنکھوں کے سامنے پکڑ لی تھی۔

”مجھے ایک آدمی کو قتل کرنا ہے اور اس کے لیے آپ کی مدد چاہیے بدلے میں آپ کو جو بھی درکار ہو گا میں دوں گی۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے قہقہہ برآمد ہوا۔ جو بالکل اوپرا اوپرا لگ رہا تھا۔ یقیناً اس کے ہونٹ ہنسنے کے لیے نہیں بنے تھے۔ ”لڑکی مجھے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا کہ تم کیا چاہتی ہو، ایک بات تو یقینی ہے کہ تم کبیر دادا سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں رکھتی ہو۔“

”آپ مجھے تھوڑا وقت دیں گے تو میں اپنے بارے کچھ بتا پاؤں گی، دو منٹ میں میں کیا وضاحت کر سکتی ہوں۔“

”اچھا بولو۔“ صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے تھپڑ کھائے ہوئے خدمت گار کو دفع ہونے کا اشارہ کیا۔ تناوش کو بیٹھنے کا اس نے نہیں کہا تھا۔

وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے نشست سنبھالتے ہوئے کہنے لگی.....

''میں ایک بے سہارا یتیم لڑکی ہوں، ہمارے محلے کا غنڈہ دلاور شیخ مجھے آئے روز تنگ کرتا ہے۔ نہ تو اس ظالم کے خلاف پولیس کوئی کارروائی کرتی ہے اور نہ کوئی محلے دار ہماری مدد کرتا ہے۔ اس نے میرے بڑے بھائی کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے ہی میں بی اے کر لوں گی وہ مجھ سے زبردستی شادی کرے گا اور اگر اس سے پہلے میں نے کسی اور سے شادی کی کوشش کی تو وہ اسے قتل کر کے اسی وقت مجھ سے شادی کر لے گا۔''

''تو.....؟'' کبیر دادا نے ساری تفصیل سنتے ہی کندھے اچکائے۔

''کیا میں خوب صورت نہیں ہوں۔'' تناوش نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے باکی سے پوچھا۔

''مجھے تمھاری خوب صورتی سے کیا لینا۔''

''دلاور شیخ کو قتل کرنے میں میری مدد کرو اور مجھے حاصل کر لو۔'' یہ بات کرتے ہوئے اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''تم پاگل ہو یا احمق..... دلاور شیخ سے اپنی عزت بچانے کے لیے تم اپنی عزت ہی بیچ کر اسے مارنا چاہ رہی ہو۔''

''عزت نہیں بیچ رہی، بلکہ ہم دونوں کا نکاح پڑھایا جائے گا۔''

''کیا..... یقیناً تم جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادی ہو۔'' کبیر دادا نے اٹھنے کے لیے پر تولے۔

اتنی دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد تناوش کے دل میں کوئی جھجک تھی بھی تو ختم ہو چکی تھی۔ وہ فوراً اسے روکتے ہوئے بولی۔ ''صرف نکاح پڑھوا لینا..... اس کے بعد بے شک مجھے اپنی رکھیل سمجھ کر پاس رکھنا، رکھیل ہی سا سلوک کرنا، اپنے جاننے والوں کو بھی یہی بتانا کہ میں آپ کی رکھیل ہوں..... مجھ سے زیادہ کسی کو بھی اپنا وفادار نہیں پاؤ گے، بس میرے دل میں بھڑکتی آگ پر دلاور شیخ کا خون چھڑکنے میں میری مدد کر دو۔''

''میرے پاس وفاداروں کی پوری فوج ہے، تم جیسی کمزور کی وفاداری سے مجھے کیا حاصل۔'' کبیر دادا نے بہ ظاہر منہ بنایا، مگر نہ جانے کیوں تناوش کو اس کا بے زاری ظاہر کرنا مصنوعی لگ رہا تھا۔

وہ کہنے لگی۔ ''میں اٹھارہ سال کی ہوں اور ان بازاری آبرو باختہ عورتوں سے کئی گنا بہتر ہوں جو ہر بستر کی

زینت بننے پر تلی رہتی ہیں۔ مجھے جب تک پاس رکھو گے صرف آپ کی خدمت کرتی رہوں گی، جب دل بھر جائے طلاق دے کر واپس بھیج دینا۔ کوئی حق مہر کوئی روپیا پیسہ نہیں، بس دلاور شیخ کا خون ہی میرا مہر ہوگا۔ اور یقین مانو آپ کے اردگرد جو وفاداروں کی فوج ہے ان میں سے اکثریت ان کی ہے جو آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ بس خوف نے انھیں چاپلوسی اور خدمت کرنا سکھا دیا ہے۔"

وہ اس کی باتوں پر لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "تمھاری خوب صورتی اور دوشیزگی کے حصول کے لیے مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یوں بھی میری کوٹھی میں خود چل کر آئی ہوئی ہو اور اتنا موقع میرے لیے کافی ہے۔ بلکہ میں چاہوں تو تمھیں دنیا کے کسی بھی کونے سے اٹھا کر لا سکتا ہوں۔"

"یقیناً اپنی فطرت کے مطابق آپ کا یہی سوچنا بنتا ہے، لیکن سچ بتائیں کبھی کسی لڑکی کی پرخلوص محبت محسوس کی ہے، کوئی ایسی لڑکی جس کی سوچیں آپ سے شروع ہو کر آپ ہی پر ختم ہوں۔ کوئی ایسی جس کی اولین ترجیح آپ کو سکون اور آرام پہنچانا ہو۔"

"میرا خیال ہے اس مکالمہ بازی کو رہنے دو۔ باقی اس میں شک نہیں کہ تم جیسی لڑکی کو ہر مرد اپنے بستر کی زینت بنانا چاہے گا اور میں ایک مرد ہی ہوں، تمھارے حصول کے لیے گھٹنے ڈیڑھ کی قربانی دے دوں گا، لیکن یاد رکھنا اپنے وعدے سے پھرو گی نہیں۔"

وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ "اپنی بات سے ایک انچ بھی نہیں ہٹوں گی۔"

"پھر کب؟"

"کل، میں دلہن بن کر اپنے گھر میں منتظر رہوں گی اور کل نکاح پڑھاتے ہی آپ مجھے اپنے ساتھ لیتے آنا۔"

"نکاح پڑھانا ضروری ہے کیا؟" کبیر دادا نے ہلکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کم سن لڑکی کی ہر بات کیسے مانتا جا رہا تھا۔ ورنہ اسے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

"ہاں..... بس یہ ناپائیدار گرہ میرا نصیب کر دینا، اس کے علاوہ کچھ نہیں مانگوں گی۔" تناوش کی آواز گلوگیر ہونے لگی تھی۔

”میرا موبائل فون نمبر نوٹ کرو، جب ضرورت پڑے مجھے بلا لینا۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنا ذاتی موبائل فون نمبر دہرا دیا۔

اس کا نمبر اپنے موبائل فون میں نوٹ کر کے وہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ”ویسے کل سہ پہر کو میں منتظر ہوں گی اور یاد رکھنا دلاور شیخ کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔“

”کبھی مرغی بھی ذبح کی ہے؟“ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ بھی اپنی نشست سے اٹھ گیا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دلاور شیخ سے ابتداء کروں گی.....اور یوں بھی آپ جیسے بڑے دادا کی بیوی کو کم از کم ایک قتل تو کرنا چاہیے۔“

پتا نہیں تناوش کے لہجے میں ایسی کون سی بات تھی کہ وہ بے ساختہ مسکرا پڑا تھا۔ تناوش کو محسوس ہوا کہ وہ مسکراتے ہوئے بہت اچھا لگنے لگتا ہے۔

”کل ملیں گے۔“ وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی تھی۔ اس کے کمرے میں غائب ہوتے ہی وہ باہر کی طرف چل دی۔ ڈرائینگ سے باہر ہی اسے وہی خدمت گار چہرے پر غیض و غضب کے تاثرات سجائے کھڑا نظر آیا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہوئے تناوش کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ اسے متبسم دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لیا اپنے جھوٹ کا انجام۔“

وہ ہنسی۔ ”کون سا جھوٹ، ابھی اتنی دیر میں کبیر کے ساتھ گپ شپ ہی کر رہی تھی نا۔“

”پھر انھوں نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔“

تناوش نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”اس وجہ سے کہ آپ نے مجھے اتنی دیر کیوں روکے رکھا۔“

”اچھا اب دماغ نہ کھاؤ اور جاؤ۔“ یقیناً وہ کبیر دادا کے تناوش کے ساتھ اتنی دیر بات چیت کرنے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

”مجھے گھر تک جانے کے لیے گاڑی چاہیے۔“ تناوش کو ایک دم پیدل چلنے کا خیال آیا اور اس نے فوراً اس کا حل سوچ لیا۔

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس بارے مجھے کوئی حکم نہیں ملا۔''

''ٹھیک ہے میں کبیر دادا کو کہہ دیتی ہوں۔'' وہ پیچھے مڑی۔

''بات سنو.....'' اس نے اتنی جلدی تناوش کو آواز دی کہ وہ پوری مڑ بھی نہیں پائی تھی۔

اس نے رکتے ہوئے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔ ''سنائیں۔''

وہ دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمھارے ساتھ ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں، اب تشریف لے جاؤ میری ماں۔'' یہ کہتے ہی اس نے موبائل فون نکال کر کسی الٰہی بخش نامی ڈرائیور کو کال کر کے بتایا کہ کبیر دادا کی مہمان کو گھر تک چھوڑ آئے۔

تناوش وہیں ڈرائیور کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر ڈرائیور سفید رنگ کی ٹویوٹا لے کر وہیں پہنچ گیا۔ تناوش کے قریب کار روک کر اس نے عقبی نشست کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

وہ اعتماد ظاہر کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار کبیر دادا کی وسیع و عریض کوٹھی سے باہر آ گئی۔ وہ ڈرائیور کو گھر کا پتا بتا کر دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگی۔ اس قیمتی کار میں بیٹھ کر راستے کے مناظر بھی خوش کن اور قابل دید نظر آنے لگے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنی قیمتی کار میں بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بقیہ زندگی اس کا سفر ختم نہ ہو اور وہ یونہی آرام دہ سیٹ پر بیٹھی محو سفر رہے۔ مگر اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ طویل فاصلہ لمحوں میں طے ہو گیا۔ یقیناً پیدل جاتے ہوئے اسے گھر تک پہنچتے ہوئے شام ہو جاتی تھی۔

وہ کار کو سڑک ہی پر رکوا کر اتر گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دلاور شیخ کا کوئی چمچا اسے کار سے اترتے دیکھ کر ڈرائیور کو چھیڑنے کی کوشش کرے۔ اور ایسا ہونے کی صورت میں دلاور شیخ تک کبیر دادا کا نام پہنچ جاتا۔ اور اس نے بزدل نے بھاگنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگانا تھا۔ جبکہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے اتنی بے تاب اور بے صبر ہوتی جا رہی تھی کہ اس سے کل تک کا انتظار مشکل ہو رہا تھا۔

سڑک سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر اس کا گھر تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے ماں بے چینی کے عالم میں اپنی منتظر نظر آئی۔

''اتنی دیر لگا دی بیٹی!'' تناوش کو دیکھتے ہی اس نے پریشانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ سکون بھرے انداز میں بولی۔ ”ہاں ماں!.....آج بہت دور نکل گئی تھی۔ اتنا دور کہ اب واپسی بھی ناممکن ہوگئی ہے۔“

”دماغ تو ٹھیک ہے کیا اول فول بک رہی ہے۔“ بشریٰ نے اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

”امی جان!.....آپ چاہتی تھیں نہ کہ میری شادی ہو جائے اور ہم شاہ نواز بھائی کے قاتل کو بھی اس کے انجام تک پہنچادیں۔“ اس نے خواب ناک لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بیٹی!.....مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ وہ خواہش ہے جو ہمیشہ تمنا کا روپ ہی دھارے رکھے گی۔“

”امی جان!.....سنا ہے مقصد کی تکمیل قربانی مانگا کرتی ہے۔“

وہ حسرت ناک لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک سنا ہے بیٹی!.....مگر ہم کس چیز کی قربانی دے کر اس خبیث کو جہنم واصل کریں۔“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”اس کا بندوبست ہوگیا ہے۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں۔“ تناوش کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور موجود تھی جو اس کا دل دھڑکا رہی تھی۔

”ماں آج میں اپنا رشتہ طے کرآئی ہوں، گو مجھے آپ سے اجازت مانگ لینا چاہیے تھا، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا اور ایسا موقع دوبارہ نہ ملتا۔“

بشریٰ نے قریب ہوکر اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔ ”ہوش میں تو ہونا۔“

”پتا نہیں ماں جی!.....بس وہ مجھے اچھا لگا، اپنا لگا، بااختیار لگا اور میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے شادی کی آفر کردی۔“

بشریٰ متوحش ہوتے ہوئے بولی۔ ”کہیں کسی اور غریب کو جان سے نہ مروا دینا۔“

تناوش کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”امی جان!.....آپ نے ہمیشہ دلاور شیخ کو بااختیار درندے کے روپ میں دیکھا ہے، کل ان شاء اللہ آپ اس کا وہ روپ دیکھیں گی جس کی تمنا میں ہم دونوں پچھلے کئی ماہ سے دست بدعا ہیں۔“

”ایسا کیسے ممکن ہے؟“ بشریٰ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”ممکن اور ناممکن کے درمیان بس رب کی مرضی کی رکاوٹ ہے ماں جی!..... جب وہ بے نیاز کن فرماتا ہے تو پھر ہر ناممکن ثابت قدمی بھول جاتا ہے۔“

”ایسا با اختیار اور صاحبِ حیثیت تمھیں کہاں سے مل گیا بیٹی!.....اور پھر وہ تم جیسی غریب لڑکی کے ساتھ شادی پر کیسے راضی ہو گیا؟ مجھے تو لگ رہا ہے تم نے جاگتے میں خواب دیکھنا شروع کر دیے ہیں۔“ بشریٰ کو بیٹی کی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”خود تو کہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی شہزادی ہے، پھر شہزادیوں کو تو شہزادے ہی ملا کرتے ہیں نا ماں جی!“ اس کی آنکھوں میں کبیر دادا کی صورت لہرائی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خواہش جاگی۔ ”کاش جیسا وہ ماں کو کہہ رہی ہے ویسا ہی ہوتا۔“

”اچھا مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ؟“

”آج میں اسکول نہیں گئی تھی۔ یونہی دائیں بائیں گھومتی رہی اور پھر وہ مجھے ایک ہوٹل کے باہر نظر آیا اس حالت میں کہ ایک جج اس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے گڑگڑا رہا تھا۔ میں جان گئی کہ وہی ایسا ہے جو مجھے دلاور شیخ کے چنگل سے نجات دلا سکتا ہے۔ مجھے اللہ پاک نے اس سے بات کرنے کا موقع دیا اور میں نے فوراً اپنی مجبوری اس کے سامنے بیان کر دی۔ لیکن یہ تو آپ جانتی ہیں نا ماں جی کہ اس دنیا میں لے دے کا اصول ہی کارفرما ہے۔ بس میں نے دلاور شیخ کی موت کے بدلے خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔ البتہ پریشان نہ ہوں وہ مجھے نکاح پڑھا کر ہی ساتھ لے جائے گا۔“ اس نے بہت ساری باتیں حذف کرتے ہوئے اجمالاً سارا واقعہ دہرا دیا۔

”مجھے تو یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والا معاملہ لگتا ہے۔ تم نے دلاور شیخ سے جان چھڑانے کے لیے اس سے بھی بڑے غنڈے کا ساتھ اپنا لیا ہے۔“

”ماں جی! میں بس ایک بات جانتی ہوں کہ مجھے دلاور شیخ سے بھیا کی موت کا بدلہ لینا ہے۔ اس کے لیے میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اگر دلاور شیخ نے بھیا کے خون سے ہاتھ نہ رنگے ہوتے تو شاید میں اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتی۔“

''اب کیا ہوگا؟.....میرا تو دل ہول رہا ہے۔'' بشریٰ خاتون کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ دلاور شیخ والے معاملے میں کچھ مہلت تو ان کے پاس موجود تھی، اس کی بیٹی تو ایک دم ہی طوفان سر پر لے آئی تھی۔

''اطمینان رکھیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ماں جی!'' اس نے اعتماد بھرے انداز میں ماں کو تسلی دی۔

''تم نہیں جانتی میری جان!.....ایسے بااختیار اور صاحب حیثیت لوگوں کے لیے ہم غریب مخمل میں ٹاٹ کے پیوند جتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس نے بس تمھاری صورت دیکھ کر شادی کی حامی بھری ہے۔ تمھیں چند دن استعمال کرنے کے بعد وہ طلاق کے تین لفظ بول کر تمھیں واپس پھینک دے گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''تو کیا میں پہلی مطلقہ ہوں گی، نہ جانے حوا کی کتنی بیٹیاں روزانہ طلاق کا داغ اپنی پیشانی پر سجا کر ماں باپ کے دروازے پر آ بیٹھتی ہیں۔ ان میں ایک کا اضافہ سہی۔ اور امید ہے مجھے دوسری شادی کے لیے بھی اتنی تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ سب سے بڑھ کر دلاور شیخ جیسی نحوست سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔''

''تمھیں اکیلے اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم مجھ سے مشورہ تو کر لیتیں۔'' بیٹی کی باتوں سے اتفاق کرنے کے باوجود اسے اطمینان محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''امی جان!.....کہا تو ہے مشورے یا اجازت لینے کا وقت میرے پاس نہیں تھا۔ اگر میں وہ موقع گنوا دیتی تو پھر وہی کڑھنا، سلگنا ہی مقدر ٹھہرتا۔''

''اگر اس سودے سے پیچھے ہٹنا ممکن ہے تو بہتر ہوگا اس شخص کو منع کر دو، بلکہ معافی مانگ کر اپنی جان چھڑا لو۔'' ماں نے اس کی حوصلہ شکنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

ایک بار تناوش کے دل میں بھی خیال آیا کہ ماں کی بات مان لینا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کبیر دادا کی قد آور اور پر رعب شبیہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی، اسے لگا بدلہ لینے کے علاوہ بھی کبیر دادا میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ وہ اس کی سوچوں پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر ڈٹ گئی۔ ''ماں جی!.....اگر وہ مجھے خود بھی منع کر دے تب بھی میں پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ آپ نہیں جانتیں میرے دل میں دلاور شیخ سے بدلہ لینے کے لیے کیسی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس آلاؤ کو دلاور شیخ کا خون ہی بجھا سکتا ہے۔''

اگر تناوش کو بھائی کے قاتل سے اس درجہ نفرت تھی تو وہ اس کے بیٹے کا بھی تو قاتل تھا۔ وہ فرماں بردار اور

خدمت کرنے والے بیٹے کی اذیت ناک موت کو کیسے بھلا سکتی تھی۔ بیٹی سے کئی گنا زیادہ وہ خود دلاور شیخ کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہاں تھی۔ تناوش کے طریقہ کار سے اختلاف رکھنے کے باوجود آخر اسے متفق ہونا پڑا۔ وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے بیٹی!..... بس یہی دعا کرتی ہوں اللہ پاک تمھارا نصیب اچھا کرے۔"

"آمین۔" کہہ کر تناوش نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔

رات کو تناوش ماں کے ساتھ مل کر اگلے دن کا منصوبہ طے کرتی رہی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بشریٰ کو بیٹی کا ساتھ دینا پڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تناوش صبح اسکول جانے کے بہ بجائے ماں کو ساتھ لے کر مولوی محبوب الٰہی کے گھر کی جانب چل دی تھی۔ اس وقت مولوی صاحب گھر ہی میں موجود تھے۔ کافی مضمحل اور تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ ماں، بیٹی کو دیکھ کر مولوی کی بیوی نے تو ناک بھوں چڑھائی تھی مگر مولوی محبوب الٰہی خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا۔

"بیٹھو بہن!" تناوش کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بشریٰ کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بیوی کو مخاطب ہوا۔ "صغریٰ کی ماں!..... چائے تو پلوا دو۔"

"چائے ہم پی کر آئے ہیں بھائی جان!" بشریٰ نے رسمی سا انکار کیا۔

مولوی محبوب الٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بہانے میں بھی پی لوں گا بہن جی!" اس کی بیوی البتہ بشریٰ کے انکار سے پہلے ہی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"تو آپ نے یہاں سے جانے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟" بشریٰ دکھی دل سے پوچھنے لگی۔

"مجبوری ہے بہن!..... جو لوگ آج ایک بیٹی کے لیے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے نہیں ہو سکتے ان سے مزید کیا توقع کی جا سکتی ہے۔"

"بھیا!..... آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں، مگر آپ جس جگہ بھی تشریف لے جائیں گے وہاں بھی تو ایسے ہی لوگ ہوں گے، یہ تو ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے ہم ظلم کے خلاف کبھی آواز نہیں اٹھاتے۔ اگر ہم متحد ہوتے تو کیا

کراچی کی یہ حالت ہوتی۔ نہ پینے کا پانی میسر ہے، نہ سڑکوں کی حالت کسی قابل ہے، لوڈ شیڈنگ کی صورت حال ملاحظہ فرمالیں، غنڈہ گردی کا راج ہے یہ سب اور اس کے علاوہ بھی ہزاروں مسائل کا کیا ایک ہی حل نہیں ہے کہ ہم متحد ہو جائیں۔ مگر ہماری حالت چند بھیڑیوں کے سامنے بھاگتے ہوئے اس ریوڑ کی سی ہے جس میں ہر بھیڑ بکری کے دل میں اپنی جان بچانے کی دھن سمائی ہوتی ہے۔"

"مگر ہم بھیڑ بکریاں نہیں ہیں بہن!..... ہم انسان ہیں۔ اللہ پاک نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ بھیڑ بکریاں اگر چاہیں بھی تو بھیڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ہماری ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری ہی جنس کے چند غنڈے کیوں ہم پر حکمرانی کریں۔"

"بھائی جان!..... چھوڑیں اس دل خراش موضوع کو۔ یقیناً اکیلے آپ کے چاہنے سے تبدیلی نہیں آسکتی۔ آپ بس اپنے متعلق سوچیں۔ یہاں سے جانا آپ کے لیے قطعی مفید نہیں ہے۔"

مولوی محبوب الٰہی دکھی لہجے میں بولا۔ "اب تو فیصلہ ہو گیا ہے۔ اور سچ بات کہوں تو میں یہاں سے جانے پر مجبور ہوں۔"

"ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔ آپ کا مسئلہ ہمیں پریشانی سے نکالنا تھا اس کا حل ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔"

"کیسا حل؟" مولوی محبوب الٰہی کے لہجے میں اشتیاق بھرا تھا۔

بشریٰ اطمینان سے بولی۔ "آج سہ پہر کو تناوش بیٹی کا نکاح اور رخصتی ہے۔"

"کس کے ساتھ اور یوں ایک دم کیسے؟..... اس موذی کے بارے کیا سوچا۔"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا چچا جان!..... بس ایک خواہش ہے کہ میرا نکاح آپ خود پڑھائیں۔" خاموش بیٹھی تناوش نے زبان کھولی۔

"میں بہت کمزور اور بے بس آدمی ہوں بیٹی!..... یقین مانو یہ بہت بڑی سعادت اور خوش قسمتی ہوتی کہ مجھے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھانے کا موقع ملتا، مگر اس بدبخت کی دھمکی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور سچ کہوں تو یہ محلہ چھوڑ دینے کا حکم بھی مجھے اسی خبیث نے دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بے بسی کا مذاق اڑایا جائے یا پیٹھ پیچھے یہ کہا جائے کہ دیکھ لو کسی اور کے کام میں دخل اندازی کا یہ انجام ہوتا ہے۔ بس اسی وجہ سے میں

نے محلہ چھوڑنے کی اصل وجہ سے پردہ نہیں اٹھایا۔"

تناوش اعتماد سے بولی۔ "چچا جان!..... میں وعدہ کرتی ہوں کوئی آپ کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ اور اگر آپ مجبور ہو کر یہ محلہ چھوڑ رہے ہیں تو ان شاء اللہ آج اس مجبوری کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

مولوی محبوب الٰہی بے یقینی سے بولا۔ "یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟"

تناوش نے کہا۔ "اس بات کو راز ہی رہنے دیں چچا جان!..... باقی آپ کو دلاور شیخ نے ہماری مدد کرنے سے منع کیا ہے، نکاح پڑھانے سے تو نہیں روکا۔"

اسی وقت مولوی محبوب الٰہی کی بیوی چائے کے برتنوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ اس نے باورچی خانے میں ان کی ساری گفتگو سنی تھی۔ پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"بشریٰ بہن!..... بہتر ہوگا کہ اب ہمیں اپنے ساتھ گھسیٹنا بند کر دیں، پہلے بھی آپ کی مدد کرنے کا صلہ ہم بھگت رہے ہیں، یہ نہ ہو کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے۔"

"یقیناً آپ لوگوں نے اپنوں سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا ہے اور ہماری وجہ سے آپ کو بہت زیادہ تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں، مگر یقین مانیں بہن، اب خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بھائی جان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"نہیں بہن!..... آپ نکاح پڑھانے کے لیے کوئی اور مولوی بلوا لیں۔" مولوی کی بیوی حامدہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"ایسا نہیں کہتے نیک بخت۔" مولوی ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔ "زندگی اور موت اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔"

"آپ خاموش رہیں جی!" حامدہ شوہر پر برس پڑی۔ "پہلے بھی آپ کے نیکی کمانے کے شوق میں ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ گھر کے ساتھ ہمیں عزت کے بھی لالے پڑ جائیں۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا چچی جان!" تناوش اسے تسلی دینے لگی۔ "ہم تو بس اس لیے آئے ہیں کہ چچا جان اپنی آنکھوں سے اس منحوس کا انجام دیکھ لے۔"

”سپنے دیکھنے بند کرو لڑکی!.....ایسا کچھ ڈراموں فلموں میں تو ہو سکتا ہے حقیقت میں نہیں۔ دلاور شیخ جیسے درندوں کی رسی کو مالک بھی ڈھیلا چھوڑے رکھتا ہے۔ ایسے موذی کا ہم جیسے کمزور لوگ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”بہن جی!.....ہم مولوی صاحب کو دلاور شیخ سے لڑائی کرنے کی دعوت دینے نہیں آئے۔ اور خطرہ تو لڑکے والوں کو ہونا چاہیے نا؟ مولوی صاحب تو نکاح پڑھانے تشریف لائیں گے، اور اس بات پر اس منحوس دلاور کو کیا اعتراض ہوگا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے.....“ حامدہ نے کچھ کہنے کے لیے پر تولے مگر مولوی محبوب الٰہی قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔ ”ٹھیک ہے بہن جی!.....اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں بعد از نماز عصر حاضر ہو جاؤں گا۔“

”اللہ پاک آپ کو عزت دے بھائی جان!“ بشریٰ نے ممنونیت سے کہا۔ مولوی صاحب کا حوصلہ دیکھ کر تناوش کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں تھیں۔ وہ بے صبری سے اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب دلاور شیخ جیسا ظالم اپنے انجام سے دوچار ہوتا۔

مولوی محبوب الٰہی کا حتمی جواب سن کر حامدہ نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

چائے پی کر ماں بیٹی واپس گھر کی طرف چل پڑیں۔ مولوی صاحب کے گھر سے نکلتے ہی انھیں دلاور شیخ کا منحوس کارندہ نظر آ گیا تھا۔ گلی کی نکڑ پر کھڑا وہ مولوی صاحب کے گھر ہی کی جانب متوجہ تھا۔ وہ ماں بیٹی کے اکٹھے کہیں جانے پر ضرور ان کا پیچھا کرتے۔ اسکول جانے کے علاوہ تناوش اگر اکیلی کہیں جاتی، تب بھی وہ اس کا تعاقب کرتے۔ البتہ تناوش کے اسکول جاتے وقت وہ کبھی اس کے پیچھے چل پڑتے اور کبھی جانے دیتے۔ گزشتہ کل بھی انھوں نے تناوش کا پیچھا نہیں کیا تھا ورنہ دلاور شیخ تک کبیر دادا اور تناوش کی ملاقات کی خبر ضرور پہنچ جاتی۔

اس منحوش شکل کے کارندے کے پاس سے گزرتے ہوئے نہ جانے تناوش کو کیا سوجھا کہ وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”دلاور شیخ کو بتا دینا، آج بعد از نماز عصر میرا نکاح اور رخصتی ہے۔ اپنے چچوں کے ساتھ ضرور شرکت کرے۔“

تناوش کی جرات اور بے باکی پر دلاور شیخ کے آدمی کی آنکھوں میں حیرانی نمودار ہوئی، مگر پھر حیرانی پر استہزاء کا عنصر غالب آ گیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”ضرور بھابی!“

تناوش اس کا جواب سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔ یوں بھی دلاور شیخ کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی اسے چھیڑتا نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

تناوش کو گھر پہنچا کر بشریٰ خاتون نے محلے میں گھوم پھر کر تمام کو بیٹی کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ جس جس تک یہ بات پہنچتی گئی وہ ششدر ہوتا گیا۔ ہر ایک تفصیل جاننے کا خواہاں تھا مگر سب کے سوال کے جواب میں مسکرا کر بشریٰ خاتون یہ کہتی رہی.....

”اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔“

گھر پہنچنے پر اسے تناوش افسردہ انداز میں بیٹھی نظر آئی۔ یقیناً شادی کر کے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہونا کسی بھی لڑکی کے لیے بہت اذیت ناک اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ پسند کی شادی کرنے والی لڑکی بھی اس موقع پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی، یہاں تو مسئلہ ہی اور تھا۔ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس نے اندھا جواء کھیلا تھا۔ نہ معلوم کبیر دادا اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتا۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ اسے کبیر دادا سے کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلوغت کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی ایک ان دیکھے شہزادے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے جس نے اس کا دولھا بننا تھا۔ اس کے سپنوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دلاور شیخ کی صورت میں نمودار ہوئی، جس نے خوب صورت سپنوں کو چھین کر اس کی آنکھوں میں آگ و خون کے خواب سجا دیے تھے۔ اب کبیر دادا سے ملنے کے بعد نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ سے اسی کے خواب ہی تو دیکھتی رہی تھی۔

بشریٰ بیٹی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب پریشان ہونے کا کیا فائدہ..... تیر کمان سے نکل چکا ہے، بس نتیجے کا انتظار کرو۔“

وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”ماں جی!..... میں اپنے فیصلے پر نہیں آپ سے جدائی کا سوچ کر دکھی ہوں۔“

وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”جدائی کون سی، ایک ہی تو شہر میں ہوں گے۔ میں روزانہ اپنی بیٹی کو ملنے جایا کروں گی۔“

”نہیں ماں جی!“ تناوش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ وہاں کبھی بھی نہیں آئیں گی۔ جب بھی موقع ملا میں خود ملنے آجایا کروں گی۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ ”کیا یہ تمھارے ہونے والے شوہر کا حکم ہے۔“

”نہیں۔“ ایک مرتبہ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بھی میرا اپنا فیصلہ ہے۔ اور فکر نہ کریں، جب بھی آپ کا دل چاہے گا میں ملنے آجایا کروں گی۔“

بشریٰ مسکرائی۔ ”تو کیا، مجھ سے ملنے کو تمھارا دل نہیں چاہے گا۔“

”آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔“ تناوش شکوہ کناں ہوئی۔

”مذاق کر رہی تھی چندا!“ بشریٰ نے جھک کر بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔

اسی وقت دروازہ کھٹکھٹا کر تناوش کی دو سہلیاں گھر میں داخل ہوئیں۔ یقیناً کالج سے واپسی پر انھیں تناوش کی شادی کی بابت معلوم ہوا تھا اور وہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی تھیں۔ وہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ کالج کے کپڑے تک وہ تبدیل نہیں کر سکی تھیں۔ بشریٰ انھیں خوش آمدید کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ شازیہ اور نازیہ نے آتے ساتھ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ انھیں بھی دلاور شیخ کے بارے مکمل معلوم تھا۔ بلکہ وہ کیا پورا محلہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا اور اب وہ حیران اس بات پر تھے کہ آخر دلاور شیخ کی مصیبت سے ان کی جان کیسے چھوٹی تھی۔

وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ”میرے ہونے والے شوہر کے سامنے دلاور شیخ کی حیثیت ایک کیڑے جتنی بھی نہیں ہے۔“

شازیہ نے پوچھا۔ ”ایک دم ایسا رشتہ تم نے کہاں سے ڈھونڈ لیا؟“

تناوش کے جواب دینے سے پہلے داخلی دروازے پر ایک بار پھر حرکت ہوئی اور اس کی ایک اور سہیلی سلمیٰ گھر میں داخل ہوئی۔ ان دونوں بہنوں کی طرح وہ بھی آتے ساتھ حیرانی کا اظہار کرنے لگی۔ تناوش ان کی حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائی۔

”وہ کیا کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور یہ کہ اللہ پاک جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔“

”بس محاورے ہی سناتی رہنا اصل بات سے پردہ نہ اٹھانا۔“ نازیہ نے تنگ آ کر دہائی دی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”کبیر خان نام ہے، چھے فٹ سے اونچا قد، کسرتی جسم، چوڑی چھاتی، گندمی رنگت، کشادہ پیشانی، موٹی ساحرانہ آنکھیں، مضبوط ہاتھ پاؤں بہت بڑے کاروبار، بنگلے اور کئی کاروں کا مالک۔ ساس سسر، نند دیور کی آلودگی سے پاک..... اتنا کافی ہے یا کچھ اور بتاؤں۔“

سلمٰی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”بولتی رہو جھوٹ، تم سے تو اللہ میاں ضرور پوچھے گا۔“

اس دوران اس کی دو تین اور سہلیاں بھی پہنچ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کبیر دادا کی شخصیت کو موضوع گفتگو بنائے رکھنے کے بعد وہ تناوش کو دلھن بنانے کے درپے ہو گئیں۔ پہلے پہل تو تناوش نے سختی سے انکار کر دیا مگر پھر اسے اپنا رویہ مصنوعی لگا۔ شادی کے دن لڑکی کا بناؤ سنگھار کرنا رسم و رواج کا حصہ تھا۔ بلکہ اس بارے تو شریعت کا حکم بھی موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ کبیر دادا کو خصوصی انعام سے نوازنا چاہتی تھی۔ جب اس سے معاہدہ ہو ہی گیا تھا تو اپنے الفاظ کا پاس رکھنے ہی میں اسے بھلائی نظر آئی۔

اس کے پاس میک اپ کا کوئی سامان موجود نہیں تھا نہ وہ اس قسم کی عیاشیوں کی متحمل ہو سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سر پر تیل لگا کر کنگھی کر دینا ہی اس کی تیاری میں شامل ہوتا تھا۔ یوں بھی حسن کو سجاوٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر اب اس کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ اور دلھن کی سجاوٹ تیل کنگھی تک محدود نہیں ہوتی۔ اس کی سہلیوں کی نظر سے بھی اس کی غربت اوجھل نہیں تھی۔ اس کی ماں کے ہاتھوں بازار سے میک اپ کا سامان منگوانے کے بجائے سلمٰی اپنا میک اپ بکس اٹھا لائی تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج کل یوں بھی ایک صاحب حیثیت لڑکی کے پاس میک اپ کا اتنا سامان موجود ہوتا ہے کہ جس سے چھوٹے موٹے بیوٹی پارلر کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

ایک غریب عورت جو بیٹی کی ماں ہو وہ بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے جہیز کی فکر میں مصروف ہو جاتی ہے۔ شادی کی خریداری کے لیے امراء اور غریبوں کا طریقہ کار بالکل مختلف ہے۔ امیروں کی خریداری شادی سے چند دن پہلے شروع ہوتی ہے جبکہ غریب کی ساری زندگی بیٹی کا جہیز تیار کرتے گزر جاتی ہے۔ تناوش کی ماں

نے بھی اس کے لیے تھوڑی بہت جیولری اور چند لباس خرید رکھے تھے۔انھی میں سے ایک سرخ رنگ کا جوڑا تناوش کو پہنا کر انھوں نے دلھن کا روپ دے دیا تھا۔شادی کی تقریب گھر کے اندر ہی ہونا قرار پائی تھی۔ان کا گھر بارہ مرلے پر مشتمل تھا۔دو کمرے ایک برآمدہ اور پھر اس کے سامنے کافی کھلا صحن بچ جاتا تھا۔بشریٰ خاتون کے پاس اتنی استطاعت نہیں تھی ورنہ وہ اس گھر کو بہتر انداز میں تعمیر کرا کر کرائے پر بھی چڑھا سکتی تھی۔وہ دو کمرے بھی اس کے شوہر رفیق نے اپنی زندگی ہی میں بنا چھوڑے تھے۔اب تو بشریٰ مشکل سے اپنا اور بیٹی کا پیٹ ہی پال رہی تھی تعمیر کی مد میں کہاں سے رقم لاتی۔

بشریٰ نے شازیہ کے بھائی کو کہہ کر ایک قنات کرائے پر منگوا کر برآمدے کے سامنے لگا دی تھی تاکہ عورتوں اور مردوں کے درمیان پردہ قائم ہو سکے۔کمروں میں موجود تین چار چارپائیاں انھوں نے مردوں کے بیٹھنے کے لیے صحن میں بچھا دی تھیں۔چند چارپائیاں وہ پڑوسیوں کے گھروں سے بھی مانگ کر لے آئے تھے۔شادی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔محلے کے چند مرد صحن میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔شادی میں شرکت کے لیے تو وہ ہمت کر کے آ گئے تھے مگر انھیں رہ رہ کر دلاور شیخ کا خوف گھیرنے لگتا۔وہ بہت پہلے سے تناوش سے شادی کا دعوے دار تھا اب اس کی شادی پر اس نے کہاں خاموش رہنا تھا۔مگر اب تک وہ وہاں نہیں پہنچا تھا شاید وہ برات کی آمد کا منتظر تھا۔اس کے ایک دو چمچے پڑوسیوں کو بشریٰ کے گھر کے گرد گھومتے نظر آئے تھے۔

عصر کی آذان سن کر دو تین آدمی نماز کے لیے مسجد کی طرف بڑھ گئے جبکہ کچھ ازلی بے حسی سے مالک کائنات کی دعوت کو نظر انداز کیے وہیں بیٹھے رہے۔یقیناً انھیں فلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ورنہ فلاح کی ضمانت یعنی نماز سے غافل نہ رہتے۔

نماز کے بعد مولوی محبوب الٰہی بھی پہنچ گیا تھا۔محلہ داری میں لوگ آپس میں پردے کا اہتمام کم ہی کرتے ہیں اس کے باوجود مولوی محبوب الٰہی نے پردے کے قریب جا کر اندر جانے کی اجازت طلب کرنا ضروری سمجھا تاکہ کوئی عورت پردہ کرنا چاہے تو اسے اطلاع مل جائے۔بشریٰ نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اندر بلا لیا۔وہ سیدھا تناوش کے قریب پہنچا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”میں آ گیا ہوں بیٹی۔“

''اللہ پاک آپ کو دنیا اور آخرت کی عزت عطا فرمائے مولوی صاحب!'' تناوش نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

''آمین۔ اللہ پاک ہم سب کو عزت سے نوازے۔'' دعائیہ انداز میں کہتے ہوئے مولوی محبوب الٰہی باہر نکل گئے۔ اسی وقت تناوش نے موبائل فون نکالا تاکہ کبیر دادا کا نمبر ڈائل کر سکے۔ اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتی اس کے کانوں میں دلاور شیخ کی منحوس آواز پڑی۔

''ارے یہاں تو سچ مچ شادی کا ماحول بنا ہے۔ انھیں شاید دلاور شیخ کی طاقت کے بارے کوئی شبہ ہو گیا ہے۔''

''لگتا تو یہی ہے باس۔'' اس کے ایک چمچے کی آواز ابھری۔

''اور تم سب کو میرا کوئی خوف نہیں رہا کہ یہاں اکٹھے ہو گئے ہو، یقیناً یہ اس بڈھے عاشق مولوی کی کارستانی ہے۔'' بے ہودہ انداز میں کہتے ہوئے وہ مولوی محبوب الٰہی کی طرف بڑھا۔ ''کیوں بے مولوی، تجھے کون سا کیڑا سدھرنے نہیں دے رہا۔''

اس کے انداز سے تناوش سمجھ گئی تھی کہ وہ مولوی محبوب الٰہی کی طرف جا رہا ہے۔ سر پر دوپٹا جماتے ہوئے وہ سرعت سے باہر نکلی۔ اس وقت تک دلاور شیخ، مولوی محبوب الٰہی کو گریبان سے تھام چکا تھا۔

اس نے کڑک کر کہا۔ ''ایک منٹ دلاور شیخ!''

وہ حیرانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے دیکھتے ہی دلاور شیخ کے منحوس چہرے پر خباثت نمودار ہوئی۔ ''ارے واہ، یہاں تو میری دلھن کسی اور کے لیے سجی ہوئی ہے۔''

''مولوی صاحب کو چھوڑ دو دلاور شیخ۔'' تناوش نے اپنی بات دہرائی۔

''اگر کسی میں اتنی جرات ہے کہ دلاور شیخ سے اس کا گریبان چھڑا لے تو آگے آ جائے۔

''تو مرد ہے کہ ہیجڑا۔'' تناوش کے الفاظ ایسے نہیں تھے کہ دلاور شیخ آپے سے باہر نہ ہوتا۔ وہ کمینگی سے بولا۔

''بے فکر رہو، میری مردانگی کا ثبوت تمھیں آج رات مل جائے گا بے بی۔''

''وہ بعد کا مسئلہ ہے، فی الحال مولوی صاحب کا گریبان چھوڑ دو، کیا تم نے خود نہیں کہا تھا کہ جب کوئی میری

برات لے کر آئے گا تو وہ خود بھی جان سے جائے گا اور تم میرے بی اے کرنے سے پہلے ہی مجھ سے شادی کر لو گے۔"

"بالکل کہا تھا۔" دلاور شیخ نے چھاتی چوڑی کی۔

"تم نے نکاح پڑھانے والے کے بارے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی پھر مولوی صاحب کی توہین کا مطلب؟ میرے ہونے والے شوہر سے نبٹ لو، شاید اس کے بعد مجھ سے نکاح پڑھانے کے لیے تمھیں بھی مولوی صاحب کی ضرورت پیش آجائے۔"

"ہونہہ!..... یہ تم نے کام کی بات کی ہے۔" مولوی صاحب کا گریبان چھوڑ کر وہ اپنے چمچوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کرمے!..... جا ذرا پہلوان کی دکان سے ایک ٹوکرا مٹھائی کا تو اٹھا لا۔ آج اس ٹنٹنے کو ختم ہی کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے باس۔" کرمے نامی چمچے نے اثبات میں سر ہلا کر باہر کا رخ کیا۔

"تو نکاح کی کارروائی شروع کریں۔" دونوں ہاتھوں سے ہلکی سی تالی بجاتے ہوئے اس نے ہاتھ دھونے کے انداز میں ملے۔

تناوش بے باکی سے بولی۔ "پہلے میرے شوہر سے تو نبٹ لو۔"

"تو بلاؤ اسے..... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ کسی ٹٹ پونجیے کا انتظار کرتا رہوں۔"

تناوش نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر کبیر دادا کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل فون کان سے لگا لیا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد کسی نے کال کاٹ دی تھی۔ اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکا۔ اور وہ دوبارہ نمبر ملانے لگی۔ مگر آگے سے ایک بار پھر نمبر مصروف کر دیا گیا۔ اس نے تیسری کوشش کی جس کا حال پہلی والی کوششوں سے مختلف نہیں تھا۔ ایک دم اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی بے باکی اور بہادری کے غبارے سے فوراً ہوا نکل گئی تھی۔ یقیناً کبیر دادا کو اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وقتی طور پر اسے ٹالنے کے لیے اس نے حامی بھری تھی ورنہ اس کی زندگی میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی تھی نہ اسے تناوش سے نکاح پڑھانے کا کوئی شوق تھا۔ وہ اپنا قیمتی وقت کسی بے سہارا یتیم لڑکی پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ تناوش کا دل ڈوبنے لگا۔

وہاں موجود تمام مردوں کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ بغیر کوئی بات رابطہ منقطع ہونے پر دلاور شیخ چہکا.....

"بے بی!..... یقیناً تمھارے ہونے والے سورما شوہر کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم پر دلاور شیخ کی نظر ہے۔ دلاور شیخ تو موت کا دوسرا نام اور موت کا سامنا اس مولوی جیسا بے قوف ہی کر سکتا ہے۔ بہ ہر حال مولوی صاحب نکاح پڑھانا شروع کرو۔" اس نے شاید زندگی میں پہلی بار مولوی محبوب الٰہی کو تمیز سے مخاطب کیا تھا۔

زمین اور آسمان تناوش کی نگاہوں میں چکرانے لگے تھے۔ بے اختیار وہ قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں فوراً دہائی دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

"نہیں دلاور شیخ!..... تم نے خود چودہ جماعت کرنے تک کی مہلت دی ہوئی ہے اور میری بیٹی ابھی بارہویں کلاس میں ہے۔"

"سن مائی!..... میں نے کہا تھا کہ تم لوگ کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جیسی اب کر چکے ہو۔ اور اب تمھاری مہلت ختم۔ میں خود ہی تمھاری بیٹی کو بی اے کروا لوں گا۔ بلکہ اس کی بہت اچھی ٹیوشن بھی رکھوں گا۔" بشریٰ کو یہ کہتے ہی وہ مولوی محبوب الٰہی کو مخاطب ہوا۔ "ابے مولوی کی اولاد!..... کیا کہا ہے، نکاح پڑھانا شروع کر۔"

"مم..... مگر لڑکی تیار نہیں ہے۔" مولوی محبوب الٰہی ہکلاتے معترض ہوا۔

"کیسے تیار نہیں ہے۔ اپنے کسی یار کے لیے تو اس نے اتنا سنگھار کر لیا ہے، عاشق کو بھی مایوس نہیں کرے گی۔"

"مم..... مگر جناب لڑکی رضامندی تو لازمی ہوتی ہے نا۔"

"تم فکر نہ کرو..... وہ بالکل بھی رضامند ہوگی، یقیناً اسے تمھاری لاش دیکھنا پسند نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہی اس نے جیب سے پستول نکال کر مولوی محبوب الٰہی کی کنپٹی پر رکھ دیا تھا۔

حیران و پریشان بیٹھی تناوش کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مولوی صاحب کو وہ بڑے اعتماد سے بلا کر لائی تھی۔ اس نے تو دعوا کیا تھا کہ دلاور شیخ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا اور اب مولوی صاحب کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

”خدا کے لیے یہ ظلم نہ کرو۔“ وہ دلاور شیخ کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے گڑگڑائی۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ نکاح پڑھوالو، مولوی کو کچھ بھی نہیں کہوں گا۔“

تناوش کے پورے وجود کے اندر بے بسی بھر گئی تھی۔ اس کے دماغ میں مولوی کی بیوی حامدہ کی آواز ابھری۔

”سپنے دیکھنے بند کرو لڑکی!..... ایسا کچھ ڈراموں، فلموں میں تو ہوسکتا ہے حقیقت میں نہیں۔ دلاور شیخ جیسے درندوں کی رسی کو مالک بھی ڈھیلا چھوڑے رکھتا ہے۔ ایسے موذی کا ہم جیسے کمزور لوگ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

اس کی بات بالکل سچ تھی۔ اب دلاور شیخ کی بات نہ مان کر وہ بس مولوی صاحب کی زندگی کی دشمن ہی بن سکتی تھی۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی.....

”ٹھیک ہے۔ مولوی صاحب!..... آپ نکاح پڑھانا شروع کریں۔“ زندگی کی بے سکون جھیل میں ایک اور پتھر گرنے کو تھا۔

”مگر بیٹی .....“ مولوی صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلانے چاہے۔ اسی وقت دلاور شیخ اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے دھاڑا۔

”بکواس بند کرو بڈھے، شاید تجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔“

تناوش بلکتے ہوئے بولی۔ ”دلاور شیخ، شرم آنی چاہیے تمھیں ایک کمزور نہتے بزرگ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔“

”اس بڈھے کو بھی تو فتنے سے باز آجانا چاہیے، جب ایک لڑکی شادی کے لیے تیار ہے تو اسے کیا مسئلہ ہے۔ اس کی بیٹی سے تو نکاح نہیں کر رہا جو اسے تکلف ہو رہی ہے۔“

”بیٹی نہیں، بیٹی جیسی تو ہے۔“ مولوی صاحب نے حوصلہ کر کے زبان کھولی۔

”ایسی کی تیسی تیری بیٹی اور تیری بیٹی جیسی کی..... چل نکاح پڑھانا شروع کر۔“

محلے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ تمام خوفزدہ انداز میں یہ ڈراما دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ مولوی صاحب کا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتے تو دلاور شیخ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر پاتا۔ مگر مقابلہ تو کجا وہ شادی میں شرکت کے فیصلے پر پچھتا رہے تھے۔ انھیں تو یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں مولوی صاحب کے بعد دلاور شیخ انھیں زدوکوب کرنا نہ شروع کر دے۔

''اب بھی سوچ لے بیٹی!..... میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں، میری موت سے اگر تمھاری زندگی بچ سکتی ہے تو انکار کر دے۔'' دلاور شیخ کی بکواس کے باوجود مولوی محبوب الٰہی ہمت نہیں ہارا تھا۔

''فکر نہ کر بڈھے، تیرے مرنے کی خواہش کو میں جلد ہی پورا کر دوں گا۔'' یہ بے ہودہ الفاظ دلاور شیخ کے ہونٹوں پر تھے کہ تناوش کے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے مایوسی بھری نگاہ سکرین پر ڈالی، یہ دیکھ کر اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا کہ وہ کال کبیر دادا کے نمبر سے آ رہی تھی۔ اس نے بے صبری سے بٹن دبا کر رابطہ جوڑا۔

''اسلام علیکم!'' اس کی آواز سے حد درجے کی شکر گزاری ابل رہی تھی۔

وہ سلام کا جواب دیے بغیر گویا ہوا۔ ''معذرت خواہ ہوں میرا موبائل فون ملازم کے ہاتھ میں تھا اور میں ورزش میں مشغول تھا۔ اس نے ابھی آ کر اطلاع دی ہے۔ میں بس تمھاری جانب نکل پڑا ہوں۔''

''مم..... میں منتظر ہوں۔'' خوشی کے مارے اسے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔

کبیر دادا نے مزید کوئی بات کیے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''دلاور شیخ!..... برات میرے گھر تک آنے کے لیے چل پڑی ہے۔'' ایک بار پھر اس کے لہجے میں اعتماد در آیا تھا۔

''شاید تم مزید مہلت حاصل کرنا چاہتی ہو، لیکن یاد رکھنا آج دلاور تمھیں ساتھ لے کر ہی جائے گا۔ تمھیں اپنی مردانگی کا ثبوت بھی تو دینا ہے۔''

وہ بے باکی سے بولی۔ ''ضرور دینا، بس بیس پچیس منٹ ٹھہر جاؤ۔''

اسی وقت دلاور کا چچا کرم دین سر پر مٹھائی کا ٹوکرا لادے دروازے سے نمودار ہوا۔

''ہونہہ!..... مٹھائی تقسیم ہونے تک تمھارے یار کا بھی انتظار کر لیتے ہیں۔ تمھیں اگر اس کی موت کے بعد ہی میری بیوی بننا ہے تو مجھے کیا اعتراض۔'' زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''چلو بھئی حاضرین میں مٹھائی تقسیم کرو..... کیا یاد کریں گے یہ لوگ دلاور شیخ کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور اب تک پھیکا منھ لیے بیٹھے ہیں۔''

"جی باس۔" کہہ کر وہ سب سے پہلے مٹھائی کا ٹوکرا دلاور شیخ کے قریب لائے۔

وہ ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کھڑوس مولوی کا منہ بھی میٹھا کراؤ۔"

انھوں نے مٹھائی کا ٹوکرا مولوی صاحب کے سامنے پکڑا۔ مولوی محبوب الٰہی کا جی بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ مٹھائی کو ہاتھ لگائے۔ اسے متذبذب دیکھ کر تناوش بولی۔

"چچا جان!..... بے فکر ہو کر مٹھائی لیں، تمھاری بیٹی کا دولھا چند منٹ میں پہنچنے والا ہے۔"

"ہا..... ہا..... ہا۔" دلاور شیخ نے زبردستی کا قہقہہ لگایا۔ "دولھا نہیں قربانی کا بکرا کہو جس نے آج دلاور کے ہاتھوں ذبح ہونا ہے۔"

مولوی محبوب الٰہی نے بے دلی سے مٹھائی کا ایک دانہ اٹھا لیا تھا۔ مگر اس نے وہ دانہ منہ میں نہیں ڈالا تھا۔ دلاور شیخ کی حرام کی مٹھائی کھانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے مٹھائی نہ کھانے پر دلاور شیخ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا وہ تو بس خباثت بھری نگاہوں سے تناوش کو گھور رہا تھا جو دلھن کے روپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر نظر آنے والا اطمینان اسے ضرور اچنبھے میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی آنے والے ہولناک وقت کا تصور موجود نہیں تھا ورنہ وہ وہاں سے بھاگنے میں ایک منٹ بھی نہ لگاتا۔

اس کے کارندے بہ مشکل لوگوں میں مٹھائی تقسیم کر پائے تھے کہ بریکوں کی زوردار چرچراہٹ کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ تناوش کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم نمودار ہوا۔ اس کا دولھا، اس کے خوابوں کا شہزادہ پہنچ گیا تھا۔ تمام لوگ دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اس کے ساتھ ہی کبیر دادا کے قد آور وجود نے تناوش کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ اس نے سپورٹس پاجامے کے اوپر ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس سے اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً وہ اپنی ورزش ادھوری چھوڑ کر تناوش سے کیا وعدہ نبھانے آن پہنچا تھا۔ اس کے عقب میں اسی کی طرح چار قد آور محافظ موجود تھے۔ ان میں سے دو تو دروازے پر رک گئے تھے جبکہ دو کبیر دادا کے عقب میں چلتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ کبیر دادا حاضرین پر نظر ڈالنے کی زحمت کیے بغیر سیدھا تناوش کے قریب پہنچا۔

''میں آ گیا ہوں۔'' اس کی دھیمی آواز بھی ایسی تھی جیسے بادل گرج رہا ہو۔ تناوش کو لگا سچ مچ اس کا محبوب پہنچ گیا ہو۔ کبیر دادا کا چہرہ ایک لمحہ اس کی چاہت بھری نگاہوں کے حصار میں مقید رہا اس کے بعد تناوش نے اپنی نگاہیں دلاور شیخ کی طرف موڑیں۔ اس کی ٹانگوں کی لرزش واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

''آپ بیٹھیں نا۔'' اس نے چاہت بھرے لہجے میں کبیر دادا کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے چارپائی پر جگہ سنبھال لی۔ دونوں محافظ اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے تھے۔

''دلاور شیخ!..... میرا دولہا پہنچ گیا ہے۔'' تناوش اس کے قریب پہنچتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

''مم..... میں..... کک..... کبیر دادا..... وہ میں.....'' تناوش سے نظریں چراتے ہوئے وہ کبیر دادا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

کبیر دادا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''سنا ہے میری ہونے والی بیوی کو تم نے کہا ہوا ہے کہ اس کے شوہر کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرو گے۔ چلو میں آ گیا ہوں اپنی قسم پوری کر لو۔''

''مم..... مجھے..... معاف کر دو دادا..... مم..... میں نہیں جانتا تھا کہ..... بی..... یہ آپ کی منظور نظر ہے۔''

''معاف کیا۔'' کبیر دادا نے بے پروائی سے ہاتھ لہرایا۔ ''اب جا کر میری بیوی سے معافی مانگو۔''

''مم..... مجھے معاف کر دو۔'' دلاور شیخ نے فوراً تناوش کے سامنے ہاتھ باندھ دیے تھے۔

''ہاہ.....'' تناوش کے منہ سے اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ ''دلاور شیخ اس پل کے خواب میں جانے کب سے دیکھ رہی ہوں۔ تم سے بہت حساب کتاب رہتا ہے اور معافی بھیا سے مانگنا جنھیں تم نے بے گناہ قتل کیا تھا۔ اور اس کے لیے یقیناً تمھیں ان کے پاس ہی جانا پڑے گا۔''

یہ کہتے ہی وہ ماں کی جانب مڑی۔ ''چلیں ماں جی!..... ہمارا انتظار تو اختتام پذیر ہوا۔''

''ہاں بیٹی!'' بشریٰ نے باورچی خانے کی دیوار کے سہارے کھڑی دو لاٹھیاں اٹھائیں، ایک تناوش کو دے کر دوسری اس نے خود تھام لی۔ ان مضبوط لاٹھیوں کا بندوبست انھوں صبح ہی سے کر کے رکھا ہوا تھا۔

''مم..... معاف کر دو خالہ.....'' ان کے تیور دیکھ کر دلاور شیخ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”کر دیں گی، پہلے کفارہ تو ادا کر لو۔“ بشریٰ کو خود اپنی آواز بے گانی لگ رہی تھی۔ اس کے جوان بیٹے کو دردناک موت کے حوالے کرنے والا اس کے سامنے موجود تھا۔ شاہ نواز کا کٹا پھٹا خوں چکاں جسم ہمیشہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا۔ نہ جانے مرنے سے پہلے اس کا بے گناہ بیٹا کن اذیتوں سے گزرا تھا۔ اور اس سب کا ذمہ دار دلاور شیخ اب بے بسی کی حالت میں اس کے سامنے موجود تھا۔

دوسری طرف تناوش تھی، جس کی زندگی اس نے اجیرن کر دی تھی۔ جس کی آنکھوں کے سپنے اس نے چھین لیے تھے۔ جس کا گبھرو بھائی اس نے اس وجہ سے قتل کر دیا تھا کہ اس نے اپنی بہن کی عزت کی حفاظت کی کوشش کی تھی۔ آج اس بہن کو اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ بھائیوں پر تو بہنیں یوں بھی قربان، صدقے واری جاتی ہیں۔ وہ کیسے اپنے بھائی کے قاتل کو معاف کر دیتی۔

ماں بیٹی نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھیاں بلند کیں۔

”پلیز..... پلیز..... خدا کے لیے.....“ دلاور شیخ گڑگڑایا۔ مگر اس کی منت زاری کی پروا کیے بغیر ان کی لاٹھیاں ایک جھٹکے سے نیچے آئیں اور دلاور شیخ کے دفاعی انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کے منہ سے بلند بانگ چیخ نمودار ہوئی.....

”ہائے..... مر گیا۔“

تناوش اور اس کی ماں کے کلیجوں تک ٹھنڈک کی لہر اتر گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی لاٹھیاں ایک تواتر سے دلاور شیخ کے جسم پر برسنے لگیں۔ وہ اس کے نچلے دھڑ کو نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔ دلاور شیخ کی چیخ و پکار اور اس کے تڑپنے کا منظر اتنا خوش کن تھا کہ وہ جلدی جلدی اس کھیل کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مضبوط لاٹھیوں کی ضربوں نے چند لمحوں میں دلاور شیخ کو زمین بوس کر دیا تھا۔ ماں بیٹی دل جمعی سے اس پر لاٹھیاں برساتی رہیں۔ یہاں تک کہ دلاور شیخ کے منہ سے آوازیں نکلنا موقوف ہو گیا تھا۔ چھاتی پر پڑنے والی لاٹھی کی زوردار ضربوں نے اس کی پسلیوں کو توڑ کر دل کو ناکارہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ماں بیٹی کے ہاتھ مسلسل چلتے رہے۔

کبیر دادا بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ حاضرین محفل کے دل بھی خوف سے دھڑک رہے تھے۔ ایک طرف تو انھیں دلاور شیخ کے انجام سے خوشی ہو رہی تھی تو اس کے ساتھ وہ کبیر دادا کی پر رعب شخصیت سے بھی

خوف محسوس کر رہے تھے۔ نہ جانے وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دکھ پہنچانے کے گناہ میں کس کس کو تشدد کا نشانہ بناتا ۔دروازے پر کھڑے اس کے قوی ہیکل محافظوں کی موجودی میں کوئی گھر سے باہر بھی تو نہیں نکل سکتا تھا۔ دلاور شیخ کے کارندوں کے چہروں پر موت کی زردی کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

دلاور شیخ کی بھیانک موت کے بعد بھی جب ماں بیٹی کا لاٹھیاں برسانا جاری رہا تو مولوی محبوب الٰہی ہمت کر کے آگے بڑھا اور تناوش کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''بس کرو بیٹی!..... یہ موذی اپنے کرتوتوں کے ساتھ اللہ پاک کی عدالت میں پہنچ گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بشریٰ کی لاٹھی بھی تھام لی تھی۔

دونوں ماں بیٹی چونکتے ہوئے جیسے کسی گہرے سپنے سے بیدار ہوئی تھیں۔ مسلسل لاٹھیاں برسانے سے ان کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

ان کے رکتے ہی کبیر دادا کی پر رعب آواز ابھری۔ ''دلاور شیخ کے کارندے سامنے آئیں۔''

وہ چاروں سورما لرزتی ٹانگوں سے سامنے ہوئے اور بھاگ کر کبیر دادا کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''اللہ پاک کا واسطہ ہمیں معاف کر دو، ہمارے باپ کی توبہ جو آئندہ غلط کام کیا۔'' چاروں یک زبان ہو کر واویلا کرنے لگے۔

''پیچھے ہٹ کر بات کرو۔'' کبیر دادا نے انھیں دور جھٹکنے کی کوشش کی۔

''جب تک آپ ہمیں معاف نہیں کر دیتے ہم قدموں سے سر نہیں اٹھائیں گے۔'' چاروں معافی لیے بغیر اٹھنے پر تیار نہیں تھے۔

کبیر دادا عقب میں موجود اپنے محافظوں کو مخاطب ہوا۔ ''میرے تین گننے تک ان میں سے جو کھڑا نہ ہو پائے اسے گولی مار دینا۔'' مگر اس کے گنتی شروع کرنے سے پہلے وہ چاروں ہاتھ باندھتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

''ان کے ساتھ کوئی حساب کتاب کرنا ہے؟'' اس مرتبہ اس کا مخاطب تناوش تھی جو عقیدت بھری نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

تناوش نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اپنے سرغنہ کی لاش کو ٹھکانے لگانا تم چاروں کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہ لاش پولیس کو مل گئی تو شاید انھیں مزید چار لاشوں کی تفتیش بھی کرنا پڑ جائے۔''

''کک..... کسی کو بھی نہیں ملے گی دادا!'' ان میں سے ایک نے جرات کر کے زبان کھولی تھی۔

''اب دفع ہو جاؤ اور اس کے بعد تم یا تمھارا کوئی بھی ساتھی اس محلے میں نظر آیا تو وہ ہمیشہ کے لیے نظر آنا بند ہو جائے گا۔''

''کبھی بھی نہیں آئیں گے دادا..... یہاں سے گزریں گے بھی نہیں۔'' چاروں پر ابھی تک لرزہ طاری تھا۔ جرم کی دنیا میں کبیر دادا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ زیر زمین حلقوں میں وہ ایک افسانوی کردار جیسی شہرت رکھتا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس عام سے محلے کے سب سے غریب گھر میں وہ ایک دم یوں آ کر بیٹھ جائے گا۔ اور وہ لڑکی جسے پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ تنگ کرتے آ رہے تھے اسے اپنی بیوی کا خطاب دے دے گا۔

کبیر دادا نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں دفع ہونے کا کہا اور تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔

''میرا خیال ہے میرا کام ختم ہو گیا۔''

''جی ہاں..... بس ایک چھوٹی سی رسم باقی ہے۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے سر پر دوپٹا درست کیا اور مولوی محبوب الٰہی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''چچا جان!..... ہمارا نکاح پڑھا دیں۔''

مولوی محبوب الٰہی کی آنکھوں میں شدید حیرانی کی لہریں اٹھیں مگر اس نے کوئی سوال پوچھنے کے بجائے وہ ''بسم اللہ'' پڑھ کر نکاح کا خطبہ پڑھنے لگا۔ خطبہ پڑھتے ہی اس نے کبیر خان سے نام مع ولدیت پوچھا۔

اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''کبیر علی خان ولد عمر علی خان۔''

''حق مہر.....؟'' اس مرتبہ وہ بشریٰ خاتون سے مستفسر ہوا تھا۔

ماں کے کچھ کہنے سے پہلے تناوش بولی..... ''حق مہر دلاور شیخ کی موت ہی تھا۔''

''مگر بیٹی.....''

وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔ ”چچا جان! جو عرض کر رہی ہوں اسے مان جائیں۔“

اور مولوی محبوب الٰہی تکرار کیے بغیر ایجاب وقبول کرانے لگا۔ کبیر دادا نے اس ضمن میں زبان نہیں کھولی تھی ۔وہ بس دلچسپی سے تناوش کی باتیں سنتا رہا۔ اس چھوٹی سی لڑکی میں خوب صورتی کے علاوہ بھی کوئی تو خاص بات تھی جو وہ اس کی باتوں پر یوں محظوظ ہو رہا تھا۔

نکاح کی رسم پوری ہوتے ہی وہ کھڑا ہو کر تناوش سے پوچھنے لگا۔

”تمھیں لینے کے لیے کس وقت گاڑی بھیجوں؟“

”میں آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔“ وہ پختہ لہجے میں بولی۔

”نہیں۔“ کبیر دادا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رات کے دس بجے تمھیں لینے کے لیے کار پہنچ جائے گی۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ چند گھنٹے مزید بھی گزار لو۔ اور کوئی رسم وغیرہ رہتی ہو تو وہ بھی پوری کر لو۔“ آخری فقرہ اس نے متبسم ہو کر کہا تھا۔ تناوش کو محسوس ہوا کہ وہ مسکراتے ہوئے مزید اچھا لگنے لگتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ تبسم اس کے چہرے پر خال خال ہی نمودار ہوتا تھا۔

اس کے رخصت ہوتے ہی مولوی صاحب نے بھی جانے کی اجازت مانگی۔

مولوی محبوب الٰہی کے سامنے سر جھکاتے ہوئے وہ ممنونیت سے بولی۔ ”چچا جان!..... آپ کے احسانات ہمیشہ قرض رہیں گے۔“

”چچا بھی کہتی ہو اور احسانات کا ذکر بھی کرتی ہو۔ پگلی بیٹیوں پر احسان نہیں کیے جاتے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“ مولوی محبوب الٰہی اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرنے لگے۔

”اللہ پاک ہر لڑکی کو ایسا ہی سرپرست عطا کرے۔“ گلوگیر لہجے میں کہہ کر وہ ماں طرف مڑی اور اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

محلے والے بھی نادم اور خفیف انداز میں ماں بیٹی کے قریب ہو کر انھیں مبارک باد دینے لگے۔ گو وہ ساری کہانی ان کے سروں سے کافی اونچی گزری تھی۔ کبیر دادا جیسی شخصیت کی آمد، دلاور شیخ کی بھیانک موت، ماں بیٹی کی کارروائی، تناوش کا نکاح۔ سب کچھ نہایت عجیب تھا مگر وہ سوال کرنے کی جرات نہیں کر پا رہے تھے۔ ان

کے لیے بس یہ بات باعث اطمینان تھی کہ کبیر دادا نے دلاور شیخ کے کارندوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے ان کے محلے سے دفع ہو جانے کا حکم دے دیا تھا۔

محلے کی عورتوں میں بھی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کئی ایک نے تو دلاور شیخ کا انجام صحن میں آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تناوش کے شوہر کو دیکھ کر تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔ گو وہ تناوش سے عمر میں بڑا تھا مگر اس کا رکھ رکھاؤ، رعب و دبدبہ ایسا تھا کہ عمر کا فرق بالکل ہی پسِ منظر میں چلا گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر تناوش کا رویہ انھیں حیرت میں ڈالے ہوئے تھا۔ کوئی دلھن نکاح کے وقت یوں باتیں نہیں کیا کرتی۔ نہ وہ اپنے حق مہر کے متعلق منہ کھولتی ہے اور نہ شوہر کو یوں مشورے دیا کرتی ہے۔ مگر وہاں اتنے عجیب حالات ظہور پذیر ہوئے تھے کہ کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ وہ کس کس بات پر حیرت ظاہر کرتے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد مرد حضرات بھی وہاں سے کھسک لیے تھے۔ ان کے جانے کے بعد عورتوں کو کھلی آزادی مل گئی تھی۔ تمام نے تناوش اور اس کی ماں کو گھیر لیا تھا۔ یوں بھی شادی کے دن دلھن مرکز نگاہ ہوتی ہے مگر وہ تو ایسی دلھن تھی جس نے تمام کے دماغ کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ گھر میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کوئی ماں بیٹی کو مبارک دے رہی تھی تو کوئی دلاور شیخ جیسے موذی کی موت پر اظہار تشکر کر رہی تھی اور کوئی اس حیران کن واقعے پر تبصرے میں مشغول تھی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ یوں بھی عورت ذات باتیں کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، سننا اس نے کسی کی نہیں ہوتی۔ اپنی کہے جانا اور دوسرے کی سنے بغیر سر ہلاتے جانا عورتوں کی عادت ثانیہ ہوتی ہے اور اس وقت وہاں اسی عادت کا بھرپور طریقے سے اظہار ہو رہا تھا۔

عورتوں کے سوالات سے بچنے کے لیے تناوش روایتی دلھن کی طرح خاموشی سے گھونگٹ میں چھپ گئی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کا دل اندیشوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ کبیر دادا جیسی شخصیت کے بارے سوچ کر اس کی رہی سہی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ دلاور شیخ کا انجام تو اس کی تمنا کے مطابق ہو گیا تھا، مگر اپنی زندگی اسے اندھیروں میں گم نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کبیر دادا نے اسے کتنا عرصہ اپنے پاس رکھنا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگلے دن کا سورج طلوع ہونے تک وہ طلاق کے تین الفاظ کا تحفہ لیے گھر کی دہلیز پار کر چکی ہوتی۔ ایسا ہونے کی صورت میں ماں بیٹی لوگوں کا سامنا کیسے کرتے۔ تمام نے یہی کہنا تھا کہ ”بڑے غنڈے سے اپنی عزت کا سودا

کر کے چھوٹے غنڈے سے عزت بچانے کا کیا فائدہ۔"

"کیوں نہیں ہے فائدہ۔" اس نے زور و شور سے اپنی سوچ کی مخالفت کی تھی۔ "میں نے اپنے باپ جیسے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے، پھر کبیر دادا سے میرا نکاح ہوا ہے اور نکاح کے بعد ہر مرد اپنی بیوی کے جسم کا حق دار بن جاتا ہے تو کبیر دادا کو یہ حق کیوں نہیں مل سکتا۔ اور ہمارے ملاپ کو عزت فروشی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ باقی رہی طلاق کی بات تو وہ تو پہلی رات کی دلھن کو بھی مل جایا کرتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں خود کو تسلیاں دیتی رہی۔

اس کی ماں عورتوں کے سوالات پر "یہ سب میرے مولا کا کرم ہے۔" کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ وہ خود خاموش بیٹھی آنے والے ہول ناک وقت کو سوچتی رہی۔ کبھی خود کو تسلیاں دینے لگتی اور کبھی اپنے اللہ پاک سے خیر و عافیت مانگنے لگتی۔ کبیر دادا کے بارے بھی اس کا دل متضاد قسم کے احساسات کا شکار تھا۔ ایک طرف وہ سوچتی کہ اچھا ہے جتنی جلدی طلاق دے دے اتنی جلدی ہی میں نارمل زندگی گزارنا شروع کر دوں گی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہوں میں کبیر دادا کا پر رعب اور مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ گھومنے لگا۔ اس نے کسی ایسے ہی کے تو سپنے دیکھے تھے۔ کوئی ایسا جو اسے زمانے کے ہر سرد و گرم سے بچا سکے، کوئی ایسا جو اس کی طرف بری نظر ڈالنے والے کی آنکھیں نکال سکے، کوئی ایسا جس کا سہارا پا کر دنیا کا ہر خوف اور اندیشہ اس کے دل سے زائل ہو جائے۔ اور وہ ایسا ہی تو تھا۔ دلاور شیخ جسے غنڈے نے اسے دیکھتے اپنی شلوار گیلی کر لی تھی۔ پولیس کے پانچ چھے محافظ ساتھ پھرانے والے جسٹس کی ٹانگیں اسے دیکھتے ہی کانپنے لگ گئی تھیں۔ تو کوئی اور کیسے اس کا سامنا کرتا۔

گھنٹے ڈیڑھ میں زیادہ تر عورتیں رخصت ہو گئی تھیں۔ بس دو تین پڑوسنیں اور تنوش کی چند قریبی سہیلیوں کے علاوہ وہاں کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ باقی عورتوں کی طرح اس کی سہیلیاں بھی اصل بات جاننے کے لیے بے چین تھیں۔ عورتوں کے جاتے ہی وہ اسے کمرے میں لے آئیں اس کے ساتھ ہی سلمٰی نے تمام کے ذہنوں میں مچلتے سوال کو الفاظ کی شکل دے دی۔

"اری!..... کبیر خان کے متعلق تم نے جتنا بتایا تھا وہ اس سے کچھ زیادہ ہی شاندار شخصیت کے مالک نکلے

ہیں۔ سچ بتاؤ ایسا دولھا کہاں سے ڈھونڈا۔"

تناوش ہنسی۔ "کیوں، تمھیں بھی کسی ایسے ہی کی تلاش تھی۔"

سلمٰی حسرت ناک لہجے میں بولی۔ "اللہ پاک کی قسم، کوئی ایسا ملے تو خوشی سے مر نہ جاؤں۔"

تناوش اس پر چوٹ کرتے ہوئے بولی۔ "مطلب، جسے تمھاری موت مطلوب ہو وہ تمھارے لیے ایسے ہی دولھا کی دعا کرے۔"

"وہ تو میں نے بہ طور محاورہ بولا ہے۔" سلمٰی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اب اصل بات پھوٹو۔"

"کون سی اصل بات۔"

سلمٰی نے کہا۔ "یہی کہ کبیر صاحب آپ کو کہاں ملے، کیسے پسند کیا اور تم نے اتنا عرصہ ہم سے کیوں یہ بات چھپائے رکھی اور اس سے پہلے تم نے کبیر کو دلاور شیخ کے بارے کیوں خبر نہ دی۔ وغیرہ وغیرہ۔" شازیہ، نازیہ، اقراء اور صالحہ بھی پرشوق انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

تناوش نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سچ تو یہ ہے ان سے میری کل ہی ملاقات ہوئی ہے۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھیں۔" اقراء نے اس کی پیٹھ پر دھپا لگایا۔

"بکواس نہیں کر رہی حقیقت بتا رہی ہوں۔"

شازیہ نے کہا۔ "مگر ایسا کیسے ممکن ہے۔"

"ہاں بالکل۔" باقیوں نے بھی شازیہ کی تائید میں سر ہلا دیے تھے۔

"جب اللہ پاک چاہے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔"

سلمٰی جل کر بولی۔ "کوئی واسطہ، کوئی تعارف، کوئی میل ملاپ بھی ہوا یا کبیر خان صاحب براہ راست آسمان سے ٹپکے جنھیں محترمہ تناوش نے جھولی پھیلا کر سنبھال لیا۔"

"یاد ہے نا کل میں کالج نہیں آئی تھی۔"

سلمٰی نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ اور اگر کالج سے چھٹی کرنے پر کبیر خان جیسا دولھا مل سکتا ہے تو میں ہمیشہ کے لیے کالج جانے سے رک جاؤں گی۔"

تناوش نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”ہر اندھے کے پاؤں تلے بٹیرہ نہیں آیا کرتا۔ نہ ہما ہر شخص کے سر پر بیٹھا کرتا ہے۔“

اقراء نے بے صبری سے کہا۔ ”یار فلسفے کو چھوڑو اور اصل بات بتاؤ۔“

نازیہ بولی۔ ”ہاں ہاں، جلدی جلدی اصل واقعہ سناؤ، یہ نہ ہو کبیر خان صاحب محترمہ کو لینے پہنچ جائیں۔ آخر اتنی پیاری دلھن کے بغیر وہ بھی تو اداس ہوں گے۔“

”کاش ایسا ہوتا۔“ حسرت ناک انداز میں سوچتے ہوئے اس کے منہ سے ٹھنڈا سانس خارج ہوا اور وہ انھیں تفصیل بتلانے لگی۔

”کل میرا دل کالج جانے کو نہیں کر رہا تھا، میں یونہی کسی سمت کا تعین کیے بغیر شہر میں پھرتی رہی۔ ایک بڑے ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر پولیس کے سپاہیوں کے جھرمٹ میں ہوٹل سے باہر آتی ایک شخصیت پر پڑی۔ میرے دل میں ایک دم اسے اپنے حالات بتانے کا داعیہ پیدا ہوا۔ وہ اپنی قیمتی کار میں بیٹھ کر ہوٹل سے باہر آنے والی روش پر آ رہا تھا، میں اسے روکنے کے لیے آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ سڑک پر ایک مرسڈیز نے نمودار ہو کر اس شخص کا راستہ روک دیا۔ اور جانتی ہو مرسڈیز میں وہ سوار تھے۔“

”وہ کون؟“ شازیہ نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بھی سوالیہ انداز حرکت دی تھی۔

”ان کے ہونے والے وہ یار..... اب خاموشی سے بات سنو۔“ سلمٰی نے بیزاری بھرے انداز میں شازیہ کو جھڑکا۔ باقی بھی شازیہ کو خشمگین نظروں سے گھورنے لگی تھیں۔

”اچھا سوری، اب نہیں بولتی۔“ شازیہ نے فوراً اپنے ہاتھ بلند کر لیے۔

تناوش دوبارہ بولنے لگی۔ ”ہوٹل سے نکلنے والی شخصیت ایک جج کی تھی۔ اور یقین مانو پولیس کے محافظوں میں گھرے اس جج نے جب انھیں دیکھا تو وہ تھر تھر کانپنے لگ گیا تھا۔ غالباً ان کے کسی آدمی کا مقدمہ اس جج کی عدالت میں پھنسا تھا۔ انھوں نے جج کو کل تک اپنے آدمی کے حق میں فیصلہ سنانے کا حکم دیا، جسے جج نے بغیر کسی حجت کے مان لیا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ کس کے سامنے فریاد کرنا چاہیے۔ پس موقع ملتے ہی میں نے اپنی

پریشانی ان کے سامنے دہرادی انھوں نے مجھ سے شادی کرنے کی شرط پر میری مدد کرنے کی حامی بھرلی۔بس اتنی سی بات ہے۔باقی کا سارا واقعہ تو تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔'' تناوش نے گول مول انداز میں انھیں سارا واقعہ سنادیا۔

''ارے کہیں وہ دلاور شیخ سے بھی بڑا.....میرا مطلب ہے کوئی ایسا ویسا آدمی تو نہیں ہے.....'' شازیہ نے محتاط انداز میں جو کہا وہی تمام کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

''اگر اس کے بعد انھیں ایسا ویسا کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا.....'' تناوش سچ مچ ناراض ہونے لگی ،حالانکہ یہ بات تو اسے اچھی طرح پتا تھی کہ کبیر دادا کیا تھا۔باقی تمام سہلیاں بھی خشمگین نظروں سے شازیہ کو گھورنے لگی تھیں۔گو اندازہ تو انھیں بھی ہوگیا تھا کہ کبیر خان کی اصلیت کیا تھی مگر ایسے سچ پیٹھ پیچھے بولے جاتے ہیں منھ پر نہیں۔

''مم.....مم.....میں نے تو بس یونھی.....'' شازیہ منمنا کر رہ گئی تھی۔

''بیٹی کھانا لاؤں۔'' بشریٰ نے اندر آکر پوچھا۔

''ماں جی!.....دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''تھوڑا سا کھالو اور تمھاری سہیلیاں بھی تو کھائیں گی نا۔'' بشریٰ مصر ہوتے ہوئے کھانا لینے چلی گئی۔

سہیلیوں کی وجہ سے اس نے بھی تھوڑا سا کھانا زہر مار کرلیا تھا۔اور پھر وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا کار کے ہارن پر اس نے پاس بیٹھی سلمیٰ سے وقت پوچھا۔

وہ گھڑی پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔''پونے نو۔''

وہ سرسراتے ہوئے ہوئے لہجے میں بولی۔''ان کی کار وقت سے گھنٹا بھر پہلے ہی پہنچ گئی ہے۔''

سلمیٰ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔''ہاں جی،صبر ہی کہاں ہو رہا ہوگا بے چارے سے۔''

تناوش سرخ پڑتے ہوئے بولی۔''بکواس نہ کرو۔''

''اس میں بکواس کی کیا بات ہے،خود ہی تو بتا رہی تھیں آپ کے،وہ دس بجے کار بھیجیں گے۔''

تناوش منھ بناتے ہوئے بولی۔''تو تمھیں کوئی تکلیف.....''

سلمیٰ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”تکلیف تو خیر جس کو ہونا ہے اسے معلوم ہے۔ باقی میں نے آپ کے، ان کا ارادہ ہی بتایا تھا۔“

اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ بشریٰ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھولنے پر اسے دو عورتیں اور ایک مرد کھڑے دکھائی دیے۔ گلی میں ایک چمکتی دمکتی کار بھی کھڑی تھی۔

”آئیں جی۔“ اس نے ایک طرف ہو کر انھیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

”میں کار میں بیٹھا ہوں آپ لڑکی کو لے آئیں۔“ مرد نے اندر گھسنے سے احتراز برتا تھا۔ بشریٰ کو اس کا تناوش کے لیے دلھن کے بجائے لڑکی کا لفظ استعمال کرنا نہایت عجیب اور برا لگا تھا، مگر اس نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور عورتوں کو ساتھ لے کر تناوش کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دونوں عورتیں ملازمہ نظر آ رہی تھیں، اسی وجہ سے وہ ان کا تعارف چاہے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”بیٹھیں میں کھانا لاتی ہوں۔“ بشریٰ نے انھیں بیٹھنے کی دعوت دی۔

”نہیں شکریہ، ہمارے پاس وقت کم ہے۔“ وہ عجلت میں دکھائی دے رہی تھیں۔

تناوش کی سہیلیاں اسے سہارا دے کر اٹھانے لگیں، باری باری تمام سے گلے مل کر وہ ماں سے مل کر رو پڑی تھی۔ بشریٰ اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس کی تسلی دینے لگی مگر خود اپنے آنسو وہ نہیں روک پا رہی تھی۔

”پلیز چلیں وقت کم ہے۔“ دونوں عورتیں نے ایک بار پھر عجلت ظاہر کی۔ تناوش ان کے ہمراہ چل پڑی تھی۔ تمام سہیلیاں اور بشریٰ ان کے پیچھے تھیں۔ دروازے سے نکلتے وقت وہ ایک بات پھر ماں سے لپٹ گئی تھی۔ اسے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھ کر عورتوں نے ایک مرتبہ پھر وقت کی کمی کا رونا رو کر اسے چلنے کو کہا۔

بشریٰ نے اس کی پیشانی چوم کر اسے خود سے علاحدہ کیا اور وہ دونوں عورتوں کے درمیان میں کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ وہی مرد براجمان تھا جس نے دروازے پر دستک دی تھی۔

تناوش کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ بشریٰ، حسرت بھری نظروں سے کار کو دور ہوتے جاتا دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

تناوش سر جھکائے ان دونوں عورتوں کے درمیان بیٹھی گئی۔ نہ تو کسی نے اسے مخاطب کیا اور نہ اس نے خود کسی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ جوں جوں کار گھر سے دور ہوتی جا رہی تھی اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ شرم و حیا ایک دلھن کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے اور وہ تو ایسی دلھن تھی جس کے ساتھ اس کی کوئی واقف کار خاتون بھی موجود نہیں تھی۔ کار کافی دیر چلتی رہی، سر جھکا ہونے کی وجہ سے اسے نہ تو دائیں بائیں کے مناظر نظر آ رہے تھے اور نہ وہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔

کار رکتے ہی وہ باہر نکلی۔ دونوں عورتیں اسے ایک پر تعیش کمرے میں لے آئیں۔ اور بیڈ پر بٹھا کر باہر نکل گئیں۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی وہ سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ آرام دہ ڈبل بیڈ جس پر خوب صورت بیڈ شیٹ بچھی تھی۔ کھڑکیوں سے لٹکے قیمتی پردے، فرش پر بچھا دبیز قالین جس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے، عمدہ صوفہ سیٹ اور بھی بہت کچھ ایسا جو اس نے صرف ٹی وی ڈراموں میں دیکھا تھا، یا اپنی امیر سہیلیوں سے اس کا ذکر سنا تھا۔ اور اب وہ بھی ایسی ہی خوب گاہ کی مالک بن گئی تھی۔

"مالک....." اس کے دماغ میں طنزیہ سوچ ابھری اور تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔ نا معلوم کبیر دادا نے اسے کتنا عرصہ اپنے پاس رکھنا تھا، یہ بھی ممکن تھا کہ آج اس خواب گاہ میں اس کی پہلی اور آخری رات ہوتی۔

دیر تک وہ سر جھکائے تلخ و شیریں خیالات میں گم رہی یہاں تک کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ گھونگٹ میں چہرہ گم کرتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک قبول صورت جوان اندر داخل ہوا۔

"شاید یہ کبیر دادا کا سیکریٹری وغیرہ ہوگا۔" اس کے دماغ میں ایک امکانی سوچ گونجی۔ لیکن جونھی کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ کنڈی کیا وہ ایک دم چونک پڑی تھی۔

"کک.....کون ہیں آپ.....کنڈی کیوں لگا دی۔" وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بے بی!.....خادم کو خاور کہتے ہیں، آج کی رات تم مجھے اپنا خدمت گار سمجھ سکتی ہو اور کنڈی اس لیے لگائی ہے کہ کوئی ہماری تنہائی میں مخل نہ ہو سکے۔"

''وہ.....وہ.....کہاں ہیں۔'' تناوش ہکلائی۔

''وہ کون .....'' اس نے چہرے پر مصنوعی حیرانی طاری کی اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا.....اچھا تمھارا مطلب ہے کبیر دادا کہاں ہے۔'' ایک لمحہ سوچنے کا انداز بنا کر وہ کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے اپنی کسی منظور نظر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا۔ اور فکر نہ کرو تم نے کون سا روزانہ میرے ساتھ ہی ہونا ہے۔ آج میں کل کوئی اور ہوگا۔ امید ہے کبھی نہ کبھی کبیر دادا بھی تمھیں شرف ملاقات بخش دے گا۔''

''دیکھو، میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹی۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اتنی زیادہ توہین اور بے توقیری کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ جسے دل و جان سے اپنے سر کا سائیں سمجھے بیٹھی تھی اس نے تو اسے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ پہلی رات ہی اس کے پاس آجاتا۔ اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کے خواب شیشے کے برتن کی طرح کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ کہاں تو وہ اسے جرم کی دنیا سے دور لے جانے کے منصوبے سوچ رہی تھی، اسے اپنی وفا اور خدمت گزاری سے متاثر کرنے کا سوچے بیٹھی تھی اور کہاں وہ رکھیل اور داشتہ کے درجے سے بھی گر گئی تھی۔

''ویسے یہ تو زیادتی ہے بے بی کہ مجھے اپنے قریب آنے سے منع کر رہی ہو آخر میرا قصور تو بتلاؤ نا۔'' اس نے مکروہ لہجے میں کہا۔

''دیکھیں خدا کے لیے آپ کبیر دادا کو بلوائیں مجھے اس سے بات کرنا ہے۔''

اس نے بھونڈے انداز میں کہا۔ ''آئے ہائے، کبیر دادا کو بلواؤں یا انھیں.....'' یہ کہتے ہوئے وہ دیوار میں بنی شیشے کی خوبصورت الماری کی طرف بڑھا۔ پٹ کھول کر اس نے ترتیب سے رکھی ہوئی بوتلوں سے ایک بوتل باہر نکالی۔ بوتل کا لیبل تو تناوش کو نظر نہ آیا مگر اتنا اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ وہ شراب کی بوتل تھی۔ تپائی پر پڑا نفیس گلاس اٹھا کر اس نے اپنے لیے شراب انڈیلی۔

''تم پینا پسند کرو گی۔''

خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تناوش منمنائی۔ ''پلیز مجھے کبیر دادا سے ملوا دیں۔''

''صبح مل لینا یار!.....فی الحال تو موڈ خراب نہ کرو۔'' صوفے پر بیٹھ کر وہ گلاس خالی کرنے لگا۔

''میں خود مل لیتی ہوں۔'' ہمت مجتمع کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ دروازے سے دو تین قدم دور ہی تھی کہ وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''دروازے پر میرے محافظ کھڑے ہیں اور انھیں میں بتا کر آیا ہوں کہ تمھارے کمرے سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ میری طرف سے تم فارغ ہو اور اب وہ اپنا حصہ وصول کر سکتے ہیں۔ اگر اکٹھے تمام کو بھگتانے کا شوق ہے تو تم شوق سے باہر جا سکتی ہو۔''

تناوش کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ وہ ہاتھ باندھتے ہوئے گڑگڑائی۔ ''خ..... خدا کے لیے، مجھے ایک بار کبیر دادا سے ملوا دو۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں میرا قد کبیر دادا سے چھوٹا نظر آ رہا ہے یا مجھ میں ہمت کی کمی نظر آ رہی ہے جو بار بار کبیر دادا..... کبیر دادا کا نام الاپ رہی ہو۔''

''وہ میرے شوہر ہیں..... ان سے نکاح ہوا ہے میرا۔'' تناوش جیسے پھٹ پڑی تھی۔

اس نے چند لمحے سوچنے کی اداکاری کی اور پھر گھٹیا لہجے میں بولا۔ ''ویسے شوہر بننے کے لیے جن لوازم کی ضرورت ہوتی ہے کیا وہ مجھ میں موجود نہیں ہیں۔''

تناوش کو خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، آج کی رات مجھے موقع دے دو اگر تمھیں شکایت ہوئی تو کل کبیر دادا کے پاس چلی جانا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے خالی گلاس تپائی پر رکھا اور تناوش کی طرف قدم بڑھا دیئے۔''

''اگر مجھے ہاتھ لگایا تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔'' تناوش نے یوں دھمکی دی جیسے وہ کسی عوامی مقام پر کھڑی ہو۔

''میرے کانوں کے لیے پسندیدہ آواز عورتوں کی چیخیں ہی ہیں۔'' وہ قدم روکے بغیر اس کی طرف بڑھتا رہا۔ الٹ قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے تناوش کی پیٹھ دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ اب مزید پیچھے ہونے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

وہ گڑگڑائی۔ ''خ..... خدا کے واسطے..... سوہنے نبی پاک ﷺ کے واسطے مجھے کچھ نہ کہو۔'' اس کا رنگ پیلا

پڑ گیا تھا۔ایک دلاور شیخ سے اپنی عزت بچانے کے لیے وہ کئی دلاوروں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

''بے بی!.....موڈ خراب نہ کرو۔''اس کے گڑگڑانے اور واسطے دینے کو کسی خاطر نہ لاتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھتا رہا۔تناوش کی حالت بلی کے منہ میں آئی اس چوہیا کی سی تھی جس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ بچا ہو۔

☆.....☆.....☆

''کہاں جانا ہے دادا!.....''تناوش کے گھر سے باہر نکلتے ہی وہ جونھی کار میں بیٹھا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے موڈبانہ لہجے میں پوچھا۔

''گھر۔''مختصراً کہتے ہوئے اس نے کار کی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ایک دم تناوش کا خوب صورت سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرا اور سر جھٹکتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں۔کار چوڑی گلی سے نکل کر سڑک پر چڑھ رہی تھی۔وہ باہر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

اس کا دماغ اپنے رویے پر الجھا ہوا تھا۔ایک کم سن لڑکی کے لیے یوں وقت ضائع کرنا اس کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔تناوش کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن اسے زندگی میں کبھی خوب صورت لڑکیوں کی کمی نہیں رہی تھی۔تناوش کی طرح درجنوں خوب صورت لڑکیاں اس کی زندگی میں آ چکی تھیں۔اس کی خواب گاہ میں آئے روز خوب صورت تتلیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔دولت اور اختیار ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی کسی خواہش کو تشنہ نہیں رہنے دیتیں۔دنیا کی ہر عیاشی دولت کے سامنے سر تسلیم خم کرتی نظر آتی ہے۔وہ تو ایسا آدمی تھا کہ کسی لڑکی پر دل آ جانے پر اسے ہر قیمت پر اپنی خواب گاہ کی زینت بنا سکتا تھا۔لیکن اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔اس نے کبھی کسی عورت کو اٹھانے کا جرم نہیں کیا تھا۔خود اس کے گروہ میں ایسی کئی خوب صورت لڑکیاں موجود تھیں جو اس کے اشارہ ابرو کی منتظر رہتیں۔فلموں اور ڈراموں کی کئی اداکارائیں بھی اس کی دولت اور دھونس کے رعب میں آ کر اسے نواز چکی تھیں۔اس کے باوجود نجانے تناوش میں ایسی کون سی بات تھی کہ وہ ایسی بے وقوفی کا ارتکاب کر بیٹھا تھا۔سب سے بڑھ کر اسے نکاح پڑھوانے پر حیرانی ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں ایک دو دن بعد طلاق دے دوں گا۔''وہ خود کو تسلی دینے لگا۔

اچانک موبائل فون کی گھنٹی نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا۔ موبائل فون کی سکرین پر نظریں دوڑاتے ہی اس نے اٹینڈنگ بٹن دبا کر فون کان سے لگالیا۔

''ہیلو!'' اس کے لہجے میں حیرانی کا عنصر نمایاں تھا۔ یقیناً وہ اس وقت کسی ایسی کال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''کبیر دادا!..... آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔'' دوسری جانب ابھرنے والی آواز میں موڈبانہ جھجک کے بجائے بے تکلفی اور ہم سری کی کھنک شامل تھی۔

''ابھی.....؟'' کبیر دادا کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

وہ مصر ہوا۔ ''بالکل، ابھی اور اسی وقت آپ کو میرے پاس آنا پڑے گا، یا میں خود آجاتا ہوں۔''

''اچھا میں آرہا ہوں۔'' رابطہ منقطع کرتے ہوئے وہ اپنے سیکرٹری عظیم کو مخاطب ہوا۔ ''شہاب قصوری کی طرح چلو۔''

''جی!'' موڈبانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ یہ بات ڈرائیور کو بتانے لگا۔ ڈرائیور سیدھا چلتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے یوٹرن سے گاڑی موڑی اور مطلوبہ سمت کی طرف بڑھ گیا۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ وسیع کوٹھی کے داخلی دروازے پر رک رہا تھا۔

ان کی گاڑیوں کو پہچانتے ہی چوکیدار نے دروازہ کھولا اور وہ گاڑیاں اندر لے گئے۔ سیمنٹ کی پختہ روش کے اختتام پر کار رک گئی۔ کبیر دادا نیچے اتر کر اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دونوں محافظ بھی اس کے پیچھے چل پڑے، البتہ انھوں نے کبیر دادا کے پیچھے ڈرائینگ روم میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پرتکلف ڈرائینگ روم میں دو آدمی اس کے منتظر تھے۔ دونوں نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔

نشست سنبھالتے ہی کبیر دادا مستفسر ہوا۔ ''شہاب بھائی!..... خیریت تھی؟''

''خیریت کہاں کبیر دادا.....'' ادھیڑ عمر شہاب شاہ قصوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب کبیر دادا جیسا آدمی شادی کرلے گا تو خیریت کہاں رہے گی۔''

''ہاہاہا.....'' کبیر دادا نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ خبر آپ تک بڑی جلدی پہنچ گئی ہے۔''

''باخبر رہنا تو پڑتا ہے کبیر دادا!..... ویسے اخلاق حسین شاہ آپ سے سخت خفا ہیں۔'' شہاب نے ساتھ بیٹھے

دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

''خدا خیر کرے شاہ صاحب!..... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' کبیر دادا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کبیر دادا!..... دلاور شیخ میرا خاص آدمی تھا۔'' اخلاق حسین کے لہجے سے بھی سخت قسم کی خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہونہہ!.....'' کبیر دادا نے سر ہلاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اب تو نہیں رہا نا تو آپ کسی اور کو اپنا خاص آدمی بنالیں۔''

''سن لیا شہاب صاحب۔'' اخلاق حسین، شہاب کی طرف متوجہ ہوا۔

''کبیر دادا آپ زیادتی کر رہے ہیں۔'' شہاب نے اخلاق حسین کی طرف داری کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

کبیر دادا نے کندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ بھلا کون سی زیادتی ہے۔ دلاور شیخ، اخلاق حسین کا رشتہ دار تو تھا نہیں۔ ایک عام سا غنڈہ تھا۔ مر گیا ہے تو اس کی جگہ لینے والے کئی آجائیں گے۔''

اخلاق حسین غصے بھرے طنز سے بولا۔ ''صحیح کہا، کسی بھی غنڈے کے مرنے کے بعد جگہ لینے والے کئی مل جاتے ہیں۔''

کبیر دادا کے چہرے پر گہری سرخی ابھری، مگر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ ان تاثرات سے میل نہیں کھا رہا تھا جو اس کے چہرے پر ہویدا تھے۔ ''شاہ صاحب!..... میرا تجربہ کہتا ہے کہ سوچ کر بولنے والے زیادہ عرصہ زمین کے اوپر چلتے نظر آتے ہیں۔''

شہاب نے فوراً مداخلت کی۔ ''آپ لوگ تو لڑنے لگے۔''

''شہاب صاحب!..... آپ نے دیکھ لیا کبیر دادا کا لہجہ اور انداز؟..... زیادتی بھی یہ کرے اور دھمکیاں بھی یہ دے۔ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہنیں، سیاست میں حصہ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنا کام بھول گئے ہیں یا چھوڑ دیا ہے۔''

''اچھا اب چھوڑو اس بحث و تکرار کو اور بات ختم کرو۔ دلاور شیخ کا قتل کبیر دادا کی جلد بازی ہے، لیکن اس کی

اہمیت اتنی زیادہ نہیں کہ لڑائی کرنا پڑے۔"

"ٹھیک ہے شہاب صاحب!.....آپ کی بات مان لیتے ہیں، لیکن کبیر دادا نے وہاں نہایت غلط اعلان کیا ہے کہ آج کے بعد اس محلے میں میرا کوئی آدمی نہیں جائے گا۔"

شہاب، کبیر دادا کو مخاطب ہوا۔"یقیناً اس بارے آپ کچھ سوچیں گے۔"

کبیر دادا حتمی لہجے میں بولا۔"میں سوچ کر فیصلہ کرتا ہوں، فیصلہ کر کے نہیں سوچتا۔"

اخلاق نے طنزیہ لہجے میں شہاب کو متوجہ کیا۔"سن لیا۔"

"کبیر دادا!....." شہاب شاہ نے امید بھرے لہجے میں اسے پکارا۔

کبیر دادا نے کہا۔"شہاب صاحب!.....کیا کبیر دادا کی زبان اتنی ہلکی ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس مرتبہ اخلاق حسین براہ راست اسے مخاطب ہوا۔"اگر میں نے اس محلے والوں کو یونہی چھوڑ دیا تو وہ باغی ہو جائیں گے اور میرا رعب خاک باقی رہے گا۔"

"چند گھرانوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کبیر دادا اپنی زبان سے پھرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"شہاب صاحب!.....اب مجھ سے گلہ نہ کرنا۔" اخلاق حسین خفگی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

"بات تو سنو؟" شہاب نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اخلاق حسین سنی ان سنی کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

شہاب نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔"یہ اچھا نہیں ہوا۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔" کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلایا۔"غریب ایم این اے اور ایک گینگ کا سربراہ بے موت مارا جائے گا۔"

شہاب ہنسا۔"ویسے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔اس سے پہلے تو آپ نے کبھی کسی عورت کو اتنی اہمیت نہیں دی۔"

"اہمیت کہاں دی ہے صرف نکاح پڑھایا ہے، اگر کوئی عورت نکاح پڑھا کر ہی میری تنہائی کی ساتھی بننے کی خواہاں ہے تو مجھے کیا اعتراض۔ان دو بولوں کی اہمیت تو بس اتنی ہی ہے کہ ایک لفظ تین بار دہرانے سے سب کچھ

ختم، ہر ذمہ داری اور ہر واسطہ خلاص....."

"تو اس ایک لفظ کی تکرار کب ہوگی؟"

وہ مسکرایا۔"کبیر دادا کے ایک گھنٹے کی قیمت اتنی کم نہیں کہ دو تین دن میں اس کی قیمت وصول ہو جائے۔ چند دن اس سے لطف اندوز تو ہولوں۔ یوں بھی ان چھوا مال ہے۔"

"کیا اس کے بعد ہمیں بھی اس گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع مل سکتا ہے۔ سنا ہے لڑکی نہایت پرکشش، جاذب نظر اور خوب صورت ہے۔"

کبیر دادا نے قہقہہ لگایا۔"وہ کیا کہتے ہیں امید پر دنیا قائم ہے۔"

"اچھا وہ بعد کا مسئلہ ہے، فی الحال یہ بتائیں اخلاق حسین شاہ کے مسئلے کے بارے کیا سوچا۔ میرا تو مشورہ ہے جانے دیں۔ اس محلے میں سے کون سا کسی نے آپ کے پاس آ کر شکایت کرنا ہے۔"

کبیر دادا نے بے ساختگی سے کہا۔"وہ تناوش کا محلہ ہے۔" یہ کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے۔ فوراً وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"میرا مطلب ہے جب تک وہ میرے پاس موجود ہے، یہ کہہ تو سکتی ہے کہ میرا اعلان بس ہوائی فائر ہی تھا۔"

"یہ تناوش کون ہے؟" شہاب معنی خیز لہجے میں مسکرایا۔

کبیر دادا جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔"میری بیوی سمجھ لو۔"

"ویسے بیوی اور رکھیل میں فرق کیا ہوتا ہے؟" شہاب نے اسے چھیڑنا جاری رکھا تھا۔

"یار چھوڑو اس موضوع کو۔" کبیر نے بے زاری کا اظہار کیا۔

"ایسے بہت سارے سوالات کا سامنا کرنا تو باقی ہے کبیر دادا، ابھی سے چیں بول گئی ہے۔"

"مجھے چلنا چاہیے۔" کبیر دادا کھسیانی ہنسی ہونٹوں پر بکھیرے کھڑا ہو گیا۔

"کب تک بھاگو گے۔" شہاب کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس کے ہمراہ اٹھ گیا تھا۔

کبیر دادا کو باہر آتا دیکھ کر ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کے قریب لے آیا۔ شہاب سے الوداعی مصافحہ کر کے اس نے عقبی نشست سنبھال لی۔

"گھر چلو۔" ڈرائیور کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتا دیا تھا۔ ساڑھے آٹھ ہو گئے تھے اور دس بجے اس نے تناوش کو لینے جانا تھا۔

گھر پہنچتے ہی محافظوں کو چند منٹ میں تیار ہو جانے کا حکم سنا کر وہ اپنی خواب گاہ میں گھس گیا۔

"ویسے دادا کل سے کچھ عجیب سی حرکتیں نہیں کر رہا۔" کبیر دادا کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے ذاتی محافظ رخسار نے تبصرہ کیا۔

بخش نے تائیدی انداز میں کہا۔ "کہہ تو صحیح رہے ہو۔" امتیاز اور باقر نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

باقر نے خیال ظاہر کیا۔ "ویسے لڑکی بہت خوب صورت ہے جس کی وجہ سے باس سے رہا نہیں جا رہا۔"

امتیاز بولا۔ "کئی خوب صورت لڑکیاں کبیر دادا کی زندگی میں آ چکی ہیں۔"

"ہاں مگر اس لڑکی میں کوئی نئی بات ضرور ہے۔" باقر اپنی بات پر قائم تھا۔

رخسار نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "نئی بات یہی ہے کہ نئی نکور ہے۔"

بخش نے کہا۔ "دلاور شیخ کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ اخلاق حسین شاہ کا خاص آدمی تھا۔ اور ابھی دیکھا تھا کتنے غصے سے وہ شہاب صاحب کی کوٹھی سے رخصت ہو کر گیا ہے۔"

امتیاز نے لقمہ دیا۔ "تمھاری بھی بے عزتی کر دی ہے نا۔"

"مجھے علم ہوتا تو کبھی بھی مصافحے کے لیے ہاتھ نہ بڑھاتا۔ بہ ہر حال اس بارے کبیر دادا کے سامنے منہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

باقر ہنسا۔ "بہتر تو یہی ہے کہ کبیر دادا کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے ان کے محافظ کی کتنی بے عزتی ہو گئی ہے۔"

بخش نے کہا۔ "چھوڑو یار!..... سانڈوں کی لڑائی میں فصل ہی اجڑتی ہے۔"

باقر نے کہا۔ "یہ تو خیر غلط بات ہے، اخلاق حسین شاہ ہمارے لیے سانڈ ہو سکتا ہے، کبیر دادا کے سامنے اس کی حیثیت بکری سے زیادہ نہیں ہے۔"

امتیاز پوچھنے لگا۔ "ویسے اب اس لڑکی کی یہاں کیا حیثیت ہو گی۔ کیا اس کے احکامات کی بھی پابندی کرنا

پڑے گی؟''

''اس کی مدتِ قیام دو تین دن سے زیادہ نہیں ہوگی۔'' بخش نے قہقہہ لگایا۔ ''اور اتنے دنوں میں غریب کو خواب گاہ سے نکلنے کا موقع نہیں ملے گا احکامات خاک دے گی۔'' اس کی بات سن کر باقی بھی کھل کھلا ہنس پڑے تھے۔

اسی وقت کبیر دادا اندر سے برآمد ہوا۔ سیاہ رنگ کے تھری پیس سوٹ نے اس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا امتیاز دبے لہجے میں بولا۔ ''آج تو دادا نے بڑی چمک نکالی ہوئی ہے۔''

''دولھا جو ہوا۔'' بخش نے سر جھکاتے ہوئے دانت نکالے۔

کبیر دادا ان کی باتوں سے بے خبر آگے والی کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ اپنے محافظوں سے زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ یوں بھی کم گوئی اس کی فطرت تھی۔

کوٹھی سے نکلتے نکلتے پونے دس ہو چکے تھے۔ سوا دس بجے کے قریب وہ تناوش کے گھر کے سامنے رک رہے تھے۔ کبیر دادا کے کار سے باہر نکلتے ہی بخش اور امتیاز اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دروازہ بند تھا۔ کبیر دادا نے بخش کو دستک دینے کا اشارہ کیا۔

دروازہ کھٹکھٹانے کے چند لمحوں بعد ہی اندر سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔ ''کون؟''

بخش نے فوراً جواب دیا۔ ''خالہ!..... ہم دلھن کو لینے آئے ہیں۔''

ایک دم دروازہ کھول کر بشریٰ نے باہر جھانکا۔ ''دلھن؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ حیرانی تھی۔ سٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں کبیر دادا کو دیکھتے ہی وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''تت..... تناوش بیٹی کو تو کافی دیر ہوئے لے گئے ہیں۔''

''کون.....؟'' بخش کے کچھ کہنے سے پہلے کبیر دادا نے بے صبری سے پوچھا۔

''آ..... آپ کے ہی آدمی تھے بیٹا۔'' بشریٰ الجھی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

لمحہ بھر اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد کبیر دادا سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''ہونہہ!..... سمجھ گیا۔ میں کسی کام سے گیا تھا، شاید میرے آدمی لے گئے ہوں۔''

بشریٰ نے سکون بھرا سانس لیا۔ ”میں تو ڈر ہی گئی تھی بیٹا!“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ بشریٰ کو تسلی دیتا ہوا بولا۔ ”آپ آرام کریں ہم چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی کار کے قریب پہنچا۔ اس کے چہرے پر چھایا غیض وغضب دیکھ کر بخش پارٹی کے دل دھڑکنے لگے تھے۔ پہلی مرتبہ انھیں کبیر دادا کے چہرے پر اتنا غصہ نظر آیا تھا۔ وہ بڑے بڑے مسائل اور نقصانات کو ذرا بھر اہمیت نہیں دیا کرتا تھا، آج کسی اور ہی جون میں نظر آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شہاب قصوری کے گھر سے نکلتے ہی اخلاق حسین موبائل فون نکال کر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ڈرائیور کو اس نے گھر جانے کا بتا دیا تھا۔

پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

مودبانہ لہجے میں پوچھا گیا۔ ”جی شاہ صاحب!“

”خاور!..... کبیر اس وقت شہاب قصوری کے پاس بیٹھا ہے، تم اس لڑکی کو لانے کے لیے کسی کو اس کے گھر بھیج دو۔“

خاور نے حیرانی سے پوچھا۔ ”مگر کسی دوسرے کے ساتھ وہ کیسے آئے گی؟“

”میری اطلاع کے مطابق کبیر نے دس بجے اپنے آدمی وہاں بھیجنے ہیں اور وہ لڑکی کبیر خان کے تمام آدمیوں کو نہیں پہچانتی ہوگی۔ تم کسی کو بھی وہاں بھیج دو اسے کیا معلوم وہ آدمی کس کے ہیں۔“

”ٹھیک ہے شاہ جی!..... میں خود تو اس وقت کہیں باہر ہوں، اپنے آدمیوں کو بتا دیتا ہوں وہ اسے لے آئیں گے۔ کیا اسے آپ کے پاس بھیجنا ہے۔“

اخلاق حسین ہنسا۔ ”بھابی تو وہ تمھاری بننے والی تھی، یقیناً مجھ سے زیادہ تمھارا حق بنتا ہے۔“

”کبیر دادا پھڈا تو ڈالے گا۔“ خاور کے لہجے میں تشویش تھی۔

”کبیر نے کون سا سچ مچ کا نکاح پڑھایا ہے کہ پھڈا ڈالے گا۔ کبیر جیسے آدمیوں کے لیے ایسی لڑکیوں کی اہمیت رکھیل سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ یوں بھی جو جنس وافر مقدار میں دستیاب ہو وہ اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے اور کبیر

جیسے آدمیوں کو لڑکیوں کی کیا کمی۔"

"تو ہمیں لڑکیوں کی کون سی کمی ہے۔ ہم کیوں ایک لڑکی کے لیے کبیر دادا سے دشمنی کو بڑھاوا دیں۔"

"ہم دشمنی نہیں بڑھا رہے کبیر دادا کو باور کرا رہے ہیں کہ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنیں۔ دوسرا یہ لٹی پٹی لڑکی جب گھر جا کر اپنی بربادی کی داستان سنائے گی اور وہ داستان اس محلے میں پھیلے گی تو خود بہ خود اس محلے کے لوگوں کو میری اہمیت معلوم ہو جائے گی۔"

خاور شیخ نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔ "گویا آپ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔"

اخلاق حسین نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ایک اچھے شکاری کو تیر ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔"

"شاہ جی!..... آپ کی بات تو ٹھیک ہے مگر کبیر دادا سے کوئی بعید نہیں کہ اس لڑکی کے لیے کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھا لے۔" خاور شیخ کے لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

"کبیر کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ کبھی کچے پر پاؤں نہیں رکھے گا۔ ایک لڑکی کے لیے وہ کسی صورت مجھ سے دشمنی مول نہیں لے گا۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی!..... جو آپ کی مرضی۔"

☆.....☆.....☆

"کک..... کہاں جانا ہے دادا!" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اس کے سیکرٹری نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اخلاق حسین کی کوٹھی پر چلو۔" کبیر دادا نے اپنے لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی جس میں اسے بالکل ہی ناکامی ہوئی تھی۔

"جی دادا!" عظیم نے کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اخلاق حسین کی وسیع و عریض کوٹھی تک انھیں بیس منٹ لگے تھے۔ اس دوران کبیر دادا بے صبری سے پہلو بدلتا ہوا بار بار گھڑی کو دیکھتا رہا۔ ڈرائیور اس کا مزاج آشنا تھا اس لیے اس نے حتی الوسع تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

چوکیدار نے باہر نکل کر اس کی کار کو دیکھا۔ وہ کبیر دادا کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دروازہ کھولنے کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ البتہ کبیر دادا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے اثرات ضرور نمودار ہو گئے تھے

اسے خاموش کھڑا دیکھ کر ڈرائیور نے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔“

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”شش..... شاہ صاحب نے کسی کے لیے بھی دروازہ کھولنے سے منع کیا ہوا ہے۔“

”میں کوئی نہیں ہوں۔“ ڈرائیور سے پہلے کبیر دادا نے دبنگ لہجے میں کہا۔ اس کا عام لہجہ بھی مخالف کا پتہ پانی کر دیتا تھا۔ اس کے غصے کا اظہار کرنے پر چوکیدار تھر تھر کانپنے لگا۔

”دروازہ کھولا تو نوکری چلی جائے گی۔“

”نوکری بچانا ہے یا زندگی۔“ کبیر دادا کی بات ایسی نہیں تھی کہ چوکیدار مزید بحث کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ کبیر دادا جو کہتا وہ کرتا بھی ہے۔ اور یقیناً نوکری زندگی سے اہم نہیں تھی۔ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا وہ دروازے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی ڈرائیور کار اندر لے گیا۔ سیمنٹ کے پختہ رستے کے اختتام پر جونہی ڈرائیور نے کار روکی کبیر دادا باہر نکلا اور اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت اس کے چاروں محافظ بھی گاڑی سے باہر نکل کر اس کے پیچھے ہو لیے تھے۔ کبیر دادا کی رفتار دیکھتے ہوئے انھیں بھاگنا پڑ گیا تھا۔ ڈرائینگ روم میں گھستے ہی انھیں اخلاق حسین کی خواب کے سامنے دو محافظ کھڑے نظر آئے۔ کبیر دادا کو دیکھتے ہی وہ چونکے اگلے ہی لمحے انھوں نے جیبوں سے خوفناک شکل والے پستول نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔

ان کے پستولوں کی پروا کیے بغیر کبیر دادا ان کی طرف بڑھتا گیا۔ کبیر دادا خالی ہاتھ تھا اور وہ دونوں مسلح مگر اس کے باوجود ان کے چہروں پر چھایا خوف نمایاں نظر آ رہا تھا۔

”کبیر دادا!..... شاہ صاحب آرام کر رہے ہیں اور.....“ ایک محافظ اسے رکنے کی دھمکی دینے کے بجائے وضاحت پیش کرنے لگا تھا۔ لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کبیر دادا کا ہاتھ گھوما۔ کنپٹی پر لگنے والے ہتھوڑے نما مکے سے وہ اچھل کر خواب گاہ کے دروازے سے ٹکرایا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”تم بھی آرام کرو۔“ اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے دوسرے محافظ کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے پر دستک دینے کے بجائے کبیر دادا نے زوردار لات رسید کی۔ دروازہ کافی مضبوط تھا اس لیے

صرف کھڑ کھڑا کر رہ گیا تھا۔

کبیر دادا نے ایک طرف ہوتے ہوئے اپنے محافظوں کو اشارہ کیا۔ امتیاز اور بخش دوڑتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچے اور اپنے کندھوں کی ضرب سے دروازے کا لاک توڑ دیا۔

کبیر دادا فوراً اندر گھسا، اخلاق حسین صوفے پر بیٹھا تھا۔ سامنے پڑی شیشے کی میز پر ادھ بھری بوتل دھری تھی۔ نفیس گلاس ہاتھ میں تھامے وہ سنہری سیال کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی اس نے مطلق پروا نہیں کی تھی۔

''لڑکی کہاں ہے؟'' کبیر دادا کسی تمہید کے بغیر براہ راست مقصد کی گفتگو پر آ گیا تھا۔

اخلاق حسین نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''لڑکی یا تمھاری دلھن۔''

''جو سمجھو، مگر وہ ہے کہاں؟''

اخلاق حسین منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تمھاری بیوی کے بارے مجھے کیا معلوم۔''

یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھے کہ بجلی چمکنے کی طرح کبیر دادا اپنی جگہ پر اچھلا، اس کے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اخلاق حسین کی چھاتی پر لگی اور وہ صوفے سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے گریبان سے پکڑتے ہوئے کبیر دادا نے اوپر اٹھا لیا تھا۔

''شاید تمھیں بھول گیا ہے کہ کسے مخاطب ہو۔''

''کبیر دادا!..... اس کا نتیجہ تمھیں بھگتنا پڑے گا۔'' اخلاق حسین کے گلے خرخراتی ہوئی آواز نکلی۔

''اگر تم زندہ بچ گئے تو.....'' کبیر دادا نے اسے زمین پر پٹختے ہوئے جیب سے پستول نکالا۔

''تم اپنے حواس کھو چکے ہو، ایک لڑکی کے لیے تم میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو؟'' اخلاق حسین کے لہجے میں پہلی بار خوف جھلکا تھا۔

''میرے تین تک گننے سے پہلے تم اس کے بارے زبان کھول کر اپنی زندگی کو طول دے سکتے ہو۔ ایک.....'' اس کی بات کا جواب دیے بغیر کبیر دادا نے دھمکی دیتے ہوئے گنتی شروع کر دی تھی۔

اس کے تین کہنے سے پہلے اخلاق حسین جلدی سے بولا۔ ''وہ خاور شیخ کے پاس ہے۔''

''کہاں رہتا ہے وہ؟'' کبیر دادا نے میکانکی انداز میں اگلا سوال پوچھا۔

اخلاق حسین سرعت سے اس کا پتا دہرانے لگا۔ کبیر دادا کی آنکھوں سے ہویدا دیوانگی نے اسے ڈرا دیا تھا۔

''دعا کرنا خاور شیخ نے اسے کچھ نہ کہا ہو اور صرف اسی صورت میں تم زندہ رہ پاؤ گے۔'' یہ کہتے ہی کبیر دادا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس کے محافظ اخلاق حسین کی خواب گاہ کے دروازے ہی پر رک گئے تھے۔ لیکن اندر داخل نہ ہونے کے باوجود انھوں نے سارا منظر دیکھ لیا تھا۔

کار میں بیٹھتے ہی اس نے ڈرائیور کو خاور شیخ کی کوٹھی کا پتا بتایا اور ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

خاور شیخ اخلاق حسین کا دست راست اور دلاور شیخ کا بڑا بھائی تھا۔ یقیناً تناوش کو اغوا کرنا اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے تھا۔

''عظیم!..... خاور شیخ کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔'' اس نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اپنے ذاتی سیکرٹری سے پوچھا۔ ایسے معاملات میں وہ بہت باخبر رہتا تھا۔

''خاور شیخ، دلاور شیخ کا بھائی اور اخلاق حسین شاہ کا خاص بندہ ہے۔ دونوں بھائی اخلاق حسین کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کا والد عبداللہ شیخ ایک شریف آدمی ہے اور اپنے دونوں بیٹوں کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے اس نے انھیں گھر سے نکال دیا ہے۔ ان کی تین بہنیں ہیں۔ دو کی شادی ہو چکی ہے اور ایک یونیورسٹی میں جاتی ہے۔ تینوں بہنیں بھی نہایت شریف اور گھریلو لڑکیاں ہیں۔ اگر یہ کبھی گھر جاتے بھی ہیں تو والد فوراً گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اسے ان کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔ ماں اور بہنیں البتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان سے رشتہ رکھے ہوئے ہیں۔ خاور شیخ لڑائی بھڑائی کا کافی ماہر ہے۔ نہایت ہی چالاک اور خطرناک شخص ہے۔ اخلاق حسین شاہ کے سارے غیر قانونی دھندوں کا نگران یہی ہے۔''

''ہونہہ!'' کر کے کبیر دادا نے گہرا سانس خارج کیا اور کلائی پر بندھی سنہری ڈائل کی گھڑی پر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کی بے چینی ڈرائیور کی نظروں سے بھی اوجھل نہیں تھی۔ وہ حتی الوسع کار کو اڑائے جا رہا تھا۔

تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ پندرہ منٹ میں خاور شیخ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ کار کے ہارن پر

چوکیدار ذیلی کھڑکی کھول کر باہر نکلا، اس نے کندھے سے رائفل لٹکائی ہوئی تھی۔ اسے تعارف کرا کر دروازہ کھلوانے کا تکلف کیے بغیر کبیر دادا نیچے اترا۔ وہ پہلی مرتبہ وہاں آیا تھا۔ چوکیدار اسے پہچانتا نہیں تھا، لیکن اس کی قیمتی کار دیکھ کر چوکیدار کے لیے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

اس نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ ”جی سر!..... کس سے ملنا ہے؟“

سوال و جواب میں خود کو الجھائے بغیر کبیر دادا کا ہاتھ گھوما، کنپٹی پر لگنے والا ہتھوڑا نما مکا چوکیدار کو استفسار کی دنیا سے بہت دور لے گیا تھا۔ کبیر دادا اس کا انجام دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا۔ یا پھر اسے اپنے مکے کی طاقت پر مکمل بھروسا تھا۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے جیب سے خوفناک شکل کا سائیلنسر لگا پستول نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ کوٹھی کا صحن عبور کر کے وہ اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔ چاروں محافظ اس کے عقب میں چوکنا انداز میں چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں کسی پھرکی کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہی اسے ایک کمرے کے سامنے دو ہتھیار بردار آدمی کھڑے نظر آئے۔ کبیر دادا کو دیکھتے ہی ان کے چہروں خوف ابھرا، کبیر دادا کی شخصیت ان کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

خوفزدہ ہونے کے باوجود انھوں نے کندھوں سے لٹکائے ہتھیار ہاتھ میں تھام کر سیدھے کرنا چاہے۔ لیکن انھیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ یوں بھی کبیر دادا ان کی گیدڑ بھبکیاں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تناوش کا کسی دوسرے مرد کے ساتھ بند کمرے میں ہونا اس کے سینے میں عجیب قسم کی آگ کو بھڑکائے جا رہا تھا۔ ایک ایسی آگ جو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح جلانے پر تلی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے ہاتھوں میں موجود پستول نے مسلسل تین چار دفعہ آگ اُگلی اور خاور شیخ کے دونوں محافظ اپنی چھاتیوں میں سرخ روشندان کھولے نیچے گر کر تڑپنے لگے۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی کبیر دادا نے زوردار لات رسید کی۔ دروازے کا تالہ ٹوٹ کر دونوں پٹ کھل گئے تھے۔ پستول ہاتھ میں تھامے وہ بے دھڑک اندر گھس گیا۔ اس کا دل عجیب خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چاروں محافظ بھی اس کے پیچھے اندر گھستے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

خاور شیخ نے اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کمرے سے باہر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ رک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اور پھر اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی دروازے کے پٹ ایک دھماکے سے کھلے اور کبیر دادا ہاتھ میں پستول لیے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر چھائی وحشت دیکھ کر خاور شیخ لرز کر رہ گیا تھا۔ ایک دم اسے لگا کہ وہ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا ہے۔ اس کی ساری شوخی اور مستی ایک منٹ میں ہوا ہو گئی تھی۔

''کک..... کبیر دادا!..... ایک منٹ میں وضاحت کر سکتا ہوں۔'' دفاعی انداز میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے وہ ہکلایا۔

''کرو۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے کبیر دادا نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔ تناوش کو باخیریت دیکھ کر اس کے دل میں جلتی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا تھا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب فوراً ہی پرسکون ہو گئے تھے

''مجھے شاہ جی نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔'' خاور شیخ نے یوں کہا جیسے اخلاق حسین کا نام ہی وضاحت کے لیے کافی ہو۔

''کیا تمھیں معلوم تھا کہ اس لڑکی کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔'' کبیر دادا کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ بھی خاور شیخ کے دل کی دھڑکن کو بڑھائے جا رہا تھا۔ یوں بھی کبیر دادا کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ زیر زمین دنیا میں اس کا نام ہیبت و دہشت کی علامت تھا۔ جس کام میں اس کے ملوث ہونے کا شبہ بھی ہوتا باقی لوگ اس کام سے یوں دور بھاگتے جیسے موت سے بھاگا جاتا ہے۔

''جج..... جی..... مم..... مگر.....'' کبیر دادا کے بھرپور تھپڑ نے اس کی ہکلاتی ہوئی زبان کو لگام دے دی تھی۔ وہ پہلو کے بل زمین پر گر گیا۔ البتہ فرش پر بچھے دبیز قالین کی وجہ سے وہ نیچے گرنے کی چوٹ لگنے سے محفوظ رہا تھا۔

اٹھتے ہوئے اس نے ہونٹوں سے رستا خون ایک جانب تھوکا اور محتاط لہجے میں بولا۔ ''کبیر دادا!..... آپ زیادتی کر رہے ہیں۔''

''ہاں..... مگر یہ زیادتی کی ابتداء ہے اور گلے شکوے اختتام پر کرنا اگر کچھ بولنے کے قابل رہے تو

۔" پرسکون انداز میں کہتے ہوئے کبیر دادا اس کی جانب بڑھا۔ خاور شیخ کو معلوم تھا کہ وہ کبیر دادا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور پھر کبیر دادا کے چار مسلح محافظ سونے پر سہاگا تھے۔ اس نے فوراً جان بچانے کی تجویز سوچی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی تناوش کو پکڑ کر ایک ہاتھ اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے اسے اپنے سامنے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"کبیر دادا!..... اگر کوئی میرے قریب آیا تو یہ جان سے جائے گی۔"

"یہ تو ویسے بھی اپنے سانس پورے کروا چکی ہے، تمہارا کیا خیال ہے اتنی دیر تمہارے ساتھ ایک کمرے میں بند رہنے کے بعد یہ میرے کسی کام کی رہ گئی ہے۔"

"قق..... قس..... قسم کھاتا ہوں، میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" خاور شیخ ہکلا کر صفائیاں دینے لگا۔

"مجھے تمہاری گواہی کی ضرورت نہیں۔ اور تمہاری زندگی ختم کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ تم نے میری چیز کو چھونے کی کوشش کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے بھی کبیر دادا کے قدم رکے نہیں تھے۔

خاور شیخ بھی مسلسل الٹے قدم لیتے ہوئے پیچھے کو ہٹ رہا تھا۔ تناوش کا خوفزدہ چہرہ اب پرسکون ہو گیا تھا۔ کبیر دادا کی موجودگی میں ہر خوف اور ڈر اس کے دل سے رخصت ہو جایا کرتا تھا۔ اپنے متعلق کبیر دادا کی تلخ باتیں بھی اسے خفا نہیں کرسکی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت کبیر دادا کے چہرے پر چھائے وحشت بھرے اثرات اسے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھے کہ وہ کتنا پریشان تھا۔ اور پھر تناوش کو خیریت سے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر جھلکنے والا سکون بھی اس بات کا مظہر تھا کہ وہ اسے کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا بیزاری اور بے توجہی ظاہر کرنا یقیناً خود کو تسلی دینے کے لیے تھا۔

جونہی خاور شیخ کی پیٹھ عقبی دیوار سے ٹکرائی وہ دھمکی امیز لہجے میں بولا۔ "کبیر دادا!..... میں سچ کہہ رہا ہوں اگر آپ نہ رکے تو میں اس لڑکی کی گردن توڑ دوں گا۔ اگر مجھے مرنا ہے تو زندہ یہ بھی نہیں رہے گی۔"

کبیر دادا ڈیڑھ دو گز دور رکتے ہوئے بولا۔ "خاور شیخ!..... اگر اس لڑکی کو کچھ بھی ہوا تو اس کی جگہ رات گزارنے کے لیے عبداللہ شیخ کی یونیورسٹی میں پڑھنے والی بیٹی کو لینا پڑے گی۔ اب یہ نہ کہنا کہ تم اس لڑکی کو نہیں جانتے۔ آخر بہن ہے وہ تمہاری۔"

''تت.....تم.....تم.....میں تمھیں جان سے ماردوں گا۔'' ہذیانی انداز میں کہتے ہوئے اس نے تناوش کو ایک جانب دھکیلا اور چیختے ہوئے کبیر دادا پر حملہ کر دیا۔

اپنے سر کو چند انچ حرکت دے کر کبیر دادا نے اس کا مکا خطا کیا اور اس سے پہلے کہ خاور شیخ کا ہاتھ واپس پہنچتا کبیر دادا نے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ اس نے بایاں ہاتھ خاور شیخ کی کہنی پر اس انداز میں رسید کیا کہ ''کٹاک'' کی آواز کے ساتھ اس کی کہنی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ برآمد ہوئی۔ کبیر دادا کی کارروائی رکی نہیں تھی۔ اس نے خاور کا دوسرا بازو پکڑ کر مروڑا، چیختے ہوئے وہ بے ساختہ الٹا گھوم گیا تھا۔ کبیر دادا نے ایک پاؤں اٹھا کر خاور شیخ کی کمر پر رکھا۔ اپنے پاؤں سے اسے آگے دھکیلتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے مروڑے ہوئے بازو کو پیچھے کھینچا۔ دوسری مرتبہ ''کٹاک۔'' کی آواز گونجی۔ خاور شیخ کے کندھے کا جوڑ بھی نکل گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے دلخراش چیخ بلند ہوئی وہ گھٹنوں کے بل نیچے گرا اس کا جسم رعشے کے مریض کی طرح کانپنے لگ گیا تھا۔

کبیر دادا اس کی طرف بڑھا۔ وہ خوفزدہ اور سہمی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گڑگڑایا۔

''مم..... مجھے معاف کر دو کبیر دادا!..... آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

اس کی گڑگڑانے اور تڑپنے سے بے پروا کبیر دادا نے قریب پہنچ کر ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے اور دوسرا سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں غلطی دہرانے کا موقع نہیں دیا کرتا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ ''کٹاک۔'' کی ایک اور آواز بلند ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ خاور شیخ چیخ نہیں پایا تھا۔ اوندھے منہ دبیز قالین پر گرتے ہوئے وہ ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔ وہ ایک معصوم اور بے بس لڑکی کی چیخیں سننے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا، حوا کی بیٹی کو اذیت دے کر وہ خود محظوظ کرنے کا سوچے ہوئے تھا اور تقدیر اس ظالم پر خندہ زن تھی۔

کبیر دادا، تناوش کی طرف مڑا۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آئی اور یوں وارفتگی سے لپٹی گویا برسوں کی شناسا ہی تو ہو۔ ''اتنی دیر لگا دی۔'' اس نے لاڈ بھرے انداز میں شکوہ کیا تھا۔

کبیر دادا کے چاروں محافظ یہ منظر دیکھتے ہی فوراً کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اس کے یوں بے ساختگی سے لپٹنے پر کبیر دادا ششدر رہ گیا تھا۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تناوش اس بے باکی کا مظاہرہ کرے گی۔اس نے تناوش کی جسارت پر غصہ کرنے کا سوچا اسے جھڑکنے کا ارادہ کیا ،مگر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔تناوش کے ملائم اور نرم ونازک وجود نے اسے سن کر دیا تھا۔تناوش کے بدن کی خوشبو اس کے حواس کو مختل کرنے لگی تھی۔کافی کوشش کر کے اس نے اپنی زبان کو بولنے پر آمادہ کیا۔

''تمھیں یوں کسی کے ساتھ نہیں چلے جانا چاہیے تھا۔''

''مجھے اگر ذرا بھی امید ہوتی کہ آپ خود مجھے لینے آئیں گے تو شاید قیامت تک انتظار میں بیٹھی رہتی۔اور پھر مجھے یہ بھی گمان تھا کہ آپ کی بیوی کی طرف کوئی غلیظ ہاتھ نہیں بڑھا پائے گا۔''

اس کے موخر الذکر فقرے پر کبیر دادا کو سبکی کا احساس ہوا۔اسے بہ مشکل خود سے علاحدہ کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔''میرا بھی یہی گمان ہے،مگر کچھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات اتنی جلدی نہیں آتی اور میرا سمجھانے کا طریقہ ایسا ہے کہ وہ سمجھ تو جاتے ہیں مگر مستقبل میں اس پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہتے۔''

تناوش کھل کھلا کر ہنسی۔''اب مجھے بھی اس طریقے سے سمجھانا نہ شروع کر دینا۔''

کبیر دادا نے بے ساختہ امڈ پڑنے والی مسکراہٹ کو ہونٹ بھینچ کر روکا اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔''چلنا چاہیے۔''

''ہاں چلیں،مگر یاد رہے اتفاق سے آپ نے میرا چہرہ تو دیکھ لیا ہے۔منہ دکھائی معاف نہیں کروں گی۔''

''نکاح پڑھوانے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں تمھارے چونچلے اٹھانا شروع کر دوں۔اپنی حیثیت پہچان کر بات کیا کرو۔''خشک لہجے میں کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف چل دیا۔

تناوش کے ہونٹوں سے خوشی بھری مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔اپنی حیثیت اسے یاد تھی۔اس نے خود کبیر دادا کو یہی دعوت دی تھی کہ وہ صرف نکاح پڑھوا لے اس بعد وہ بے شک اسے رکھیل سمجھ کر رکھے اور رکھیل ہی سا سلوک کرے۔اس وقت کبیر دادا نے اس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ اپنی باتوں سے پھرے گی تو نہیں؟اور اس نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تھا کہ وہ اپنے کہے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے گی۔

اس وعدے وعید کے بعد تناوش کا ایک بیوی کے حقوق کے لیے اصرار کرنا کسی طرح بھی نہیں جچتا تھا۔ یوں بھی کبیر دادا کے چہرے پر اپنے لیے پریشانی دیکھ کر اس نے امید کا دامن دراز کیا تھا۔ لیکن کبیر دادا نے اسے یہ باور کرانے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں تھی کہ اس کا پریشانی ظاہر کرنا اس کی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی عیاشی کی وجہ سے تھا۔ وہ تناوش کو اپنی ملکیت سمجھ رہا تھا اور عورت چاہے بیوی ہو یا رکھیل اس میں حصے دار بنانا مرد کی فطرت میں شامل نہیں۔ تناوش اس کی ملکیت تھی اور اپنی ملکیت پر وہ کیسے کسی دوسرے کا تصرف برداشت کر سکتا تھا

ایک محافظ نے کبیر دادا کے لیے عقبی دروازہ کھولا ہوا تھا۔ اس کے بیٹھنے تک تناوش دوسری جانب سے گھوم کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

راستے میں کبیر دادا سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔ تناوش نے بھی کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبیر دادا کی تلخ بات اسے ابھی تک ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ لیکن گھر پہنچنے تک وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ فی الحال کبیر دادا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن کوشش سے وہ اس کے دل جگہ بنا سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل کبیر دادا کے دل میں جگہ بنانے کا خواہاں تھا۔ وہ اس سے علاحدہ ہونے پر خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی کبیر دادا نیچے اتر کر تیز قدموں سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش ایک مرتبہ پہلے وہاں آ چکی تھی۔ اسے خواب گاہ کا راستہ معلوم تھا۔ اور کسی سے رہنمائی لیے بغیر وہ آسانی سے وہاں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے باوجود کبیر دادا کی حرکت پر وہ دل مسوس کر کے رہ گئی تھی۔ نئی نویلی دلھن کا اتنا تو حق بنتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ چلا کر لے جایا جاتا۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے عظیم کو دیکھ کر بھی وہ مسکرا نہیں سکی تھی۔ حالانکہ گزشتہ روز اسے دیکھتے ہوئے وہ ہنسی نہیں روک پا رہی تھی۔ کہ تناوش کی وجہ سے اسے کبیر دادا کے بھرپور تھپڑ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب شاید عظیم کے ہنسنے کی باری تھی۔ بجھے دل سے کار سے اتر کر وہ بوجھل قدموں سے خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

خواب گاہ میں گھستے ہی اسے کبیر دادا منقش دروازے والی ایک الماری کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ الماری سے کوئی چیز نکال کر وہ پیچھے مڑا۔ اس کے ہاتھ میں سنہری سیال والی دو بوتلیں دیکھتے ہی تناوش سمجھ گئی تھی وہ کس غلیظ مشروب سے شغل شروع کرنے والا ہے۔ لیکن وہ جیسا بھی تھا اب اس کا شوہر تھا۔ اور وہ جن حالات میں وہاں

پہنچی تھی اس کے بعد اپنے شوہر کی کسی بات پر ناک بھوں چڑھانا مناسب نہیں تھا۔ وہ خود ہی تمام کشتیاں جلانے پر آمادہ ہوئی تھی۔ نکاح سے پہلے ہی اس نے اپنے تمام حقوق کبیر دادا کو معاف کر دیے تھے تو اب کوئی واویلا کرنا اسے جچتا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کبیر دادا کے نزدیک اس کی اہمیت ایک لذیز پکوان جتنی ہی تھی کہ پیٹ بھرنے کے بعد جسے نظر بھر دیکھا بھی نہیں جاتا۔

کبیر دادا نے صوفے پر بیٹھ کر شیشے کا نفیس گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ سبک قدموں سے چلتی ہوئی جہازی سائز کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پر تعیش خواب گاہ کا جائزہ لینے لگی۔ فرش پر گہرے بھورے رنگ کا دبیز قالین بچھا تھا۔ جہازی سائز بیڈ کے پاؤں کی طرف کی دیوار پر ایک بڑی ایل ای ڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار میں ڈریسنگ روم اور آگے غسل خانے کا دروازہ تھا۔ دوسری دو دیواروں پر جنگل کے بادشاہ کی دو بڑی بڑی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ چھت میں خوب صورت سیلنگ کی گئی تھی اور ایک ترتیب سے دس بارہ انرجی سیور نصب تھے۔ ان کے جلنے سے خوب تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ کے دائیں جانب فائیو سیٹر صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ کے سامنے شیشے کی خوب صورت میز رکھی تھی جبکہ صوفے کے جوانب میں شیشے کی تپائیاں پڑی تھیں۔ چھت سے پنکھے لٹکے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بجائے ایک دیوار میں لگا ہوا اے سی اعلان کر رہا تھا کہ مکین کو پنکھوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کونے میں درمیانہ سا فریج بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے کو ایک نظر دیکھنے والا بھی آسانی سے اندازہ کر سکتا تھا کہ گھر کا مالک کتنا دولت مند ہے۔ اس خواب گاہ کو دیکھتے ہوئے تناوش کی نگاہوں میں اپنے گھر کے کمرے کا منظر ابھرا۔ بان کی چارپائی پر بچھی منقش چادر جو زیادہ دھلائی سے اپنے اصل رنگ گم کر چکی تھی۔ لکڑی کی ایک پرانی سی میز جس کا نہ ہونا، ہونے سے کئی گنا بہتر تھا۔ چھت سے لٹکتا ہوا پرانا پنکھا جو ہوا سے زیادہ آوازیں دیتا تھا۔ اور واپڈا کی مہربانی سے انھیں وہ آوازیں کم ہی سننے کو ملا کرتی تھیں۔ گرد و غبار ختم کرنے کے لیے اسے ہر دوسرے دن کچے فرش پر پوچا بھی پھیرنا پڑتا تھا۔

امارت اور غربت کا تضاد دکھانے کے لیے دو تصویریں کھینچی جاتیں تو اس کے لیے کبیر دادا کی خواب گاہ کے مقابل ان کا کمرہ غربت کی مکمل تصویر پیش کرتا تھا۔

”تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا۔“ یکے بعد دیگرے تین گلاس حلق میں انڈیل کر وہ چوتھے گلاس سے ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے تناوش کو مخاطب ہوا۔اس کے ایک دم پکارنے پر وہ ہڑبڑا گئی تھی۔”جی کون سا وعدہ؟“

”یہی کہ میں نکاح پڑھوالوں اور اس کے بعد تم کوئی مطالبہ پیش نہیں کرو گی۔ بلکہ رکھیل کی طرح میرے پاس رہو گی۔“

کبیر دادا کی طرف زخمی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔”بیوی اور رکھیل میں کیا فرق ہوتا ہے۔“

”میں نہیں جانتا کہ کیا فرق ہوتا ہے اور نہ جاننے کی خواہش ہے۔البتہ تم یہ جان لو کہ یہاں جتنے دن رہنا ہے اپنی حیثیت اور جگہ پہچان کر رہنا ہوگا۔آج میرے محافظوں کے سامنے تم پر رومانس کا جو بھوت سوار ہوا تھا آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ دیکھوں۔“

تناوش کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔اور اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔”یہ رومانس والی شرط کمرے سے باہر تک ہی محدود رہے گی یا کمرے میں بھی یہی قانون لاگو رہے گا۔“

کبیر دادا نے اسے غصے بھری نظروں سے گھورا، مگر وہ نگاہیں چرائے بغیر اس کی جانب متوجہ رہی۔

”یقیناً تم یہاں پر اپنا قیام مختصر کرنا چاہتی ہو۔“

وہ اطمینان سے بولی۔”بات طویل اور مختصر قیام کی نہیں ہے۔بس یہ یاد رہے کہ جتنے دن یہاں رکھو گے اپنے کسی کام سے منع کرنے کی کوشش نہ کرنا۔خواب گاہ سے باہر آپ مجھے رکھیل کا نام دیتے ہیں، داشتہ کہہ کر میرا تعارف کراتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ کسی غلیظ لقب سے پکارتے ہیں۔اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔میں اس خواب گاہ میں اپنا تصرف چاہتی ہوں اور یہاں مجھے بیوی کے حقوق میسر رہنے چاہئیں اور بس۔“

”تم اس قسم کی کوئی شرط منوانے کی مجاز نہیں ہو۔“

”یہ شرط نہیں میرا حق ہے۔یقیناً ایک رکھیل اتنا حق تو رکھتی ہے کہ ایک کمرہ اس کے تصرف میں رہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی۔”اب رات کافی ہوگئی ہے میرا خیال ہے آرام کرنا چاہیے۔“اس کے سامنے قالین پر بیٹھ کر وہ اس کے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہو۔“اس نے اپنے پاؤں پیچھے سمیٹنا چاہے۔

اس کے دونوں پاؤں پر اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے وہ بولی۔ ”کہا ہے نا، مجھے اپنے کسی کام سے روکنے کی کوشش مت کرنا، یہاں جتنے دن رہوں گی آپ کو یہ سب برداشت کرنا پڑے گا یوں بھی یہاں پر آپ کا کوئی محافظ نہیں دیکھ رہا۔“

کبیر دادا صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔ ”بے وقوف لڑکی!.....ایسی کوششوں سے تمھیں کچھ نہیں ملنے والا۔“

”میرا نام تناوش کبیر ہے۔ اگر آپ پیار سے چندا، گڑیا، جانو وغیرہ کہہ کر بلانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، مگر یہ لڑکی وغیرہ بالکل نہیں چلے گا۔“ شوخی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے بوٹ اتارنے لگی۔ کبیر دادا افسوس بھرے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ وہ الٹی کھوپڑی کی لڑکی نہ تو اس کے غصے کو خاطر میں لا رہی تھی اور نہ اس کے سمجھانے کا کوئی اثر ہو رہا تھا۔ اب اس کا ایک ہی حل کبیر دادا کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جلد از جلد اسے طلاق دے کر رخصت کر دیتا۔

اس کی جرابیں اتارتے ہوئے تناوش نے منہ بنایا۔ ”شاید ہفتہ بھر سے یہ جرابیں پہنی ہوئی ہیں۔“

”اگر پسینے کی بو اتنی ہی بری لگ رہی ہے تو میری جرابوں کو ہاتھ نہ لگاتیں، کسی نے منت تو نہیں کی تھی۔“ کبیر کا لہجہ خفگی کا عنصر لیے ہوئے تھا۔

وہ وارفتگی سے بولی۔ ”ایسا میں نے کب کہا کہ آپ کے پسینے کی بو مجھے بری لگتی ہے۔ میں نے تو فقط جرابوں کے میلا ہونے کی نشان دہی کی ہے۔ بات کو غلط سمت موڑنے کی کوشش نہ کریں سمجھے۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے بوٹ اور جرابیں اٹھا کر ریک کی طرف بڑھ گئی۔ جوتوں کو ریک میں رکھ کر اس نے بیڈ کے ساتھ پڑی ہوائی چپل اٹھائی اور اس کے پاؤں کے پاس لا کر رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ صوفے پر بیٹھ کر اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگی۔ کبیر دادا کو اس قسم کی خدمتیں لینے کی عادت نہیں تھی لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ٹائی اس کے گلے سے نکال کر تناوش اس کی قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔

کبیر نے منہ بنایا۔ ”یہ بٹن میں ڈریسنگ روم میں جا کر بھی کھول سکتا ہوں۔“

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ”ہاں، مگر اس پر وقت صرف ہوگا۔ اور جب میرے جیسی پیاری بیوی موجود ہو تو

آپ کو یہ سب کرنے کیا ضرورت ہے۔"

اس کی قمیص کے بٹن کھول کر تناوش نے اس کے ہاتھ سے گلاس لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"بس کریں اتنا اچھا مشروب بھی نہیں ہے کہ آپ دو بوتلیں معدے میں انڈیل لیں۔"

اس مرتبہ کبیر دادا اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ایک ہاتھ سے تناوش کا بازو پکڑ کر اسے دھکا دے کر دور پھینکتے ہوئے وہ بولا۔"تم حد سے بڑھ رہی ہو۔"

دبیز قالین کی وجہ سے تناوش کو چوٹ تو نہیں لگی، البتہ توہین کے احساس سے اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں خفت یا شرمندگی کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔"اچھا آپ جلدی جلدی یہ گلاس خالی کریں میں سلیپنگ سوٹ لے کر آتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

کبیر دادا اسے حیرانی بھری نظروں سے گھورتا رہ گیا تھا۔اپنے رویے پر اس کے دل میں ہلکی سی ندامت ابھری تھی مگر وہ ندامت دل ہی دل میں مقید رہی اس کا اثر اس نے چہرے پر نہیں آنے دیا تھا۔

وہ ڈھونڈ کر اس کا سلیپنگ سوٹ لے آئی۔

"اب میں یہیں لباس تبدیل کرنا شروع کر دوں۔" کبیر دادا نے بہ ظاہر طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا۔

وہ بے باکی سے بولی۔"تو یہاں میرے علاوہ اور کون موجود ہے جس سے آپ کو شرمانے کی ضرورت پڑے اور میں تو آپ کی بیوی ہوں نا، میرا مطلب جب تک یہاں ہوں۔"

"تمھاری کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔" اس کے ہاتھ سے سلیپنگ سوٹ جھپٹ کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔اس کے لڑکھڑاتے قدم اعلان کر رہے تھے کہ وہ کافی شراب اپنے معدے میں انڈیل چکا ہے۔

اس کے باہر نکلنے پر تناوش اندر گھس گئی۔اپنا اتارا ہوا سوٹ اس نے نیچے قالین ہی پر پھینک دیا تھا۔شاید ایسا اس نے تناوش کے خدمت پر بہ ضد ہونے کی وجہ سے کیا تھا یا اس کی عادت ہی یہی تھی۔

سوٹ کو ہینگر میں ڈال کر اس نے الماری میں لٹکایا اور باہر نکل آئی۔شراب کی دونوں خالی بوتلیں اٹھا کر اس نے کچرہ دان میں ڈالیں اور گلاس اٹھا کر دھونے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ پہلی رات کی دلھن ہے۔

کبیر دادا بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ گلاس کو میز پر رکھ کر وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''صبح کس وقت جاگتے ہیں؟''

''تمھیں فکر کی ضرورت نہیں ملازمہ کو میرے سونے جاگنے کے اوقات معلوم ہیں۔''

''چھے بجے جگا دوں؟'' اس کی بیزاری کو نظر انداز کرتے ہوئے تناوش نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دس بجے سے ایک منٹ پہلے ہلایا تو گردن دبا دوں گا۔''

تناوش کھل کھلا کر ہنسی۔ ''یہی بات آپ شرافت سے پہلے ہی بتا دیتے۔ خیر ناشتے میں کیا لیں گے۔''

اس کی مترنم ہنسی کبیر دادا کو بہت بھلی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی دلی کیفیات پر بیزاری کا پردہ ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جو ناشتا بناتا ہے اسے سب معلوم ہے۔ تمھیں باورچن بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کہہ دیا ہے نا، جب تک میں یہاں ہوں اپنے سارے خدمت گاروں کو بھول جائیں، آپ کے سبھی کام کرنے کا حق صرف اور صرف مجھے ہے۔ البتہ آپ کو بتانے میں ہرج ہو رہا ہے تو کوئی بات نہیں صبح ملازمہ سے پوچھ لوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

وہ اسے منع کیے بغیر خشک لہجے میں گویا ہوا۔ ''جانتی ہو تمھاری ساری کوششیں بے کار اور بے فائدہ ہیں۔ فضول میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہی ہو۔ تمھاری یہاں آمد کا مقصد مجھے بھی معلوم ہے، تمھیں بھی بھولا نہیں ہوگا۔ اور اگر یاد نہیں ہے تو یاد دہانی کرا دیتا ہوں کہ تم خوب صورت، پرکشش اور جاذب نظر جسم کی مالک ہو اس لیے کبیر دادا کی خواب گاہ میں نظر آ رہی ہو۔ اس کا یہ مطلب بھی نہ لینا کہ کبیر دادا کو خوب صورت لڑکیوں کی کمی ہے۔ تم نے خود آفر کی اور ترس کھاتے ہوئے میں نے منظور کر لی۔ اس لیے جو تین دن یہاں گزارنے ہیں آرام سے گزارو۔ اس کے بعد تمھیں آزاد کر دوں گا۔''

تناوش کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔ ''یہ ساری باتیں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی وجہ سے مجھے کس عذاب سے چھٹکارا نصیب ہوا۔ اور پھر میرے غریب خانے پر آپ نے بہ ذات خود آ کر جو میرا مان بڑھایا ہے اس احسان کا بدلہ تو میں کبھی نہیں چکا سکتی۔ باقی رہا آپ کی خدمت کرنے کا مسئلہ تو یہ آپ کو متاثر

کرنے کے لیے نہیں ہے ہر مشرقی بیوی اپنے شوہر کی خدمت خوش دلی سے کرتی ہے۔اس لیے میں جب تک یہاں ہوں آپ کے چاہنے نہ چاہنے کے باوجود خدمت کرتی رہوں گی۔اور جب علاحدہ کریں گے تو خاموشی سے گھر چلی جاؤں گی۔یہ سوچ کر کہ بس اب آپ کو میری ضرورت نہیں رہی۔"

"تمھیں سمجھانا ہی فضول ہے۔" کبیر دادا نے بیڈ سائیڈ پر لگا تیز روشنی کا بٹن بند کر کے زیرو بلب جلا دیا۔

☆.....☆.....☆

صبح نہا کر تناوش نے وہی کپڑے دوبارہ پہن لیے تھے کہ گھر سے وہ ایک جوڑا ہی لے کر آئی تھی۔خواب گاہ اور پھر ڈرائینگ روم میں جائے نماز ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ باہر لان میں نکل آئی۔نرم و ملائم گھاس پر نماز پڑھتے ہوئے اسے عجیب سی فرحت کا احساس ہوا تھا۔نماز پڑھ کر وہ کافی دیر ہاتھ اٹھائے اپنے رب سے ہم کلام رہی۔نہ جانے وہ اس بے نیاز داتا سے کیا کیا مانگتی رہی کہ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔دعا مانگ کر وہ ننگے پاؤں گھاس پر ٹہلنے لگی۔شیر کے مجسمے کے گرد اڑتا فواروں کا پانی بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔وہ فوارے کے گرد گھومتی رہی۔

داخلی دروازے پر دو مسلح چوکیدار موجود تھے۔جبکہ اندرونی عمارت کے دونوں کونوں پر بھی دو آدمی اپنے ہتھیار گود میں رکھ کر کرسی پر بیٹھے تھے۔تمام کی نظریں تناوش کی جانب ہی نگران تھیں۔اسے نماز پڑھتے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔

"دستگیر بھائی!.....یہ ملانی کبیر دادا کہاں سے پکڑ لایا ہے۔" ایک چوکیدار دبے لہجے میں دوسرے کو مخاطب ہوا۔

دستگیر نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔"جانتے ہو گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور جب مرد پر برا وقت آتا ہے تو وہ کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

"تمھارے کہنے کا مطلب ہے، کبیر دادا اس بالشت بھر کی چھوکری کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

دستگیر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"نیاز بھائی، کہنے والے تو یہی کہہ رہے ہیں۔"

"کون کہہ رہا ہے؟" نیاز مستفسر ہوا۔

”رات کو امتیاز کی زبانی جو تفصیل معلوم ہوئی ہے اس مطابق تو یہی لگتا ہے کہ کبیر دادا اس لڑکی پر بری طرح فریفتہ ہے۔اس لڑکی کی خاطر اس نے اخلاق حسین شاہ جیسے آدمی پر ہاتھ اٹھایا ہے اور شاہ جی کے خاص آدمی خاور شیخ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بلکہ کل عصر کے وقت اس نے خاور شیخ کے چھوٹے بھائی کو بھی اس لڑکی کے ہاتھوں مروا دیا۔امتیاز اس کا نام دلاور شیخ بتا رہا تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اس لڑکی کو آتے جاتے چھیڑتا تھا۔“

نیاز نے حیرانی سے پوچھا۔”اس نے ایک مرد کو قتل کیا ہے؟“

”ہاں، دلاور شیخ نے اس کے بھائی کو قتل کیا تھا اس نے ماں کے ساتھ مل کر بدلہ لے لیا اور دلاور شیخ تو اس لیے بھی چوں نہ کر سکا کہ وہاں کبیر دادا موجود تھا۔“

نیاز سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔”ویسے کبیر دادا کو یہ ملی کہاں پر ہے۔“

”دو دن پہلے دن کے چوکیدار رحمت خان کی ڈیوٹی میں آئی تھی۔خود کو کبیر دادا کی دوست بتا رہی تھی۔“

نیاز بولا۔”تعلق کے بعد ملنے آئی ہو گی نا؟.....میں پوچھ رہا ہوں کہ دونوں کی آنکھ کہاں لڑی ہے۔اور کیا اس بے وقوف کو معلوم نہیں کہ کبیر دادا کس بلا کا نام ہے۔“

”چھوڑو نیاز بھائی!.....خود ہی بھگتے گی۔کبیر دادا دو تین دن سے زیادہ کسی لڑکی کو قریب نہیں چھوڑتا۔یاد نہیں جلوہ جیسی اداکار کو اس نے تین چار دن بعد ٹھینگا دکھا دیا تھا یہ تو بے وقوف سی گھریلو لڑکی نظر آتی ہے۔یوں بھی کبیر دادا جیسے شرابی غنڈے کی قربت میں کسی نمازی روزہ دار کا کیا کام۔“

تناوش ان کی باتوں سے بے خبر گھاس پر ٹہلتی رہی۔ننگے پاؤں گھاس پر گھومنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔پہلے وہ کبھی کبھار اسکول کے لان میں گھاس پر ٹہل لیتی تھی۔مگر اسکول کی گھاس کے مقابلے یہ بہت اعلا قسم کی گھاس تھی۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ریشم پر چل رہی ہو۔

طلوع آفتاب کے وقت وہ چپل پہن کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔گھر میں وہ صبح سویرے ناشتے کی عادی تھی۔رات کی باسی روٹی توے پر گرم کر کے وہ چائے کے ساتھ کھا لیا کرتی۔اس کے بعد وہ کالج جانے کی تیاری میں لگ جاتی اور ماں اس کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگتی۔

اب اسے کالج تو نہیں جانا تھا مگر بھوک تو محسوس ہو رہی تھی۔ کچن کا دروازہ کھانے کے کمرے سے ملحق تھا۔ لمبی چوڑی کھانے کی میز کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس پر اکیلا کبیر دادا بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوگا۔

اس کے ذہن میں خیال آیا۔ ''شاید یہاں مہمانوں کی آمد رہتی ہے اور اس وجہ سے کبیر دادا کو اتنی بڑی میز لگوانا پڑی۔''

کھانے کے کمرے کی طرح باورچی خانہ بھی بہت بڑا تھا۔ ایک چھوڑ دو دو فریج وہاں موجود تھے۔

ملازمہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ کبیر دادا کے جاگنے کے اوقات سے واقف تھی۔ باقی ملازموں کے لیے یقیناً ملازموں کے کوارٹرز ہی میں ناشتا بنتا ہوگا۔ لان میں ٹہلتے ہوئے اسے کوٹھی کے عقبی جانب کوارٹر نما کمروں کی جھلک نظر آئی تھی۔ اور لازماً وہ ملازمین کی رہائش کی خاطر ہی استعمال ہوتے تھے۔

خانساماں کے جاگنے کا انتظار کیے بغیر وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔ ایک کونے میں بنے ہوئے سنک کے ساتھ کافی گندے برتن پڑے تھے۔ ایسے گندے برتن دیکھ کر اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ چولھے پر چائے کا پانی چڑھا کر وہ برتن دھونے لگی۔ برتن صاف کرنے کے ساتھ ساتھ وہ چائے بھی بنا چکی تھی۔ ابھی پراٹھا بنانے کے لیے وہ آٹا گوندنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''جی آپ کون؟''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''فی الحال تو اس گھر کی مالکن کہہ سکتی ہو۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اس گھر کی مالکن تو شاید کبھی پیدا نہ ہو، آپ کو شاید صاحب کی نشے میں کی گئی گفتگو سے کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔''

وہ فوراً صفائی دیتے ہوئے بولی۔ ''خالہ!..... آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کل میرا اور کبیر علی خان کا نکاح ہو چکا ہے۔ کیا آپ کو میرے کپڑوں سے اندازہ نہیں ہو رہا کہ میں پہلی رات کی دلھن ہوں۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''آپ کھانے کی میز پر تشریف رکھیں میں ناشتا لگا دیتی ہوں۔ باقی روزانہ نئے نکور اور قیمتی لباس والیاں ہی نظر آتی ہیں آج تک کوئی پھٹے پرانے لباس میں تو نظر آئی نہیں کہ آپ کو انوکھا سمجھوں۔''

تناوش کو سخت قسم کی توہین کا احساس ہو رہا تھا مگر جھگڑ تو نہیں سکتی تھی کہ وہ اسے کبیر دادا کی دلھن سمجھے۔ یوں

بھی ایک ملازمہ سے اس بات پر جھگڑنا کہ وہ اسے کبیر دادا کی بیوی سمجھے خاصا عجیب تھا۔ وہ چپکے سے باہر نکل آئی ۔تھوڑی دیر بعد ملازمہ اس کے لیے ناشتا لے آئی۔ جوس، سیب، ڈبل روٹی، جیم، مکھن، انڈے اور جانے کیا کیا لوازمات وہ ٹرالی میں بھر لائی تھی۔

ناشتا شروع کرنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ''خالہ!.....صاحب ناشتے میں کیا لیتے ہیں؟''

''وہ بھی یہی کچھ لیتے ہیں بی بی جی!.....بس مقدار کچھ زیادہ ہوتی ہے۔''

''شکریہ خالہ!.....آج سے ان کا ناشتا میں خود لے جایا کروں گی بس آپ میری رہنمائی کر دیا کرنا۔''

''کیا فائدہ بی بی جی!.....آج آپ نے یوں بھی واپس چلے جانا ہے۔''

وہ پرعزم لہجے میں بولی۔ ''میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔''

ملازمہ نے منہ بنایا۔ ''ہونہہ!.....یہاں آنے والی ہر دوسری لڑکی یہی کہتی ہے۔''

''آئندہ بولتے وقت کچھ سوچنے کی زحمت کر لینا۔ میں کوئی بازاری لڑکی نہیں، کبیر علی خان کی بیوی ہوں۔''

''بی بی جی!.....آپ تو خفا ہونے لگیں میرا مطلب یہ تھا کہ.....''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔ ''چھوڑیں مطلب کو اور جائیں باورچی خانے کی صفائی کر لیں۔ آج تو گندے برتن میں نے دھو لیے تھے، لیکن اس کے بعد مجھے باورچی خانے میں گندا برتن نظر نہیں آنا چاہیے۔''

''خواہ مخواہ رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں بی بی جی!.....میں صاحب کی ملازمہ ہوں آپ کی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ''ایک رات کے لیے آتی ہیں اور مالکن کی طرح حکم جمانے لگ جاتی ہیں۔''

اس کی بلند خود کلامی تناوش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ مگر اسے برداشت کرنا پڑا۔ گو وہ ایک رات والی نہیں تھی اور نہ اس کا کبیر سے تعلق شریعت کے دائرے سے باہر تھا مگر حقیقت تو یہی تھی کہ اس کا قیام بھی عارضی ہی تھا۔ سر جھٹک کر وہ تلخ سوچوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ناشتا کرتے ہوئے بھی اس کی سوچیں اسی مسئلہ میں سرگرداں رہیں۔ کبیر دادا کو جسم و جاں کا مالک ماننے کے بعد وہ اس سے

دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہی تھی کہ کبیر دادا صرف اسی کا بن کر رہ جاتا۔ مگر یہ بیل کسی طرح منڈھے چڑھتے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ اتنا وہ جانتی تھی کہ کوشش کرنے والے ہی حصول کی لذت چکھتے ہیں جبکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والے بس مقدر کو کوستے رہتے ہیں۔ دلاور شیخ سے جان چھڑانے کے لیے اگر وہ ہاتھ پیر نہ ہلاتی تو کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پاتی۔ اب کبیر دادا کے معاملے میں بھی وہ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

ناشتا کر کے وہ کافی دیر وہیں بیٹھی رہی یہاں تک کہ ملازمہ برتن سمیٹنے پہنچ گئی۔ تناوش کے دماغ سے اب تک اس کی تلخ بات محو نہیں ہوئی تھی۔

''خالہ!..... بات سنو۔'' وہ جونہی برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف مڑی تناوش بول پڑی۔

''جی بی بی!'' وہ رک گئی۔

''میں آج کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کو تنبیہ کر رہی ہوں کہ اس کے بعد اگر مجھے موقع دیا یا کوئی ایسی ویسی بات کی تو نوکری سے فارغ کروا دوں گی۔''

''اس کے علاوہ آپ کر بھی کیا کر سکتی ہیں۔ اگر ایک غریب کی روزی پر لات مار کر آپ کو خوشی ملتی ہے تو آج ہی فارغ کرا دیں بی بی جی!''

''غریب کو بولنے کی تمیز بھی تو ہونا چاہیے۔'' وہ مزید برہم ہونے لگی۔

''چلیں کچھ دن رہ گئیں تو آپ سے تمیز بھی سیکھ لوں گی۔'' عام سے لہجے میں اس پر چوٹ کرتے ہوئے وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے دماغ کی سوئی بس اسی بات پر اٹکی تھی کہ وہاں تناوش کا قیام ایک دو دن سے زیادہ نہیں ہونا تھا۔ کبھی کبھی تو خود تناوش کو بھی یہی لگنے لگتا کہ وہ بس ایک دو دن کی مہمان ہے، مگر پھر اس کے اندر ایک انجانا حوصلہ بیدار ہوتا جو اسے یقین دلاتا کہ کبیر دادا اسے کسی صورت بھی طلاق نہیں دے گا۔

وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ بڑی سکرین کی ایل ای ڈی کو آن کر کے وہ دھیمی آواز میں خبریں سننے لگی۔ وہ کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھی رہی کیونکہ کبیر دادا نے دس بجے سے پہلے جگانے سے منع کیا تھا۔ اور اس سے پہلے اسے جگانے کی ہمت تناوش کو بھی نہیں ہو رہی تھی۔ دس بجے اسے ملازمہ خواب گاہ کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس

نے پلیٹ میں شیشے کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔

''خالہ کہاں جا رہی ہو۔'' اسے دروازے کے قریب روکتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

''صاحب کو جگانا تھا۔''

''گلاس میں کیا ہے؟''

''لیموں نچوڑے ہوئے ہیں۔ یہ کھٹا پانی ہی انھیں جگانے میں مدد دیتا ہے۔''

''اچھا آپ ناشتا تیار کریں میں انھیں جگا دیتی ہوں۔''

ملازمہ بغیر اصرار کیے لیموں پانی کا گلاس اس کے حوالے کرتے ہوئے واپس مڑ گئی۔ وہ خواب گاہ میں گھس گئی۔ کبیر دادا کے بھاری سانس اس کے گہری نیند میں ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وہ چند لمحے اس کے چہرے کو گھورتی رہی ملگجی روشنی میں اس کا پر رعب چہرہ پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔

''کاش آپ پر میری ملکیت متعین ہو جائے۔'' اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک تمنا جاگی اور اس کا ہاتھ کبیر دادا کے سر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس کے گھنے بالوں میں ملائم انگلیاں کنگھی کی طرح پھیرنے لگی۔ اس کے بھاری سانس مدہم پڑنے لگے تھے۔ اور پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے تناوش کو گھورنے کے بعد اس کی نظروں کا زاویہ چھت کی طرف مڑ گیا۔

بالوں سے ہاتھ نکال کر تناوش نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما اور چاہت سے بولی۔ ''اٹھ جائیں نا دس بج چکے ہیں۔'' وہ سر جھٹکتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

تناوش نے فوراً لیموں پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔

ایک ہی سانس میں کھٹا پانی معدے میں انڈیل کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ تناوش ڈریسنگ روم میں گھس کر اس کے لیے لباس نکالنے لگی۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ الماری سے نکال کر اس نے ہینگر میں لٹکایا اور ناشتا لینے چل دی۔

ملازمہ ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے ناشتا تیار کرتے دیکھتے رہی۔ اس نے جونہی ناشتا تیار کر کے ٹرالی میں ڈالا وہ بول پڑی۔

”آپ رہنے دیں خالہ!.....میں لے جاتی ہوں۔“

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔”آپ پہلی لڑکی ہیں جو صاحب جی کے کاموں میں اتنی دلچسپی لے رہی ہیں ،میری مانیں یہ کوشش چھوڑ دیں۔کبیر علی خان جیسے آدمی کسی ایک کے ہو کر نہیں رہ سکتے۔آج آپ ہیں کل دوسری ہوگی اور پرسوں تیسری۔“

”خالہ!.....ان شاء اللہ کل بھی میں ہی ہوں گی اور پرسوں بھی کوئی دوسری تیسری آپ کو نظر نہیں آئے گی ۔“یہ کہتے ہوئے وہ ٹرالی دھکیلتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔خواب گاہ میں داخل ہو کر اس نے میز پر ناشتا لگایا اور کھڑکی کے پردے ہٹا کر ملگجے اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کر دیا۔

کبیر دادا ڈریسنگ روم میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔وہ اسی جانب بڑھ گئی۔اسے سلیپنگ سوٹ سنبھالتے دیکھ کر وہ بولا۔

”ویسے اس کام کے لیے ملازمہ موجود ہے۔“

”معلوم ہے۔لیکن شاید آپ نہیں جانتے کہ ملازمہ کے رحم و کرم پر وہ مرد ہوتے ہیں جو کنوارے ہوں یا جن کی بیویاں پھوہڑ ہوں۔“

”چند دنوں کی بیوی سے کیا کام لینا۔“بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے اس نے منہ بنایا۔

”جب تک نعمت میسر ہو اس سے فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیے۔“

صوفے جانب بڑھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔”یہ غلط فہمی میں کب کی اپنے دماغ سے نکال چکا ہوں کہ بیوی نعمت ہو سکتی ہے۔“

اس کے بیٹھنے تک وہ بھی اس کے پیچھے پہنچ گئی تھی۔وہ سیب اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگا۔اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے تناوش پلیٹ سے انڈہ اٹھا کر چھلکا اتارنے لگی۔

”یہ کام میں اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرتا ہوں۔“

وہ بے نیازی سے بولی۔”اچھی عادت ہے،لیکن جب تک میں موجود ہوں آپ کو یہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

''تمھاری ہر بات مجھے تھپڑ مارنے پر اکساتی ہے مگر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ دو تین دن کی مہمان ہو۔''

''شاید یہ قیام اتنا بھی مختصر نہ ہو۔'' صاف انڈہ پلیٹ میں رکھ کر اس نے دوسرا انڈہ اٹھالیا۔

''تمھاری عادتیں دیکھ کر تو ایسا نہیں لگتا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا پڑا تھا۔

اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے وہ اس کے بازو سے چمٹ گئی۔ ''آپ کی خدمت کرنا بری عادت ہے۔''

''پھر وہی رومانس۔'' کبیر دادا نے بیزاری بھرے لہجے میں کہا مگر اس نے تناوش کو دور نہیں کیا تھا۔

''کمرے کے اندر تو آپ اجازت دے چکے ہیں نا۔''

''کب؟'' جوس کا گلاس خالی کر کے رکھتے ہوئے اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''رات کو جب آپ مجھے محافظوں کے سامنے ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے اس وقت میں نے کمرے کی بابت دریافت کیا تھا اور آپ خاموش رہے تھے۔ اور خاموش ہونے کا ایک ہی مطلب بنتا ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''اگر تم کچھ دن اور یہاں رہیں تو میرے پاگل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔''

وہ شرارت سے ہنسی۔ ''یہ نہ ہو مجھے بھیج کر دیوانے ہو جائیں۔''

ناشتے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ ''صرف تم نہیں، ہر خوب صورت لڑکی یہی سمجھتی ہے کہ اس کے بغیر مرد نہیں رہ پائے گا۔''

''واپس کس وقت لوٹیں گے۔'' وہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

''اس بارے جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں ہے۔'' کبیر دادا نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''ایک منٹ رکیں۔''

''اب کیا ہے۔'' قدم روکتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑا۔

اس کے قریب رک کر تناوش نے زیر لب کچھ بڑبڑا کر اس پر پھونکا۔ ''جلدی آنا۔''

''تمھاری یہ حرکتیں مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے وہ خواب گاہ سے نکل گیا۔ محافظوں نے گاڑیاں قطار میں لگائی ہوئی تھیں۔ ایک محافظ نے اسے آتے دیکھ کر عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا

۔کار میں بیٹھتے ہوئے اچانک اس کے دماغ میں خیال آیا۔"محبت کی دعوے دار نے خواب گاہ ہی سے رخصت کر دیا ہے۔" یہ سوچتے ہوئے اس کی نظریں بے اختیار اندرونی عمارت کے دروازے کی طرف اٹھ گئی تھیں ۔تناوش دروازے پر کھڑی اسی طرح دیکھ رہی تھی۔

"بے وقوف۔" خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔گیٹ سے نکلتے ہوئے ایک بار پھر اس نے مڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑی اس کی طرف متوجہ تھی۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کے رخصت ہوتے ہی تناوش گھر جانے کے لیے ڈرائیور کو دیکھنے لگی۔گیراج میں اسے وہی سفید کار کھڑی نظر آ رہی تھی جس میں دو دن پہلے وہ گھر تک گئی تھی۔الٰہی بخش نامی ڈرائیور اسے گھر تک چھوڑ کر آیا تھا ۔ڈرائینگ روم میں آ کر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

"راحت خالہ!.....بات سنیں۔"

"جی بی بی۔" وہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی۔

"الٰہی بخش کو کہو گاڑی لگائے میں نے گھر تک جانا ہے۔"

بیزاری بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

اس کا ارادہ گھر سے اپنے کپڑے وغیرہ لانے کا تھا۔گو وہ کبیر دادا کو بھی کہہ کر نئے کپڑے منگوا سکتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس بات پر وہ بیزاری کا اظہار بھی نہ کرتا مگر جانے کیوں وہ اسے اپنی کسی بھی ضرورت کے متعلق نہیں بتانا چاہتی تھی۔

ملازمہ نے اسے گاڑی لگنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر باہر کی طرف چل دی۔تیاری تو کوئی کرنا نہیں تھی کہ اس کے پاس ایک ہی کپڑوں کا جوڑا تھا۔

اسے قریب آتا دیکھ کر ادھیڑ عمر ڈرائیور نے کار کا عقبی دروازہ کھول دیا۔پچھلی مرتبہ کے برخلاف اس دفعہ اس کے دل میں کار میں بیٹھتے ہوئے کوئی جھجک موجود نہیں تھی۔گھر کے سامنے اترتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو تین گھنٹے بعد آنے کا کہا اور گھر میں گھس گئی۔ماں اسے گھر ہی پر ملی۔اسے دیکھتے ہی بشریٰ خاتون خوشی سے کھل اٹھی

تھی۔

''میرے شہزادی آئی ہے۔'' ماں نے بھاگ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ اسے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بڑے عرصے بعد ماں کو مل رہی ہو۔

''کبیر بیٹا نہیں آیا۔'' ماں اس کی پیشانی چوم کر اسے ساتھ لیے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''اس کے پاس اتنا وقت کہاں ماں جی۔''

''اچھا رات کو کیا ہوا تھا۔ جب تم ملازموں کے ساتھ چلی گئی تھیں تو خود یہاں دلھن لینے پہنچ گیا۔''

''ہاں..... ماں وہ اصل میں بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' تناوش جان بوجھ کر اصل بات گول کر گئی۔

''بیٹی سچ سچ بتاؤ خوش تو ہو نا۔''

''آپ سنائیں رات کیسی گزری۔'' اس نے ماں کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''رات تو اچھی گزری ہے، مگر میں نے کچھ پوچھا ہے۔''

''امی جان!..... شادیوں اور معاہدوں میں فرق ہوتا ہے۔ کبیر علی خان کا احسان ہے کہ انھوں نے نکاح پڑھوا کر میری عزت رکھ لی۔''

بشریٰ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''تو کیا ضرورت تھی آسمان سے گرتے وقت کھجور میں اٹکنے کی۔''

تناوش تلخی سے بولی۔ ''جب سینے میں نفرت کی آگ جل رہی ہو تو وہ کچھ بہتر سوچنے کا موقع نہیں دیتی۔''

''پچھتا رہی ہو؟'' بشریٰ نے دکھی دل سے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں، بس ڈرتی اس بات سے ہوں کہیں وہ مجھے طلاق نہ دے دیں۔''

''باؤلی تو نہیں ہوئی ہو۔'' بشریٰ نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''ایک غنڈے کے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ اس سے بہتر تھا اسی دلاور شیخ سے شادی کر لیتیں۔ تمھارا بھائی تو نہ جاتا۔''

''ماں جی!..... میں اس قابلِ نفرت شخص کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزارتی۔''

''اور یہ کیسا ہے۔''

''بتایا تو ہے، ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

”بے وقوف حرام کی دولت کی چکا چوند بس عارضی خوشی فراہم کرتی ہے۔“

تناوش نے منہ بنایا۔”اگر مجھے اس کی دولت سے کچھ لینا ہوتا تو گھر سے اپنے پرانے کپڑے سمیٹنے نہ پہنچ جاتی۔“

”پھر کیا بات ہے۔“

”ماں جی!.....آپ نے ابو جان سے پسند کی شادی کی تھی ناں؟“ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”ہاں بیٹی!.....مگر وہ بے وفا ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد نہ نبھا سکا۔“ بشریٰ اپنے محبوب شوہر کی یاد میں کھو گئی تھی

”ابو جان!.....آپ کو کیوں اتنا پیار اتھا ماں جی!“

بشریٰ اس کے ماتھے پر لب رکھتے ہوئے شفقت سے بولی۔”کسی کا پیار الگنا اختیار میں تھوڑی ہوتا ہے پگلی۔“

تناوش نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔”مطلب آپ جانتی ہیں کہ کسی کو چاہنا بے اختیاری فعل ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں، مگر برابری اور مسابقت بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے چندا!.....کبیر علی خان بہت بڑی شخصیت ہے اور ہم نہایت حقیر ہم کبھی اس کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ تم اس کے نزدیک ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہو۔ اور جب کھلونے سے دل بھر جایا کرتا ہے تو اسے توڑ دیا جاتا ہے یا کسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔“

وہ عزم سے بولی۔”فکر نہ کریں ماں جی!.....اگر میں اس کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی تو اسے اپنی حیثیت تک لے آؤں گی۔“

”بہتر تو یہی ہوگا کہ طلاق لے کر دوبارہ اپنا گھر بسا لو۔ اگر لوگوں کی باتوں سے ڈرتی ہو تو ہم یہ گھر بیچ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ اب تو یوں بھی اس موذی دلاور شیخ سے جان چھوٹ گئی ہے۔“

ماں جی!.....شریف لڑکیاں طلاق کا مطالبہ نہیں کیا کرتیں۔“

بشریٰ ہنسی۔”ٹھیک ہے جی شریف لڑکی نہ کرے مطالبہ۔ بدمعاش لڑکا خود ہی طلاق دے دے گا۔“

”بددعائیں تو نہ دیں ماں جی!.....“

”اچھا کچھ نہیں کہتی میری گڑیا!..... یہ بتاؤ کھانا کھاؤ گی کہ نہیں۔ میرا تو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے کچھ بھی نہیں بنایا۔ اگر تمھارا دل کر رہا ہے تو کچھ اچھا بنا لیتی ہوں۔“

”ہاں بالکل کھاؤں گی، کوئی اچھی سی سبزی بنا لیں اتنی دیر میں میں اپنا سامان سمیٹ لوں۔“

☆.....☆.....☆

”ماں جی!..... وہ پرانا موبائل فون کدھر ہے۔“

”کیا کرنا ہے؟“ بشریٰ نے باورچی خانے سے آواز دی۔

”ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

”تو اپنے والا لے جاؤ۔“

”نہیں وہ آپ کے کام آئے گا۔“

”میرا خیال ہے وہ میرے والے ٹرنک میں پڑا ہوگا۔“

اس کا پرانا موبائل فون کچھ زیادہ ہی پرانا تھا مگر ماں سے رابطہ کرنے کے لیے اس نے ساتھ لے جانا مناسب سمجھا تھا۔ کبیر دادا کو وہ اپنی کسی بھی ضرورت کے متعلق نہیں بتانا چاہتی تھی۔

ماں کے کھانا بنانے سے پہلے ہی وہ اپنا مختصر سا سامان لپیٹ چکی تھی۔ اس کا کتابوں والا بیگ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ سامان اس میں سما سکتا مجبوراً اسے شاپروں ہی میں تمام سامان ڈالنا پڑا۔ اپنی کتابیں بھی اس نے ساتھ رکھ لی تھیں۔ امتحانات قریب تھے داخلے جا چکے تھے، کبیر دادا سے بات کر کے وہ بارہویں کا امتحان تو دے ہی سکتی تھی

اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ ماں کے پاس باورچی خانے میں گھس کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

کھانا کھا کر وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ ڈرائیور کو دیا ہوا وقت بھی پورا ہو گیا تھا۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد گھر کے باہر ہارن کی آواز سنائی دی۔ ماں سے الوداعی پیار لے کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائیور اسے گھر سے برآمد ہوتے دیکھ کر کار سے نکلا اور جلدی سے عقبی دروازہ کھول دیا۔

☆.....☆.....☆

خفیہ اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے شہاب قصوری کی کال آ گئی تھی۔ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا

۔کبیر دادا نے اڈے میں گھسنے کے بجائے شہاب شاہ سے ملنا ضروری خیال کیا۔اس کے حکم پر ڈرائیور نے گاڑی شہاب شاہ کی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔اخلاق حسین شاہ، سپرنٹنڈنٹ پولیس ضمیر حسین اوڈھو، نوشاد خان آفریدی، بابر حیات اور نقیب اللہ جان وہاں موجود تھے۔تمام جرم کی دنیا کے بڑے بڑے نام تھے۔دیکھا جاتا تو کراچی کے اصل مالک یہی تھے۔انھوں نے اپنے کام کرنے کے علاقے بانٹے ہوئے تھے ۔ہر ایک اپنے علاقے میں خود مختار تھا۔بھتہ خوری، منشیات فروشی، اسلحے کی اسمگلنگ، اغواء برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، شراب خانے، جوئے کے اڈے، جسم فروشی کے اڈے وغیرہ چلانا اور اس کے علاوہ بھی بے شمار جرائم کی دلدل میں وہ گردن تک دھنسے ہوئے تھے۔ثواب و گناہ ان کی نظر میں فرضی اور خیالی باتیں تھیں۔وہ اللہ پاک کی ذات پر ایمان رکھتے تھے یا نہیں اس بارے انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔

وہ تمام ڈرائینگ روم کے بجائے ملاقات کے کمرے میں ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے تھے۔صدارت کی کرسی پر شہاب شاہ قصوری بیٹھا تھا۔اس کے دائیں جانب پہلی کرسی کبیر دادا کے لیے خالی پڑی تھی۔کبیر دادا کی بغل میں ایس پی بیٹھا تھا جبکہ اس کے سامنے نوشاد خان آفریدی اور اس کی بغل میں اخلاق حسین شاہ براجمان تھا ۔کچھ کرسیاں خالی پڑی تھیں یقیناً وہاں تمام لوگ حاضر نہیں تھے۔

''شاید کوئی خاص مسئلہ ہے جو اتنے معززین جمع ہیں۔'' کبیر دادا نے اندر داخل ہوتے ہی مزاحیہ انداز میں کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔اس کی بات پر سوائے شہاب کے کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ابھری تھی۔ان کے سامنے دھرے خالی گلاس اس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بیٹھک کافی دیر سے جاری تھی۔ایک کونے میں لگی میز پر مختلف رنگوں کی بوتلیں موجود تھیں جن میں سنہری، کالے، ارغوانی اور سرخ رنگ کی بوتلیں دھری تھیں۔جس کسی کو حاجت ہوتی وہ خود ہی اٹھ کر اپنا گلاس بھر لیتا۔

''تو.....'' تمام کو خاموشی پر رضامند پا کر وہ شہاب کی طرف متوجہ ہوا۔

شہاب نے پوچھا۔''آپ نہیں جانتے؟''

کبیر دادا بیزاری سے بولا۔''بلایا ہے تو بات کرنا آپ کا بنتا ہے۔''

''دو ٹکے کی چھوکری کے لیے ایک معزز شخص کی توہین کی گئی ہے۔'' اس کے سامنے بیٹھے نوشاد خان آفریدی

نے غصہ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے غصے کی تیز لہر نے کبیر دادا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، مگر پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ نوشاد آفریدی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”سنا ہے تم نے دو دو ٹکے کی دو عورتوں کو گھر میں رکھا ہوا ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کو کوئی معزز پکڑ کر لے جائے تو یقیناً خیر سگالی کے طور پر تم دوسری بھی اس کے پاس بھجوا دو گے۔“

”کبیر دادا منہ سنبھال کر بات کرو۔“ نوشاد آفریدی غصہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔ ”وہ میری بیویاں ہیں۔“

کبیر دادا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”تو میں نے کھوتی پال رکھی ہے۔“

”وہ ایک رکھیل ہے، بازاری عورت..... دلاور شیخ پچھلے دو سال سے اسے استعمال کر رہا تھا اور سنا ہے گزشتہ رات خاور شیخ بھی مرنے سے پہلے اس سے بہرہ مند ہو چکا تھا۔“ نوشاد کا لہجہ خاصا استہزائیہ تھا۔

”نغمہ بیگم تین سال تک ماڈل رہی اس دوران درجنوں باہر سے آنے والے سرکاری مہمانوں کو پیش ہوتی رہی اور اب وہ تمھاری نیک پروین بیوی بن گئی ہے۔“ کبیر دادا نے اس کی دوسری بیوی کے خفیہ زندگی کے راز آشکارا کیے۔

”شہاب صاحب!..... ہم یہاں بے عزت ہونے کے لیے نہیں آئے۔“ نوشاد آفریدی، شہاب کی طرف متوجہ ہوا۔

”کبیر دادا!..... پلیز۔“ شہاب خان کا لہجہ مفاہمت سے پر تھا۔

”شہاب صاحب!..... نوشاد کی زبان کو بھی لگام دو۔ وہ میری منکوحہ ہے اور اس کے بارے اگر یہ بکواس کرے گا تو ایسا سننے کو ملے گا۔“

”کبیر دادا!..... آپ خود شہاب شاہ صاحب کے سامنے اعتراف کر چکے ہیں کہ اس لڑکی کو آپ چند دن کے لیے ہی گھر لے کر آئے ہیں۔ جبکہ کسی دوسرے کی بیوی کے متعلق بات کرتے وقت یہ سوچ لیں کہ تمام نے مستقل بنیاد پر شادی کی ہوئی ہے۔“ اس مرتبہ ایس پی ضمیر حسین اسے مخاطب ہوا تھا۔

”ایس پی صاحب!..... میں اسے ایک دن اپنے پاس رکھوں یا ہمیشہ، یہ میرا ذاتی فعل ہے اور کسی سورما کو

میں یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری عزت پر ہاتھ ڈالے۔ اخلاق حسین کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے خود اس لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا ورنہ یقیناً آج شکایت کے لیے یہاں اس کا جانشین بیٹھا ہوتا۔"

"کبیر دادا ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنیں۔" اخلاق حسین شاہ بھڑک اٹھا تھا۔

کبیر دادا نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ "نہیں پہنیں تو پہنا دوں گا اور پہناؤں گا بھی دھات کی تاکہ توڑ کر ہاتھوں سے نکالی نہ جا سکیں۔"

"کبیر دادا!..... آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپس کا معاہدہ توڑ دیں اور پھر جس کی جتنی طاقت ہے وہ اس کے ساتھ میدان میں آ جائے۔" نقیب اللہ جان نے بھی کبیر دادا ہی کو قصوروار ٹھہرایا تھا۔

"کبیر دادا تھوڑا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں، خواہ مخواہ بات بڑھانے سے کچھ نہیں ملے گا۔" شہاب نے اسے نرم کرنا چاہا۔

کبیر دادا کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی آمد سے پہلے اخلاق حسین اپنے لیے میدان ہموار کر چکا تھا۔

"بابر صاحب!..... آپ بھی کچھ بولیں تاکہ میں ایک ساتھ تمام کو جواب دے سکوں۔" کبیر دادا نے خاموش بیٹھے بابر حیات کی رائے بھی جاننا چاہی۔

بابر حیات کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق تو آپ ہی غلطی نظر آ رہے ہیں، کیونکہ اس سے پہلے بھی ہم ایک دوسرے کی رکھیل اور منظور نظر پر ہاتھ ڈالتے رہے ہیں، مگر اس کی وجہ سے کبھی کسی گینگ کے سربراہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا گیا۔ البتہ کسی کارندے وغیرہ کو مار کر بدلہ لینا عام سی بات ہے۔ ہم تمام تو علاحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں، غصہ کرنا اور لڑنا جھگڑنا تو عام بات ہے مگر ایسی صورت میں بھی ہم ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔"

کبیر دادا نے طائرانہ نگاہ تمام کے چہرے پر ڈالی اور کہنے لگا۔ "تمام حضرات اخلاق حسین کی یک طرفہ گفتگو سن کر مجھے غلط گردان رہے ہیں، حالانکہ اس معاملے میں سراسر اخلاق حسین غلطی پر ہے۔ کل میرا نکاح تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس لڑکی کو چھیڑنے والا دلاور شیخ کس کا آدمی ہے۔ لیکن اس ضمن میں میں نے نہ تو اخلاق حسین کو کچھ کہا اور نہ شہاب صاحب کو کوئی شکایت کی، البتہ دلاور شیخ سے حساب کتاب کرنا میری مجبوری تھی

۔رات ہی کو اخلاق حسین شکایت کرنے شہاب صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اسی وقت میں نے اپنی صفائی پیش کر دی تھی۔اسے یہ شکایت تھی کہ میں نے اس محلے میں اس کے آدمیوں کا داخلہ کیوں بند کر دیا۔اب ان پندرہ بیس گھرانوں پر تو اس کی سیاست یا غنڈہ گردی کا انحصار نہیں ہے نا۔اس کا کہنا تھا کہ کبیر دادا نے جو لوگوں کے مجمع میں بیٹھ کر اعلان کیا ہے کہ اب اس محلے میں کوئی غنڈہ نہیں آئے گا تو وہ اعلان بس کہنے کی حد تک ہی رہے۔جبکہ کبیر دادا کبھی زبان دے کر نہیں پھرا یہ بات آپ تمام لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔وہاں سے جناب خفا ہو کر چلے گئے اور مجھے بے عزت کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے اپنے آدمی میری منکوحہ کے گھر بھیج دیے جو اسے دھوکے سے خاور شیخ کی کوٹھی پر لے گئے۔مجھے جب اپنی بیوی کے غائب ہونے کا پتا چلا تو میں سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اپنی منکوحہ کے بارے استفسار کیا۔محترم الٹا مجھ پر طنز و تشنیع کے تیر چلانے لگا۔مجبوراً میرا بھی ہاتھ اٹھ گیا۔اور اس کی خوش قسمتی کہ خاور شیخ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا ورنہ اس پر میرا قرض باقی تھا ۔اب وہ قرض اس سے کیسے وصول کرتا اس بارے کچھ کہنا فضول ہے کہ وہ بات گزر گئی ہے۔باقی تمام کا یہ کہنا کہ وہ لڑکی میری رکھیل ہے اور اسے بیوی کے حقوق حاصل نہیں ہیں تو یہ نہایت غلط بات ہے کیونکہ جب میں نے نکاح پڑھا دیا ہے تو اس قسم کے تخمینے ثانوی رہ جاتے ہیں کہ اس نے میرے ساتھ ایک دن رہنا ہے یا ہمیشہ۔آخر میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ یہی ختم کر دیا جائے تو بہتر رہے گا۔"

"ویسے ساری غلطی کبیر دادا کی بھی نہیں ہے اور اب اس بات کو ختم کیا جانا چاہیے، کیا خیال ہے شاہ جی ۔" بابر حیات نے اپنی طرف سے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"اس لڑکی کی وجہ سے میرے دو اہم آدمی قتل ہوئے ہیں وہ خود چل کر میرے پاس معافی مانگنے آئے گی اب میں اسے ایک رات میں معافی دیتا ہوں یا دو راتوں میں اس کا تعین میں اسے ملنے کے بعد ہی کروں گا۔ممکن ہے ایک رات کے لیے میں اسے نوشاد آفریدی کے پاس بھی بھیج دوں۔اگر کبیر دادا کو یہ منظور نہیں تو پھر تیار رہے وہ لڑکی جہاں بھی ہمارے ہتھے چڑھی ہم بدلہ لینے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" سارے گروپوں کی ہمدردی پا کر اخلاق حسین کمینگی پر اتر آیا تھا۔

اخلاق کی بات سن کر سوائے شہاب قصوری کے تمام کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔صاف نظر آ رہا

تھا کہ کبیر دادا کی مخالفت صرف حالیہ مسئلے کی وجہ سے نہیں تھی اور وہ کسی بھی طرح کبیر دادا کو نیچا دکھانے کے خواہاں تھے۔

کبیر دادا اطمینان سے بولا۔ ''ان اچھی شرائط کو نہ ماننے والا کوئی بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔ دو راتیں کوئی اتنی زیادہ قیمت بھی نہیں ہے کہ مجھے انکار کرنا پڑے اور یقیناً پہلی رات جب وہ شاہ صاحب کے ساتھ ہو گی تو اس کی جگہ شاہ صاحب کی بڑی بیٹی فرحانہ میری تنہائی دور کرنے آئے گی اور دوسری رات جب وہ نوشاد آفریدی کے ساتھ ہو گی تو اس کی چھوٹی بیگم نغمہ میری بیوی کی جگہ سنبھالے گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' نوشاد آفریدی غضب ناک ہوتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا، مگر یہ کھڑا ہونا اسے مہنگا پڑا ..... کبیر دادا اپنی نشست سے سپرنگ کی طرح اچھلا ایک پاؤں درمیانی میز پر رکھتے ہوئے اس نے آگے کی طرف چھلانگ لگائی اور چوڑی میز کو عبور کرتا ہوا نوشاد آفریدی پر جا پڑا۔ اسے گریبان سے تھامتے ہوئے اس نے ایک لات اخلاق حسین کو بھی رسید کر دی تھی وہ کرسی سمیت فرش پر لمبا ہو گیا تھا، اس کے ساتھ ہی کبیر دادا نے ایک ہی ہاتھ سے نوشاد آفریدی کو سر سے بلند کر کے اس کی پیٹھ دیوار سے لگا دی تھی۔

''اب بتاؤ بکواس کون کر رہا ہے۔'' کبیر دادا کا سرد لہجہ نوشاد آفریدی کو دہلا گیا تھا۔

باقی تمام ایک لمحے کے لیے سن ہو گئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی وہ بے ساختہ نوشاد خان کو چھڑانے کے لیے کبیر دادا کی طرف بڑھے۔

''کبیر دادا..... کبیر دادا..... یہ کیا بے وقوفی ہے چھوڑو اسے.....'' شہاب اور بابر حیات بیک زبان بولے تھے۔ کبیر دادا کے ہاتھ کے دباؤ سے نوشاد آفریدی کے گلے رگیں پھول گئی تھیں۔ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے حرکت کی کوشش کی مگر کبیر دادا کی طاقت ور گرفت سے آزاد نہ ہو سکا۔

دونوں نے کبیر دادا کو دائیں بائیں سے پکڑ لیا تھا۔ کبیر دادا نے جھٹکا دے کر نوشاد آفریدی کو قالین پر پھینکا اور دوبارہ اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ موبائل جیب سے نکال کر وہ کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔

بابر حیات اور شہاب قصوری نے نوشاد کو کرسی پر بٹھایا اخلاق حسین بھی کرسی کو سیدھا کر کے بیٹھ گیا تھا، دونوں

کے چہرے غصے وخجالت سے سرخ ہو گئے تھے۔

''ایسا کرو اپنے تمام آدمیوں کو بتا دو کہ آج رات نو بجے کے بعد کوئی حدود بندی اور علاقہ نہیں رہے گا وہ جہاں چاہیں اپنا کاروبار کر سکتے ہیں اور اگر کوئی بھی رکاوٹ ڈالنے یا رخنہ اندازی کی کوشش کرے تو اڑا دینا۔'' ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے مخالف کی بات سنی اور پھر کہا۔ ''ہاں آج رات نو بجے کے بعد اس سے پہلے نہیں۔'' اس کے رابطہ منقطع کرتے ہی شہاب قصوری تشویش ناک لہجے میں بولا.....

''یہ کیا مذاق ہے کبیر دادا!.....''

''مذاق یہ ہے یا وہ جو دونوں خبیث کر رہے ہیں..... آٹھ بجے تک اگر اخلاق حسین نے گھر آ کر میری بیوی سے معافی نہ مانگی تو پھر نتائج کے ذمہ دار آپ لوگ خود ہوں گے۔'' یہ کہتے ہی کبیر دادا ان کی بات سنے بغیر کرسی سے اٹھ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

''ہونہہ! تو بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔'' کبیر دادا کے باہر جاتے ہی ایس پی ضمیر نے ہنکارا بھرا۔

بابر حیات نے کہا۔ ''اس کا ذمہ دار اخلاق حسین شاہ ہے۔''

''اس کی آمد سے پہلے یہی طے ہوا تھا کہ وہ لڑکی مجھ سے معافی مانگنے آئے گی۔ اب مجھے مطعون کیوں ٹھہرا رہے ہو۔''

بابر حیات نے تلخی سے کہا۔ ''کیونکہ یہ بات شہاب صاحب نے اسے کہنا تھی۔ اور بات لڑکی کے معافی مانگنے کی تھی اس کے ساتھ رات گزارنے کی نہیں۔''

''اچھا اب آپس میں نہیں لڑ پڑنا۔'' نقیب اللہ جان نے انھیں بحث سے روکا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا، ہمیں کبیر دادا کو منانا پڑے گا۔'' شہاب قصوری نے زبان کھولی۔

''ہم ڈرتے نہیں اس سے اور اکیلا اس کا گینگ تمام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' نوشاد آفریدی نے انکار میں سر ہلایا۔

بابر حیات نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بے وقوفوں کی سی بات نہ کرو۔ وہ اکیلا نہیں ہے

۔یہاں پر صرف چھے گینگو کے بڑے موجود ہیں، پانچ نے آنے کی زحمت ہی نہیں کی ہے، اگر ان پانچ کو کبیر دادا اپنے ساتھ ملا لیتا ہے تو یقیناً وہ بھاری پڑیں گے۔خود کبیر دادا کا گینگ بھی سب سے بڑا ہے۔"

ایس پی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔"اسی لیے تو وہ انڈر گراؤنڈ حلقوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"اور یہ موقع اسے ہم لوگ فراہم کر رہے ہیں۔" بابر حیات کی گفتگو سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کبیر دادا کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔

نوشاد آفریدی نے تلخی سے کہا۔"بابر صاحب! آپ اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہے ہیں۔"

"بابر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شہاب قصوری نے بابر کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔"آپ لوگوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کبیر دادا کا مقابلہ کر سکے، اس کا گینگ بھی سب سے بڑا ہے۔اور میرا خیال ہے اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے ہم اس پر شک کر سکیں کہ وہ سب کا بڑا بننا چاہتا ہے۔"

ایس پی نے شہاب قصوری کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔"شمشیر دادا کے جانے کے بعد اس نے کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں۔اور آپ اس کی طرف داری نہ کریں وہ آپ ہی کی جگہ لینا چاہتا ہے۔"

شہاب قصوری صاف گوئی سے بولا۔"میں شمشیر دادا کی طرح کا بڑا نہیں ہوں، میں تو بس آپ تمام کو ایک جگہ اکٹھا کر کے صلح صفائی کرا دیتا ہوں۔اس سے بڑھ کر غالباً میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔باقی جہاں تک میری جگہ سنبھالنے کا تعلق ہے تو آج تک کبیر دادا نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔وہ شمشیر دادا کا شاگرد ہے اور شمشیر دادا ہی نے یہ سربراہی میرے حوالے کی تھی۔"

"اگر شمشیر دادا کو چند روز کے لیے بلا لیں۔" نوشاد آفریدی نے مشورہ دیا۔

بابر حیات بولا۔"اسے بمبئی کی ہوا راس آ گئی ہے۔یقیناً وہ یہاں لوٹنا نہیں چاہے گا۔"

"تو پھر ان حالات سے کیسے نبٹا جائے۔" خاموش بیٹھے نقیب اللہ جان نے زبان کھولی۔

"میرا تو خیال ہے فی الحال اخلاق حسین کو مصالحت کی کوشش کرنا چاہیے، خواہ مخواہ جھگڑا بڑھانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اگر ہم تمام نے مل کر کبیر دادا کے گینگ کا خاتمہ کر بھی دیا تب تک وہ بھی ہمیں ناقابل تلافی

نقصان پہنچا چکا ہوگا۔" بابر حیات نے مشورہ دیا۔

"بابر صاحب صحیح کہہ رہا ہے۔" نقیب اللہ جان نے بابر کی تائید میں سر ہلایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔" شہاب قصوری نے ایس پی سے مشورہ چاہا۔

ایس پی ضمیر اوڈھو گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔ "ویسے فی الحال ہم کسی قسم کے جھگڑے کی حالت میں نہیں ہیں اور وہ بے غیرت اس چھوکری کے پیچھے باؤلا ہوا ہے۔"

شہاب نے نوشاد آفریدی کی جانب دیکھا۔

"فی الحال اس کا مطالبہ پورا کر دیتے ہیں، لیکن میں کوشش کروں گا کہ شمشیر دادا کو چند روز کے لیے بلوا لوں ، جب تک میں کبیر دادا مزا نہ چکھا لوں مجھے آرام نہیں آئے گا۔ خاص کر اس کی رکھیل کو تو میں نہیں چھوڑوں گا۔"

"شاہ جی!.....اب سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔" شہاب قصوری، اخلاق حسین کی طرف متوجہ ہوا۔

اخلاق حسین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "گویا سب کا یہی فیصلہ ہے کہ میں اس دو ٹکے کی چھوکری سے معافی مانگوں۔"

"فیصلہ نہیں مشورہ۔" شہاب قصوری نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔" اخلاق حسین نے منہ بنایا۔

"آپ اپنی بات کریں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اور تجویز ہے تو بتائیں۔" شہاب قصوری نے گیند اس کے کورٹ میں پھینکی۔ "اس کے علاوہ تو یہی حل رہ جاتا ہے کہ اپنے اپنے گینگ کو تیاری کا حکم دے دیں کل صبح تک فیصلہ ہو جائے گا کہ کس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔"

"میں اس چھوکری کو چھوڑوں گا تو نہیں۔" اخلاق حسین نے دانت پیسے۔

شہاب قصوری بولا۔ "وہ بعد کا مسئلہ ہے، یوں بھی یہ تب ہی ممکن ہوگا جب آپ کبیر دادا سے بڑا گینگ بنا لیں گے۔ البتہ وہ اس لڑکی کو خود سے علاحدہ کر دے تب دوسری بات ہے۔ اور اس وقت میرا خیال ہے اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔"

"فائدہ نقصان تو میں نہیں جانتا لیکن میں نے اسے کوٹھے پر نہ بٹھا دیا تو اخلاق حسین نہ کہنا۔"

بابر حیات نے پوچھا۔ ”شاہ جی!..... مستقبل کے منصوبوں کو رہنے دیں فی الحال موجودہ مسئلے کا حل بتائیں۔“

”میں معذرت کرلوں گا۔“ اخلاق حسین نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد فیصلہ سنایا۔

ایک دم تمام کے چہرے پرسکون ہوگئے تھے۔

شہاب قصوری نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ”شکریہ شاہ جی!..... ہمیں آپ سے اسی دانش مندی اور ظرف کی توقع تھی۔ یہ پسپائی نہیں عارضی طور پر جنگ کو ٹالنے کی سعی ہے۔“

نوشاد آفریدی دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لینا جلد ہی کبیر دادا کو اس کا مزا چکھنا پڑے گا۔ اس چھوکری کو اگر بھرے مجمع میں بے لباس نہ کیا تو غنڈہ گردی چھوڑ دوں گا۔“

باقی بھی اخلاق حسین کے فیصلے کو اپنے اپنے انداز میں سراہنے لگے۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کو دیکھتے ہی عظیم نے جلدی سے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبکا ہو رہا تھا۔ عظیم کو اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ کوئی بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔ نامعلوم اسے کیوں اس سب کے پیچھے کبیر دادا کی نئی دلھن ہی دکھائی دے رہی تھی۔

نشست سنبھالتے ہی کبیر دادا نے کہا۔ ”گھر چلو۔“ اور ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چوکیدار نے کار کو حرکت کرتے دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا..... ”آپ کا نو بجے والا حکم کارکنوں تک پہنچا دوں؟“

”فی الحال نہیں، اگر ایسا کرنا ہوا تو بتا دوں گا۔“

اس کے بعد گھر آنے تک خاموشی چھائی رہی۔ کار کے رکتے ہی عظیم عقبی نشست کا دروازہ کھولنے کے لیے جلدی سے باہر نکلا، مگر کبیر دادا نے اس کا انتظار نہیں کیا تھا۔

”دادا!..... آرام کریں گے یا کہیں جانا ہوگا۔“

''آرام کرو۔'' کہہ کر اس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی متلاشی نگاہیں تناوش کو ڈھونڈنے لگیں۔ شاید وہ سو رہی تھی ورنہ گاڑیوں کے اندر آنے پر وہ لازماً باہر نکلتی۔

اسے کمرے میں بھی موجود نہ پا کر کبیر دادا کا پارہ ایک دم بلند ہو گیا تھا۔

گھنٹی بجا کر اس نے کام والی کو بلایا۔

''جی صاحب جی!'' راحت خالہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تناوش کہاں ہے؟''

راحت خالہ نے حیرانی سے جواب دیا۔ ''گھر تک گئی ہے صاحب جی۔'' اس کی حیرانی بجا بھی تھی کہ اس سے پہلے کبیر دادا نے کبھی کسی لڑکی کے متعلق استفسار نہیں کیا تھا، چاہے وہ ایک رات گزار کر جانے والیاں ہوں، چاہے دو تین دن وہاں گزارنے والیاں ہوں۔

اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھا اور موبائل فون جیب سے نکال کر تناوش کا نمبر ملانے لگا۔ مگر پھر کسی سوچ کے تحت اس نے گھنٹی جانے سے پہلے رابطہ منقطع کر کے دوبارہ کام والی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔

راحت خالہ دوبارہ اندر آئی۔ ''جی صاحب جی!''

''وہ گھر تک کیسے گئی ہے؟''

''الٰہی بخش چھوڑنے گیا تھا صاحب!''

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' اسے جانے کا کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما دو تین منٹ سوچنے کے بعد وہ کسی کا نمبر ملانے لگا۔

''آداب کبیر دادا!'' دوسری گھنٹی ہی پر کال وصول کر لی گئی تھی۔

''یار پاشا!..... شام کو نو بجے میرے پاس آ سکتے ہو؟''

''کبیر دادا شرمندہ نہ کیا کریں۔ آپ کے حکم سے سرتابی کا میں سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔''

وہ مزید بولا۔ ''کاشف راجپوت، اسد خان، شیر خان اور فصیح الدین کو بھی ساتھ لے آنا۔''

پاشا ہنسا۔ ”کوئی میٹنگ وغیرہ ہے یا دعوت کر رہے ہیں۔“

وہ صاف گوئی سے بولا ”کوئی ضروری بات ہے۔“

”ویسے اڑتی اڑتی خبریں تو مجھ تک بھی پہنچ گئی ہیں، سنا ہے شادی وادی کے چکروں میں پڑ گئے ہیں۔“

”باقی کی تفصیل ملنے پر ہوگی۔“

”ٹھیک ہے دادا!..... جلد ہی ملیں گے۔“ پاشا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس نے موبائل فون ایک طرف پھینکا اور صوفے کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ تناوش ہاتھ میں سامان پکڑے اندر داخل ہوئی تھی۔

”کہاں گئی تھیں تم۔“ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتے ہوئے وہ دھاڑا۔ اسے غصے میں پا کے تناوش ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”میں گھر تک گئی تھی۔“ اس کا غصہ تناوش کی سوچ سے ماورا تھا۔

”کس سے پوچھ کر اور ایک دن میں تمھیں ماں کی یاد ستانے لگی۔“

”مجھے پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ سوچا تھا آپ کی آمد سے پہلے واپس لوٹ آؤں گی، مگر آپ کچھ جلدی لوٹ آئے ہیں۔“

”تمھیں میری روزمرہ کا کیا پتا؟“ وہ ابھی تک غصے میں تھا۔

”تو کیا ہو گیا ہے، گھر تک ہی گئی تھی۔“ بے پروائی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا سامان کرسی پر رکھا اور اس کے قریب آ گئی۔

”یہ بکواس اس لیے کر رہی ہو کہ تمھیں صورت حال کا علم نہیں اور یہ پتا نہیں ہے کہ میرے کتنے دشمن ہیں جو تمھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”اُف اللہ جی، اتنی فکر مندی۔“ شوخی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ قالین پر بیٹھ کر اس کے بوٹ کھولنے لگی۔

ایک دم کبیر دادا کو لگا کہ اس کا غصہ کرنا اور تشویش کا اظہار واقعی یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے تناوش کی فکر تھی۔ لیکن

اس بات اقرار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ فوراً غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"فکر کرتی ہے میری جوتی۔ اور تمھیں کس نے کہا کہ میرے بوٹ اتارو۔"

وہ اطمینان سے بولی۔ "کیونکہ آپ اس وقت آرام کرتے ہیں، سات بجے تک لیٹتے ہیں، آٹھ بجے ڈنر کر کے گھر سے نکل جاتے ہیں، واپسی رات کے ایک دو بجے تک ہوتی ہے، کبھی کبھی پوری رات نہیں آتے۔ کیا خیال ہے آپ مجھے اپنی روزمرہ نہیں بتائیں گے تو میں کسی اور سے بھی نہیں پوچھوں گی۔" یہ کہتے ہی وہ مسکرائی۔ "آج پتا نہیں کیوں جلدی لوٹ آئے ہیں، شاید نئی نویلی دلھن کی یاد ستانے لگ گئی تھی۔ اسی وجہ سے غصہ بھی کر رہے ہیں کہ میں کہاں گئی تھی ہے نا۔"

اس نے بیزاری بھرے لہجے میں کہا۔ "دماغ خراب نہ کیا کرو۔"

"اچھا نہیں کرتی دماغ خراب، اب غصہ تھوکیں اور آرام کریں۔ آج کے بعد پوچھے بغیر خواب گاہ سے بھی قدم باہر نہیں نکالوں گی۔" جوتے اتار کر وہ اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگی۔

"مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے ایک طرف ہٹا کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ مگر وہ اس کی بیزاری کو خاطر میں لائے بغیر اس کے ساتھ ہی چل پڑی۔

"میرا خیال ہے میں بچہ نہیں ہوں، لباس تبدیل کر لوں گا۔" اسے اپنے ساتھ ڈریسنگ روم میں گھستے دیکھ کر وہ جھلا گیا تھا۔

وہ شوخی سے بولی۔ "ہاں بچے تو نہیں ہیں، مگر اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے کہ آپ پر دھیان دینا چھوڑ دوں۔"

"دوں گا ایک۔" کبیر دادا نے اسے ڈرانے کے لیے تھپڑ تولا۔

"سچ میں۔" الماری سے سلیپنگ سوٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے اس نے شوخی سے آنکھیں مٹکائیں۔

کبیر دادا اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

"گھورنا بند کریں اور بنیان بھی اتار لینا، اس دن آپ کو ملنے آئی تھی اسی بنیان میں جناب آرام فرما رہے تھے۔" بڑی ماں کی طرح ایک اور نصیحت جھاڑتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ کبیر دادا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس

کی ہر بات برداشت کر رہا ہے۔

ڈریسنگ روم سے نکل کر اس نے اپنا سامان اٹھایا اور دوبارہ اندر گھس آئی۔ الماری میں لٹکے خالی ہینگرز کے ساتھ وہ اپنے کپڑے لٹکانے لگی۔ کبیر دادا لباس تبدیل کر کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ بھی اپنے کپڑے اور جوتے وغیرہ سنبھال کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ پڑے تکیے پر کہنی سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''آج جلدی کیوں آئے۔'' تناوش کا لہجہ بالکل کسی خیال رکھنے والی بیوی کا سا تھا۔

''تمھیں اس سے کیا کہ میں کس وقت لوٹتا ہوں۔ بتایا ہے نا جو چند دن یہاں گزارنے ہیں اپنے کام سے کام رکھا کرو۔'' یہ کہتے ہی اس نے تناوش کا ہاتھ سر سے دور دھکیلا۔ ''سونے دو مجھے۔''

''سلا ہی رہی ہوں نا۔'' منہ بناتے ہوئے وہ دوبارہ اس کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے اس طرح نیند نہیں آئے گی۔''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''تو جب تک میں یہاں ہوں، عادت ڈال لیں۔''

وہ بپھرتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے تمھیں آج ہی واپس بھیجنا پڑے گا۔''

اس نے شوخی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تنگ نہیں کروں گی تو واپس نہیں بھیجیں گے۔'' اپنا ہاتھ اس نے پیچھے نہیں ہٹایا تھا۔

وہ لہجے میں تلخی سموتے ہوئے بولا۔ ''کم از کم آج تو نہیں بھیجوں گا۔''

''دھمکیاں نہ دیں۔ یہ لیں، نہیں کرتی تنگ۔'' منہ بسورتے ہوئے وہ پیچھے ہو کر گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھ گئی۔

کبیر دادا نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف سر گھمایا۔ وہ چھوٹی سی بچی کی طرح گھٹنوں پر سر ٹیکے منہ بنائے بیٹھی تھی۔ کبیر دادا کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہوئی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

''تمھارے روٹھنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

گہری سیاہ آنکھوں میں اداسی بھرے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''کسی کی بے بسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔''

کبیر دادا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ ”اچھا جو کرنا ہے کرو، ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں۔ باقی آج نہیں تو کل تمھیں جانا تو پڑے گا۔“

”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے دوبارہ تکیے پر کہنی ٹیکی اور اس کی ملائم انگلیاں کبیر دادا کے بالوں میں سرسرانے لگیں۔

کس وقت جگاؤں۔“

اس مرتبہ ناک بھوں چڑھائے بغیر کبیر دادا نے جواب دیا۔ ”ساڑھے سات تک جاگ جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کبیر دادا کے سانس بھاری ہوئے اور وہ نیند میں ڈوب گیا۔ عصر کی آذان سن کر وہ وضو کرنے غسل خانے میں گھس گئی۔ وضو کر کے اس نے ایک خالی کمرے میں جائے نماز بچھائی جہاں کوئی تصویر وغیرہ ٹنگی ہوئی نہیں تھی۔ ورنہ تو ہر جگہ جنگل کے بادشاہ کی تصاویر لگی تھیں۔ جائے نماز وہ گھر سے اٹھا لائی تھی۔

نماز پڑھ کر باورچی خانے میں گھستے ہوئے وہ راحت خالہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کبیر دادا کی پسند و ناپسند وغیرہ کے بارے بھی راحت خالہ کو کریدتی رہی۔

باتوں ہی باتوں میں راحت خالہ کہنے لگی۔ ”بی بی جی، سچ کہوں تو آپ کے ساتھ صاحب جی کا رویہ عجیب سا ہے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی خاتون کے بارے مجھ سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ آج تو حقیقت میں اتنا غصے میں تھے کہ میں ڈر ہی گئی تھی۔“

”کیا پوچھ رہے تھے؟“ تاوش کو راحت خالہ کی بات سن کر خوشی محسوس ہوئی تھی۔

”یہی کہ کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہے۔ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔“

”خالہ آپ جانتی تو ہیں انھیں اپنے دشمنوں کی وجہ سے پریشانی رہتی ہے۔“

راحت خالہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”دشمن انھیں کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ تو بس آپ کی وجہ سے پریشان تھے۔“

وہ خوشی سے چہکی۔ ”تو بیوی کے لیے شوہر کو پریشان ہونا پڑتا ہے نا خالہ!“

”بی بی جی خفا نہ ہوں تو ایک بات بولوں۔“

''کہو خالہ۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''صاحب جی!.....عورتوں کے معاملے میں مستقل مزاج نہیں ہیں۔''

''خالہ!.....جانتی ہیں آج تک آپ کے صاحب کو بیوی ملی ہی نہیں ہے۔ بازاری عورتیں کسی مرد کی جسمانی خواہشات کو تو وقتی طور پر پورا کر دیتی ہیں مگر وہ بیوی کی جگہ نہیں سنبھال سکتیں۔ ایک مرد کو صرف بستر کے ساتھی ضرورت نہیں ہوتی اس کی اور کئی ضروریات بھی ہوتی ہیں جنھیں ایک محبت کرنے والی بیوی ہی پورا کر سکتی ہے۔ بازاری اور ہر مرد کے بستر کی زینت بننے والی عورتوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ مرد کے ناز نخرے برداشت کر سکیں۔''

''گویا آپ کو لگتا ہے کہ آپ صاحب کو اپنے ہاتھ میں کر لیں گی۔'' راحت خالہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''میں انھیں بیوی اور کرائے کی عورت کے فرق سے آگاہ کروں گی، باقی یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' تناوش کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

''اللہ پاک آپ کو کامیاب کرے بی بی جی۔''

وہ ممنونیت سے بولی۔ ''ایسی دعائیں تو کسی اپنے کے لیے کی جاتی ہیں خالہ۔''

''آپ میرے لیے اپنوں کی طرح ہی ہیں بی بی جی۔'' راحت خالہ نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر اپنا سمجھتیں تو بی بی جی نہ کہتیں، بیٹی کہہ کر بلاتیں۔''

''اپنی حیثیت جانتی ہوں نا۔''

تناوش نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''حیثیت کا تعین پیشے سے نہیں کردار سے ہوتا ہے خالہ جان۔''

''اللہ پاک آپ کو خوش رکھے بیٹی۔'' راحت خالہ جذباتی ہو گئی تھی۔

''شکریہ خالہ جان۔ اور معذرت خواہ ہوں کہ آج صبح میں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈانٹ دیا۔ بس یونہی غصہ آ گیا تھا۔''

''نہیں بیٹی!.....آپ کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ مجھے برتن دھو کر رکھنے چاہیے تھے، مگر جب کوئی نگران نہیں

ہوتا تو ملازم کام چور ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا اب فکر نہ کریں، میں آ گئی ہوں نا آپ کا ہاتھ بٹا دیا کروں گی، بلکہ کل سے باورچی خانے کی طرف سے آپ بالکل آزاد ہیں۔"

"نہیں بیٹی آپ تنگ پڑ جائیں گی۔" راحت خالہ محجوب سی ہو گئی تھی۔

وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "ان کے کاموں کی وجہ سے میں تنگ نہیں پڑتی خالہ جان۔"

"اللہ پاک آپ کے رشتے کو خوشیوں بھری طوالت دے۔" راحت خالہ نے خلوص دل سے دعا کی۔

"آمین۔" تناوش کے ہونٹوں سے بے ساختہ پھسلا۔ راحت خالہ معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ تناوش بھی خفیف انداز میں ہنس دی تھی۔

شام کی آذان سن کر وہ نماز پڑھنے چل دی۔ نماز پڑھ کر وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ کبیر دادا اب تک بے خبر پڑا تھا۔ غسل خانے میں گھس اس نے غسل کیا اور نئے کپڑے پہن کر سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میک کا سامان تو وہاں موجود نہیں تھا کہ وہ سجتی سنورتی۔ بس بالوں کو کنگھی کر کے اس نے خوشبو لگائی اور کبیر دادا کو اٹھانے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ نیم دراز ہوتے ہوئے وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ آنکھیں کھلتے ہی کبیر دادا کی نظریں دیوار سے لگی گھڑی کی طرف اٹھیں۔ وقت دیکھتے ہی اس نے منہ بناتے ہوئے بیزاری بھرے لہجے میں کہا۔

"ساڑھے سات بجنے میں بیس منٹ رہتے ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "تو کس نے کہا آپ اٹھ جائیں، لیٹے رہیں۔"

"اور یہ جو میرے سر میں ہل چلا رہی ہو اس کا کیا؟"

"آپ کو جگانے کے لیے ایسا کر رہی ہوں، اٹھانے کے لیے نہیں۔ چند منٹ میرا بھی تو حق بنتا ہے کہ آپ کے ساتھ لیٹ کر دو باتیں کر لوں۔"

"تمہارے ناز اور لاڈ اٹھانے کے لیے نہیں لایا ہوں محترمہ۔"

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ "تو کس نے کہا ہے میرے ناز اٹھائیں، میں ناز اٹھانے آئی ہوں اٹھوانے

نہیں۔"

کبیر دادا جھلاتے ہوئے بولا۔"پھر وہی رومانس۔"

وہ کہاں باز آنے والی تھی۔شرارتی لہجے میں بولی۔"جو پیارا لگتا ہے نا،اس سے رومانس جھاڑا جاتا ہے جناب۔"

"تو میں تمھیں پیارا لگتا ہوں۔" کبیر دادا نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں گھورا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے۔"اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھیں کبیر دادا کی جانب اٹھائیں جن میں چاہت کا سمندر موجزن تھا۔

"دماغ کام نہیں کر رہا تمھارا۔"اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کبیر دادا کو کچھ ہونے لگا تھا۔وہ نظریں چراتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

مگر اس کے بیڈ چھوڑنے سے پہلے تناوش نے اسے کندھے سے پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے دوبارہ تکیے پر لٹا دیا۔"ابھی تک ساڑھے سات نہیں بجے،آپ بستر کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

"یہ چونچلے مجھے بالکل پسند نہیں سمجھیں۔" کبیر دادا نے اسے دور دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح اس سے چمٹ گئی تھی۔

"کیوں اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ آپ دو منٹ مجھ سے باتیں کر لیں۔"

وہ دق ہوتے ہوئے بولا۔"تو باتیں کرنے کے لیے اور وقت نہیں ملے گا۔"

"کس وقت ملے گا،کھانا کھا کر آپ گھر سے نکل جائیں گے اور پھر معلوم نہیں بارہ بجے لوٹیں گے یا اس سے بھی دیر کر دیں۔البتہ وعدہ کریں کہ دس گیارہ تک لوٹ آئیں گے تو جانے دیتی ہوں۔"

"دماغ درست ہے تمھارا،کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکالنا شروع کر دیے ہیں۔" کبیر دادا کو سچ مچ تپ چڑھ گئی تھی۔"دور ہٹو۔"اس نے سختی سے اسے دور جھٹکا۔

"بس پانچ منٹ اور،ساڑھے سات بجے چلے جانا۔" وہ ڈھیٹ پن سے اس سے چمٹی رہی۔

"اف.....اٹھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کبیر دادا نے سر پکڑ لیا تھا۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں

تھا کہ ایک ہی دن میں وہ اتنی بے تکلف ہو جائے گی جیسے برسوں کی آشنا ہو۔ کبھی کبھی تو اسے یونہی محسوس ہونے لگتا جیسے وہ واقعی میں اس کی محبوبہ ہو۔

''اتنے ہی تنگ پڑ رہے ہیں تو یہ لیں جائیں۔'' وہ روٹھتے ہوئے اس سے دور ہو گئی۔

''شکریہ۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب براہ مہربانی چند دن ناراض ہی رہنا۔''

مگر اس کے غسل خانے میں گھستے ہی وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے لیے استری شدہ سوٹ نکال کر اس نے باہر لٹکایا اور خود کھانا لینے چل دی۔ راحت خالہ اسے باورچی خانے ہی میں نظر آئی تھی۔

''خالہ جان! آپ جائیں آرام کریں۔ بتایا تھا نا جب تک میں یہاں ہوں آپ باورچی خانے کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔''

''مگر بیٹی.....'' اس نے فکرمندی سے کچھ کہنا چاہا۔

تناوش قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''بحث کو چھوڑیں خالہ جان!..... میں یہ سب اپنی خوشی سے کر رہی ہوں۔''

''خوش رہو بیٹی۔'' وہ دعا دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔ تناوش چولھے پر توا رکھ کر جلدی جلدی روٹیاں ڈالنے لگی۔ روٹیاں پکا کر اس نے کھانے کے برتن ٹرالی میں سجائے اور خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ راحت خالہ نے اسے بتایا تھا کہ کبیر دادا کھانا وغیرہ کمرے ہی میں کھاتا ہے۔ ڈائننگ ہال کا وسیع کمرہ صرف مہمانوں کی آمد پر استعمال ہوتا تھا۔

اس کے کھانا لگانے تک کبیر دادا بھی تیار ہو کر آ گیا تھا۔ اسی وقت تپائی پر رکھے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ کبیر دادا نے رسیور اٹھایا۔

چوکیدار نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ''سر!..... اخلاق حسین شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بھیج دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مختصراً کہتے ہوئے اس نے رسیور واپس رکھ دیا۔

''میرا مہمان آ گیا ہے تم کھانا کھا لو میں بعد میں کھا لوں گا۔'' تناوش کا جواب سنے بغیر وہ ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بس خفا نظروں سے اسے گھورتی رہ گئی تھی۔

خواب گاہ سے نکلتے ہی اسے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہوا اخلاق حسین نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ندامت بھری مسکراہٹ تھی۔ کبیر دادا نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھیں شاہ جی!''

''شکریہ۔'' کہتے ہوئے اس نے صوفے پر نشست سنبھالی۔ ''بھابی نظر نہیں آ رہیں۔''

''ہاں وہ کمرے میں ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے تناوش کو پکارا۔

وہ دروازے کی درز سے آنے والے کو جھانک رہی تھی۔ کبیر دادا کی آواز سنتے ہی اس نے پیچھے ہو کر سر پر دوپٹا درست کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''اسلام علیکم بھائی جان!'' قریب پہنچ کر اس نے دھیمے لہجے میں اخلاق حسین کو سلام کہا۔

''وعلیکم اسلام!'' اخلاق حسین نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے آپ میری بیٹی کی ہم عمر ہو، مگر کبیر بھائی کی وجہ سے آپ کو بھابی ہی کہنا پڑے گا۔''

''جی بھائی جان!'' وہ مسکرا دی تھی۔

''آپ کی شادی پر تو آ نہیں سکا کہ آپ نے جھٹ پٹ میں سب کچھ کر لیا۔ بہ ہر حال میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمالیں۔'' اخلاق حسین نے خوب صورت پیکنگ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی بھائی جان۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے کبیر دادا کی طرف دیکھا۔ اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے وہ پیکٹ پکڑ لیا۔ ''شکریہ بھائی جان۔''

''جیتی رہو۔'' اخلاق حسین نے بہ ظاہر اخلاص بھرے لہجے میں کہا، مگر نہ معلوم کیوں تناوش کو اس کے لہجے میں خلوص کی سخت کمی محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' کبیر دادا نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا اور وہ سر جھکائے خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی

۔اس کے خواب گاہ میں غائب ہونے تک اخلاق حسین کی آنکھیں اسے گھورتی رہیں۔

کبیر دادا کے گلا کھنکارنے پر اخلاق حسین نے گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا اور خفیف ہوتے ہوئے بولا ۔''ویسے بھابی کچھ زیادہ کم عمر نہیں ہے۔''

''غور نہیں کیا۔'' کبیر دادا بے پروائی سے بولا تھا۔

''اچھا میں دو کاموں کے لیے حاضر ہوا تھا، ایک تو کل رات میرے ہاں چھوٹی سی تقریب ہے آپ کو اپنی بیگم کے ساتھ حاضری دینا ہوگی اور دوسرا کام آپ کو معلوم ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ واضح انداز میں بھابی سے معذرت کروں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے شاہ جی! اگر آپ مجھے اسی وقت روک کر اپنے الفاظ واپس لے لیتے تو مجھے ضد پر جری نہ پاتے۔''

''شکریہ۔'' اخلاق حسین اٹھتے ہوئے مسکرایا۔''ویسے ایسی لڑکی کے لیے اتنا غصہ کرنا تو بنتا ہے۔''

''کھانے کا وقت ہے۔'' کبیر دادا نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

''کھانا کل رات اکٹھا کھائیں گے، اس وقت میں کسی دعوت میں جا رہا ہوں آپ کی دعوت ادھار رہی ۔'' کبیر دادا سے الوداعی مصافحہ کر کے وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی کار کا عقبی دروازہ کھول دیا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی وہ نوشاد آفریدی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''سنائیں شاہ جی!'' وہ شاید اس کی کال ہی کا منتظر تھا کہ پہلی ہی گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی تھی۔

''اپنا نمبر بھکتا آیا ہوں اب کبیر دادا کی باری ہے۔''

''تفصیل سناؤ یار!'' نوشاد کے لہجے میں کچھ جاننے کی تڑپ تھی۔

''بس اسے شادی کی مبارک دی، اس فاحشہ کو چھوٹا سا تحفہ دیا اور واپس آ گیا۔''

''کیسی ہے۔'' اس مرتبہ نوشاد گل نے صاف طور پر منہ سے اگل دیا تھا کہ اسے کیا جاننے کی خواہش تھی۔

''سچ کہوں تو وہ کمینہ فضول میں پاگل نہیں ہوا جا رہا۔ اگر اس سے جھگڑا نہ ہوا ہوتا تب بھی اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد میں اس کے حصول کی کوشش ضرور کرتا۔'' اخلاق حسین نے اپنے دماغ میں چھپی غلاظت اگلی۔

''ہاہاہا۔'' نوشاد گل نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ''اب تو اس رکھیل کو دیکھنے کی خواہش اور بڑھ گئی ہے۔''

''امید ہے کل رات کی تقریب میں تمھاری یہ حسرت باقی نہیں رہے گی۔''

نوشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی انھی باتوں نے تو ہمیں آپ کا مرید بنایا ہوا ہے۔''

اخلاق حسین بھی کھل کھلا کے ہنس پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

''تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔'' خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی کبیر دادا کی نظر جوں کے توں پڑے ہوئے کھانے کے برتنوں پر پڑی۔

''آپ کی منتظر تھی۔''

کبیر دادا کو معلوم تھا کہ اس سے بحث بے کار ہے وہ خاموشی سے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ایک ہی دن تناؤش کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے لگنے لگا تھا، جیسے وہ اسے برسوں سے جانتا ہو۔ اس کا ہر عمل کبیر دادا کو پہلے سے پتا چل جاتا تھا۔ اس کے منھ سے نکلنے والے الفاظ کا مفہوم وہ ادائی سے پہلے جان جاتا تھا۔

اس نے سالن نکالنے کے لیے جونھی ڈونگے کو ہاتھ لگایا۔ اس کے ہاتھ سے ڈونگا جھپٹتے ہوئے وہ تیز لہجے میں بولی۔

''میں ڈال رہی ہوں نا۔''

''میرے پاس ہاتھ نہیں ہیں کیا۔''

وہ کہاں ہار ماننے والی تھی برجستہ بولی۔ ''ہاتھ پاؤں تو بیوی کے پاس بھی موجود ہوتے ہیں پھر وہ کیوں شوہر کی کمائی کھاتی ہے۔''

''غلط، آج کل کئی عورتیں نوکری پیشہ ہیں۔'' وہ بحث پر اتر آیا تھا۔

''ان میں اکثریت مجبور خواتین کی ہے اور جو شوقیہ نوکری کرتی ہیں انھیں شوہر کی پرواہی نہیں ہوتی۔''

کبیر دادا اس پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔ ''تو بس تم بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لیے نوکری ڈھونڈ لو۔ کم از کم اس بہانے میری جان تو اس خدمت گزاری سے چھوٹ جائے گی۔''

”ہر کسی کا اپنا اپنا شوق ہوتا ہے اور میرا شوق آپ کی خدمت کرنا، آپ کا خیال کرنا اور آپ کے ناز نخرے برداشت کرنا ہے۔“ شوخی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے پہلا نوالہ کبیر دادا کے منہ کی طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ منہ کھولے بغیر اس نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”جب بتایا ہے اس طرح کے چونچلے مجھے بالکل پسند نہیں ہیں پھر تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خود نوالہ توڑنے لگا۔ تناوش نے اپنا ہاتھ پیچھے نہیں ہٹایا تھا۔ جونہی اس نے نوالہ منہ کی طرف لے جانا چاہا تناوش نے بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا چہرے پر غصہ طاری کرتے ہوئے کبیر دادا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرائے بغیر بولی۔ ”ہر بات پر ضد کرنا اچھی عادت نہیں ہے۔“

”ضد نہیں کر رہا تمھاری بچکانہ حرکتوں پر غصہ آجاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے تناوش کے ہاتھ میں پکڑا نوالا منہ میں لے لیا تھا۔

تناوش نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کبیر دادا کا دایاں ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے منہ کی طرف لے جانے لگی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ کبیر دادا نے اسے روکنے کی واجبی سے کوشش کی مگر وہ تناوش ہی کیا جو مان جائے۔ اپنا سر جھکا کر اس نے کبیر دادا کے ہاتھ میں موجود نوالہ اپنے منہ میں لیا اور اس کے ساتھ اس کی انگلیاں بھی منہ میں ڈال لی تھیں۔

نوالہ چباتے ہوئے وہ شوخی سے بولی۔ ”جو بچے پیار کی زبان نہیں سمجھتے ان سے زبردستی کام لینا پڑتا ہے۔“

کبیر دادا اسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہ گیا تھا۔

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ”اب خود کھانا شروع کریں مجھ سے دوسرے نوالے کی امید نہ رکھیے گا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی کبیر دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اور اگر میں کہوں کہ سارا کھانا ہی تمھارے ہاتھوں سے کھانا ہے پھر؟“

”سچ۔“ وہ جیسے خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ لگتے ہوئے وہ وارفتگی سے بولی۔ ”میں حاضر ہوں نا۔“ یہ کہتے ہی اس نے دوسرا نوالہ کبیر دادا کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی بے ساختہ خوشی نے کبیر دادا کو حیران کر دیا تھا۔ خلوص کسی تعارف کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ محبت کو اظہار

کی حاجت نہیں ہوتی۔ چاہت الفاظ کا سہارا نہیں لیتی۔ عشق خوشبو کی طرح نظر آئے بغیر اپنی موجودی کا یقین دلا دیا کرتا ہے، پیار پھول کی طرح گونگا ہو کر بھی اپنی کشش میں جکڑ لیتا ہے۔ کبیر دادا نے بھی اس کے شرارتی لہجے کو دیکھتے ہوئے مذاق کیا تھا، مگر تناوش کے چہرے پر امڈ پڑنے والی بے پایاں خوشی نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس سحر سے تب باہر آیا جب تناوش اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا چکی تھی۔

''اچھا اب بس کرو اور خود بھی دو نوالے لو۔'' پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے سیر ہو جانے کا اعلان کیا۔

وہ خوشی سے چہکی۔ ''مجھے تو لگ رہا ہے یہ سارا کھانا میرے ہی پیٹ میں گیا ہے۔''

کبیر دادا نے منہ بنایا۔ ''احمقوں کے سینگ تو نہیں ہوتے۔''

وہ شوخی سے گنگنائی.....

ایک ہی کو احمق کہنا کوئی بڑا الزام نہیں

دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

''کیا تمھیں حقیقت میں ایسا ہی لگتا کہ میں تمھیں محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر لے آیا ہوں۔'' کبیر دادا ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی.....

ع کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

''اگر جانتی ہو تو پھر ہر وقت رومانس کا بھوت خود پر سوار نہ رکھا کرو۔'' اس مرتبہ کبیر دادا کی بات کا جواب دیے بغیر وہ کھانا کھاتی رہی۔ کبیر دادا میٹھا کھانے لگا۔ دو تین چمچ لے کر وہ گلے میں مفلر کی طرح لٹکی ہوئی ٹائی باندھنے لگا تھا۔

تناوش نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی ٹائی باندھنا سکھا دو۔''

''کیوں..... کیا سوٹ پہننے کا شوق ہے؟''

''نہیں، آپ کی ٹائی میں خود باندھا کروں گی۔''

''میں باندھ سکتا ہوں۔'' وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بار بار یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کیا کیا کر سکتے ہیں۔ میں محتاج یا معذور سمجھ کر آپ کے کام نہیں کرتی۔“

اس کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا مگر کبیر دادا کو غصہ آ گیا تھا۔ ”جب مجھے ضرورت نہیں ہے تمھاری خدمت کی تو کیوں اپنی توانائیاں ضائع کرتی ہو۔“

اس کے سامنے کھڑے ہو کر تناوش نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور جب معلوم ہے کہ میں یہ سب کرنے سے باز نہیں آؤں گی تو آپ کیوں نہیں اپنی ضد چھوڑ دیتے۔“

وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ”ضد چھوڑوں گا یا نہیں تمھیں ضرور چھوڑ دوں گا۔“

”شاید مجھے ڈرا کر خوشی ملتی ہے۔“ دکھی لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے قریب ہوئی اور منہ ہی منہ کچھ بڑبڑا کر اس نے کبیر دادا کے چہرے اور چھاتی پر پھونکا۔

کبیر دادا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”اب جاؤں یا کوئی اور وظیفہ رہ گیا ہے۔“

وہ لجاجت سے بولی۔ ”پلیز، جلدی آنے کی کوشش کرنا، مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

”تو ٹی وی دیکھ لینا، ڈی وی ڈی پر فلم دیکھ لینا نہیں تو نیند کی گولیاں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف مڑ گیا۔

تناوش نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اتنا ہی کہہ دیتے کہ کوشش کروں گا تو کوئی خوش ہو جاتا۔“

دروازے کے قریب رکتے ہوئے اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”کسی کو خوش کرنا میری عادت نہیں ہے۔“

وہ شوخی سے بولی۔ ”اچھی عادت، ڈال لینی چاہیے۔“

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ”اچھی عادتیں، اچھوں کے ساتھ جچتی ہیں۔“

”اپنی اچھائی کا مجھ سے پوچھیں۔“

”رہنے دو۔“ منہ بناتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

محافظوں کو اس کی روزمرہ معلوم تھی۔ گاڑیاں تیاری حالت میں کھڑی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی

نظریں ڈرائینگ روم کے دروازے کی جانب اٹھیں۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کے آگے بڑھنے تک وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ رہا۔

☆.....☆.....☆

تمام اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

''بیٹھو یار!'' کبیر دادا نے پاشا کے پہلو میں نشست سنبھالتے ہوئے تمام کو بیٹھنے کا کہا۔

''تو کیا نئی تازی ہے۔'' کاشف راجپوت نے ہاتھ میں پکڑے جام سے گھونٹ بھرا۔

''نئی تازی تو کافی ہیں۔'' بوتل اٹھا کر وہ اپنے لیے گلاس بھرنے لگا۔

اسد خان نے قہقہہ لگایا۔ ''ہم تک تو بس آپ کی شادی کی خبر پہنچی ہے۔''

کبیر دادا نے پوچھا۔ ''آج دن کو شہاب قصوری نے آپ لوگوں میں سے کسی کو میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔''

پاشا نے کہا۔ ''نہیں۔'' باقی کے سر بھی نفی کے اظہار میں ہل گئے تھے۔

کبیر دادا نے پر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے اخلاق حسین شاہ نے بس اپنے ہمدردوں ہی کو اکٹھا کیا ہوا تھا۔''

اسد خان نے کہا۔ ''کبیر دادا!..... بھارتوں کے بجائے تفصیل سے بات کریں۔''

اس مرتبہ کبیر دادا نے اپنی شادی کے بعد ہونے والی ساری گفتگو دہرا دی۔

''تو اس میں سراسر اخلاق حسین غلطی پر ہیں۔'' پاشا نے فوراً اس کی طرف داری کی۔

''بہ ہر حال فی الحال تو اخلاق حسین نے معذرت کر لی ہے، مگر مجھے اس کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ مجھے شک ہے، اخلاق حسین، ایس پی ضمیر، نقیب اور نوشاد آفریدی اندر ہی اندر کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج کی میٹنگ میں بھی آپ سے کسی کو نہیں بلایا گیا تھا۔''

''ایس پی ضمیر اوڈھو آج میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کبیر دادا بغاوت پر اتر آیا ہے ہمیں اس کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔'' فصیح الدین نے انکشاف کیا۔

''میرے پاس نوشاد خان آفریدی آیا تھا اور ایسا ہی کچھ کہہ رہا تھا۔'' شیر خان ہونٹوں میں سگار دبا کر

لائیٹر کا شعلہ دکھانے لگا۔

اسد خان نے کہا۔ ''نقیب اللہ جان کے ساتھ میرے کافی اچھے تعلقات ہیں اور اس نے مجھے یہ ساری باتیں اس انداز میں سنائی ہیں جس میں سراسر کبیر دادا کی غلطی نظر آ رہی تھی۔''

کبیر دادا نے کاشف راجپوت اور پاشا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، مگر دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کبیر دادا معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اگر میں غلطی پر تھا تو اخلاق حسین معذرت کرنے کیوں میرے گھر آیا تھا۔''

شیر خان بولا۔ ''نوشاد آفریدی کہہ رہا تھا، چونکہ وہ لڑائی جھگڑا نہیں چاہتے اس لیے حق پر ہوتے ہوئے بھی اخلاق حسین شاہ کو آپ کے پاس جانا پڑے گا۔''

کبیر دادا صورت حال پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ میں سے کسی کو میٹنگ میں کیوں نہیں بلایا گیا؟ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ جن سے میرے اچھے تعلقات ہیں یا جو کسی کی بھی طرف داری نہیں کرتے انھیں ایسی میٹنگ سے دور رکھا جائے۔ دوسرا اگر وہ لڑائی جھگڑا نہیں چاہتے تو میری بیوی کے بارے ایسی بکواس کیوں کی؟ تیسرا اپنے تعلق والے لوگوں سے مل کر میرے خلاف زہر اگلنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی، اگر میں غلطی پر تھا تو تمام کو بلا کر میری غلطی کو سامنے لایا جاتا۔''

''اب آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟'' پاشا مستفسر ہوا۔ وہ کبیر دادا کا شاگرد اور اچھا دوست تھا۔

کبیر دادا نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی کسی کی طرف داری تو چاہیے ہوگی۔ یوں اکیلا میں تمام کا مقابلہ کر بھی لوں تو اپنا زیادہ نقصان کرا بیٹھوں گا۔''

فصیح الدین بولا۔ ''مگر دھمکی آپ نے دی ہے کبیر دادا۔''

کبیر دادا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''اگر کوئی کرن بھابی کے متعلق ایسی بات کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟''

فصیح الدین صاف گوئی سے بولا۔ ''مگر ان تمام کو لگتا ہے کہ وہ لڑکی آپ کی بیوی نہیں رکھیل ہے۔ اور ایسی لڑکی کے لیے کسی گینگ کے سربراہ پر ہاتھ اٹھانا غلط ہے۔''

کبیر دادا تیکھے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو صرف ایس پی ہی ملا ہے وہ تمام کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے۔“

فصیح الدین بغیر لگی لپٹی بولا۔ ”اس کا کہنا ہے، شہاب قصوری کے سامنے آپ نے اعتراف کیا ہے کہ یہ لڑکی صرف چند دن کی مہمان ہے اور یہ کہ چونکہ آپ کی آغوش میں آنے کے لیے اس نے نکاح کی شرط پیش کی تبھی آپ نکاح پر راضی ہوئے ہیں اور اس نکاح کا مقصد بس اس کا عارضی حصول ہے۔“

کبیر دادا نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک مذاق تھا۔ شہاب صاحب نے مجھے نکاح کی بابت چھیڑا اور میں نے کہہ دیا کہ اگر کوئی لڑکی نکاح کے بعد ہی میرے پاس آنا چاہتی ہے تب مجھے چند بول پڑھوانے میں کیا ہرج ہو سکتا ہے۔“

اسد خان مستفسر ہوا۔ ”کیا واقعی آپ اس لڑکی کے لیے سنجیدہ ہیں۔“

کبیر دادا نے کہا۔ ”اہمیت، تعلق کی نوعیت کی ہوتی ہے نہ کہ طوالت کی، فی الحال وہ میری بیوی ہے اور میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔ باقی آپ میں سے جس جس کی شادی ہوگئی ہے ان سے کسی نے یہ تصدیق نہیں چاہی ہوگی کہ وہ کب تک بیوی کو اپنے پاس رکھیں گے۔ میں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری خانگی زندگی زیر بحث لائے۔ اور اس کے بعد وہ لڑکی جب تک میرے گھر میں ہے اگر اس کے بارے کسی نے غلط لفظ منہ سے نکالا تو مجھ سے کوئی اچھی امید نہ رکھے۔“

”شاید آپ دھمکی دے رہے ہیں۔“ فصیح الدین نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

کبیر دادا نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”بھلائی کی بات کی ہے اس لیے اسے نصیحت یا مشورہ سمجھیں گے تو غصہ نہیں آئے گا۔“

”انداز تو نصیحت والا نہیں ہے۔“ شیر خان کو بھی کبیر دادا کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

”شیر خان!..... آپ نے ثمینہ بیگم کے لیے چار آدمیوں کی عدم آباد کی ٹکٹ کاٹی تھی، حالانکہ وہ اس وقت تک آپ کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی۔ اور یہ نہ کہنا کہ مجھے اس پر اعتراض ہے، میرا گلہ صرف یہ کہ میں جس لڑکی سے نکاح پڑھوا چکا ہوں اس کے لیے کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔“ کبیر دادا نے افسوس ظاہر کیا۔

”کبیر دادا!..... آپ اس لڑکی کے لیے چار افراد کو قتل کر چکے ہیں اور ہمیں اس پر اعتراض بھی نہیں ہے

ہمیں تو یہ شکوہ ہے کہ آپ نے ایک گینگ کے سربراہ کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ اب وہ بدلہ لینے کے آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرے گا تو یقیناً لڑائی چھڑ جائے گی اور ایسی لڑائی میں نقصان کس کا ہوگا؟" فصیح الدین ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر تمام پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے گویا ہوا۔ "ہم سب کا اور ہم آپ کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

کبیر دادا اس کی دلیل سے متفق نہیں تھا۔ "تو اس بارے اخلاق حسین کو بھی سوچنا چاہیے تھا۔"

اسد خان بولا۔ "اس نے غلط کیا ہے، مگر آپ کو نقصان پہچانے کی کوشش نہیں کی۔ آپ بھی اس کی کسی منظور نظر کو اٹھا لیتے۔"

کبیر دادا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس کی بیٹی بھی جوان ہے۔"

"کبیر دادا! آپ اس کی عزت اچھال رہے ہیں۔" فصیح الدین معترض ہوا۔

"تو میری کوئی عزت نہیں ہے۔"

"ایک ایم این اے اور گینگ کے سربراہ کی بیٹی اور ایک بازاری لڑکی کے درمیان فرق تو آپ جانتے ہوں گے۔"

"فصیح الدین! تمھیں شاید معلوم نہیں کہ وہ بازاری نہیں خاندانی لڑکی ہے اور یقیناً اخلاق حسین کی بیٹی سے کئی گنا عزت دار، شریف اور باکردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میری منکوحہ بن کر ہی میری خوب گاہ میں داخل ہوئی ہے۔ تمھیں سمجھا اس لیے رہا ہوں کہ میرے مہمان بن کر بیٹھے ہو۔ اور تم اس لیے کہا کہ آپ کا لفظ تم جیسے کے ساتھ لگانا مناسب نہیں لگتا۔"

فصیح الدین ہاتھ میں تھاما گلاس میز پر رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "شکریہ اور اب ایسی جگہ بات ہوگی جہاں تمھارے پاس یہ بہانہ موجود نہ ہو کہ میں تمھارے گھر میں بیٹھا ہوں۔"

"آپ لوگ تو لڑنے لگے۔ فصیح الدین صاحب پلیز بیٹھیں۔" کاشف راجپوت نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

راجپوت صاحب!.....اب ہم کسی کو شمشیر دادا بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کل شہاب قصوری کے

ہاں اس مسئلے پر تفصیلی بات چیت ہوگی۔اور جو غلطی پر ہوا اسے معافی مانگنا پڑے گی یا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

''شاید ہمیں بھی چلنا چاہیے۔'' اسد خان نے خیال ظاہر کیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' شیر خان نے اس کی تائید کی تھی۔

''کیا میں نے غلط بات کی ہے۔'' کبیر دادا اسد خان اور شیر خان کی طرف متوجہ ہوا۔

اسد خان نے کہا۔''اگر بات غلط نہیں بھی تھی تو انداز ضرور غلط تھا۔''

''آنے کے لیے شکریہ۔'' کبیر دادا نے کھڑے ہو کر دونوں سے مصافحہ کیا۔وہ دونوں بھی وہاں سے نکل گئے۔البتہ کاشف راجپوت اور پاشا وہیں بیٹھے رہے۔ان کے جاتے ہی پاشا نے کہا۔

''اگر تھپڑ کی امان پاؤں تو ایک بات کہوں کبیر دادا۔'' وہ کبیر دادا کا شاگرد تھا اور اس سے کافی بے تکلف تھا۔ کبیر دادا کی اجازت ہی سے اس نے علاحدہ گینگ بنایا تھا۔

کبیر دادا نے منہ بنایا۔''ایک تم ہی رہ گئے ہو، کہہ لو۔''

''کیا واقعی میں وہ آپ کو بہت پیاری ہے۔''

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' کبیر دادا نے نفی میں سر ہلایا۔''اگر اخلاق حسین نے بے غیرتی نہ کی ہوتی تو شاید آنے والی صبح اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس بھیج دیتا۔اب میری انا کا مسئلہ آڑے آرہا ہے۔مجھے اس لڑکی کی نہیں اپنی پروا ہے۔کیونکہ ایک ایسی لڑکی جسے میں عارضی طور پر سہی لیکن بیوی کا درجہ دے چکا ہوں اس پر کوئی ہاتھ ڈالے یہ میری غیرت کو گوارا نہیں۔اگر میں اسے نکاح پڑھا کر نہ لایا ہوتا تو یقیناً اتنا سخت ردعمل ظاہر نہ کرتا۔''

پاشا بغیر لگی لپٹی بولا۔''آپ خود کو دھوکا دے رہے ہیں یا ہمیں۔''

''کیا مطلب؟'' کبیر دادا نے ناراضی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کبیر دادا میں نے علاحدہ گینگ ضرور بنا لیا ہے مگر کوشش کے باوجود آپ سے علاحدہ نہیں ہو پایا ہوں۔میں ہر دوسرے دن آپ کے محافظوں سے تفصیلی بات چیت کرتا ہوں، آپ کے بارے مکمل معلومات لیتا ہوں اور آپ کے محافظ بھی جانتے ہیں کہ میں کیوں آپ سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔اس لیے وہ کوئی بات نہیں چھپاتے

۔اور آپ نے کل جس کیفیت کے تحت یہ ساری کارروائی کی ہے اس سے ان واجبی ذہنیت کے محافظوں نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں۔ آپ کو اس حالت میں انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے نزدیک آپ لڑکی کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ اور یہ سچ ہے تو میں گزارش کروں گا کہ واپس لوٹ آئیں۔ آپ کا مقام اور شخصیت اس بات سے میل نہیں کھاتی کہ ایک لڑکی کے لیے بدنام ہو جائیں۔"

"راجپوت!..... آپ کو بھی یہی لگتا ہے۔" کبیر دادا نے خاموش بیٹھے کاشف سے پوچھا۔ کبیر دادا کی طرح وہ بھی شمشیر دادا کا شاگرد تھا۔ اور دونوں شروع دن سے دوست تھے۔

"ہاں۔" کاشف راجپوت نے بغیر ہچکچائے اعتراف کیا۔ "جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق تو یہی لگتا ہے۔ کبیر دادا اگر کسی کی خاطر یوں بے چین ہو کر خود ہی بھاگ پڑے تو اس کا مطلب یہی کہ اس شخص کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اب فصیح الدین کے ساتھ آپ کا سلوک اس بات کو مزید تقویت دے رہا ہے۔"

"یار!..... آپ لوگوں کے نزدیک بھی میری زبان کی کوئی اہمیت نہیں، کیا مجھے اس بات سے تکلیف نہیں ہونی چاہیے کہ ایک لڑکی کو میں بیوی بنا کر لایا ہوں اور مجھ سے کم حیثیت کا آدمی اسے اٹھا کر لے جائے یا اس کے بارے بکواس کرنا شروع کرے۔"

پاشا بولا۔ "آپ کے گینگ میں درجنوں ایسے افراد موجود ہیں جو اس کام کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتے تھے۔ اور اس سے پہلے بھی آپ اپنے آدمیوں ہی سے کام لیتے ہیں۔ البتہ کوئی بہت ہی اہم کام ہو تو آپ خود تشریف لے جاتے ہیں، گویا اس چھوکری کو لانا نہایت اہم تھا۔"

"کیا آج تھپڑ کھانے کا ارادہ کر کے گھر سے چلے تھے۔"

پاشا بے فکری سے بولا۔ "مار لو کبیر دادا!..... ابھی تک میری عادات تبدیل نہیں ہوئیں۔"

"آپ لوگ کیوں اسے میری محبوبہ بنانے پر تلے ہیں؟" وہ جھلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

پاشا نے اس کے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ "کبیر دادا!..... اخلاق حسین نے معذرت کر کے اس لڑکی کو آپ کی بیوی تسلیم کرتے ہوئے گویا سرنڈر کر دیا ہے۔ اب وہ جھگڑا ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد ہمیں بلا کے یہ سارا قصہ دہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ کے نزدیک اس لڑکی کی اہمیت نہیں تھی اور آپ اس ٹنٹنے کو ختم

کرنا چاہتے تھے تو اسی وقت اخلاق حسین کے سامنے ہی اسے طلاق دے کر کہتے بس آپ کی ضد پوری ہو گئی ، یقیناً اخلاق حسین بھی خوش ہو کر کسی انتقامی کارروائی سے باز آ جاتا۔"

کبیر دادا نے منہ بنایا۔ "نہ میں کسی انتقامی کارروائی سے ڈرتا ہوں اور نہ مجھے کسی تھرڈ کلاس انسان کو خوش کرنے میں دلچسپی ہے۔"

پاشا وثوق سے بولا۔ "یقیناً آپ کسی سے نہیں ڈرتے ، لیکن جھگڑا تو آپ بھی نہیں چاہتے اسی وجہ سے آپ نے ہمیں بلایا تا کہ دونوں طرف گروپوں کی تعداد برابر رہے ، مگر فصیح الدین کے اس لڑکی کے خلاف ذرہ سا بات کرنے پر آپ بھڑک اٹھے اور امن برقرار رکھنے کی ساری کوششوں کو ٹھوکر مار دی ، کیونکہ وہ آپ کو بہت عزیز ہے۔"

"بھاڑ میں جائے وہ..... فضول باتیں نہ کیا کرو۔" کبیر دادا آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

پاشا گھبرائے بغیر بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے ، یوں ہے کہ آپ آج رات اس لڑکی کے ساتھ شغل کریں اور صبح سویرے کچھ دے دلا کر اسے چلتا کر دیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

کبیر دادا پر خیال لہجے میں بولا۔ "اخلاق حسین اسے تنگ کرے گا۔"

تو کرتا رہے۔" پاشا بے پروائی سے بولا۔ "آپ کی ذمہ داری دلاور شیخ تک محدود تھی ، اسے پورے پاکستان کے مردوں سے بچانے کا ٹھیکا آپ نے نہیں لے رکھا۔ آپ اس کے باڈی گارڈ نہیں ایک گینگ کے سربراہ ہیں۔ خود کو اتنا ہلکا نہ کریں کہ ایک چھوکری کے لیے دوسروں کے ساتھ لڑائی جھگڑا مول لیتے رہیں۔"

"وہ بہت مظلوم ہے یار!" کبیر دادا کا تھکا ہوا لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے پاس دلائل ختم ہو چکے ہیں۔

"یقیناً وہ پاکستان میں اکیلی مظلوم نہیں ہے ، بلکہ کئی مظلوم تو آپ کے ظلم کا نشانہ بن چکے ہوں گے۔ آپ امام مسجد یا تبلیغی جماعت کے مبلغ نہیں ایک گینگسٹر ہیں۔ کبیر علی خان نہیں کبیر دادا ہیں۔ اور دادا کا لفظ آپ کی عمر نہیں عہدے کو ظاہر کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے یار ، دماغ خراب نہ کرو صبح اسے بھیج دوں گا۔" وہ اپنے لیے دوسرا گلاس بھرنے لگا۔

کاشف راجپوت اور پاشا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

کاشف نے کہا۔ ''اب ہمیں بھی اجازت دیں چند ضروری کام نبٹانے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جائیں، کل شہاب قصوری کے ہاں ملاقات ہوگی۔''

پاشا خلوص سے بولا۔ ''دادا!..... میں جانتا ہوں کہ آپ اکیلے بھی ان تمام کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں وعدہ کرتا ہوں ہمیشہ ہمیں اپنے دائیں بائیں ہی پائیں گے۔''

''جانتا ہوں۔'' کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان کے جانے کے دو تین منٹ بعد اس کا سیکرٹری عظیم اجازت مانگ کر اندر داخل ہوا۔

''دادا!..... ساحل والے اڈے پر جانا ہوگا دو دن سے نہیں جا سکے ہیں۔''

کبیر دادا نے دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑائی سوئیاں ساڑھے دس بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ اپنے محافظوں کے نام لیتے ہوئے بولا۔ ''امتیاز، باقر وغیرہ کو ساتھ لے جاؤ میں واپس جا رہا ہوں۔''

''آپ اکیلے.....'' عظیم نے کچھ کہنا چاہا، مگر کبیر دادا کی تیز نظریں دیکھتے ہی گڑبڑا کر بات بدل دی۔ ''میرا مطلب ہے کار کے بغیر۔''

''سوزکی کھڑی ہے نا، اسی میں چلا جاؤں گا۔'' کبیر دادا نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اور عظیم سر ہلاتا ہوا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ صحن میں جاتے ہی اس نے امتیاز پارٹی کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

امتیاز نے کہا۔ ''کبیر دادا کو تو باہر نکلنے دو۔'' وہ چاروں صحن میں کرسیاں لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔

''کبیر دادا ساتھ نہیں جا رہے۔ وہ واپس گھر جا رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عظیم کبیر دادا کی کار کی طرف بڑھ گیا۔

''اتنی جلدی واپس جا رہے ہیں اور وہ بھی اکیلے۔'' باقر نے حیرانی سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے پتے میز پر پھینک دیے۔

بخش نے کہا۔ ''تو کیا..... دادا اکیلا بھی دس پندرہ افراد پر تو بھاری ہے۔''

''بھئی دادا تو گیا کام سے۔ دس بجتے ہی اسے نمازن کی یاد ستانے لگی۔'' باقر کی تقلید میں امتیاز بھی ہاتھ

جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''ویسے کیا کہتے ہو یہ عشق کب تک قائم رہے گا۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے امتیاز، بخش کی طرف متوجہ ہوا۔

بخش وثوق سے بولا۔ ''اتنی جلدی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ کم بخت بلا کی خوب صورت اور معصوم ہے۔ آج صبح لان میں نماز پڑھ رہی تھی پھر وہیں ٹہلتی رہی۔ دوپٹا بھی سر سے نہیں سرکنے دیتی۔ پتا نہیں ایک گینگسٹر کے ہاتھ کیسے چڑھ گئی۔''

رخسار نے خیال ظاہر کیا۔ ''ایسی لڑکیاں حد درجہ کی شوہر پرست ہوتی ہیں، خود سے تو اس نے کبھی طلاق نہیں مانگنا۔''

امتیاز منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''بات اس کی نہیں کبیر دادا کی مرضی کی ہے۔''

''وہ اپنے حواسوں میں کب ہے۔'' باقر نے قہقہہ لگایا۔ ''دیکھتے نہیں کس طرح دس بجتے ہی بھاگ پڑا ہے۔ جبکہ وہ نمازن صبح اور ابھی شام کو گھر سے نکلتے وقت باہر تک کبیر دادا کو رخصت کرنے آئی تھی۔ کار کے داخلی دروازے سے نکلنے تک وہیں کھڑی کبیر دادا کی طرف متوجہ رہی۔ دادا بھی بار بار مڑ کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے مجنوں، لیلیٰ کو دیکھا کرتا تھا۔''

تمام باقر کی بات پر کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

کار کے ہارن کی آواز کان میں پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بھاگتے ہوئے باہر نکل آئی۔ ڈرائینگ روم کے دروازے سے نکلتے ہی اس کی نظر سیمنٹ کی روش پر رکتی ہوئی سوزکی کار پر پڑی اور اس کی خوشی ایک دم ماند پڑ گئی تھی۔ وہ کبیر دادا کی گاڑی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ اکیلی کار میں سفر نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ دروازہ کھول کر طویل قامت کبیر دادا کار سے برآمد ہوا۔

اس کے مایوسی بھرے چہرے پر تبسم نمودار ہوا اور وہ وہیں جم گئی۔

کبیر دادا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ کار سے باہر نکل کر وہ جان بوجھ کر اس سے انجان بنتا ہوا چوکیدار کو مخاطب ہوا۔

"کار گیراج میں کھڑی کروادو۔"

"جی دادا!" کہہ کر چوکیدار ڈرائیور کو بلانے چل پڑا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں تناوش چہرے پر تبسم بکھیرے کھڑی تھی۔

"آ گئے آپ۔" اس کے قریب پہنچتے ہی وہ کبیر دادا کے بازو سے چمٹ گئی۔

"کہا تھا نا کہ تمھارے رومانس جھاڑنے سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

"ملازمین کے سامنے منع کیا تھا نا۔" شوخی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے بازو سے چمٹی رہی۔

"کالج کی یونیفارم کیوں پہنی ہوئی ہے، اور کپڑے نہیں ہیں کیا۔" کبیر دادا جانتا تھا کہ وہ باز آنے والی نہیں ہے۔ اس لیے موضوع تبدیل کر دیا۔

"کیوں نہیں ہیں، لیکن میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ یہ لباس مجھ پر بہت پھبتا ہے۔ اور ان کپڑوں میں میں زیادہ خوب صورت نظر آتی ہوں۔ پس اسی لیے پہن لیے۔"

"سچ ہی کہتی ہیں۔" کبیر دادا کے اندر کہیں دور سے ایک آواز ابھری جسے اس کے ہونٹوں تک رسائی حاصل نہیں ہو پائی تھی۔

اس نے منہ بنایا۔ "تو خوب صورت لگنے سے کیا ہوگا۔"

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ "بیوی کا مقصد اپنے شوہر کو خوش کرنا ہوتا ہے، سوچا شاید اس طرح آپ کو زیادہ پیاری لگوں۔"

"دماغ خراب ہے تمھارا۔"

"وہ تو ہے، اگر خراب نہ ہوتا تو آپ سے پیار کرتی۔"

"منت کس نے کی ہے۔" کبیر دادا کو جانے کیوں اس کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا۔ اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

تناوش کھل کھلاتے ہوئے قالین پر بیٹھ کر اس کے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ "غصے میں اور بھی پیارے لگنے لگتے ہیں۔"

''شٹ آپ۔'' اسے لگا تناوش اسے چڑا رہی ہے۔

''ایسا بھی کیا غلط کہہ دیا ہے۔'' اس کے بوٹ اتار کر ایک جانب رکھتے ہوئے تناوش اس کے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

وہ بیزاری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمھارے رومانس میں تھوڑا وقفہ آجائے تو میں لباس تبدیل کر لوں۔''

''کر لینا، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' اس کے ساتھ بیٹھ کر وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگی۔

''پڑھائی ہو رہی تھی۔'' میز پر بکھری کتابیں دیکھتے ہوئے اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔

''ہاں، سوچا آپ سے اجازت مانگ کر امتحان میں بیٹھ جاؤں گی۔ تین چار ہفتے بعد ہی امتحان شروع ہوں گے۔''

''تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''کلاسیں تو اب تک لگ رہی ہیں۔''

''صبح عظیم کو کالج کا نام پتا بتا دینا وہ تین چار دن کی چھٹی کرا دے گا، میرا مطلب تم نے یہاں دو چار دن ہی رہنا ہے اس کے بعد تو میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی نا۔'' یہ کہتے ہوئے کبیر دادا کو یاد آیا کہ وہ پاشا کو یہ کہہ کر آیا ہے کہ صبح اسے واپس بھیج دے گا۔ مگر تناوش کے سامنے آتے ہی اسے اپنا ارادہ کمزور پڑتا نظر آ گیا تھا۔

وہ کھل کھلاتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں بولی۔ ''آپ کی مرسڈیز میں بیٹھ کر امتحان دینے جایا کروں گی۔''

''بس شیخ چلی کی طرح منصوبے بناتی رہا کرو۔''

''خواب دیکھنے پر پابندی ہے کیا۔'' وہ اس مرتبہ اپنا دکھ چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کی بات کبیر دادا کو برچھی کی طرح لگی تھی۔ اس کی جانب سر گھماتے ہوئے وہ تسلی دیتا ہوا بولا۔

''ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں یہ مرسڈیز تمھاری ہوئی گھر جاتے ہوئے ساتھ لیتی جانا۔''

''مجھے مرسڈیز نہیں، مرسڈیز والا چاہیے۔'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''ناممکن ہے۔''

وہ بگڑ کر بولی ”میں یہیں رہوں گی کہیں نہیں جانے والی سمجھے آپ۔“

”دماغ خراب نہ کیا کرو۔“

”ٹھیک کب تھا۔“

”زیادہ بکواس نہ کرو مار کھاؤ گی۔“

”اچھا چھوڑیں نا جھگڑے کو، یہ بتائیں آج جلدی کیوں لوٹ آئے۔“

”میری پرچون کی دکان نہیں ہے کہ لگی بندھی روزمرہ ہوگی۔ کوئی ضروری کام نہیں تھا تو لوٹ آیا ہوں، ممکن ہے ابھی کال آجائے اور جانا پڑے۔“

”ابھی تو نہیں جانے دوں گی۔“ قریب ہو کر اس نے سر کبیر دادا کے کندھے پر رکھ دیا۔

”جانتی ہو تمھاری محبت جتانے اور چاہت کے اظہار پر مجھے اتنی کوفت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے بغیر لحہ ضائع کیے تمھیں گھر بھیج دوں۔“ بیزاری ظاہر کرتے ہوئے بھی کبیر دادا نے اسے دور نہیں دھکیلا تھا۔

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ”اگر وعدہ کریں کہ ایسا نہ کرنے پر مجھے گھر نہیں بھیجیں گے تو کبھی ایسا نہیں کروں گی۔“

”ابھی تک اس تحفے کو نہیں کھولا۔“ اچانک کبیر دادا کی نظر اخلاق حسین کے دیے ہوئے تحفے پر پڑی جو ویسے ہی پیک شدہ تپائی پر پڑا تھا۔

”آپ کا دوست بہ ظاہر تو اخلاق کا مظاہرہ کر رہا تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے دل سے یہ تحفہ نہیں دیا۔“

کبیر دادا کو اس چھوٹی سی لڑکی کے مشاہدے پر خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”صحیح سمجھا، وہ دوست نہیں ہے۔ بس دوستی کا نقاب پہن کر آیا تھا۔ حقیقت میں وہ میرا سب سے بڑا مخالف ہے۔“

تناوش اس کا بازو چھوڑ کر تپائی کی طرف بڑھی اور تحفے کو اٹھا کر کوڑا کرکٹ کی ٹوکری کی طرف اچھال دیا۔

”یہ کیوں؟“ کبیر دادا نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ بے پروائی سے بولی۔ ”دشمن سے میں زندگی کا تحفہ بھی قبول نہ کروں۔“

”وہ میرا دشمن ہے۔“ کبیر دادا نے اسے یاد دلایا۔

”کیا آپ کے دشمن کو میں خیر خواہ سمجھ سکتی ہوں۔“

کبیر دادا اس کی بات کا جواب دیے بغیر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش اپنی کتابیں سمیٹ کر اس کے پیچھے بڑھ گئی تھی۔ لباس تبدیل کر کے وہ شراب کی بوتلوں والی الماری کی طرف بڑھا۔ تناوش اس کے کپڑے ہینگر میں لٹکانے لگی۔

”الماری کو تالہ کس نے کیا ہے۔“

”میں نے۔“ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”بوتل نکال کر ریک پر رکھ دی ہے نا۔“

ریک سے بوتل اٹھا کر وہ صوفے پر آ بیٹھا۔ ”ایک اور بوتل بھی لے آؤ۔“

”ایک کافی ہے۔“ تکیے پر نیم دراز ہوتے ہوئے تناوش نے موشگافی کی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ گلاس منہ سے لگاتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے کہا ایک بوتل پر گزارہ کریں۔“

”دماغ جگہ پر ہے تمہارا یا کل والی بے عزتی بھول گئی ہے۔“

تناوش خاموشی سے اسے گھورتی رہی جواب دینے کی ضرورت اس نے محسوس نہیں کی تھی۔ کبیر دادا بھی مزید کچھ کہے پینے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بوتل خالی کر کے وہ اس کی طرف بڑھا۔

”چابی کہاں ہے؟“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

تناوش نے اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ ”بس کریں نا، ایک بوتل کافی ہے۔“

”دوں گا ایک۔“ غصے بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے تھپڑ تولا۔

”دھمکی نہ دیں، مار لیں۔“ تناوش نے اپنا رخسار اس کی جانب سیدھا کیا۔

”بکواس بند کرو..... چابی ادھر دو۔“ کبیر دادا کا غصہ بڑھنے لگا۔

"مجھے آدھا گھنٹا دو، اگر سلا نہ دیا تو پی لینا۔" کبیر دادا کو زبردستی بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے تناوش نے لگاوٹ ظاہر کی۔

وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ "آخر تمھیں مسئلہ کیا ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ جو دو دن یہاں ہوں مجھے بھی وقت چاہیے۔"

وہ دھاڑا۔ "نہیں ہو تم دو دن یہاں، صبح دفع کر دوں گا تمھیں۔"

"اتنا غصہ کرتے ہیں۔ ملازم سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ چھوٹی سی لڑکی کو ڈانٹ رہے ہیں آپ۔" وہ اسے بچوں کی طرح پچکارنے لگی۔

"چابی ادھر کرو۔"

"کہہ دیا نا نہیں دوں گی، روزانہ ایک بوتل پر گزارا کرنا پڑے گا۔"

کبیر دادا جانتا تھا کہ ایک تھپڑ کھا کر اس نے بے ہوش ہو جانا تھا۔ اور زبانی کلامی وہ مان کے نہیں دے رہی تھی۔ وہ لہجے میں تھوڑی نرمی پیدا کرتا ہوا بولا۔ "دیکھو تناوش، میرے کاموں میں مداخلت کرنا بند کر دو۔ میں اپنا اچھا برا جانتا ہوں۔"

"اگر اچھی چیز ہے تو میں بھی پیوں گی۔"

وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ "تو منع کس نے کیا ہے۔"

وہ کھل کھلا کے ہنسی۔ "کتنے برے ہیں آپ، چھوٹی سی بچی کو شراب پینے کا کہہ رہے ہیں۔"

"چابی ادھر کرو۔" کبیر دادا نے مطالبہ دہرایا۔

تناوش نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ "اچھا ایک منٹ بیٹھ کر میری بات تو سنیں نا۔"

"بولو۔" بادل نخواستہ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

تناوش نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زبردستی دھکا دے کر تکیے پر لٹایا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں سلا دیتی ہوں نا۔" گو کبیر دادا اس کے دھکے سے نیچے نہیں گر سکتا تھا مگر جانے کیوں اس نے اپنا بدن اس نرم و نازک لڑکی کے حوالے کر دیا۔ تناوش کی ہٹ دھرمی پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ غصے کا اظہار بھی اس

نے کیا مگر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا سکا۔ نہ تو اسے تھپڑ رسید کر سکا نہ زبردستی اس سے چابی چھین سکا اور آخر میں اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ لیٹ گیا، یہ سوچ کر کہ دو دن کے بعد یوں بھی چلی جائے گی۔ یا پھر یہ بھی اس کی غلط فہمی تھی۔ شاید وہ جانے کے لیے نہیں لے جانے کے لیے آئی تھی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگی، صورت کی طرح اس کی آواز بھی سریلی تھی۔ کبیر دادا کی آنکھیں اس بچے کی طرح بند ہونے لگیں جسے لوری سنائی جا رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

رات کو جلدی سونے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی پڑھائی میں مصروف تھی۔ گاہے گاہے اس کی نظریں کبیر دادا کی طرف بھی اٹھ جاتیں۔ اسے کسمسا کر اٹھتے دیکھ کر وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھی۔ لیموں نچوڑے پانی کا گلاس اس نے میز پر تیار رکھا ہوا تھا۔

"یہ لیں۔" گلاس پکڑاتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

کبیر دادا نے خاموشی سے گلاس کو منہ لگا لیا۔

"ناشتا لے آؤں یا اپنے وقت پر ناشتا کریں گے۔"

خالی گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔ "جاگ تو گیا ہوں، کیا کروں گا۔"

وہ معصومیت سے بولی۔ "مجھ سے باتیں۔"

"اتنا فالتو دماغ میرے پاس ہے نہیں جو تمھاری بے مزہ اور بے مطلب باتیں سنتا رہوں۔" کبیر دادا نے منہ بنایا۔

"اچھا میں نہیں کرتی باتیں، آپ کی سنوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" کہتے ہوئے کبیر دادا نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر پھینک دیا۔ تناوش نے اس کی کمر کے گرد بازو لپیٹنے کی کوشش کی مگر کبیر دادا نے اس کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔

"اچھا دور دور بیٹھ کر باتیں کر لیں گے۔" برا منائے بغیر اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کبیر دادا کا بازو پکڑ لیا۔

"بتایا تھا نا مجھے ایسی باتوں سے چڑ ہے، کوفت ہوتی ہے تمھاری حرکتیں دیکھ کر۔" اس کی گرفت سے بازو چھڑا کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اور تناوش ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے پہننے کے کپڑے وہ پہلے ہی الماری سے باہر لٹکا چکی تھی۔

ناشتا تیار ہونے تک وہ سوٹ پہن کر نکل آیا تھا۔ ٹائی حسب عادت اس نے مفلر کی طرح گلے میں ڈالی ہوئی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد ہی وہ ٹائی باندھا کرتا تھا۔ آج سویرے تیار ہونے کی وجہ سے اس نے بیٹھنے سے پہلے موبائل فون پر عظیم کو کال کر کے آدھے گھنٹے تک اپنی آمد کا بتا دیا تھا۔

بیٹھتے ساتھ اس نے میز پر سجے ناشتے کو دیکھ کر حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ پراٹھا اور انڈہ فرائی کس کے لیے؟"

"یہ میرا ناشتا ہے۔" اسے مطلع کرتے ہوئے وہ انڈہ چھیلنے لگی۔

"صبح سویرے اٹھ جاتی ہو تو اسی وقت کر لیا کرو۔"

"امی جان کہتی ہیں، بیویوں کو شوہر سے پہلے ناشتا وغیرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ یا بعد میں کرنا چاہیے۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ہنسی آتی ہے یہ فرسودہ باتیں سن کر۔"

"تو ہنس لیں۔" صاف انڈہ پلیٹ میں رکھ کر اس نے دوسرا انڈہ اٹھا لیا۔

"امی جان نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ شوہروں کو روکنا ٹوکنا نہیں چاہیے۔"

تناوش کے ہونٹوں پر شرارتی ہنسی نمودار ہوئی۔ "بتایا تو ہے، مگر ہر بات پر عمل تو نہیں کیا جا سکتا نا۔"

"جس دن تمھیں ایک تھپڑ بھی لگ گیا یہ شوخی شرارت بھول جائے گی۔"

"خیال رکھنا نازک سی ہوں، کہیں آپ کے تھپڑ سے جان ہی نہ نکل جائے۔" جوس کا گلاس بھرتے ہوئے وہ شوخی سے بولی۔

"اچھا ہے جلدی جان چھوٹے گی۔"

"کتنا شوق ہے جان چھڑانے کا۔" وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔

''ناشتا کرلو ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' اس کے چاہت جتانے پر کبیر دادا نے حسب عادت ناک بھوں چڑھائی۔

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر پہلا نوالہ آپ کھلائیں تو کر لیتی ہوں، ورنہ ناشتا نہیں کروں گی۔''

''بھاڑ میں جاؤ۔''

''جب آپ غصہ کرتے ہیں تو جی کرتا ہے.....'' وہ فقرہ پورا کیے بغیر ہنس پڑی۔

''کیا؟'' کبیر دادا نے اس کی طرف غصیلی نظروں سے گھورا۔

''چھوڑیں اگر بتا دیا تو آپ کچھ اور پیارے لگنے لگیں گے۔'' شرارتی لہجے میں کہتے ہوئے اس نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے مزید غصہ کر کے۔''

کبیر دادا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو تم میری ضد اور انا کی وجہ سے یہاں نظر آ رہی ہو، کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ ایک چھوکری کو میں اتنی اہمیت نہ دوں اور میں اپنی بات پر اڑ گیا۔ اصرار کرنے والے کافی بڑے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک کل تمھیں تحفہ دے کر بھی گیا ہے۔ اگر وہ تمام لوگ مجھے مجبور کرنے کی کوشش نہ کرتے تو یقین مانو تم کل کی گھر جا چکی ہوتیں۔''

''اچھا، میں یونہی انھیں اپنا دشمن سمجھے بیٹھی ہوں۔'' تناوش نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ ''جن کی وجہ سے میں یہاں ہوں وہ دشمن تو نہ ہوئے نا۔''

''تمھاری تو کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہے۔'' ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے وہ ٹائی باندھنے لگا۔

وہ سرعت سے بولی۔ ''ایک منٹ، ٹائی میں خود باندھوں گی۔''

''کل تو کہہ رہی تھیں تمھیں ٹائی باندھنے کا طریقہ نہیں آتا۔''

''گزشتہ رات آپ کے آنے سے پہلے یہی سیکھتی رہی تھی۔ اب آ گیا ہے طریقہ۔'' اعتماد سے کہہ کر وہ اس کے ٹائی باندھنے لگی۔ پہلی مرتبہ اس نے الٹی گرہ لگا دی۔ دوبارہ کھول کر اس نے سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر پھر الٹا کر دیا۔

اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''گھنٹا ایک لگ جائے گا۔''

''صبر کریں نا۔'' اس نے روہانسے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"یہ ایسے باندھتے ہیں۔" وہ تنگ آ کر اسے سمجھانے لگا۔

"اب نہیں بھولے گا۔" کبیر دادا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے گرہ لگا کر بچوں کے سے انداز میں خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اب ناشتا کر لو۔" وہ جانے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔

وہ مسکرائی۔ "بتا دیا نا، ایسے نہیں کروں گی۔" اس کے ساتھ کھڑے ہو کر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ کبیر دادا اس کی عادت سے واقف تھا خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔ اس کے چہرے اور چھاتی پر پھونک مارتے ہوئے وہ بولی۔ "جلدی آنے کی کوشش کرنا۔"

افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کبیر دادا چل پڑا۔ اس کے بار بار ڈانٹنے اور شرمندہ کرنے کا تناوش پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

وہ حسب عادت اس کے پیچھے ہی بڑھ گئی تھی۔

گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ عظیم نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اس کے قریب رکتے ہوئے بولا۔ "تم آج یہیں رہ جاؤ، اس کے داخلے کا کوئی مسئلہ تھا۔ کالج کے پرنسپل سے جا کر مل لینا۔"

"کس کے داخلے کا مسئلہ ہے دادا۔" عظیم کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کبیر دادا نے گہرا سانس لے کے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا، تناوش دروازے پر کھڑی اسی کی جانب متوجہ تھی۔ "وہ مصیبت جو دروازے پر کھڑی ہے۔" کبیر دادا کے لہجے سے شوہرانہ بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

عظیم کے ہونٹوں پر تبسم ظاہر ہوا مگر پھر وہ ہونٹ بھینچ کر خود کو سنجیدہ ظاہر کرنے لگا۔ "ٹھیک ہے دادا، یہ ہو جائے گا۔ البتہ ایک اور مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ شیشہ کھول کر عظیم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تنویر پلازہ اور عباسیہ مارکیٹ کے دکانداروں کو مقامی تھانیدار تنگ کر رہا ہے۔"

"نیا تھانیدار ہے؟"

"وہی پرانے والا ہے راؤ اجمل رحیم، اس کا حصہ بھی باقاعدگی سے دیا جا رہا ہے۔"

کبیر دادا نے پوچھا۔ ''ذرا اس کا بائیو ڈیٹا دہراؤ۔'' اور عظیم اس کے بارے تفصیل بتانے لگا۔

''ہونہہ!'' عظیم کی بات ختم ہوتے ہی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس کی نظریں تناوش کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ دروازے سے ٹیک لگائے کسی تصویر کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا معصومیت بھرا انداز دیکھ کر ایک لمحے کے لیے کبیر دادا کا جی چاہا کہ جا کر اسے اپنے ہاتھ سے ناشتا کرادے۔ نہ جانے اسے کیوں یقین تھا کہ وہ ناشتا نہیں کرے گی، مگر پھر وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

اسے خاموش پا کر ڈرائیور نے پوچھا۔ ''چلیں دادا!''

''آں، ہاں..... چلو۔'' چونکتے ہوئے اس نے تناوش سے نظر ہٹائی۔ گاڑی کے آگے بڑھتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر مڑ کے دیکھنے لگا۔ گیٹ سے نکلتے ہی اس سے رہا نہیں گیا تھا موبائل فون نکال کر وہ اس کا نمبر ملانے لگا۔ تیسری چوتھی گھنٹی پر اس نے کال وصول کی یقیناً موبائل کمرے میں تھا وہ باہر سے بھاگ کر گئی تھی۔

''جی۔'' اس کی خوشی سے بھرپور آواز نے کبیر دادا کے کانوں میں رس گھولا۔

اس نے بہانہ گھڑا۔ ''کل جو سوٹ پہنا تھا اس کی جیب میں ایک وزٹنگ کارڈ پڑا تھا۔''

''ان میں تو صرف پرس پڑا تھا جو میں نے آپ کے پہننے والے کپڑوں میں منتقل کر دیا تھا۔''

''تم ان کپڑوں میں دوبارہ بھی دیکھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس کی آواز میں شامل مایوسی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کال اس کی توقع کے برعکس نکلی تھی۔

''اور ہاں..... ناشتا کر لینا۔'' کبیر دادا نے یوں ظاہر کیا جیسے رابطہ منقطع کرتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی بات آ گئی ہو۔

وہ خوشی سے چہکی۔ ''اس شرط پر کہ کل آپ پہلا نوالہ اپنے ہاتھوں سے کھلائیں گے۔''

''ہٹ دھرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' اس نے مصنوعی غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔''

''ہاں یا ناں میں جواب دیں۔'' اس کا خوشی سے بھرپور لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کال کی نوعیت کو جان چکی تھی۔

''ٹھیک ہے مس مصیبت کھا لینا۔'' اس نے گویا بادل نخواستہ حامی بھری۔

اس کا ''اب کر لیتی ہوں۔'' سن کر کبیر دادا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

گاڑیوں کے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے عظیم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ کمرے کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔

''بیگم صاحبہ.....'' اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں موبائل فون کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ کبیر دادا کی کال ہے۔

''ایک منٹ بھائی۔'' قطع کلامی کرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے اندازے کے مطابق کبیر دادا ہی تھا۔ بات کے اختتام پر وہ خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ بغیر کسی شک وشبہ کے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کبیر دادا کی کال کا مقصد کیا تھا۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی وہ ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ عظیم کا بیگم صاحبہ کہنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔

''جی بھائی آپ کچھ کہہ رہے تھے۔'' عظیم ڈرائینگ روم میں اس کا منتظر تھا۔

''جی بیگم صاحبہ، کبیر دادا آپ داخلے کے بارے کچھ بتا رہے تھے۔''

''بیٹھو۔'' نشست سنبھالتے ہوئے اس نے عظیم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے عظیم نے نوٹ بک نکال لی۔

وہ اسے اپنا رول نمبر، کلاس، کالج کا پتا وغیرہ بتا کر اپنا مطمح نظر بتانے لگی۔

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ!..... آپ اپنا موبائل فون نمبر بھی نوٹ کرا دیں اگر کوئی معلومات لینا ہوئی تو میں کال کر کے پوچھ لوں گا۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنا موبائل فون نمبر نوٹ کرایا اور خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ کبیر دادا کے کہنے کے بعد جانے کیوں اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ تو اس نے ناشتا نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

تھانے کے سامنے گاڑیاں رکتے ہی کبیر دادا اندر کی جانب بڑھ گیا۔محافظوں کو اس نے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

اسے ایس ایچ او کے دفتر کی جانب بڑھتے دیکھ کر ایک سپاہی نے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا دفتر میں گھس گیا۔

راؤ اجمل رحیم اسے اچھی طرح جانتا تھا۔اسے دیکھتے ہی وہ بے اختیار اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

''کبیر دادا آج کیسے بھول پڑے۔''اس نے لہجے میں خوشگواری سمونے کی کوشش کی جو بالکل ناکام ہوئی تھی۔اسی وقت ایک سپاہی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔''سر! یہ.....''

''دو چائے لے آؤ۔''ایس ایچ او نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

''وہ جی سر۔''کہتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

ایس ایچ او کی دعوت کا انتظار کیے بغیر کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے کسی تمہید میں پڑنے کے بجائے براہ راست مطلب کی بات شروع کر دی۔''یقیناً آپ میری آمد کا مقصد جانتے ہوں گے۔''

''جب آپ تشریف لے ہی آئے ہیں تو بتا دیں۔''اس نے بیٹھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''تنویر پلازہ اور عباسیہ مارکیٹ کے دکانداروں کی شکایت موصول ہوئی تھی۔''

''کوئی بڑی بات کریں کبیر دادا!.....یہ چھوٹی موٹی شکایتیں تو آئے روز کا معمول ہیں۔''

''آپ کا حصہ پہنچ گیا تھا؟''کبیر دادا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، مگر مجھے لگتا ہے اس کی مقدار کچھ بڑھا دینا چاہیے۔''

''اس وجہ سے کہ نادیہ اب دسویں کلاس میں پہنچ گئی ہے۔''کبیر دادا کا معنی خیز لہجہ کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔

''سنا تھا کبیر دادا، دشمن کی بہو بیٹیوں پر بھی بری نظر نہیں ڈالتا۔''راؤ اجمل کے چہرے پر کھلنے والی مسکراہٹ گھمبیر سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔

کبیر دادا اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔''بالکل، نادیہ بھی میری بھانجی، بھتیجی کی طرح ہے اسی لیے میں نہیں

چاہتا کہ اس کے سر سے باپ کا سایا اٹھ جائے۔"

"کبیر دادا! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" اجمل رحیم کو غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"میں لکھ کر دے رہا ہوں کہ ایس پی ضمیر حسین اوڈھو آپ کے جنازے میں شرکت سے زیادہ کچھ نہیں کر پائے گا۔"

"شاید پولیس سے دشمنی آپ کو مہنگی پڑے۔"

"سپنوں کی دنیا سے باہر نکلو راؤ صاحب!.....ایس پی ضمیر حسین کی زیر کمان دوسرے تھانیدار ایسی حرکت کیوں نہیں کر رہے۔ یقین مانو ضمیر حسین تمھارے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا کام تھا سمجھانا، اب بس کل تک انتظار کروں گا۔" وہ مڑ کر باہر جانے لگا۔

"بات سنیں۔" اس کے پکارنے پر کبیر دادا رک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"دس ہزار ماہانہ بڑھانے سے آپ کو کوئی فرق تو نہیں پڑے گا، البتہ میری لاج رہ جائے گی۔"

کبیر دادا کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس شرط پر کہ یہ دس ہزار میری بھتیجی نادیہ کے جیب خرچ کا حصہ بنیں گے۔"

"منظور۔" راؤ اجمل کے چہرے پر پہلی بار اطمینان چھلکا۔ "اب چائے تو پی لیں۔"

"ادھار رہی۔" کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا تھانے سے باہر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

"جی پاشا دادا!" اسے امتیاز کی آواز سنائی دی۔

پاشا نے پوچھا۔ "سناؤ بھائی، کبیر دادا اٹھا ہے کہ نہیں۔"

"ہم یہاں تھانے پہنچے ہوئے ہیں۔"

"اتنی جلدی۔" پاشا کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"رات کو کبیر دادا آپ لوگوں کے جاتے ہی ہمیں کام پر بھیج کر خود گھر چلے گئے تھے۔ آج سویرے ہی جاگ گئے۔"

پاشا نے اندازہ لگایا۔ ''شاید اس چھوکری سے جان چھڑانے کی خوشی میں سویرے جاگے ہوں گے۔''

امتیاز نے حیرانی سے کہا۔ ''کس چھوکری سے، وہ نمازن تو ابھی تک گھر میں ہے۔''

''مگر رات کبیر دادا کہہ رہے تھے کہ صبح سویرے اسے گھر بھیج دے گا۔''

''اس بارے تو میں کچھ نہیں جانتا، صبح آتے وقت حسبِ معمول وہ کبیر دادا کو چھوڑنے دروازے تک آئی تھی اور گاڑیوں کے گھر سے نکلنے تک دونوں لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔''

''نہ کر یار!'' پاشا کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''رات کو کبیر دادا نے اسے واپس بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔''

امتیاز نے خیال ظاہر کیا۔ ''ویسے عظیم کو دادا گھر میں چھوڑ آیا ہے شاید اسے بتایا ہو کہ ہمارے نکلنے کے بعد نمازن کو گھر تک چھوڑ آئے۔''

''میں پتا کر لیتا ہوں۔'' رابطہ منقطع کر کے وہ عظیم کا نمبر ملانے لگا۔

''جی دادا!.....'' عظیم نے فوراً کال وصول کی تھی۔ کبیر دادا کے گینگ کے افراد پاشا کا اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا کبیر دادا کا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ کبیر دادا کا کتنا چہیتا ہے۔

پاشا نے بے صبری سے پوچھا۔ ''یار کہاں ہو؟''

''بیگم صاحبہ کے کام کے سلسلے میں کالج آیا تھا۔''

''کون بیگم صاحبہ؟''

عظیم اطمینان سے بولا۔ ''کبیر دادا کی بیوی۔''

''کبیر دادا تمھیں گھر کیوں چھوڑ گئے تھے۔''

''انھوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ کے داخلے وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہے میں اسی سے پوچھ کر وہ کام کر دوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' رابطہ منقطع کر کے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ کبیر دادا کا نمبر ملا رہا تھا۔

''ہاں پاشا خیریت تو ہے۔'' کبیر دادا نے کال وصول کرتے ہی پوچھا۔

''خیریت ہے دادا، بس ایک بات پوچھنا تھی۔''

''تلاش کے علاوہ کچھ ہے تو پوچھو۔''

”مگر رات کو آپ نے حامی بھری تھی۔“

”ہاں، مگر بعد میں سوچا تو مناسب نہ لگا۔“

”جینا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔“ پاشا نے بغیر لگی لپٹی رکھے پوچھا۔

”جب آدمی تھپڑ کی حدود سے باہر ہو تو اسی قسم کی بکواس کرتا ہے۔“

”دادا، میں تھپڑ سے نہیں ڈرتا مگر آپ کی تازہ روش سے ڈر گیا ہوں۔“

”بکواس نہ کرو یار!.....اس لڑکی کو ایک غنڈے سے پناہ دے کر میں خبیثوں کے ٹولے کے سامنے کس طرح پھینک دوں۔ جانتے ہو نوشاد آفریدی، اخلاق حسین وغیرہ کسی گدھ کی طرح اس پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ جس دن وہ گھر چلی گئی اس سے بہت برا برتاؤ کریں گے، صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔ اور اس وقت میں اس کی کوئی مدد بھی نہیں کر پاؤں گا کیونکہ میں اس سے رشتہ ختم کر چکا ہوں گا اور ایک انجان لڑکی کے لیے کسی گینگ کے سربراہ کو میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔“

پاشا اس کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ ”اس متعلق ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔ آپ نے عوام کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔“

”کبیر دادا سے تعلق کے بعد وہ عام نہیں رہی۔“

پاشا نے گہرا سانس لیا۔ ”ہاں، کبیر دادا جیسے شخص کو دیوانہ بنانے والی عام کیسے ہو سکتی ہے۔“

کبیر دادا زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ”یار! ایسی کوئی بات نہیں، تم بس بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔“

”میں شام کو کوٹھی پر آ رہا ہوں، دیکھوں تو ہے کیسی؟“

”آج شام کو اخلاق حسین کے ہاں دعوت ہے، وہیں ملاقات ہو گی۔“

”اوہ مجھے تو بھول ہی گیا تھا۔“

”ہاں تمھیں بس استاد پر بکواس کرنا یاد رہتا ہے۔“ کبیر دادا نے منہ بناتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

تھانے سے نکلتے ہی کبیر دادا نے ڈرائیور کو برکت کے اڈے پر جانے کا بتا دیا۔ برکت ہی تنویر پلازہ اور

عباسیہ مارکیٹ کے دکانداروں سے بھتہ وصول کیا کرتا تھا۔ رستے ہی میں اسے پاشا کی کال موصول ہوئی۔ اس سے بات ختم کرنے تک وہ برکت کے اڈے پر پہنچ چکے تھے۔

کبیر دادا کی گاڑی دیکھتے ہی وہ بھاگتا ہوا قریب پہنچا تھا۔ مرسڈیز کا دروازہ کھول کر اس نے کبیر دادا کو باہر آنے کی دعوت دی۔

"کیا چل رہا ہے۔" کبیر دادا نے گاڑی سے نکلنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"چھوٹا سا مسئلہ چل رہا تھا، اس بارے عظیم کو بتا دیا تھا۔"

کبیر دادا نے کہا۔ "وہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ابھی تھانیدار ہی سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ ہے تو بتاؤ۔"

"باقی تو سب ٹھیک چل رہا ہے دادا۔"

"تھانیدار راؤ اجمل کے ماہانہ خرچ میں دس ہزار کا اضافہ کر دو اور اس کے بعد اگر اس کے تھانے کا کوئی سپاہی گڑبڑ کی کوشش کرے تو پھر کوئی دوسرا علاج ڈھونڈیں گے۔"

"جی دادا!....." برکت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دفتر چلو۔" ڈرائیور کو مخاطب ہوتے ہوئے اس نے بات ختم کرنے کا اشارہ دیا۔ برکت کار کے دروازے سے پیچھے ہٹا اور ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ کمپنی آفس کی طرف تھا۔ کنسٹرکشن کمپنی اس کا کالا دھن چھپانے کی آڑ تھی، وہ ہفتے دس دنوں میں ہی چند منٹوں کے لیے دفتر کا چکر لگاتا تھا۔ ورنہ کمپنی کا سارا کام مینجنگ ڈائریکٹر کے ذمہ تھا۔ آفس میں بیٹھ کر اس نے چائے پینے کے دوران ایم ڈی سے چند منٹ کی گپ شپ کی، کام کے بارے سرسری سا پوچھا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔ ایم ڈی کبیر دادا کی اصل شخصیت سے اچھی طرح واقف تھا اس وجہ سے اسے کبھی ہیرا پھیری کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی کبیر دادا کے لیے کنسٹرکشن کمپنی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو ہوٹل جانے کا کہا۔ ہوٹل کے تہہ خانے میں بہت بڑا جوا اڈہ تھا جو کبیر دادا ہی کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں کار روکتے ہوئے ڈرائیور نے جھجکتے ہوئے پوچھا

۔"دادا!.....اگر چند منٹ یہاں گزارنے ہیں تو میں سامنے شاپنگ پلازہ سے تھوڑی خریداری کرلوں۔" شاپنگ پلازہ ہوٹل سے مخالف جانب بنا تھا۔درمیان میں صرف سڑک گزرتی تھی۔

"چلے جاؤ۔" مختصراً کہتے ہوئے وہ کار سے اتر کر ہوٹل کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔چاروں محافظ اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔ہوٹل کے ہال میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔البتہ سڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے وہ نیچے پہنچے۔دروازے پر کھڑے محافظ نے اسے دیکھتے ہی مؤدبانہ لہجے میں سلام کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔تہہ خانے میں کافی رش تھا۔مختلف میزوں پر جواری ہاتھوں میں تاش کے پتے تھامے اپنی قسمت آزمائی کررہے تھے۔کچھ جوا مشینوں پر مقدر میں لکھا پیسہ ڈھونڈ رہے تھے۔کبیر دادا دائیں بائیں سرسری نظر دوڑاتا ہوا ایک کونے میں بنے ہوئے کالے شیشے کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔اس کے چاروں محافظ جوا ہال ہی میں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔بیرے نے فوراً ان کے سامنے شراب کی بوتل اور گلاس لاکر رکھ دیے تھے۔

شیشے کے کیبن کے سامنے بھی ایک ہتھیار بردار کھڑا تھا۔کبیر دادا کو دیکھتے ہی اس نے سلام کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر گھومنے والی کرسی پر بیٹھے بھدے نقوش والا شخص دروازے کی طرف متوجہ ہوا ۔کبیر دادا کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ کر ایک طرف ہوتے ہوئے بولا ۔"سلام دادا۔"

سر کی ہلکی سی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کبیر دادا گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھو ارشد۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کبیر دادا دیوار میں لگی بڑی سکرینوں کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں مختلف میزوں اور جوا مشینوں کا منظر نظر آرہا تھا۔

"کیسا چل رہا ہے۔" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد وہ مستفسر ہوا۔

"بہت اچھا دادا۔" بوتل سے شراب کا گلاس بھر کر کبیر دادا کے سامنے رکھتے ہوئے ارشد نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

کبیر دادا نے گلاس سے گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔"کوئی مسئلہ۔"

''کوئی نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پولیس کی طرف سے تو کوئی پریشانی نہیں ہو رہی۔''

''نہیں دادا۔'' ارشد کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

''ہونہہ!'' گلاس میں بچی بقیہ شراب ایک سانس میں حلق میں انڈیلتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

''کھانے کا وقت ہے۔'' ارشد نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''شکریہ۔'' کبیر دادا نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ارشد نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور اس کے باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ چاروں محافظ بھی اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ تہہ خانے کے دروازے تک ارشد اس کے ساتھ گیا تھا۔

پارکنگ میں جاتے ہی اس کی نظر سڑک پار کرتے ڈرائیور پر پڑی اس نے ہاتھ میں شاپر پکڑا ہوا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں شام کی دعوت کا خیال آیا اور اس نے ڈیش بورڈ کھول کر بڑی مالیت کے نوٹوں کی آدھی گڈی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور شاپنگ پلازے کی طرف چل پڑا۔ محافظوں کو اس نے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

سڑک عبور کر کے وہ ایک دکان میں داخل جس کے سامنے عورتوں کے مجسموں پر فیشن ایبل سوٹ چڑھا کر شوپیس کے طور پر کھڑے کیے گئے تھے۔ دکان میں داخل ہوتے ہی اسے خیال آیا کہ تناوش کا ناپ وغیرہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ اور جس قسم کی وہ لڑکی تھی یقیناً اس نے کبھی ریڈی میڈ کپڑے خریدے بھی نہیں ہوں گے۔ وہ مایوس ہو کر واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ اس نظر شوکیس کے سامنے کھڑی ایک لڑکی پر پڑی۔ جسمانی خال وخد کے لحاظ سے وہ تناوش کے بالکل مشابہ تھی۔ سیلز مین سے کسی چیز کی قیمت دریافت کر کے اس نے اپنا پرس کھول کر اندر نظر دوڑائی اور مایوسی سے سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ کالی قمیص کے نیچے اس نے نیلے رنگ کی جینز پہنی ہوئی تھی۔

''بہن بات سنو۔'' کبیر دادا نے اسے جھجکتے ہوئے مخاطب ہوا۔

وہ کبیر دادا سے چند قدم کے فاصلے سے گزر رہی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی اس نے حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کسی کو موجود نہ پا کر دوبارہ کبیر دادا کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی جانب انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے

استفہامیہ اشارہ کیا۔

''ہاں آپ سے مخاطب ہوں۔'' کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی بھائی۔'' اس کے قریب رکتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

''اگر خفا نہ ہوں تو ایک چھوٹی سی مدد درکار تھی۔''

''جی بھائی بولیں۔'' اس کے لہجے میں شکوک کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

''میں نے اپنی بیوی کو تحفہ دینے کے لیے ایک سوٹ لینا تھا لیکن اس کا ناپ مجھے معلوم نہیں ہے اور اتفاق سے آپ کا قد وغیرہ بالکل اس سے مشابہ ہے، کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتی ہیں۔''

''کال کر لو۔'' اس نے مشورہ دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ ہنسا۔ ''پھر تحفہ لے جانے کا مزہ باقی نہیں رہے گا۔''

''چلیں آپ سوٹ پسند کریں میں سیلز مین کو ناپ بتا دیتی ہوں۔'' اس نے مزید تکرار سے گریز کیا تھا۔

''اگر اتنی مہربانی کر رہی ہیں تو اپنی پسند ہی کا ایک سوٹ دکھا دیں۔''

کبیر دادا کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ پیچھے مڑی اور سیلز مین کے قریب پہنچتے ہوئے کہنے لگی۔ ''وہ سوٹ دینا۔'' اس نے انگلی سے اشارے سے ہینگر میں لٹکتے ایک سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ شاید تھوڑی دیر پہلے بھی وہ اسی سوٹ کا پوچھ رہی تھی۔ کالی جینز اور ہلکے گلابی رنگ کی پھولدار قمیص۔

''مجھے تو یہ پسند ہے اور یہ میرے ناپ کے مطابق ہے۔'' پاس کھڑے کبیر دادا کو کہہ کر وہ جانے کے ارادے سے مڑی۔

''ٹھہرو بہن۔'' کبیر دادا اسے روکتے ہوئے سیلز مین کو مخاطب ہوا۔ ''اسی ناپ اور رنگ میں دو سوٹ علاحدہ علاحدہ پیک کر دیں۔''

''جی بھائی۔'' کبیر دادا کے کچھ نہ کہنے پر وہ پوچھنے لگی۔

''ایک منٹ۔'' کبیر دادا اسے بتائے بغیر سیلز مین کی طرف متوجہ رہا۔ دونوں سوٹوں کے پیک ہوتے ہی اس نے ایک پیکٹ اس لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کے لیے۔''

''مگر یونہی سر!.....میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔'' لڑکی نے انکار میں سر ہلایا۔

وہ ہنسا۔ ''بھائی سمجھ کر مدد کی ہے، بہن سمجھ کر دے رہا ہوں۔''

''مگر بھائی یہ بہت قیمتی ہے۔'' اس کے انکار میں دراڑ پڑتی دیکھ کر کبیر دادا نے کہا۔

''ہاں.....آپ خود اعتراف کر چکی ہیں کہ آپ کی قوت خرید سے باہر ہے، اسی لیے تو دے رہا ہوں۔''

اس لڑکی نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لیا اور ''شکریہ بھائی جان!'' کہتے ہوئے چل دی۔ کبیر دادا ان سوٹوں کی ادائی کے لیے کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ بل ادا کر کے وہ باہر نکلا، وہ لڑکی سڑک کے کنارے کھڑی اسی دکان کی طرف متوجہ تھی۔ شاید اسے ابھی تک کبیر دادا کی مہربانی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کبیر دادا کو دکان سے نکلتے دیکھ کر وہ بہ ظاہر سامنے دیکھنے لگی مگر کبیر دادا جانتا تھا کہ وہ کن اکھیوں سے اسی کی طرف متوجہ ہے۔

اپنی بے وقوفی پر دائیں بائیں سر مارتا ہوا وہ سڑک عبور کرنے لگا۔ تناوش کو گھر لانے کے بعد اس سے مسلسل اوٹ پٹانگ حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ اسے قریب آتا دیکھ کر ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ اندر بیٹھتے ہوئے اس نے سڑک کے پار نگاہ دوڑائی وہ لڑکی ابھی تک سڑک کے کنارے کھڑی اس کی طرف متوجہ تھی۔

''گھر چلو۔'' وہ ڈرائیور کو مخاطب ہوا۔ اور اس نے ''جی دادا!'' کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''میں قسم کھا سکتا ہوں کہ دادا نے نمازن کے لیے خریداری کی ہے۔'' امتیاز دوسروں محافظوں کو مخاطب تھا۔

بخش ہنسا۔ ''یار! تم تو پکے ہی اس بے چاری کے پیچھے پڑے ہو۔''

امتیاز نے کہا۔ ''اس نے بھی تو ہمارے باس کو ہر کام سے نکال دیا ہے۔''

''اس غریب کا کیا قصور۔'' ڈرائیور کا ووٹ بھی بخش کی طرف تھا۔

امتیاز نے کہا۔ ''قصور تو ہے نا، نہ وہ اتنی خوب صورت اور معصوم ہوتی، نہ کبیر دادا اس بری طرح سے فریفتہ ہوتے۔''

''پتر! جس دن کبیر دادا نے تمھاری ہرزہ سرائی سن لی، تمھارا دنیا میں آخری دن ہوگا۔'' بخش نے اسے ڈرایا۔

”پاشا دادا سے بات ہوئی تھی، اس کا ووٹ بھی میرے حق میں ہے۔“ امتیاز نے چھاتی پھیلائی۔

بخش اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس سے اپنا موازنہ نہ کرو، وہ کبیر دادا کا لاڈلا ہے۔“

”یار میں نے کبیر دادا کے خلاف تو کوئی بات نہیں کی نا۔“ امتیاز نے فوراً صفائی پیش کی۔

باقر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمھارے بہ قول وہ نمازن کبیر دادا کو اتنی ہی پیاری ہے تو سوچ لو اس کے خلاف کوئی بات سن کر کبیر دادا تمھارا کیا حشر کرے گا۔“

”میری توبہ یار آپ لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔“ امتیاز کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنے موقف سے ہٹ گیا۔

اس گپ شپ کے دوران وہ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کبیر دادا کی کار کو گیٹ کی طرف مڑتے دیکھ کر امتیاز سے رہا نہیں گیا۔ ”خود دیکھ لو ایک بجے واپس پہنچ گئے ہیں۔ کل بھی قریباً اسی وقت پہنچے تھے۔ اور اس سے قبل پانچ بجے سے پہلے کبھی کوٹھی کا گیٹ نہیں دیکھا تھا۔“

”آم کھاؤ جگر، پیڑ نہ گنو۔ اگر اس کی وجہ سے جلدی گھر آ جاتے ہو تو اسے دعائیں دو۔“

”اس نمازن کو ہم جیسے گناہ گاروں کی دعا کی کیا حاجت۔“ اس مرتبہ امتیاز کے لہجے میں ہلکا سا دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کار سے اترتے ہوئے کبیر دادا کو تناوش کے چہرے پر مثبت خوشی واضح نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ اس کے جلد لوٹ آنے پر خوش تھی۔

”میرے لیے خریداری کی ہے۔“ اس کے قریب پہنچنے پر تناوش نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

”سچ۔“ خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے عقب ہی سے اس کے ہاتھ سے شاپر جھپٹ لیا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے تک وہ شاپر سے تہہ شدہ سوٹ نکال کر کھول چکی تھی۔

”یہ کیا۔“

"نظر نہیں آرہا کیا ہے۔" صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے کبیر دادا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ تناوش کے حوالے وہ سوٹ کرتے ہوئے اسے، اجنبی لڑکی کو سوٹ دینے سے بھی زیادہ خفت ہو رہی تھی۔

"کبھی مجھے اس طرح کا لباس پہنتے دیکھا ہے۔" جینز کی تنگ پتلون اور شرٹ کو دیکھتے ہوئے تناوش کا منہ بن گیا تھا۔

"مجھے شوق نہیں ہے تمہارے لیے خریداری کرنے کا۔ آج شام کو دعوت تھی سوچا نیا سوٹ خرید لوں۔

تناوش نے صاف گوئی سے کہا۔ "آپ کی خواہش پر تو نہیں البتہ حکم پر یہ پہن سکتی ہوں۔"

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "رہنے دو، میں فضول باتوں میں اپنا حکم ضائع نہیں کیا کرتا۔"

"خفا ہو گئے۔" تناوش نے اس کے چہرے پر ناراضی کے اثرات تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"میرا خیال ہے ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے جس میں ناراضی کا پہلو نکل سکے۔" کبیر دادا نے اس کے نازک احساسات پر بہت گہری چوٹ لگائی تھی۔

تناوش کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ صحیح کہہ رہے ہیں، لیکن میں نے ناراضی کا اس لیے پوچھا ہے کہ جلد بازی میں یہ کہہ گئی کہ آپ کی خواہش پر یہ کپڑے نہیں پہنوں گی۔"

"مجھ سے غلطی یہ لباس خریدنے میں ہوئی۔ باقی حقیقت یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں عورتیں کس قسم کا لباس پہننا پسند کرتی ہیں۔"

تناوش شوخ لہجے میں بولی۔ "باقی عورتوں کو چھوڑیں، میری بات کریں اور میں جو پسند کرتی ہوں روزانہ وہی تو پہنا ہوتا ہے اس میں نہ جاننے کے کیا معنی۔"

کبیر دادا نے بہ ظاہر غصے بھری نگاہ اس کے شوخی بھرے معصوم چہرے پر ڈالی مگر منہ سے کچھ کہے بنا اسے گھورنے لگا۔

"کھانا کھائیں گے۔" وہ اس کے بوٹ کھولتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"کبھی دن کا کھانا گھر کھایا تو نہیں ہے، چلو آج کھا لیتا ہوں۔"

"اتنے احسان نہ کیا کریں جو اتارے ہی نہ جا سکیں۔" اس کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیکتے ہوئے وہ ممنونیت سے

بولی۔

کبیر دادا نے اس کے لہجے میں طنز تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ ''اچھا اب فضول باتیں چھوڑو اور کھانا لے آؤ۔''

''وزننگ کارڈ تو مل گیا تھا نا۔'' تناوش نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ نظریں چرا گیا تھا۔

''میں نے ناشتا کر لیا تھا۔'' نہ جانے وہ اسے مطلع کر رہی تھی یا وعدہ یاد دلا رہی تھی۔

وہ چڑ کر بولا۔ ''بہت بڑا احسان ہے تمھارا۔''

''آپ ہر وقت اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں رہتے ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

''شاید تم کھانا لا رہی تھیں۔'' اس نے تناوش کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''اچھا شام کو کالج والی یونیفارم پہن لوں۔'' وہ برا منائے بغیر شروع رہی۔

''ان کپڑوں میں تم اتنی بھی اچھی نہیں لگتی ہو کہ ہر وقت پہنے رکھو۔ اور تین چار جوڑے سلوا لو۔''

''اچھا لگنے کی وجہ سے نہیں سلوائے۔''

''پھر؟''

وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''غریبوں کی زندگی نظریہ ضرورت کے تحت ہی گزرا کرتی ہے، عام کپڑوں کے بغیر تو گزارا ہو جاتا تھا، کالج یونیفارم کے بغیر نہیں۔ اسی وجہ سے میں عام کپڑوں کی جگہ بھی کالج یونیفارم ہی سلوا لیتی تھی۔ اور اتنے پیسے امی جان کے پاس بھی نہیں ہوتے تھے کہ میری خواہشات پوری کرتی رہتیں۔''

کبیر دادا کے دل میں ہلکی سی ندامت نمودار ہوئی وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''اگر کپڑے لینے ہیں تو ابھی عظیم کو ساتھ لے جا کر خرید لو۔''

''شکریہ۔'' وہ اس کے جوتے اٹھا کر ریک کی طرف بڑھ گئی۔ کبیر دادا خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ اس کا شکریہ کہنا اسے اچھا خاصا طنزیہ لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

تقریب کے لیے اس نے شادی کے دن والے کپڑے پہنے تھے۔ حسن سجاوٹ یا پہناوے کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ تناوش ان عام اور سستے کپڑوں میں بھی بہت نمایاں لگ رہی تھی۔ تیار ہو کر وہ کبیر دادا کو مخاطب ہوئی۔

''بتایئے نا کیسی لگ رہی ہوں۔''

''جیسی ہو ویسی ہی لگو گی۔''

''کیسی ہوں بھلا۔'' خاموش رہنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''مجھے نہیں پتا اور نہ اس قسم کے فضول سوال مجھ سے کیا کرو۔'' وہ اس کے سراپے سے نگاہیں چرا گیا تھا۔

''تو کس سے پوچھوں؟'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا میرا کسی اور سے پوچھنا آپ کو برا نہیں لگے گا۔''

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ ''چلو دیر ہو رہی ہے۔'' تناوش کے بہت سے سوالوں کی طرح اس سوال کا جواب بھی وہ گول کر گیا تھا۔

وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے اس کے پیچھے بڑھ گئی۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی، بہت زیادہ باتونی، شوخ اور نٹ کھٹ۔ دلاور شیخ کی وجہ سے اس کی ہنسی کہیں غائب ہو گئی تھی جو دلاور کی موت کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔ کبیر دادا کو چھیڑتے ہوئے اسے اور بھی لطف آتا تھا۔ نہ جانے پہلے ہی دن سے اسے کیوں یقین ہو گیا تھا کہ کبیر دادا اسے پسند کرتا ہے۔ عورتوں کی فطرت اللہ پاک نے ایسی بنائی ہے کہ وہ خود پر پڑنے والی نگاہوں کو فوراً پہچان جاتی ہیں اس کے لیے حرص و ہوس میں ڈوبی نگاہوں اور خلوص بھری نگاہوں میں فرق کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ دلاور شیخ اور خاور شیخ کی گندی نگاہیں اسے بھولی نہیں تھیں۔ اس کے برعکس کبیر دادا نے ابھی تک نہ تو محبت یا چاہت کا اظہار کیا تھا اور نہ اس کی کوئی تعریف ہی کی تھی اس کے باوجود جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کی طرف سے بیزاری اور کوفت کا مسلسل اظہار بھی تناوش کو مصنوعی لگتا تھا۔ اس کے بار بار یہ کہنے پر کہ وہ جلد ہی اسے طلاق دے کر گھر بھیج دے گا۔ تناوش کو یوں لگتا جیسے وہ خود یقین دلا رہا ہو کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ اس کی انہی کیفیات سے جرات پا کر تناوش اس حد تک اتر آئی تھی کہ شراب کی الماری کو بھی تالہ کر کے اس پر اپنی اہمیت جتانا شروع کر دی تھی۔ مگر اس سب کے باوجود یہ خوف اور اندیشہ اس کے دل میں

پہلے دن سے موجود تھا کہ کبیر دادا کی پسند پر کسی بھی وقت اس کی لاابالی فطرت اور ایک گینگ کے سربراہ ہونے کا زعم حاوی ہو سکتا تھا۔

ڈرائینگ روم کے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے اچانک اسے اپنا موبائل فون یاد آیا جو وہ تپائی پر بھول کر آ رہا تھا۔

''تم جاؤ میں ایک منٹ میں آیا۔'' بجائے تناوش کو بتانے کے وہ خود کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کبیر دادا کا اس کو کوئی کام خود سے نہ بتانا بھی یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس سے پہلو تہی کی کوشش میں مصروف ہے۔ محافظ اور ڈرائیور تیار کھڑے تھے۔ کبیر دادا کے موبائل فون اٹھا کر دروازے تک پہنچنے تک تناوش کار کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''اسلام علیکم بیگم صاحب۔'' عظیم نے فوراً مؤدبانہ انداز میں اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

''مجھے بیگم صاحبہ نہیں، دادی کہا کرو۔'' اس کے قریب رکتے ہوئے وہ بہ ظاہر سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔

''د.....دادی۔'' عظیم ہکلا گیا تھا۔

''ہاں۔'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''کبیر کو دادا کہتے ہو تو اس لحاظ سے میں تمھاری دادی ہوئی نا۔''

کبیر دادا کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ گئی تھی۔ بے ساختہ امڈ پڑنے والے قہقہے کو روکنے کے لیے وہ ایک دم مڑ کر پردے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ''تناوش دادی۔'' تصور کی سکرین پر اسے اپنے آدمی کہتے سنائی دیے۔ بڑی مشکل سے ہنسی کو روک کر اس نے چہرے پر دوبارہ سنجیدگی طاری کی اور باہر نکل آیا۔ وہ عقبی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ عظیم نے کبیر دادا کے لیے دوسرا دروازہ کھولا اور اس کے نشست سنبھالتے ہی دروازہ بند کر دیا۔

گاڑی کے آگے بڑھتے ہی وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گئی تھی۔ کھڑکی کی طرف سمٹتے ہوئے کبیر دادا نے اسے غصیلی نظروں سے گھورا مگر وہ بے نیاز بنی بیٹھی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ منہ زبانی کہنے پر اسے الٹا ہی جواب ملتا اور اپنے ملازموں کے سامنے وہ کوئی الٹی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کے تمام آدمی اس سے یوں خوف کھاتے تھے جیسے پرائمری کے طالب علم استاد سے ڈرتے ہیں جبکہ تناوش اس کے غصے اور رعب کو کسی خاطر نہیں لاتی تھی۔ وہ شرمیلی، معصوم اور کم گو نظر آنے والی چھوٹی سی عمر کی لڑکی اتنی شوخ اور تیز ہو گی یہ کبیر دادا نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ہر

بار کبیر دادا یہ سوچ کر طرح دے جاتا کہ دو تین دن بعد اس نے چلے جانا ہے۔ مگر کبھی کبھی اسے خود بھی وہ تین دن گزرتے نظر نہ آتے۔ وہ خود کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگتا کہ اخلاق حسین جیسے آدمیوں سے بچانے کے لیے اس نے وقتی طور پر اسے رکھ لیا ہے۔

اخلاق حسین کی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ کافی گاڑیاں ایک ترتیب کے ساتھ پارک تھیں لیکن اس کی گاڑی سیدھا گیٹ پر جا کر رکی تھی۔ محافظوں نے البتہ اپنی جیپیں باہر ہی پارک کر کے پیدل گیٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ چوکیدار نے کبیر دادا کو پہچانتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ ڈرائیور گاڑی اندر لے گیا۔ کوٹھی کے وسیع لان میں رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی سیمنٹ کی پختہ روش پر روکی، عظیم نے جلدی سے اتر کر کبیر دادا کے لیے دروازہ کھول دیا۔ تناوش، عظیم کا انتظار کرنے کے بجائے خود دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ ان کے اترتے ہی ڈرائیور گاڑی کو گیراج کی طرف لے گیا۔ ان کی گاڑی کو دیکھتے ہی اخلاق حسین خوش آمدید کہنے کے لیے ان کی طرف آ گیا تھا۔

کبیر دادا سے مصافحہ کر کے اس نے گہری نگاہ تناوش پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تشریف آوری کے لیے شکریہ بھابی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ سے انھیں ترتیب سے لگے ہوئے صوفوں کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

تناوش کا ایسی تقریب میں شرکت کا پہلا موقع تھا۔ اس سے پہلے وہ محلے کی شادیوں وغیرہ میں تو شامل ہو چکی تھی مگر ان تقاریب اور حالیہ تقریب میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا تھا۔ تقاریب کو دولت ہی سے چار چاند لگائے جا سکتے ہیں اور اخلاق حسین شاہ کے پاس دولت کی کون سی کمی تھی۔

تناوش ہلکی سی نروس ہوئی مگر پھر اپنے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے کبیر دادا کو دیکھتے ہی اس کے دل سے تمام خوف اور ڈر بھاگ گئے تھے۔ وہ پر اعتماد انداز میں صوفوں کے قریب پہنچی وہاں اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے مرد و زن اعلا پہناووں میں براجمان تھے۔ عورتوں نے خوب میک آپ تھوپا ہوا تھا۔ ان کے چمکتے دمکتے لباس کے مقابلے میں تناوش کا سستا اور عام سا لباس تضحیک اور استہزاء کا نمونہ ہی تھا۔ وہ چہرے پر خود اعتمادی پیدا کیے کبیر دادا کے ساتھ بیٹھ گئی۔

زیادہ تر حاضرین کی نگاہیں تناوش کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور اس کی وجہ کبیر دادا کی اس سے شادی

کا معاملہ تھا۔ کافی لوگ اس لڑکی کو دیکھنے کے خواہاں تھے جس نے کبیر دادا جیسے اکھڑ کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ کچھ عورتیں دبی زبان میں ہنستے ہوئے اس کے لباس اور سر سے لپٹے دوپٹے کا مذاق اڑانے لگیں۔ پاشا اپنے ساتھ بیٹھے کاشف راجپوت کو مخاطب ہوا۔

"کاشف دادا!..... مشکل ہے کہ کبیر دادا اس لڑکی کو طلاق دے۔ اتنی معصوم اور پاکیزہ صورت لڑکی سے جان چھڑانا آسان کام نہیں ہے۔"

کاشف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یوں بدفال تو منہ سے نہ نکالو یار!"

اسی وقت نوشاد آفریدی نے اخلاق حسین کے کان میں سرگوشی کی۔ "شاہ جی!..... اب اس خبیث کا باؤلہ پن سمجھ میں آ رہا ہے۔"

اخلاق حسین نے بھی اسی کی طرح سرگوشی کی۔ "کہا تھا نا لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔ یقین کرو ہنستی ہے تو انسان کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

نوشاد آفریدی ندیدے پن سے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ "اب تو اس بلبل کو حاصل کرنے کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا ہے۔"

"مگر اس خبیث دیو سے نبٹے بغیر تو یہ بلبل ہاتھ آنے والی نہیں۔" اخلاق حسین کے لہجے میں کبیر دادا کے لیے نفرت ہی نفرت ابل رہی تھی۔

نوشاد بے پروائی سے بولا۔ "اس کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔"

"کون سا حل؟" اخلاق حسین مستفسر ہوا۔

نوشاد جھلاتے ہوئے بولا۔ "وہی یار، تمھیں دس دفعہ تو بتا چکا ہوں۔" اس کی پرہوس نگاہیں ابھی تک تناوش کے ملیح چہرے پر گڑی تھیں۔

کبیر دادا، شہاب کے ساتھ بیٹھ گیا، تناوش بھی اس کے پہلو میں جم گئی تھی۔ ان صوفوں پر زیادہ تر مرد ہی بیٹھے تھے، عورتوں کی ٹولیاں دائیں بائیں کھڑی گپیں ہانک رہی تھیں۔ یا کچھ مردوں سے تھوڑے فاصلے پر سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ باوردی بیرے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے مہمانوں کو مختلف مشروبات پیش کر رہے تھے۔ ان میں عام

مشروبات کے علاوہ شراب بھی فراوانی سے پیش کی جا رہی تھی۔ اخلاق حسین شاہ جیسے شخص کو کسی قانون وغیرہ کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ بلکہ قانون خود وہاں ایس پی ضمیر حسین اور درجن بھر انسپکٹروں کی صورت میں اس حرام مشروب کو جائز اور حلال قرار دینے کی دلیل دے رہا تھا۔

مشروب پیش کرنے والا ایک بیرا ٹرے میں درجن بھر گلاس سجائے کبیر دادا کے قریب ہوا۔

شہاب سے باتیں کرتے ہوئے کبیر دادا نے وہسکی کا گلاس اٹھا لیا۔ بیرے نے ٹرے تناوش کے سامنے پکڑی۔

کبیر دادا کی نقل کرتے ہوئے اس نے بھی ایک گلاس اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ وہاں موجود زیادہ تر خواتین و حضرات کے ہاتھوں میں گلاس نظر آ رہے تھے۔

اور پھر اس سے پہلے کہ وہ گھونٹ لے پاتی کبیر دادا بہ مشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے اس کی طرف جھکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

"مجھے منع کرتی ہو اور خود پینا شروع کر دی۔"

"مم..... میں نے سوچا کولڈ ڈرنک ہے۔" وہ ہکلا گئی تھی۔ یہ کہتے ہی اس نے جلدی سے گلاس سامنے پڑی شیشے کی میز پر رکھ دیا۔

کبیر دادا نے ایک دوسرے بیرے کو انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"یہ ہیں تمھارے کولڈ ڈرنک۔" اسے کہہ کر وہ شہاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کھسیاتے ہوئے دوسرا گلاس اٹھانے لگی۔

"کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں بھئی۔" شہاب نے مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔

کبیر دادا ہنسا۔ "بے وقوف شراب پینے لگی تھی۔"

"خود پیتے ہو اور ہماری بھابی کو منع کرتے ہو، یہ تو زیادتی ہے جناب۔" شہاب قصوری کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ کبیر دادا کے پہلو میں بیٹھی تناوش تک پہنچ گئی تھی۔

"منع تو نہیں کیا۔" کبیر دادا نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "صرف مطلع کیا ہے کہ محترمہ جو مشروب نوش کرنے

والی ہوا سے وہسکی کہتے ہیں۔"

شہاب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ تناوش خفیف ہو کر نیچے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی حیا کی لالی نے کبیر دادا کے دل کو عجیب انداز میں دھڑکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ لال ہو کر مزید جاذب نظر ہو گیا تھا۔ اسی وقت ایک خوب صورت سے لڑکی نے قریب آ کر کبیر دادا سے مصافحہ کیا۔

"کبیر صاحب، چوری چوری شادی کر لی اور ہمیں جھوٹے منہ بھی دعوت نہیں دی۔" کبیر دادا سے ہاتھ ملا کر اس نے تناوش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مسز کبیر!..... میں ہوں آپ کی میزبان فرحانہ اخلاق۔"

تناوش نے بے دلی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا کبیر دادا کو ہاتھ ملانا تناوش کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

اسی وقت کبیر دادا بہ ظاہر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "کوئی بات نہیں اگلی مرتبہ دعوت ضرور دوں گا۔"

"ہائیں کیا اتنی خوب صورت دلھن حاصل کرنے کے بعد بھی آپ دوسری شادی کریں گے۔" پاس سے گزرتے ہوئے بیرے سے کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"مولویوں سے سنا ہے کہ ایک مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میں یونہی پریشان تھی۔" فرحانہ معنی خیز لہجے میں کھل کھلائی۔

غصے سے کھولتی تناوش سے رہا نہیں گیا تھا۔ "آپ کی پریشانی شاید اتنی آسانی سے دور نہ ہو۔"

فرحانہ نے کہا۔ "سوری مسز کبیر، آپ کو برا لگا، میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔"

کبیر دادا فرحانہ کو مخاطب ہوا۔ "اچھا اسے ذرا ساتھ لے جا کر دوسروں سے تعارف وغیرہ ہی کرا دو۔ یہاں بیٹھی بور ہوتی رہے گی۔"

"کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ "چلیں مسز کبیر۔"

اسے دوسری عورتوں کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے "میں یہیں ٹھیک ہوں۔" کہہ کر جان چھڑانا چاہی۔

"ہر وقت ضد نہیں کرتے۔" کبیر دادا نے اسے سمجھانے کے انداز میں مخاطب کیا۔ مگر اس کے لہجے میں شامل حکم تناوش کو واضح طور پر محسوس ہوا تھا۔

منہ سے کچھ کہے بنا وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے فرحانہ کے ساتھ چل پڑی۔

کبیر دادا سے تھوڑا دور ہٹتے ہی فرحانہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''ویسے کوئی ڈھنگ کے کپڑے ہی پہن لینا تھے۔ جھونپڑی سے نکل کر آ گئی ہو تو پرانے کپڑے وغیرہ بھی وہیں چھوڑ آنا تھے۔''

تناوش بغیر لگی لپٹی رکھے بولی۔ ''کپڑوں کا مقصد تن ڈھانپنا ہوتا ہے اور یقیناً میرا لباس آپ کے پہناوے سے زیادہ اس مقصد پر پورا اترتا ہے۔''

فرحانہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ایسے کپڑوں والی کے خیال بھی ایسے ہی ہوں گے۔''

''بالکل، مجھے بھی آپ کے لباس سے آپ کے عمدہ خیالات کی جھلک نظر آ رہی ہے۔'' تناوش نے اس کے نیم عریاں لباس کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔

''تمھیں شاید کبیر علی خان سے شادی کا زعم ہے۔ محترمہ یہ دو دن کی عیاشی ہے، کبیر جیسے مرد کسی ایک عورت پر قانع نہیں رہتے۔'' فرحانہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

''یہ میرا دردِ سر ہے تجھے دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' تناوش تم سے بھی نچلے درجے پر آ گئی۔

فرحانہ نے اسے گھور کر دیکھا، مگر تناوش اسے خاطر میں لائے بغیر ایک قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''شکریہ، میں کچھ دیر یہاں بیٹھنا پسند کروں گی۔''

''کبیر صاحب نے کہا ہے کہ معزز خواتین سے تمھارا تعارف کرا دوں۔'' اس نے لفظ ''معزز'' پر اس طرح زور دیا گویا تناوش کی کوئی عزت نہ ہو۔ اپنے تئیں اس نے تناوش کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اسے جانتی نہیں تھی۔

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''تو منع کس نے کیا ہے۔ کروا دو نا تعارف، جس جس سے ملوانا ہے اسے یہیں بلوا لو۔ اب کبیر دادا کی بیوی دوسری عورتوں کے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔''

فرحانہ قہر آلود نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ وہ بے نیازی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کبیر دادا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ شہاب قصوری کے ساتھ کسی خاص بحث میں مشغول تھا۔ تناوش کے اٹھنے کے بعد پاشا اور کاشف بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے۔ تناوش ان میں سے نہ تو کسی مرد کو جانتی تھی نہ عورت کو۔ اچانک اس کے

موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔نہ جانے اس وقت کس کی کال تھی۔سستا سا موبائل فون نکال کر اس نے سکرین پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کال وصول کرنے کا بٹن دبایا۔

''اسلام علیکم ماں جی!''

''وعلیکم اسلام کیسی ہو بیٹی!''بشریٰ خاتون نے بشاشت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ماں جی!.....خیریت تو تھی؟''

''ہاں خیریت تھی صبح سے تمھاری کال کا انتظار کر رہی تھی۔پھر رہا نہ گیا اور خود سے رابطہ کرنا پڑا۔''

خاموش کھڑی فرحانہ پر ناگواری بھری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ کہنے لگی۔''پڑھائی میں مصروف تھی ماں جی،اس لیے رابطہ نہ کر سکی اور اس وقت بھی ایک تقریب میں ہوں کل ان شاءاللہ بات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے بیٹی!.....خدا حافظ۔''بشریٰ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تناوش کے بات ختم کرتے ہی وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔''کافی جدید اور خوب صورت سیل فون رکھا ہوا ہے ،داد دینا پڑے گی تمھاری پسند کی۔''یہ کہہ کر وہ چل دی۔تناوش کا جواب سننے کی زحمت اس نے نہیں کی تھی۔

لمحہ بھر بعد وہ خواتین کے جھرمٹ میں کبیر دادا کی دلھن کے لباس،موبائل فون اور بداخلاقی کا مذاق اڑا رہی تھی۔وہاں موجود خواتین کی زیادہ تر تعداد اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اگر کوئی متوسط خاندان کی تھی بھی،تو اب اس طبقے میں رچ بس کر انھی جیسی ہو گئی تھی اور ایسی خواتین کا پسندیدہ مشغلہ غریب لڑکیوں کے طرز زندگی کا مذاق اڑانا ہی ہوتا ہے۔

نسیم بیگم نے پوچھا۔''آپ بھی دیکھنے اس کے پاس گئی تھیں۔''وہ ایک جج کی بیوی تھی،لیکن جس طرح کے زیورات سے لدی پھدی تھی ایسے زیور سیشن کورٹ کا جج کم از کم اپنی تنخواہ سے بنا کر نہیں دے سکتا تھا۔یوں بھی جس تقریب میں وہ جج صاحب مدعو تھا وہاں اس کی آمد ہی اس کے کردار کا تعین کرنے کے لیے کافی تھی۔

''میں تو یہ سوچ کر گئی تھی کہ کبیر علی خان نے اپنی دلھن کو ناز نخروں سے رکھا ہوگا،مگر اس بے چاری کی حالت دیکھ کر ترس آنے لگا ہے۔''فرحانہ نے منھ بنایا۔

نوشاد آفریدی کی چہیتی بیگم نغمہ بے باکی سے بولی۔''اب بھی حسرت بھری نظروں سے کبیر صاحب کو گھور

رہی ہے، شاید اسی کے پاس جا کر بیٹھنے کا دل کر رہا ہے بے چاری کا، لیکن بے وقوف یہ نہیں جانتی کبیر خان جیسے آدمی کے پاس ایسی لڑکیوں کے لیے صرف بستر پر لیٹتے وقت چند لمحات ہوتے ہیں۔"

اس کی بات پر تمام کھل کھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

"سنا ہے کسی غنڈے کی منظور نظر تھی جسے کبیر علی خان نے اپنے اثر و رسوخ سے مروا دیا اور اس کی خوب صورتی دیکھتے ہوئے چند دنوں کے لیے گھر لے آیا۔ اب یہ بے چاری خود کو کبیر دادا کی سچ مچ کی بیوی سمجھے ہوئے ہے۔" یہ راز آشکارا کرنے والی شیر خان کی بیوی ثمینہ تھی۔ ایسا کہتے ہوئے اسے یہ بھول گیا تھا کہ خود اس کی شادی شیر خان سے کس طرح ہوئی تھی۔

ایس پی ضمیر حسین کی بیوی سلطانہ بولی۔ "ہاں میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے کہ کبیر خان نے اسے رکھیل بنا کر گھر رکھا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے کوئی بڑا جھگڑا بھی متوقع ہے۔ اس ڈائن کی وجہ سے شاہ صاحب کے دو آدمی بھی کبیر خان کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔"

بہ ظاہر تمام گھریلو خواتین دکھائی دے رہی تھیں، مگر ان کی باتوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہروں وغیرہ کی اصلیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کبیر دادا کو کبیر علی خان کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے دادا ہونے سے ناواقف تھیں۔

نغمہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "ویسے اس میں ایسی کون سی بات ہے کہ کبیر خان جیسے پرکشش اور خوب صورت مرد نے اس کے لیے قتل تک کر ڈالا۔"

"مردوں کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہوتی آ گیا ہوگا دل، حالانکہ اس سے کئی گنا خوب صورت اور دلکش خواتین سے اس کا روزانہ واسطہ رہتا ہوگا۔" فرحانہ کا ڈھکا چھپا اشارہ اپنی جانب تھا۔

"شاید کم عمری اچھی لگی ہو۔" رخسانہ نے لقمہ دیا۔ وہ شہاب قصوری کی بیٹی تھی۔

"اتنی بھی بچی نہیں ہے، مجھ سے سال دو ہی چھوٹی ہوگی۔" ثمینہ نے عورتوں کی ازلی فطرت کا اظہار کیا کہ وہ کسی دوسری عورت کو کم عمر نہیں سمجھ سکتیں۔

اس کے بغل میں کھڑی فصیح الدین کی بیوی کرن نے پوچھا۔ "ویسے آپ نے ماسٹر کیا ہوا ہے نا۔"

''ہاں۔'' اس نے فخریہ انداز میں سر ہلایا۔

''اور اس کے بعد آپ کی شادی کو بھی غالباً پانچواں سال ہے۔''

''ہاں، قریباً اسی طرح ہی ہے۔'' ثمینہ نے حیرانی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

کرن نے تناوش کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہے۔''

''تو کیا، میری بلا سے پانچویں میں پڑھتی ہو۔ یوں اس کی عمر تو کم نہیں ہو جائے گی نا۔ غریب غرباء ویسے بھی دیر سے اسکول جانا شروع کرتے ہیں۔'' ثمینہ اپنی بات سے پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔

''آپ کو بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔'' فرحانہ خفگی بھرے لہجے میں کرن کو مخاطب ہوئی۔

کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھاڑ میں جائے وہ، میں تو بس ثمینہ آپی کو چھیڑ رہی تھی۔'' ثمینہ اور اس میں کافی گہری دوستی تھی۔

''کیوں نا اس کے پاس جا کر تھوڑی گپ شپ کی جائے۔'' رخسانہ نے مشورہ دیا۔

باقیوں کے ہاں ناں کرنے سے پہلے اخلاق حسین شاہ کی بلند آواز گونجی۔ ''خواتین و حضرات کھانا لگ چکا ہے، آپ مزید گپ شپ کھانا کھاتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔''

تمام مسکراتے ہوئے یوشکل کی لگی ہوئی کھانے کی میزوں کی طرف بڑھ گئے تھے جہاں انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے۔ کبیر دادا، پاشا، کاشف اور شہاب قصوری کی معیت میں کھانے کی میز کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اس کی نظریں تناوش کی متلاشی ہوئیں۔ شہاب پارٹی سے گپ شپ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے چہرے پر تناوش کی نظروں کی تپش محسوس کرتا رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا تھا لیکن دوسروں کی موجودگی میں اسے دوسری جانب متوجہ ہونے کا اشارہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ اب بھی اسی جگہ بیٹھی تھی۔ حاضرین میں وہ واحد مہمان تھی جس نے کھانے کی میز کا رخ نہیں کیا تھا۔

''یہ مصیبت تماشا بنائے گی میرا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''مجھے کچھ کہا۔'' پاشا مستفسر ہوا۔

اس نے بات بنائی۔ ''ہاں، میں کہہ رہا تھا تم کھانا کھاؤ میں اسے لاتا ہوں۔''

"کسے۔" حیرانی سے کہتے ہوئے پاشا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی۔ تناوش کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ "دادا تو گیا کام سے۔"

"بکواس نہ کیا کرو۔" کبیر دادا جھینپتا ہوا تناوش کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تناوش پر توجہ نہیں دینا چاہتا تھا، اسے نظر انداز کر دینا چاہتا تھا، مگر پھر اسے معلوم بھی نہ ہوتا اور وہ بے دھیانی میں اسے اہمیت دے جاتا۔

کبیر دادا کو اپنے جانب آتا دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

"کیا تمھارے لیے علاحدہ بلاوہ آئے گا۔" قریب پہنچتے ہی کبیر دادا نے بے زاری بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ نشست چھوڑتے ہوئے بولی۔ "بالکل، اہم لوگوں کے لیے خصوصی بلاوا آیا کرتا ہے۔"

وہ چڑ کر بولا۔ "تو پھر بیٹھ کر انتظار کرو کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔"

"آ تو گیا ہے خصوصی بلاوا۔" اس نے شوخی بھرے لہجے میں کبیر دادا کی جانب اشارہ کیا۔

"بے وقوف۔" افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ واپس مڑ گیا۔

وہ اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے بولی۔ "اچھا لگتا ہے آپ کا یوں خیال رکھنا۔"

"خیال نہیں رکھ رہا، خود کو تماشا بننے سے بچانے کی تگ و دو میں ہوں۔"

وہ متبسم ہوئی۔ "چلیں، کسی بہانے تو آپ کی توجہ مل گئی۔"

وہ کھانے کی میز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک خالی پلیٹ اٹھا کر تناوش کے حوالے کرتے ہوئے اس نے دوسری پلیٹ اپنے لیے سیدھی کر کے اپنا پسندیدہ پکوان ڈالنے لگا۔

تناوش نے بھی اس کی تقلید میں پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے اور بیٹھنے کے لیے کرسی وغیرہ کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک جدید طریقہ تہذیب سے ناواقف تھی۔ یورپ کی نقالی میں اب اونچے طبقے میں بھی کھڑے ہو کر اور چل پھر کر کھانے کا رواج پھیل گیا ہے۔ جیسے جانوروں کے آگے چارہ پھینکا جائے تو بیٹھا ہوا جانور بھی کھڑا ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ پاک نے اسے کھڑے ہو کر کھانے کا مکلف کیا ہے۔ جبکہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اور اس کی تربیت کے لیے اللہ کریم نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ مگر آج کے لبرل اور دین بیزار طبقے کو انبیاء کی نہیں یورپ کی تقلید پر خوشی ملتی ہے۔ تناوش چونکہ کھانے کے آداب سے واقف تھی اس لیے بیٹھ کر کھانے لگی۔ اس وقت

کبیر دادا کو چند خواتین نے گھیرا ہوا تھا وہ اسے شادی کی مبارک باد دے رہی تھیں۔

''بے چاری کو اونچے طبقے کے آداب ہی معلوم نہیں ہیں۔'' اسے بیٹھا دیکھ کر فرحانہ پاس کھڑی رخسانہ کو مخاطب ہوئی تھی۔

رخسانہ نے جواب دیا۔ ''یہ تو کبیر صاحب کی غلطی ہے نا۔''

''خیر غلطی تو نہیں کہہ سکتے۔'' فرحانہ نے قہقہہ لگایا۔ ''اس دیہاتن کو اس نے ہمیشہ تو ساتھ نہیں رکھنا نا۔ چند دن مستفید ہو کر دفع دور کر دے گا۔''

رخسانہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''ویسے آپ کو وہ اتنی بری کیوں لگتی ہے۔''

فرحانہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ وہ ہے ہی بری۔'' اور رخسانہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

کھانے کے بعد بھی تقریب جاری رہی۔ اخلاق حسین نے ایک مشہور غزل خواں کو بلایا ہوا تھا۔ کھانے کے اختتام پر ملازموں نے برتن سمیٹ کر تمام میزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر سٹیج بنایا اور اس پر قالین بچھا کر گلوکار کے بیٹھنے کی جگہ بنانے لگے۔ مہمان خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ جگہ بنتے ہی موسیقار اپنی آواز کا جادو جگانے لگا۔ تناوش کو وہاں خواہ مخواہ بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ کبیر دادا اس سے دور دوستوں کے درمیان میں بیٹھا تھا۔ موسیقی سنتے ہوئے زیادہ تر سامعین الکوحل سے بھی فیضیاب ہو رہے تھے۔ ان میں کبیر دادا پیش پیش تھا۔ اس کے ہر نئے گلاس کو تناوش شمار کر رہی تھی۔

اس سے زیادہ دیر انتظار نہ کیا گیا اور اس نے موبائل فون نکال میسج لکھنا شروع کر دیا۔

''پلیز چلیں نا، میں سخت بور ہو رہی ہوں۔'' یہ لکھ کر اس نے کبیر دادا کے نمبر پر بھیج دیا۔ مگر موسیقی کے شور میں شاید اسے پیغام کی گھنٹی سنائی نہیں دی تھی تبھی تو وہ موبائل فون کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

لمحہ بھر انتظار کے بعد وہ اسے کال کرنے لگی۔ یقیناً اس طرح وہ موبائل فون کی طرف متوجہ ہو کر اس کا میسج پڑھ لیتا۔

اس کی ترکیب کارگر رہی تھی۔ موبائل فون کی گھنٹی بجتے ہی وہ چونک کر جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں آتے ہی تناوش نے کال کاٹ دی۔ سکرین پر نگاہ دوڑاتے ہی اس کی خفگی بھری نگاہیں تناوش کی

جانب اٹھیں اور پھر وہ پیغام پڑھنے لگا۔ اگلے ہی لمحے تناوش کو اس کی انگلیاں موبائل سکرین پر متحرک نظر آئیں ۔منٹ بھر بعد ہی پیغام کا جواب پہنچ چکا تھا۔

''روکا کس نے ہے، ڈرائیور کو ساتھ لے کر گھر چلی جاؤ۔'' جواب اس کی توقع کے مطابق تھا۔ مگر وہ باز آنے والی نہیں تھی۔ فوراً لکھ بھیجا۔

''گھر میں اکیلی تو یہاں سے بھی زیادہ بور ہو جاؤں گی۔''

''تو نہ جاؤ۔'' اس مرتبہ اسے جواب کے حصول کے لیے کال نہیں کرنا پڑی تھی۔

''پلیز چلو نا، اس گائیک سے اچھا تو میں خود گا لیتی ہوں، گھر جا کر جتنی چاہے غزلیں اور گیت سن لینا۔'' اس کے شوخی بھرے میسج نے کبیر دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ وہ خود موسیقی وغیرہ کا اتنا شوقین نہیں تھا ،لیکن یوں بھری محفل سے اٹھ کر جانا اسے عجیب لگ رہا تھا خاص کر ان دنوں جب پاشا اور اس کے دوسرے احباب بڑی سختی سے اس کے پیچھے پڑے تھے کہ وہ اپنی نئی نویلی دلھن کی وجہ سے باقی ساری دلچسپیوں سے دور ہونے لگا ہے۔ مگر یہ سوچ اسے زیادہ دیر نہیں روک سکی تھی، اس دوران تناوش کے شوخی شرارت اور منت بھرے میسج اسے مسلسل موصول ہو رہے تھے۔ آخری میسج پڑھتے ہوئے وہ بہ مشکل اپنی ہنسی روک پایا تھا۔

''یقین مانیں مجھے لونگ لاچی والے گانے پر رقص کرنا بھی آتا ہے۔''

''سخت نیند آ رہی ہے یار!'' دائیں پہلو میں بیٹھے کاشف راجپوت کو مخاطب ہوتے ہوئے اس نے مصنوعی جمائی بھی لی تھی۔

''صاف کہیں دادا، کہ آپ جانا چاہتے ہیں۔'' جواب کاشف کے بجائے بائیں جانب بیٹھے پاشا نے دیا تھا

''تمھیں کوئی تکلیف؟'' کبیر دادا نے اسے جھڑکنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''کیا آپ میری تکلیف دور کر سکتے ہیں۔'' وہ باز آنے والا نہیں تھا۔

''ہاں۔'' کبیر دادا اطمینان سے بولا۔ ''مرنے کے بعد انسان ہر قسم کی تکلیف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور تمھاری گردن دبانا اتنا بھی مشکل نہیں ہوگا۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''شکریہ، آپ جا سکتے ہیں، لیکن یاد رکھیے گا کہ میسج کے ذریعے منصوبہ بندی کرنے والے

آپ پہلے پری نہیں ہیں۔"

"صحیح کہا، مگر یوں دوران محفل اپنے استاد کے ہاتھوں مرنے والے یقیناً تم پہلے فرد ہو گے۔"

پاشا طنزیہ انداز میں بولا۔"آپ شاید گھر جا رہے تھے۔بس یہ یاد رہے کہ جاتے وقت میزبان سے اجازت لینا اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔"

کبیر دادا جانتا تھا کہ پاشا کی زبان کو اتنی آسانی سے لگام نہیں دی جا سکتی تھی۔بھری محفل میں وہ اسے تھپڑ بھی نہیں مارنا چاہتا تھا، بس دانت پیس کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ گیا۔اس کی متلاشی نظروں نے اخلاق حسین کو ڈھونڈا جو اس وقت ایس پی ضمیر حسین اور نوشاد آفریدی کے درمیان بیٹھا تھا۔قریب جا کر اس نے رسمی اجازت لی اور عظیم کو کال کر کے گاڑی لگانے کا کہنے لگا۔

تناوش بھی اٹھ کر اس کی جانب بڑھ گئی تھی۔اس بات سے بے نیاز کہ جانے کتنی نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔کچھ نگاہوں میں تمسخر، کچھ میں ہوس اور کچھ میں حسد جھلک رہا تھا۔

وہ لان سے نکل کر سیمنٹ کی پختہ روش آ گیا۔وہ اس کے پہلو میں رکتے ہوئے دل آویز انداز میں مسکرائی۔"شکریہ۔"

"کس لیے۔"اس نے بہ ظاہر انجان بن کر پوچھا۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"مسکراہٹ اس کے لبوں پر گہری ہو گئی تھی۔

وہ کڑھتے ہوئے بولا۔"مجھے نیند آ رہی تھی اس لیے واپس جا رہا ہوں سمجھیں۔"شاید وہ اپنے واپسی کے فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔"شرارتی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں رہی۔"کم از کم میں ان وعدوں کی انجام دہی سے تو نجات پا گئی جو آپ کو گھر واپس جانے کی شرط پر غلطی سے کر بیٹھی تھی۔"

"کون سے وعدے۔"کبیر دادا جانتے بوجھتے انجان بن گیا تھا۔

وہ کھل کھلائی۔"وہی رقص، گیت اور اس طرح کے کچھ اور جھوٹے وعدے۔"

کبیر دادا نے ہونٹوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو زبردستی کی کھانسی میں چھپایا، اس باتونی لڑکی کو بحث و تکرار سے

ہرانا مشکل تھا۔اسی وقت ڈرائیور نے گاڑی ان کے ساتھ آ کر روک دی۔ عظیم نے نیچے اتر کر جلدی سے کبیر دادا کے لیے دروازہ کھولا۔

نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ تناوش کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود دوسری جانب گھوم گیا۔

☆.....☆.....☆

''اب دادا ان رنگ برنگی محفلوں سے بھی بھاگنے لگا ہے۔'' کبیر دادا کے نشست چھوڑتے ہی پاشا کاشف راجپوت کو مخاطب ہوا۔

''یار کیوں اپنے استاد کے پیچھے پڑے ہو، بری طرح پٹو گے۔'' کاشف نے دھیمے لہجے میں سرزنش کی۔

''یقین مانو دادا!.....اس خوب صورت چڑیل نے کبیر دادا کو ضائع کر دینا ہے۔'' پاشا کے لہجے میں تناوش کے لیے نفرت ابل رہی تھی۔

کاشف ہنسا۔''اتنی پیاری لڑکی کو چڑیل کہہ کر تم اپنی بدبختی پر مہر ثبت کر رہے ہو۔''

پاشا نے منہ بنایا۔''بات شکل وصورت کی نہیں کردار کی ہوتی ہے۔''

''یہ بھی خوب کہی، کیا برا ہے اس کے کردار میں، لباس کو دیکھو، سر پر اوڑھا دوپٹا دیکھو، حیا آلود آنکھیں دیکھو، اس سے بڑھ کر کیا کردار ہوگا، پوری محفل میں اس جیسی ایک بھی نظر آئی ہو تو بتاؤ۔''

''دادا، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر طوائف کے گھر تہجد گزار پیدا ہو جائے تو اس کا کاروبار تو ٹھپ ہو جانا ہے نا۔''

''گویا تم کبیر دادا کو طوائف کہہ رہے ہو۔''

''ہم سب اسی زمرے میں آتے ہیں، پیار محبت اور عشق معشوقی کی گنجائش اپنے کاروبار میں نہیں ہے۔''

کاشف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''وہ شادی کرنے والا اکیلا نہیں ہے، اب تو ہم دو تین ہی کنوارے رہ گئے ہیں۔''

''بات شادی کی نہیں کبیر دادا کے رویے کی ہے ابھی یہاں بیٹھے ہوئے وہ اس مصیبت کے ساتھ میسج پر بات کر رہا تھا۔ایک میسج پڑھنے میں میں کامیاب رہا ہوں، وہ اسے گھر چلنے کا کہہ رہی تھی، کچھ انعام وغیرہ کے وعدے

بھی کر رہی تھی، ایسے چونچلے صرف محبوب ہی سے کیے جاتے ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ چھوکری کبیر دادا کو یوں انگلیوں پر نچانے لگ جائے گی۔"

"کچھ نہیں ہوتا یار۔" کاشف راجپوت اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ "چند دن کی بات ہے غریب کو ایک خوب صورت اور پرکشش لڑکی سے لطف اندوز ہونے دو، ختم ہو جائے گی یہ محبت وغیرہ۔ کبیر دادا زیادہ دن کسی چھوکری سے نہیں بہلنے والا۔"

پاشا تیقن سے بولا۔ "غلط فہمی ہے آپ کی، یہ پہلی خوب صورت اور کنواری لڑکی نہیں ہے جو کبیر دادا کی زندگی میں آئی ہو۔ پہلے بھی کئی آ چکی ہیں مگر میں نے کبھی کبیر دادا کو یوں پاگل ہوتے نہیں دیکھا۔ دادا!..... سچ کہوں تو مجھے دال میں ذرا بھی سفیدی نظر نہیں آ رہی۔"

"تم بس یونہی پریشان ہو رہے ہو، کبیر دادا کسی لڑکی کے لیے اپنا مقام اور عزت گنوانے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ عورت ذات کی اہمیت اس کے لیے ٹشو پیپر سے بڑھ کر نہیں ہے اور ٹشو پیپر استعمال ہونے کے بعد اپنی اہمیت کھو دیا کرتا ہے۔" کاشف اس کی بات کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"کاش ایسا ہی ہو۔" پاشا حسرت بھرے لہجے میں بولا کہ وہ کبیر دادا سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ اس کا آئیڈیل تھا اور اپنے آئیڈیل کو وہ کسی صورت برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

"یار، سچ کہوں تو یہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ پرکشش اور جاذب نظر ہے۔" نوشاد آفریدی اخلاق حسین کو مخاطب تھا

اخلاق حسین نے کہا۔ "وہ خبیث ایسے تو پاگل نہیں ہو رہا۔"

"اب تو اس کے قتل کی ایک اور وجہ بھی مل گئی ہے۔" نوشاد آفریدی زہریلے لہجے میں بولا۔

"کیا تمھیں لگتا ہے کہ ہم اسے آسانی سے ختم کر پائیں گے، ہمارے ساتھ صرف ایس پی ضمیر حسین ہی اس کی موت کے حق میں ہے، شہاب قصوری اب بھی اس کی بغل میں گھسا بیٹھا ہے، پاشا کے بارے کچھ کہنا ہی فضول ہے اور کاشف راجپوت اس کا قریبی دوست ہے۔"

''پانچ سربراہ اور بھی موجود ہیں، ہم انھیں اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں، کم از کم کبیر دادا کی سربراہی کے حق میں تو وہ بھی نہیں ہیں، بس انھیں اس بات پر قائل کرنا ہے کہ وہ کبیر دادا کے خاتمے پر راضی ہو جائیں۔'' نوشاد آفریدی نے منصوبہ سامنے رکھا۔

''یوں بھی بات کچھ جچتی نہیں ہے، ایک جانب اگر ہم آٹھ بھی ہو جائیں ہمارے مخالف چار تو موجود ہوں گے اور اس طرح ہم انھیں ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تب بھی وہ ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہوں گے۔'' اخلاق حسین اس کے منصوبے کے ساتھ متفق نہیں تھا۔

''یار، ہم نے صرف اس خبیث کا خاتمہ کرنا ہے اس کے بعد جھگڑا ختم کر دیں گے۔'' نوشاد کے دماغ پر کبیر دادا کی موت سوار تھی۔

اخلاق حسین اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ پہلے حملے میں بچ گیا تو اس کے ہاتھ ہمارے خلاف کارروائی کرنے کا جواز آجائے گا اب تو وہ شمشیر دادا کی وجہ سے جھجک رہا ہے۔ اور اتنا تو تم جانتے ہو کہ وہ گینڈے کی طرح طاقت ور اور لومڑ کی طرح پھرتیلا ہے۔ اس کے ساتھ کاشف راجپوت اور پاشا بھی بہت خطرناک ہیں، ہمارے گینگ میں ایسا کوئی نہیں جو ان میں سے کسی کے مقابل آسکے، ایک فصیح الدین لڑائی بھڑائی جانتا ہے مگر اتنا اچھا لڑاکا وہ بھی نہیں کہ کبیر دادا کے سامنے ٹھہر سکے۔''

نوشاد آفریدی پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''اس کا مطلب وہی شمشیر دادا کو بلانے والا فیصلہ ہی درست ہے۔''

''اس کے علاوہ چارہ بھی کوئی نہیں۔'' اخلاق حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی وقت انھیں کبیر دادا اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ نوشاد آفریدی نے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوا سے کبیر دادا کی طرف متوجہ کیا۔ اخلاق حسین نے سنبھلتے ہوئے چہرے پر منافقانہ مسکراہٹ سجالی تھی۔

قریب آتے ہی کبیر دادا نے کہا۔ ''شاہ جی!..... بہت شکریہ اب اجازت چاہوں گا اتنا اچھا کھانا کھانے کے بعد نیند آنے لگی ہے۔''

''نیند آرہی ہے یا ہماری بھابی کی یاد ستا رہی ہے۔'' اس کے کان سے منہ لگاتے ہوئے اخلاق حسین نے

مزاحیہ انداز اپنایا۔

''دونوں سمجھ لو۔'' کبیر دادا اسی کے انداز میں بولا تھا۔

اخلاق حسین نے زبردستی کا قہقہہ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے رسمی لہجے میں کہا۔ ''تشریف آوری کا شکریہ، آپ کی وجہ سے ہماری روکھی پھیکی تقریب میں جان پڑ گئی ہے۔''

کبیر دادا اس سے مصافحہ کر کے واپس مڑ گیا۔ اس نے نوشاد کے ساتھ مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اخلاق حسین نے کبیر دادا کے پیچھے جاتی ہوئی تناوش کو ہوس ناک نظروں سے گھورا۔ ''ایسی لڑکی کہاں کسی کو محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونے دے سکتی ہے۔''

نوشاد ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ ''کیا معلوم چند دنوں تک اس خبیث کا دل بھر جائے اور اسے واپس بھیج دے۔''

اخلاق حسین نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''چند دن کیا میں چند ماہ بھی صبر کر سکتا ہوں مگر ایسا لگتا نہیں ہے کہ یہ دیو اس پری کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا۔''

''تو پھر شمشیر دادا والی تجویز پر عمل کرتے ہیں، اس خبیث کی دو تین غلطیاں تو ہم نے ڈھونڈ رکھی ہیں جس کے ہمارے پاس گواہ بھی موجود ہیں اس سے ایک دو غلطیاں اور کروا کر شمشیر دادا کی منت کر لیتے ہیں امید ہے چند دنوں کے لیے وہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کر لے گا۔''

اخلاق بولا۔ ''یاد رہے، یہ خبیث اس کا چہیتا شاگرد رہ چکا ہے۔''

''اس کی رکھیل کو دیکھتے ہی شمشیر دادا استادی شاگردی بھول جائے گا اور جہاں تک میرا اندازہ ہے کبیر اس لڑکی کو شمشیر دادا کی جھولی میں ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔''

اخلاق افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بات تو پھر وہیں پہنچی، کیا کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا، اگر یہ بلبل شمشیر دادا کے ہتھے چڑھ گئی تو ہمیں کیا ملے گا۔''

''اس نے کون سا ہمیشہ پاس رکھنا ہے ایک دو دن میں چھوڑ دے گا پھر ہماری باری۔'' نوشاد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی تو سوچو نا، ہمارا مقصد تو اس لڑکی اور کبیر سے بدلہ لینا ہے نا۔ اگر شمشیر دادا نے اس کی

جان بخشی کر بھی دی تب بھی کبیر دادا دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"بدلہ لینے والی بات اس لڑکی کو دیکھنے سے پہلے تک تھی، اب تو کم بخت پر دل آ گیا ہے۔" اخلاق حسین دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے عاشقانہ انداز میں بولا۔ نوشاد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

راستے بھر وہ خاموش بیٹھی رہی، کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کبیر دادا دوسرے آدمیوں کے سامنے ایسی باتیں کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ البتہ یہ اور بات کہ وہ اس کے ساتھ بالکل جڑ کر بیٹھی رہی۔ کبیر دادا نے ایک دو بار اسے کہنی سے ٹہوکا دے کر دور ہٹنے کا اشارہ بھی کیا مگر ایسے اشاروں کو وہ خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔

گاڑی کے مخصوص جگہ پر رکتے ہی عظیم نے نیچے اتر کر کبیر دادا کے لیے دروازہ کھولا اس دوران وہ خود نیچے اتر کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ کبیر دادا اس سے ایک قدم آگے تھا۔ خواب گاہ میں گھستے ہی وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔

"کچھ کھانے پینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو بتائیں۔" اس کے قریب بیٹھتے ہوئے تناوش نے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ویسے میرا مزاج اور موڈ تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔" وہ یقیناً گاڑی میں اس کے ساتھ جڑے بیٹھنے پر خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔

"آپ کے دل میں پیدا ہونے والی ذرا سی بات بھی سمجھ لیتی ہوں۔" تناوش کے ہونٹوں پر تبسم رقصاں ہوا۔ "البتہ اس پر عمل کرنے نہ کرنے کے بارے خود طے کرتی ہوں۔"

"گاڑی میں تھوڑا ہٹ کر بیٹھ جانے سے کیا قیامت آ جاتی۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "گاڑی میں آپ کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے سے کون سی قیامت آ گئی۔"

"ایک دفعہ منع جو کیا ہے کہ میرے آدمیوں کے سامنے ایسی حرکتیں نہ کیا کرو۔"

وہ باغی لہجے میں بولی۔ "واہ جی واہ چوبیس گھنٹے میں چند لمحے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا ہے وہ بھی فاصلہ رکھ کر بیٹھوں، کیوں جی۔"

"دماغ تو ٹھیک ہے، پوری رات تمھارے ساتھ ہی تو ہوتا ہوں۔" اس کے لہجے میں حیرانی بھرا غصہ شامل تھا۔

"نہیں جی، پوری رات آپ سوتے ہیں۔" اس نے منہ بسورا۔

"جانتی ہو تمھاری ان حرکتوں کا مجھے ایک ہی حل نظر آ رہا ہے کہ تمھیں جلد از جلد چلتا کروں۔"

کبیر دادا کی ہر بات کا خاطر خواہ جواب دینے والی اس کے چھوڑ دینے کی بات پر لاجواب ہو جاتی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کبیر دادا اپنا کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا۔ بوٹ اس نے جان بوجھ کر نہیں کھولے تھے وہ جانتا تھا کہ اس کے ایسا کرنے پر تناوش نے خفگی کا اظہار کرنا تھا۔ جانے کون سی ایسی طاقت تھی جو اسے تناوش کو خفا کرنے کی اجازت نہیں دے پا رہی تھی۔

چند منٹوں بعد وہ ڈریسنگ روم سے برآمد ہوئی اسے دیکھ کر کبیر دادا حیران رہ گیا تھا۔ اس نے کبیر دادا کے دن کو لائے ہوئے کپڑے پہن لیے تھے۔ جینز کی تنگ پتلون اور اس پر گلابی رنگ کی پھول دار قمیص میں وہ خوب جچ رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" کبیر دادا کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی ٹھوڑی کبیر دادا کے گھٹنوں پر سجالی۔

اس کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے کبیر دادا نے بہ مشکل اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹائیں۔ "پہلے تو یہ لباس اچھا نہیں لگ رہا تھا، اب کیوں پہنا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں شکوہ جھلک رہا تھا۔

"میں نے کب کہا کہ آپ کا لایا ہوا لباس اچھا نہیں ہے، میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں ایسا لباس نہیں پہنتی۔"

"تو اب کیوں پہنا؟"

وہ معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ کے لیے۔"

"مجھ پر احسان کرنا تھا تو آج کی تقریب میں پہنا ہوتا۔" اس نے طنز کیا۔

”کہانا آپ کے لیے پہنا ہے، لوگوں کے لیے نہیں۔“

”اور اگر میں کہوں آئندہ تقریبات میں اسی قسم کا لباس پہنو گی پھر۔“

وہ وارفتگی سے بولی۔”میں صرف آپ کے لیے بجنا سنورنا چاہتی ہوں، آپ کے لیے ہنسا مسکرانا چاہتی ہوں ،آپ پر اپنی خدمتیں نچھاور کرنا چاہتی ہوں اور اگر آپ کی خوشی اس میں ہے کہ ایسے بے حجابانہ کپڑے پہن کر سب کے سامنے گھومتی پھروں تو دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایسا کروں گی۔“

علامہ اقبالؒ نے جانے کس کیفیت کے زیر اثر فرمایا تھا.....

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اس وقت تناوش کے دل سے نکلے ہوئے خلوص بھرے الفاظ نے کبیر دادا کو عجیب قسم کی خوشی سے سرشار کر دیا تھا۔وہ دل کی بدلتی حالت کی توجیہ سے قاصر تھا۔اس کم عمر لڑکی میں نہ جانے ایسی کون سی بات تھی کہ ہر گزرتی گھڑی وہ اسے اپنے لیے ناگزیر ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔کبیر دادا کا ناگواری ظاہر کرنا، بیزاری کا اظہار، غصے کا برتاؤ کسی بھی ایسی ترکیب کو وہ خاطر میں نہیں لا رہی تھی جس سے کبیر دادا خود کو سنبھال سکتا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے جان چھڑائے۔تین دن پہلے ہی وہ اس کی زندگی میں زبردستی شامل ہوئی اور اب اس کے ساتھ گزارے دن صدیوں پر محیط نظر آنے لگے تھے۔وہ کبیر دادا سے پندرہ سولہ سال چھوٹی تھی لیکن کسی بڑی اماں کی طرح اسے انگلیوں پر نچا رہی تھی۔وہ پختہ ارادہ کرتا کہ اب اس کی کوئی بات نہیں مانے گا، مگر وہ منوا لیتی، وہ سوچتا کہ اسے طلاق دے کر گھر بھیج دے اور اخلاق حسین پارٹی سے بچانے کے لیے اسے کسی اور جگہ پر روپوش کرا دے گا، مگر اسے گھر بھیجنے کی جرات اپنے اندر مفقود پاتا۔خود پر جبر کر کے اسے جھڑکتا مگر ہر آن اس کی شرارتوں اور شوخیوں کا متمنی رہتا۔اس کی خدمت گزاری کبیر دادا کو اپنی اہمیت کا احساس دلاتی۔اس کا حکم ماننے والے، اس کا کام کرنے درجنوں موجود تھے مگر جس خوشی سے وہ اس کی خدمتیں بجالاتی ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اس کی خوب صورتی اور جسمانی کشش کی وجہ سے وہ اس کی بات ماننے پر راضی ہوا تھا۔یہ سوچتے ہوئے کہ

دو دن کی عیاشی کے بعد، کچھ دے دلا کر اسے رخصت کر دے گا، مگر شاید وہ جانے کے لیے نہیں، ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھی۔ گھر سے باہر جاتے ہی وہ واپس آنے کی گھڑیاں گننا شروع کر دیتا۔ پاشا اس کا چہیتا اور مخلص شاگرد تھا۔ آج تک اس نے پاشا کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی، مگر تناوش کے معاملے میں وہ اس کے مشورے پر بھی عمل نہیں کر پایا تھا۔

''کپڑے تبدیل کر لوں۔'' اس کے اظہار محبت پر کوشش کے باوجود وہ کوئی طنزیہ فقرہ یا بیزاری کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ خوش دلی سے اس کے جوتے کھولنے لگی۔ جوتوں کو ریک میں رکھ کر اس نے ہوائی چپل اٹھا کر اس کے پاؤں کے قریب رکھ دیے۔ اور پھر کبیر دادا سے پہلے ڈریسنگ روم میں گھس کر اس کے لیے شب باشی کا لباس نکالنے لگی۔

لباس تبدیل کر کے وہ بستر کے قریب آیا وہ بھی اس کے اتارے ہوئے کپڑے سمیٹ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

''میری بوتل تو لے آؤ۔'' اسے بیٹھتے دیکھ کر کبیر دادا نے یاد دہانی کرائی۔

''کون سی بوتل؟'' اس نے شرارت بھری حیرانی سے پوچھا۔

''اب تھپڑ نہ کھا لینا، دو، تین سے ایک بوتل پر آ گیا ہوں اور تمھیں معلوم نہیں کون سی بوتل۔'' اسے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''میں نے ناپے ہیں، ایک بوتل میں چھ گلاس گندہ مشروب ہوتا ہے اور آج تقریب میں آپ نے سات گلاس پیے تھے، اس لحاظ سے کل جو بوتل ملے گی اس میں سے بھی ایک گلاس مشروب کم ہو گا۔''

وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''لاتوں کے بھوت، باتوں سے نہیں مانا کرتے۔''

''مجھے مارو گے، ترس نہیں آئے گا۔'' معصومیت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کبیر دادا کے شانے پر سر ٹکا دیا۔

''تمھاری حرکتیں ترس کھانے دیتی ہیں۔''

''کوئی اچھا مشروب تو ہے نہیں کہ دھڑا دھڑ معدے میں انڈیلتے جائیں۔''

''تمھیں کس نے میرا مصلح بنایا ہے، جاؤ جو کہا ہے کرو۔''

''نکاح کے دوران قبول ہے کہنے کا مطلب ہوتا ہے دوسرے کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا اور ذمہ داریوں میں پہلا درجہ ہی اپنے شریک حیات کی صحت اور ضروریات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔''

کبیر دادا دھاڑا۔ ''بکواس بند کرو، اور جو کہا ہے کرو۔''

وہ منھ بسورتے ہوئے بولی۔ ''ہمیشہ دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ جو بھی شوہر ملے وہ مجھے خوب ڈانٹے لیکن اس کے ساتھ میری ہر بات بھی مانے۔ لگتا ہے اللہ میاں نے آدھی دعا ہی قبول فرمائی ہے۔''

کبیر دادا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ہٹ دھرم کا کیا کرے۔ ''تم نے بوتل لانا ہے یا میں الماری ہی توڑ دوں۔'' چند لمحے سوچنے کے بعد وہ دھمکی پر اتر آیا تھا۔

''اچھا لاتی ہوں دو منٹ گپ شپ تو کرو۔'' وہ جیسے بادل نخواستہ اس کی بات مان گئی تھی۔

''گپ شپ بھی ہوتی رہے گی۔'' اس کی ہاں پر کبیر دادا کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے، مگر یہ اس کی بھول تھی کہ تناوش اس کے لیے شراب کی بوتل لائے گی۔

''اچھا آپ لیٹیں تو سہی، میں اپنا ایک وعدہ ہی پورا کر دوں؟''

''کون سا وعدہ۔'' اس نے حیرانی ظاہر کی، مگر اس کا لیٹنے کا ارادہ نہیں تھا۔

''بتاتی ہوں نا۔'' اس کے مضبوط شانوں کو اپنے ملائم ہاتھوں سے دھکیل کر وہ اسے تکیے پر لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا زبردستی کبیر دادا کو تکیے پر سلا دینا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا چیونٹی کا ہاتھی کو پچھاڑنا، مگر ان ملائم ہاتھوں اور معصومیت بھری نگاہوں کو اللہ پاک نے ایک ان دیکھی قوت بھی عطا کر رکھی ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور مرد بھی مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ وہ بھی پہلے لیٹنے پر آمادہ نہ ہوا مگر جب اس نے روہانسا ہو کر۔

''لیٹ بھی جائیں نا، لیٹیں تو سہی نا۔'' کہا تو وہ مصنوعی بیزاری ظاہر کرتا ہوا لیٹ گیا۔ تکیہ موڑ کر اس نے کہنی کے نیچے رکھا اور اس کے بالوں میں ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گنگنانے لگی۔ کبیر دادا

کو الفاظ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر اس گنگناہٹ میں ایسی نغمگی شامل تھی جو تفکرات اور پریشانیوں کو دور کر دے ۔اسے شراب کی بوتل بھول گئی، اپنی حیثیت، رتبہ مقام یاد نہ رہا، یہ بھی بھول گیا کہ اس نے تناوش کی کسی بھی بات پر عمل نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ ایک خوب صورت اور دلکش آواز سماعتوں کے رستے اس کے دل تک رسائی پا کر دل کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے سانس بھاری ہوئے اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا، البتہ میٹھا اور سریلا نغمہ اسے سپنوں کی دنیا میں بھی سنائی دیتا رہا۔ پھر اسے سفید لباس میں سر پر تاج سجائے تناوش نظر آئی وہ اسے سامنے بٹھا کر کوئی عمل کر رہی تھی شاید اسے ہپناٹائز کر رہی تھی یا کوئی اور قسم کا جادو کر رہی تھی۔ پوری طرح ٹرانس میں لینے کے بعد اس کی مدھر آواز نے کبیر دادا کی سماعتوں کو رونق بخشی.....

"مجھے چھوڑیں گے تو نہیں نا۔"

وہ منمنایا۔ "نہیں۔"

"مجھے طلاق تو نہیں دیں گے نا۔" کبیر دادا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔"

کبھی خود سے دور تو نہیں کریں گے نا۔"

"کبھی نہیں۔"

میری ہر بات مانیں گے نا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں دل و جان سے۔"

"مجھے شہزادیوں کی طرح رکھیں گے نا۔"

وہ اسے یقین دلاتا ہوا بولا۔ "شہزادیوں کو شہزادیوں ہی کی طرح رکھا جاتا ہے۔"

"میرے علاوہ آپ کی زندگی میں کوئی دوسری تو نہیں آئے گی نا۔"

"ناممکن۔"

اس نے تصدیق چاہی "وعدہ کریں۔"

کبیر دادا کے لبوں سے بے ساختہ پھسلا۔ "وعدہ کرتا ہوں۔"

"اللہ پاک کی قسم کھائیں۔"

''اللہ پاک کی قسم کھاتا ہوں۔'' وہ بے چوں وچراں ہر بات کو حکم جان کر تسلیم کرتا گیا۔

تناوش کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری۔ ''جانتے ہیں بدلے میں کیا ملے گا۔''

وہ مستفسر ہوا۔ ''تم بتادو۔''

وہ وارفتگی سے بولی۔ ''میں، میری محبت، میری وفائیں، میری خدمتیں۔ کیا سودا منظور ہے۔''

''دل وجان سے۔''

''مکر نہ جانا۔''

''تم بھی۔''

''نہیں مکروں گی، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں، وعدہ کرتی ہوں، سو ہنٹریں رب کی قسم کھاتی ہوں، ہمیشہ ساتھ رہوں گی..... ساتھ رہوں گی..... ساتھ رہوں گی.....'' منظر دھندلایا اور تناوش دھیمے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگی۔

''کہاں جارہی ہو، مت جاؤ، میرے قریب آؤ.....'' اس نے تناوش کو روکنا چاہا، مگر وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹتی رہی۔ اس نے جھپٹ کر اسے پکڑنا چاہا اور ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب گاہ میں روشنی اسی طرح جل رہی تھی وہ تکیے پر کہنی ٹیکے بیٹھے سروں میں گنگنا رہی تھی اور اس کی ملائم انگلیاں کبیر دادا کے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ وہ وعدے کے مطابق اس کے ساتھ ہی تھی۔ کبیر دادا ابھی تک خواب کے زیر اثر تھا اس نے تناوش کی طرف سر گھمایا وہ خواب جتنی ہی پیاری اور من موہنی لگ رہی تھی۔ بس سفید لباس اور سر پر رکھے تاج کی کمی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ خواب ہی طرح اس سے عہد و پیمان باندھے۔ اسی طرح دھونس جما کر وعدے قسمیں لے۔ مگر وہ اس کے احساسات سے بے خبر چاہت بھری مسکان ہونٹوں پر سجائے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ شاید یہ سارے وعدے اور قسمیں وہ بغیر کہے پورا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کبیر دادا زیادہ دیر اس کے ملیح چہرے کا دیدار نہیں کر سکا تھا۔ ایک دم اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے بالکل قریب گھسیٹ لیا، اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ نے بیڈ سائیڈ پر لگا تیز روشنی کا بٹن بند کرتے ہوئے ہلکے نیلی رنگ کی روشنی جلادی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح ناشتے کے وقت اسے کبیر دادا کا گزشتہ کل والا وعدہ نہیں بھولا تھا۔ کبیر دادا نے ناشتے کا پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور پھر ایک نوالے کا وعدہ کرنے والے نے بہ ظاہر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے تناوش کو پورا ناشتا اپنے ہاتھ سے کرا دیا تھا۔ اس کے رخصت ہوتے وقت تناوش نے حسب عادت منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اس پر پھونکا اس کے ساتھ ہی اس کی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔ ''کس وقت لوٹیں گے۔''

کبیر دادا نے اپنے دل میں جھانکا جو کہہ رہا تھا کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے لیکن اس کے لبوں سے بالکل متضاد بات نکلی تھی۔

''آج شاید کچھ دیر ہو جائے، کافی کام نبٹانے ہیں۔''

''پانچ چھے بجے تک آ جائیں گے نا۔''

''شاید اس سے بھی لیٹ ہو جاؤں۔''

''اگر اجازت دیں تو میں امی جان سے مل آؤں آپ کی آمد سے پہلے لوٹ آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے چلی جانا۔'' کبیر دادا نے ایک لمحہ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کس وقت لوٹیں گے تاکہ میں اس کے مطابق وہاں وقت گزار سکوں۔''

''کیوں میری آمد کے وقت تمھارا گھر میں ہونا ضروری ہے۔'' اس نے ناگواری ظاہر کی۔

''ہاں، تھکا ہوا شوہر گھر آئے تو بیوی کو استقبال اور اس کی خدمت کے لیے گھر میں موجود ہونا چاہیے۔''

بے ساختہ کبیر دادا کے لبوں سے پھسلا۔ ''کیا ساری بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

''پتا نہیں۔'' تناوش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مگر محبت کرنے والی ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

''اب جاؤں۔'' کبیر دادا اور کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔

وہ اداسی بھرے لہجے میں بولی۔ ''اس بات کا جواب میں کبھی اثبات میں نہیں دے سکتی۔''

''بے وقوف۔'' سر جھٹکتے ہوئے وہ دروازے کی طرف مڑا مگر دروازے کے قریب رکتے ہوئے پیچھے مڑا جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''کسی وقت عظیم کو ساتھ لے جا کر اپنے لیے شاپنگ کر لینا، کوئی ڈھنگ کا موبائل فون

بھی خرید لینا، کل کچھ لڑکیاں تمہارا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہی تھیں، مجھ تک بھی تمہارے لباس اور موبائل فون وغیرہ کی بات پہنچائی گئی۔"

وہ شوخی سے بولی۔ "جس دن آپ ساتھ لے جا کر شاپنگ کرائیں گے چلی جاؤں گی۔"

"صاف کہو شاپنگ نہیں کرنا چاہتی ہو۔" کبیر دادا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میں نے کبھی اپنے لیے شاپنگ نہیں کی۔"

"تو میں نے کب کہا کہ شاپنگ پر جانے کے لیے مری جا رہی ہوں۔"

"تو نہ جاؤ۔" کندھے اچکاتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ ڈرائینگ روم کے دروازے کی طرف نہیں دیکھے گا مگر داخلی دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے بے اختیار اس کی گردن پیچھے گھوم گئی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے اس کی طرف متوجہ تھی۔ اور پھر گاڑی کے باہر نکلنے تک وہ اسی کی طرف متوجہ رہا۔ وہ اپنے افعال اور ارادوں پر اختیار کھوتا جا رہا تھا۔ تناوش کے خلاف اس کی کوئی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

کچھ جو کرتا ہوں مگر اور ہی کچھ ہوتا ہے
کیا یہ سچ ہے کہ محبت میں یہی ہوتا ہے

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کے جاتے ہی وہ راحت خالہ کو آوازیں دینے لگی۔

"جی بیٹی!" وہ گھر کی صفائی کو جڑی تھی، ایک کونے سے نمودار ہوتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"خالہ ڈرائیور کو کہیں گاڑی تو لگا دے گھر تک جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی!" خوش دلی سے کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ گھر کے سامنے اترتے ہوئے ڈرائیور کو واپسی کا وقت بتا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔" کہتے ہوئے ادھیڑ عمر الٰہی بخش نے کار واپس موڑ لی۔

ماں اسے گھر کے صحن میں جھاڑو دیتے نظر آئی تھی۔

''ارے میری شہزادی آئی ہے۔'' وہ جھاڑو پھینک کر اس کی طرف لپکی۔

''کیسی ہیں امی جان۔'' وہ اس کی شفقت بھری آغوش میں سماتے ہوئے آسودگی سے بولی۔

''میری شہزادی کیسی ہے۔'' ماتھا چومتے ہوئے وہ اسے ساتھ لیے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ چہکی۔ ''آپ کو کیسی لگ رہی ہوں۔''

''اللہ کرے میری شہزادی سدا یونہی خوش رہے۔'' بشریٰ کے دل سے دعا نکلی۔

وہ۔ ''آمین۔'' کرتے ہوئے حیا آلود لہجے میں بولی۔ ''امی جان!.....وہ میرا بہت خیال رکھنے لگے ہیں۔''

بشریٰ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''مطلب تمھارا رشتہ ڈھونڈنا بند کرنا پڑے گا۔''

وہ چڑتے ہوئے بولی۔ ''ماں جی، کوئی شادی شدہ بیٹیوں کا بھی رشتہ ڈھونڈا کرتا ہے بھلا۔''

''مطلب ڈٹی ہوئی ہو۔''

وہ عزم سے بولی۔ ''ہمیشہ ڈٹی رہوں گی۔ ابھی تک بھی وہ انجان ہیں کہ میں انھیں کتنی پیاری ہوں۔ تھوڑا وقت اور بیتنے دیں، پھر دیکھنا۔''

''پگلی، شروع شروع میں ہر لڑکی مرد کو انوکھی لگتی ہے مگر چند دنوں کے تعلق کے بعد وہ کسی نئی کھوج میں آگے بڑھ جاتا ہے۔''

''یہ کلیہ کسی خاص مرد پر تو لاگو ہو سکتا ہے، تمام کو آپ ایک ہی چھڑی سے تو نہ ہانکیں ماں جی، ابو جان بھی تو ایک مرد ہی تھے۔

وہ بیٹی کی تصحیح کرتے ہوئے بولیں۔ ''ہم نے پسند کی شادی کی تھی۔''

تناوش جھٹ بولی۔ ''مجھے بھی وہ پسند ہیں۔''

بشریٰ نے منہ بنایا۔ ''بات تمھاری نہیں اس کی ہے۔''

وہ یقین بھرے لہجے میں بولی۔ ''انھیں بھی آہستہ آہستہ پسند آ ہی جاؤں گی۔''

''دیکھ لو کہیں اس سے پہلے تم ہی گھر نہ لوٹ آؤ۔''

''ماں جی میں خفا ہو جاؤں گی۔'' تناوش نے منہ بسورا۔

''ارے مذاق کر رہی تھی میری شہزادی۔'' بشریٰ نے اسے ہنستے ہوئے ساتھ لپٹا لیا۔

''آج وہ کہہ رہے تھے کہ میں ان کے سیکرٹری کو ساتھ لے جا کر اپنے لیے شاپنگ کر لوں، مگر میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ خود ساتھ جائیں گے تو جاؤں گی ورنہ نہیں۔''

بشریٰ نے منہ بنایا۔ ''بھاڑ میں جائے ایسی محبت، ایک شاپنگ کے لیے ساتھ لے جا نہیں سکتا اور خاک خیال رکھے گا۔''

''میں آپ سے بات ہی نہیں کرتی ماں جی۔'' تناوش روٹھنے کے انداز میں ماں سے دور ہو گئی اور بشریٰ ہنستے ہوئے بیٹی کو منانے لگی۔ کیا کرتی کہ تناوش اس کی بیٹی کے علاوہ قریبی سہیلی، رازدار، غم گسار اور سب کچھ تھی۔

☆.....☆.....☆

گھر سے نکلتے ہی کبیر دادا نے سب سے پہلے ساحل سمندر والے اڈے کا رخ کیا وہاں سے فارغ ہو کر وہ دوسرے ضروری کام نمٹانے لگا۔ آج یوں بھی اسے معلوم تھا کہ تناوش اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔ اب اس کا دل گھر لوٹنے کو نہیں کر رہا تھا۔ تناوش کے سامنے اعتراف نہ کرنے کے باوجود اس کی دلی تمنا یہی تھی کہ وہ اس وقت گھر لوٹے جب وہ موجود ہو، کار کی آواز سنتے ہی وہ بھاگ کر باہر نکلے اور ڈرائنگ روم کے دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر بے تابی سے اس کے قریب آنے کا انتظار کرے۔ اور قریب پہنچتے ہی شکوہ کناں ہو کہ اتنی دیر کیوں لگا دی۔ جب وہ صوفے پر بیٹھ جائے تو قالین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کیا الٹا سیدھا سوچے جا رہا ہے۔ فوراً ہی سر جھٹک کر اس نے ان سوچوں کو دور کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک ناکام کوشش تھی۔

اس کے بالکل عقب میں آنے والی جیپ میں امتیاز اپنے ساتھیوں کو مخاطب تھا۔ ''لگتا یہی ہے کہ آج مقناطیس گھر میں موجود نہیں ہے ورنہ اب تک اس نے لوہے کو اپنی کشش سے گھسیٹ لیا ہوتا۔''

بخش نے نہ سمجھنے کے انداز میں کہا۔ ''کیا اول فول بک رہا ہے۔''

''یہی کہ آج نمازن گھر میں نہیں ہے ورنہ بے نمازی کب کا گھر پہنچ چکا ہوتا۔''

بخش نے کہا۔''سوال یہ ہے کہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔''

امتیاز ہنسا۔''جواب یہ ہے کہ گھڑی پر نگاہ دوڑاؤ، سوئیاں تین کا ہندسہ عبور کر چکی ہیں اور کبیر دادا کے کام ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔''

ڈرائیور نے لقمہ دیا۔''ایسا کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا، کبیر دادا کی روزمرہ یہی ہے۔''

امتیاز اطمینان بھرے انداز میں بولا۔''ہے نہیں تھی، اب دادا نے شادی کر لی ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔'' بخش نے نفی میں سر ہلایا۔

''شرط لگا لو۔'' امتیاز نے اسے للکارا۔

''شام کے کھانے میں دو کلو مٹن کڑاہی۔'' بخش نے اس کی دعوت قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' امتیاز بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔

بخش نے کہا۔''اب پتا کیسے کریں گے۔''

''ابھی ہو جاتا ہے۔'' امتیاز موبائل فون نکال کر کسی کا نمبر ڈھونڈنے لگا۔ منٹ بھر بعد ہی مطلوبہ نمبر ڈھونڈ کر وہ رابطہ کر رہا تھا۔

''الٰہی بخش میاں کیا حال ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے موبائل فون کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

''ٹھیک ٹھاک ہوں امتیاز بھائی۔'' ڈرائیور الٰہی بخش کی آواز وہ خوب پہچانتے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے۔'' امتیاز نے تمہید کو طول دیا۔

''کچھ نہیں لیٹا ہوں اپنی چارپائی پر۔

اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔''بیگم صاحبہ نے کہیں جانا تھا، کیا ابھی تک گھر میں ہیں۔''

الٰہی بخش جلدی سے بولا۔''نہیں وہ تو آپ لوگوں کے نکلتے ہی میکے چلی گئی تھیں، انھیں پانچ بجے واپس لینے جانا ہے۔''

امتیاز کے ہونٹوں پر بھرپور ہنسی نمودار ہوئی مگر بہ ظاہر وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''اچھا پھر تو ہمارا کام

نہیں ہوسکتا۔"

الٰہی بخش نے پوچھا۔"ایسا بھی کیا کام آن پڑا ہے امتیاز باؤ۔"

امتیاز فوراً بولا۔"رات کے کھانے کے لیے شالیمار ہوٹل سے دو کلو مٹن کڑاہی بنوا کر لانا تھی۔"

الٰہی بخش اسے اطمینان دلاتا ہوا بولا۔"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، بیگم صاحبہ کو گھر چھوڑ کر لے آؤں گا۔"

"بہت شکریہ الٰہی بخش۔" امتیاز نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے بلند و بانگ قہقہہ برآمد ہوا۔

بخش خفیف ہوتا ہوا بولا۔"تمھیں پہلے سے معلوم ہوگا بے غیرت آدمی۔"

امتیاز نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔"صبح سے تمھارے ساتھ ہی ہوں۔"

"چلو کھالو کڑاہی، مگر کبھی تو پھنسو گے پتر۔" بخش نے دانت پیسے۔

امتیاز نے دوبارہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے پھر موبائل فون نکالا اور عقبی جیب میں آنے والے باقر اور رخسار کو رات کے کھانے کی دعوت دینے لگا۔ اس کے ساتھ وہ بخش کے ہارنے کی بات بھی مرچ مصالحہ لگا کر بیان کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"دادا!.....آپ سے بات کرنا ہے۔" کال وصول کرنے کا بٹن دباتے ہی کبیر دادا کے کانوں میں پاشا کی لجاجت بھری آواز پڑی۔

کبیر دادا نے پوچھا۔"کہاں پر ہو۔"

"اپنے جواء خانے والے دفتر میں بیٹھا ہوں۔"

"آدھے گھنٹے تک آرہا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ڈرائیور کو پاشا کے ہوٹل کی طرف جانے کا کہنے لگا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ پاشا کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پاشا نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کبیر دادا کی موجودگی میں وہ کبھی بھی اس کرسی پر نہیں بیٹھتا تھا۔

کبیر دادا گھومنے والی کرسی پر بیٹھتے ہی مستفسر ہوا۔"جی فرمائیں۔" وہاں وہ دونوں اکیلے ہی تھے، کبیر دادا

کے محافظ اور عظیم وغیرہ باہر ہی رک گئے تھے۔

''کھانے پینے کو کیا منگواؤں۔'' پاشا نے خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''کافی کا بتا دو اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہی کبیر دادا نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

انٹرکام اٹھا کر پاشا نے دو پیالی کافی کے بتائے اور کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوتا ہوا بولا۔ ''میرا خیال ہے اب آپ کو گھر جانے کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہوتی ہے۔''

''بکواس نہ کرو، مطلب کی بات پر آؤ۔'' کبیر دادا نے اسے جھڑکا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''اسی بکواس کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔''

کبیر دادا نے اسے ڈرایا۔ ''شاید کافی دنوں سے تمھیں تھپڑ نہیں پڑا۔''

پاشا خوفزدہ ہوئے بغیر بولا۔ ''سچ کہا، آج ایک نہیں کافی تھپڑ کھانے کا ارادہ کیے بیٹھا ہوں۔''

کبیر دادا بگڑ کر بولا۔ ''اگر سچ میں وہی بکواس کرنا ہے تو میں جا رہا ہوں۔''

''میں بہت پریشان ہوں دادا۔'' پاشا بالکل سنجیدہ تھا۔

''اچھا بکو، کیا پریشانی ہے۔'' کبیر دادا نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔

''وہ خوب صورت ڈائن آپ کو ضائع کر دے گی، کبیر دادا ایک دہشت، خوف، اور ڈر کی علامت ہے۔ کبیر دادا آہنی ارادے، چٹانی حوصلے اور فولادی عزم کا نام ہے۔ کبیر دادا کی شخصیت، کردار اور صلاحیتوں کی ایک دنیا معترف ہے آپ ایک چھوکری کے پیچھے اسے بدنام نہ کریں۔ یقین مانیں اپنے دکھی ہیں اور پرائے ہنس رہے ہیں دفع کریں اسے ٹھوکر لگا کر اپنی زندگی سے دور پھینکیں۔''

کبیر دادا کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بکواس اچھی کر لیتے ہو مگر بے مقصد۔''

''جب آنکھوں پر کسی دلربا کے نوخیز حسن کی پٹی بندھی ہو تو ہمدردوں کی نصیحتیں بکواس ہی لگتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے شادی کرنے والا میں پہلا گینگسٹر نہیں ہوں۔''

''بالکل صحیح اور میرا اعتراض آپ کے شادی کرنے پر بالکل بھی نہیں ہے۔ شادی دوسرے گینگسٹرز نے بھی کی ہے اور تھوڑی بہت روایتی محبت بھی ان میں موجود ہو گی۔ مگر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے

پاؤں کی جوتی کو سر کا تاج بنالیا ہو۔"

"الزام پر الزام دھرے جا رہے ہو بے غیرت آدمی۔" کبیر دادا نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرنا چاہا۔

اسی وقت ایک ملازم اجازت مانگ کر اندر داخل ہوا اور ان کے سامنے کافی کے بھرے مگ رکھ کر سر جھکائے باہر نکل گیا۔

پاشا کافی کا ہلکا سا گھونٹ لیتا ہوا بولا۔ "یہ سچ ہے کبیر دادا۔ کل رات تقریب میں میری نظر آپ دونوں ہی پر تھی۔ اس دوغلی ڈائن نے آپ کو اپنی بناوٹی محبت کا یقین دلانے کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی آپ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ یقیناً اسے کسی نے خوب پڑھا لکھا کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ بھی گاہے گاہے نظریں چرا کر اس کی دید سے آنکھیں ٹھنڈی کر رہے تھے۔ اور پھر محفل موسیقی میں جو محبت بھرے پیغام لکھے جا رہے تھے ایسا تو ہائی اسکول کے طلبہ ہی کر سکتے ہیں۔ اور معاف کرنا اس چڑیل کے ساتھ تو چلیں یہ جچتا بھی ہے کہ میرے خیال میں وہ فرسٹ ائیر یا سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے۔ آپ خود کو دیکھیں کیا اتنے اونچے مقام سے نیچے اترنا آپ کو روا تھا۔"

کبیر دادا صاف گوئی سے بولا۔ "کوئی محبت بھری گفتگو نہیں تھی یار، اس نے مجھے گھر چلنے کا لکھا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا۔"

"ایک چھوکری کی اتنی ہمت کہ وہ کبیر دادا کو محفل چھوڑ کر گھر چلنے کا کہے اور ایک بار بھی نہیں بار بار پیغام بھیجے۔ درجن بھر پیغامات کی گھنٹیاں تو میں نے گنی تھیں، یقیناً آپ کی طرف سے ڈھیل تھی ورنہ وہ ایسی حرکت نہ کرتی۔ اور ایک دو میسج پڑھنے کا تو مجھے بھی اتفاق ہوا تھا وہ کوئی ناچنے گانے کی بکواس کر رہی تھی اور آپ اپنی مسکراہٹ نہیں روک پا رہے تھے۔"

کبیر دادا چڑ کر بولا۔ "بے وقوف آدمی، وہ کم عمر لڑکی ہے نادانی میں ایسی حرکتیں کر گزرتی ہے اب کیا اس کی پٹائی شروع کر دوں۔"

"ہونہہ!..... کم عمر نادان لڑکی نہیں، پوری چار سو بیس ہے۔ اگر آپ کو تگنی کا ناچ نہ نچایا تو مجھے پاشا نہیں کہنا۔"

''پیٹھ پیچھے تو اب بھی یہی کہتا ہوں یار۔'' کبیر دادا نے قہقہہ لگایا۔

''پھر سامنے بھی کہنا، بلکہ میں اپنا نام ہی یہی رکھ لوں گا۔''

''بہرام میری جان، بے وقوفوں کی سی بات نہ کرو، یہ پریشانیاں اور الجھنیں اپنے دل و دماغ سے نکال دو، مجھے نہ تو اس لڑکی سے محبت ہے اور نہ میں اپنے مقام اور جگہ ہی سے ناواقف ہوں۔'' کبیر دادا نے اسے اصل نام سے پکارا۔

''مجھے ثبوت درکار ہے۔'' پاشا کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''کیا ثبوت چاہیے۔'' کبیر دادا کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''شہاب قصوری، اخلاق حسین، نوشاد آفریدی اور وہ سالا ایس پی وغیرہ ہر دوسرے دن نت نئی لڑکیوں کے ساتھ رات گزرتے ہیں اور ان کی یہ بے غیرتیاں ان کی بیویوں سے بالکل بھی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔'' پاشا سانس لینے کے لیے رکا، مگر کبیر دادا سے صبر نہیں ہوا تھا بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔

''تو.....؟''

پاشا اطمینان سے بولا۔ ''تو یہ کہ آپ اپنی روزمرہ پر آجائیں ہر دوسرے دن آپ کی خواب گاہ میں نئی لڑکی ہونی چاہیے، بالکل اس طرح جیسے شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔''

کبیر دادا نے منہ بنایا۔ ''میری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔''

''تین راتیں اس ڈائن کے ساتھ گزار لی ہیں اتنا کافی ہے۔''

کبیر دادا نے افسوس بھرے انداز میں دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی اور لڑکی کے ساتھ رات گزارنے سے کیا ہوگا۔''

پاشا جھٹ بولا۔ ''مجھے یقین آجائے گا کہ آپ اس فراڈن کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے اور میرے اندیشے غلط ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جان چھڑائی۔ ''جیسے ہی میرے معیار کی کوئی لڑکی نظر آئی تمھاری یہ تمنا بھی پوری کردوں گا۔''

''وعدہ۔'' پاشا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ایک بار کہہ تو دیا ہے۔'' کبیر دادا جھلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمھاری نصیحتیں اختتام پذیر ہو گئی ہوں تو میں واپس چلا جاؤں۔''

''ایک منٹ۔'' وہ جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کسی کو گھنٹی کرنے لگا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی تھی شاید جسے کال کی گئی تھی وہ اسی کال ہی کا منتظر تھا۔ پاشا نے مختصراً ''آجاؤ۔'' کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کون ہے۔'' کبیر دادا نے حیرانی سے پوچھا۔ مگر پاشا کے جواب دینے سے پہلے دروازے کو دھکیلتے ہوئے کوئی اندر داخل ہوا۔ آنے والی شخصیت کو دیکھتے ہی کبیر دادا گہرا سانس لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس کا اصل نام تو کبیر دادا کو معلوم نہیں تھا اور نہ اس نے کبھی جاننے کی کوشش ہی کی تھی، البتہ وہ نگی کے نام سے مشہور تھی۔ شاید اس کا اصل نام نگینہ، نگین، نگہت یا نغمہ وغیرہ تھا۔ چند دن کبیر دادا کی منظورِ نظر بھی رہ چکی تھی۔ کبیر دادا ہی کی وساطت سے اسے ماڈلنگ کے شعبے میں کافی آگے تک جانے کا موقع ملا تھا اور آج کل وہ چوٹی کی ماڈل تھی۔ کبیر دادا کے بارے اس کے دل میں پسندیدگی کے گہرے جذبات پوشیدہ تھے جنھیں جاننے والوں کے گوش گزار کرنے میں اس نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کبیر دادا کے لیے کسی ایک لڑکی کا ہو کر رہنا ناممکن ہے۔ مگر اب پاشا کی زبانی اسے جو خبر ملی تھی، پاشا پر یقین ہوتے ہوئے بھی اس خبر کے بارے وہ شک میں پڑی تھی۔

''نگی تم۔'' کبیر دادا نے گفتگو کی ابتداء کی۔

''شکر ہے آپ کو میرا نام تو یاد ہے۔'' پاشا سے مصافحہ کرتے ہوئے وہ کبیر دادا کے قریب پہنچی اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بے باکی سے اسے چومنے لگی۔

اسے نرمی سے دور کرتے ہوئے کبیر دادا نے پوچھا ''کیسی ہو۔'' جانے کیوں اسے نگی کی قربت اچھی نہیں لگی تھی۔ ایک دم تناؤش کا خوشبودار اور ملائم وجود اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا، اسے یوں لگا جیسے وہ اسے دیکھ رہی ہو۔

نگی اچک کر میز کے کونے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''بالکل ٹھیک۔''

''میرا خیال ہے نگی کی آمد کی وضاحت کرنا ضروری نہیں ہے۔'' پاشا نے زبان کھولی۔

''پاشا، میرے پاس ان چونچلوں کے لیے وقت نہیں ہے۔'' کبیر دادا ایک دم بیزار ہو گیا تھا۔

''دادا، یہ وہی نگی ہے جسے چھونے کی پاداش میں تین تھپڑ چہرے پر اور ایک بھرپور لات میری تشریف پر لگی تھی۔ قسم سے اس دن کے بعد آج تک اسے مصافحے کے علاوہ نہیں چھو پایا۔''

''سچ کہہ رہا ہے یہ جھوٹا۔'' نگی نے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے پاشا کی تائید کی تھی۔

''پاشا تھوڑی دیر پہلے میں نے کیا کہا تھا۔''

''یہی کہ ''جیسے ہی آپ کے معیار کی کوئی لڑکی نظر آئی آپ میری یہ تمنا بھی پوری کر دیں گے۔''

''تو بس ٹھیک ہے۔'' کبیر دادا نے کندھے اچکائے۔

''آئے ہائے، اب ہم آپ کے معیار سے بھی گر چکے ہیں۔'' نگی بے باکی سے اسے گھورتے ہوئے بازاری لہجے میں بولی۔

''دادا، ہاں یا ناں میں جواب دیں۔ نگی سستی لڑکی نہیں ہے۔ بڑے بڑے نامی گرامی لوگ اس کے لیے ترستے ہیں۔ یہ تو بس آپ کی محبت میں دوڑی چلی آئی۔''

''آج کل یہ جھوٹا سچ بولنے پر تلا ہوا ہے۔'' نگی ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

کبیر دادا بے بسی سے بولا۔ ''تو یوں تمھیں چین آ جائے گا۔''

''ہاں۔'' پاشا نے بھرپور انداز میں سر ہلایا۔

کبیر دادا نے بیزاری بھرے لہجے میں کہا۔ ''تو اس قسم کے اور کتنے ثبوت دینا پڑیں گے۔''

پاشا نے عزم ظاہر کیا۔ ''ہر دوسرے تیسرے دن ایک جل پری آپ کی خواب گاہ کی زینت بناؤں گا یہاں تک کہ وہ ڈائن خود ہی کہیں دفع دفعان ہو جائے۔''

''کھوتے وہ تیرے استاد کی بیوی ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔'' پاشا نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہائیں آپ کی بیوی۔'' نگی نے چیختے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

کبیر دادا نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ ''کیا نہیں مانتے، مجھے استاد یا اسے میری بیوی۔''

''کیا میری زندگی میں یہ ممکن ہے کہ میں آپ کو استاد نہ ماننے کے بارے سوچ بھی سکوں۔''

کبیر دادا سنجیدگی سے بولا۔ ''دوبارہ اسے غلط نام سے نہ پکارنا، وہ جیسی بھی ہے، مگر عزت دار خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور باکردار لڑکی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھابی کہہ دیا کروں گا۔'' پاشا نے منہ بنایا۔

''رات نو بجے میری کوٹھی پر آجانا۔'' نگی کو کہتے ہی کبیر دادا نے بات چیت ختم ہونے کا اعلان کیا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل پڑا۔ نگی اور پاشا کے چہرے خوشی سے کھل گئے تھے۔ نگی کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے پاشا کبیر دادا کو رخصت کرنے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

''یار، میں نے تو سوچا تمھاری جھوٹ کی عادت اب تک نہیں گئی، مگر یہاں تو سچ مچ انقلاب آگیا ہے۔ اس ضدی، ہٹ دھرم اور اکھڑ نے شادی کر لی ہے، وہ بھی کسی لڑکی سے۔'' پاشا کے واپس آتے ہی نگی شروع ہوگئی تھی۔ وہ اس سے کافی بے تکلف تھی۔ البتہ پاشا کی یہ بات بالکل ٹھیک تھی کہ وہ کبھی ہاتھ ملانے سے زیادہ نگی کے قریب نہیں گیا تھا۔

پاشا جھلاتے ہوئے بولا۔ ''تو لڑکیوں ہی سے شادی کی جاتی ہے احمق لڑکی۔''

''نہیں میرا مطلب ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کبیر دادا کی اس حرکت کے بعد کیا کہوں، کیا کروں اور کہاں جاؤں۔'' وہ بدحواس سی لگ رہی تھی۔

''کہیں جانے اور کچھ کہنے کا تو پتا نہیں ہے البتہ تمھارے پاس خودکشی کرنے کا اچھا موقع ہے۔ اس طرح کم از کم دادا کو یہ یقین تو آجائے گا کہ اس خوب صورت ڈائن بھابی کے علاوہ بھی اسے کوئی چاہتا ہے۔'' پاشا نے خلوص بھرے انداز میں مشورہ دیا۔

''کیسی ہے وہ، میرا مطلب شکل وصورت کے لحاظ سے۔'' نگی کی حیرانی اب تک برقرار تھی۔ اس نے خودکشی

والے مشورے پر جوابی وار سے احتراز برتا تھا۔

''پوری کی پوری ڈائن.....اوہ سوری۔'' ایک دم اسے کبیر دادا کا حکم یاد آیا اور اس نے زبان دانتوں میں دبا لی۔ ''میرا مطلب بھابی کو دیکھتے ہی آپ کے دل سے یہ پھانس نکل جائے گی کہ کبیر دادا نے کیوں شادی کی ہے۔''

''مجھ سے بھی خوب صورت ہے۔'' نگی کے لہجے میں چھلکتا اپنی خوب صورتی کا زعم واضح تھا۔

پاشا صاف گوئی سے بولا۔ ''اگر تمھیں کوئی لڑکی خود سے زیادہ خوب صورت لگتی ہے تو وہ اس سے بھی خوب صورت ہوگی۔''

''میں تو الیگزنڈرا ڈڈاریو، شاہکن وڈلے، کترینہ کیف، کرینہ کپور، ماہرہ خان اور کبریٰ خانم کی شکلوں کو بھی خود سے بہتر تو کیا اپنے جیسا نہیں سمجھتی۔'' اس نے تینوں فلم انڈسٹریز کی خوب صورت لڑکیوں کو بے جھجک مسترد کر دیا تھا۔

''فکر نہ کرو میری ڈائن بھابی کو دیکھ کر تمھاری خود سے خوب صورت لڑکی کو دیکھنے کی حسرت تو کم از کم ضرور پوری ہو جائے گی۔''

''تو پھر میری دال وہاں کیا گلے گی۔'' نگی روہانسی ہونے لگی۔

پاشا نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''تمھیں دال گلانے بھیج کون رہا ہے بے وقوف، کسی اور کی پکی ہوئی ہنڈیا الٹانی ہے۔''

وہ خفت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں نے سوچا شاید تم مجھے کبیر دادا کو پھانسنے کا موقع دے رہے ہو۔''

''یہ کام اس وقت کرنا تھا جب کبیر دادا تم پر فریفتہ ہوا تھا۔''

''خاک فریفتہ ہوا تھا اکھڑ، بدمزاج۔ بس اپنی عیاشیوں کے چکر میں تھا اور مجھے یقین ہے اب بھی وہی سلسلہ ہے۔ تمھارے اندیشے بے جا ہیں۔''

''کاش ایسا ہی ہو، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اور یقین مانو کہ مجھے تمھاری کامیابی میں شبہ محسوس ہو رہا ہے۔''

''اب اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں۔'' نگی کی نسوانی انا جاگ گئی تھی۔ یوں بھی اس کی خوب صورتی کسی تعریف کی محتاج نہیں تھی۔ لیکن پاشا کے دماغ میں پلنے والے اندیشوں سے وہ ناواقف تھی۔

''خیر آج تم نے کبیر دادا کو پوری رات مصروف رکھنا ہے۔ اور اس..... میرا مطلب ہے بھابی کو کمرے کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا۔ کل پرسوں بھی اگر تم کبیر دادا کو سنبھالنے میں کامیاب رہیں تو خوش آمدید ورنہ مجھے کسی اور جل پری کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''ویسے مزاج کی کیسی ہے؟''

پاشا صاف گوئی سے بولا۔ ''بالکل گھریلو، سادہ، معصوم اور بھولی بھالی۔''

''کیا.....'' نگی چیخ پڑی تھی۔ ''تھوڑی دیر پہلے تو ڈائن، چڑیل اور جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔''

''فکر نہ کرو ہمارے ہاں ڈائن، بلا اور چڑیل بدکردار نہیں باکردار، ایمان دار اور خاندانی لڑکیوں کو کہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اب کچھ طے کر لیتے ہیں۔ سیٹھ مسکین کی طرف میرے بیس لاکھ بقایا ہیں، صبح تک سونے نہیں دیا تھا خبیث نے اور اب میری کال ہی وصول نہیں کر رہا۔''

پاشا ہنسا۔ ''کب کی بات ہے؟''

''دو ہفتے سے اوپر ہو گیا ہے۔''

''اور کچھ؟'' پاشا مستفسر ہوا۔

''فیروز ملک نے وعدہ کیا تھا کہ نئی ڈرامہ سیریل میں مرکزی کردار مجھے ملے گا، معاوضا وصول کر لیا مگر اب ایک نئی ہیروئن کو آگے لا رہا ہے اور مجھے اگلی سیریل پر ٹرخانا چاہتا ہے۔''

پاشا سنجیدگی سے بولا۔ ''ان دونوں کے موبائل فون نمبر مجھے دو۔''

نگی نے فوراً اپنے موبائل فون سے ان کے نمبر نکال کر پاشا کو نوٹ کرا دیے۔

فیروز ملک کا پتا بھی نوٹ کر کے پاشا کسی کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے کال وصول ہوتے ہی وہ بغیر کسی تمہید کے فیروز ملک کا پتا دہراتے ہوئے بولا۔ ''اسے اگلے ایک گھنٹے میں خصوصی کوٹھی میں ہونا چاہیے

۔''اور پھر دوسری طرف کی بات سنے بغیر اس نے رابطہ منقطع کیا اور سیٹھ مسکین کا نمبر ملانے لگا۔ سیٹھ مسکین کو وہ ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ شہر کی بڑی بڑی مچھلیوں سے ان کی واقفیت یوں بھی ناگزیر تھی۔

''ہیلو۔'' دو تین گھنٹیوں کے بعد ہی اس نے پاشا کی کال وصول کی تھی۔ یقیناً پاشا کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا ورنہ یوں بے پروائی سے ہیلو نہ کرتا۔

''سیٹھ مسکین، پاشا بات کر رہا ہوں۔''

''پپ پاشا..... پاشا دادا۔'' اس نے گویا تصدیق چاہی تھی۔

''یاداشت تو کافی اچھی ہے سیٹھ ورنہ پچھلے دو تین ماہ سے کسی تقریب وغیرہ میں ملاقات نہیں ہو پائی ہے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''جی جی..... ویسے کیسے یاد فرمایا خادم کو۔''

''کچھ نہیں، بس یونہی آج نگی سے ملاقات ہوئی تمھیں یاد کر رہی تھی میں نے سوچا ہیلو ہائے ہی کر لیں۔''

''سیٹھ مسکین کی ہکلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''نن..... نگی۔ ہاں..... ویسے بہت اچھی لڑکی ہے۔ آج ہی میں اپنے سیکرٹری کو کہہ رہا تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ جمع کرا دے اس سے ادھار لیے تھے۔ بے وقوف کو بھول ہی گیا ہے۔ وہ غریب انتظار کرتی رہی ہوگی۔ خیر اسے بتا دینا کہ کل ضرور اسے اپنے پیسے مل جائیں گے۔''

پاشا ہنسا۔ ''چلو آپ کا پیغام پہنچا دیتا ہوں کہ اگر کل صبح دس گیارہ بجے اس کے اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم جمع نہ ہوئی تو پرسوں سیٹھ مسکین دگنی رقم جمع کرا دے گا اور اسی طرح ہر گزرتے دن کے ساتھ رقم دگنی کرتا جائے گا۔ سیٹھ مسکین ہے ہی اتنا اچھا آدمی۔''

''جج..... جی..... جی..... جی۔'' سیٹھ مسکین نے ہکلاتے ہوئے جی جی کی گردان شروع کر دی اور پاشا مزید کچھ کہے بنا رابطہ منقطع کرتے ہوئے سامنے بیٹھی نگی کو مخاطب ہوا۔

''سن تو لیا ہوگا۔''

''ہاں نگی نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''دوسرے کام سے بھی بے فکر ہو جاؤ تمھیں رات کبیر دادا کے پاس جانے سے پہلے خوش خبری مل جائے گی ۔لیکن مجھے خوش کرنا اب تمھاری ذمہ داری ہے۔''

”کبیر دادا کو پھنسانا ضرور مشکل تھا، کسی دوسری لڑکی کا پتا کاٹنا اتنا مشکل نہیں ہوتا، فکر ہی نہ کرو کبیر دادا سے ایسے دور بھاگے گی جیسے تم ایمان داروں سے بھاگتے ہو۔“

اور پاشا اطمینا بھرے انداز میں گردن ہلانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”گھر چلو۔“ پاشا سے رخصت لے کر گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ عظیم کو مخاطب ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ موبائل فون نکال کر تناوش کا نمبر ملانے لگا۔

”اسلام علیکم!“ گھنٹی وصول کرتے ہی اس کی چہکتی کھنکتی سریلی آواز نے کبیر دادا کے کانوں میں رس گھولا۔

”ایسا کرو آج امی کے گھر ہی رہ جاؤ میں کہیں مصروف ہوں۔“ کبیر دادا کو رات کی صورت حال سے نمٹنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں سوجھا تھا۔

وہ اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں ابھی آپ کی جرابیں دھو رہی تھی۔ آپ کی کال وصول کرنے کے لیے مجھے کام درمیان میں چھوڑنا پڑا۔“

”یہ ملازمہ کے کرنے کے کام ہیں۔“

”آپ کی یادداشت کمزور ہے یا بار بار میرے منہ سے سن کر اچھا لگتا ہے کہ میں آپ کا کوئی بھی کام کسی دوسرے کو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

کبیر دادا نے منہ بنایا۔ ”تم ہو نا تان سین کی پوتی کہ تمھاری آواز بار بار سننا چاہوں گا۔“

”ہا.....ہا.....ہا۔“ تناوش کے نقرئی قہقہے نے اس کے فقرے کی پھسپھساہٹ کو واضح کیا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“ وہ چڑ گیا تھا۔

”جناب جی آپ رات میری دس پندرہ منٹ کی گنگناہٹ سن کر نیند کی میٹھی وادیوں میں ڈوب گئے تھے۔“

”تھکا ہوا تھا۔“ کبیر دادا نے صفائی پیش کی۔

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ”ہائے اللہ جی کتنا چھپاتا ہے یہ لڑکا اپنی محبت کو۔“

”ہر وقت بکواس نہ کیا کرو۔“ لڑکے کا لقب سن کر اسے غصہ آ گیا تھا۔

"بکواس تو خیر نہیں ہے۔"

اس کی گنگناتی آواز کبیر دادا کو مزید تپا گئی تھی۔ ڈرائیور اور عظیم کی موجودی فراموش کرتے ہوئے وہ دھاڑا۔ "تمھاری محبت والی غلط فہمی تو آج ضرور دور کر دوں گا۔"

"کیا اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلاؤ گے۔" تناوش اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر شوخی پر آمادہ رہی۔

"احمق عورت۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

"پلیز گھر آ جائیں نا، کتنی دیر سے آپ کا چہرہ نہیں دیکھا۔" فوراً پیغام آ گیا تھا۔

جواب لکھے بغیر وہ خاموشی سے باہر دیکھنے لگا۔

موبائل فون کی پیغام گھنٹی دوبارہ بجی۔ "آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، شاید بارش بھی ہو جائے آ جاؤ نا میں پکوڑے اور چٹنی بناتی ہوں کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرتے ہوئے اکٹھے بیٹھ کر کھائیں گے۔"

پیغام پڑھتے ہی کبیر دادا نے کار کی کھڑکی سے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی واقعی بادل اکٹھے ہو گئے تھے اور کسی بھی لمحے برس سکتے تھے۔ اگر وہ اسے متوجہ نہ کرتی تو شاید بارش شروع ہونے کے بعد ہی وہ اس طرف متوجہ ہوتا۔ یوں بھی بارش کا ہونا نہ ہونا اس کے نزدیک برابر تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس پر انکشاف ہو رہا تھا بارش کے موسم کی کوئی اہمیت بھی ہوتی ہے۔

ایک اور پیغام کی گھنٹی بجی۔ "کبیر!..... آ جائیں نا، میرا بڑا دل کر رہا ہے آپ کے ساتھ بارش میں بھیگنے کو۔ چھت پر چڑھ جائیں گے کسی ملازم کو نظر بھی نہیں آئے گا۔"

اپنا نام پہلی بار بغیر کسی سابقے لاحقے کے پڑھ کر اسے عجیب مگر بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر بارش کی مزید اہمیت اجاگر ہوئی۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ وہ چھت پر تناوش کے ساتھ موجود ہے تیز بارش ہو رہی ہے وہ آنکھیں بند کیے اپنے بازو دائیں بائیں پھیلائے کسی بچی کی طرح گھوم رہی ہے اور وہ اسے بھیگتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ لباس اس کے جسم سے چپک کر اس کی دلکشی کو چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ کبیر دادا کے جسم میں انجانے جذبے بیدار ہوئے۔ اس کے دل میں شدت سے اس منظر کو آنکھوں کے سامنے دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ اگلے پیغام نے اسے پھر موبائل فون کی طرف متوجہ کیا۔

"اچھا آپ نہ بھیگنا، سیڑھیوں کے شیڈ میں کھڑے ہو کر پکوڑے کھانا اور مجھے دیکھنا، اب خوش، اب تو آجائیں نا۔"

ایک دم کبیر دادا کے دل میں انجانا سا خوف نمودار ہوا، اسے تناوش سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ شاید جادو گرنی تھی جو میسج پر چند الفاظ لکھ کر اس کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں جکڑ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر چٹنی پکوڑے کھانے کا ذکر کرتی اور اس کے منہ میں خستہ خستہ لذیذ پکوڑوں کا ذائقہ پھیل جاتا۔ وہ چھت پر بھیگنے کا ذکر کرتی اور کبیر دادا تصور کی آنکھ سے اسے برستی بارش گھومتا ہوا دیکھنے لگتا .....اس کے دماغ میں پاشا کی آواز گونجنے لگی.....

"وہ خوب صورت ڈائن آپ کو ضائع کر دے گی.....اس کی اتنی ہمت کہ کبیر دادا کو گھر جانے کا مشورہ دے .....آپ ایک چھوکری کے پیچھے خود کو بدنام نہ کریں.....یقین مانیں اپنے دکھی ہیں اور پرائے ہنس رہے ہیں.....وہ آپ کو انگلیوں پر نچائے گی.....کم عمر نادان لڑکی نہیں، پوری چار سو بیس ہے.....دفع کریں اسے ٹھوکر لگا کر اپنی زندگی سے دور پھینکیں....."

"کیا واقعی پاشا ٹھیک کہہ رہا ہے، کیا مجھے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرنا چاہیے۔" بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی وہ اپنی کوٹھی کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"گھر نہیں جانا، آگے گزرتے جاؤ۔" ڈرائیور کو کار آہستہ کرتی دیکھ کر بے اختیار اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔

"کہاں جانا ہے دادا؟" عظیم کے لہجے میں حیرانی تھی۔

اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ "کہیں بھی....."

"کیا؟" عظیم کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔

وہ سنبھل کر بولا۔ "ایس پی ضمیر حسین کی طرف چلو۔"

"جی دادا۔" عظیم نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

کبیر دادا نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ بارش کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ بار بار بجنے والی پیغامات کی گھنٹیوں کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

اچانک کال آنے لگی۔اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے موبائل فون کی سکرین کو دیکھا وہ تناوش کی کال تھی ۔رابطہ کاٹنے والا بٹن دبا کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔بارش کے قطرے ایک تسلسل سے گر رہے تھے ۔موتیوں کے مشابہ قطرے نہ جانے کیوں اتنے بھلے لگ رہے تھے۔پہلے اسے بارش کبھی اتنی اچھی نہیں لگی تھی ۔سڑک کے دائیں بائیں مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔کچھ گھروں کی چھت پر رنگ برنگے آنچل لہراتے نظر آرہے تھے۔تصور کی آنکھ سے وہ تناوش کے پاس پہنچ گیا۔وہ اپنا سرخ دوپٹا بدن پر لپیٹ کر گیلے کپڑوں کی شرارت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی،مگر دوپٹے کا گیلا پن اس کا ساتھ دینے کے بجائے گیلے کپڑوں کے ساتھ مل گیا تھا۔اس کے گداز اور نوخیز بدن کے خوب صورت زاویے اور قوسیں ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔'' کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے۔

اس کا دل شدت سے تناوش کے پاس جانے کے لیے مچلا اور جی چاہا کہ ڈرائیور کو گھر کی جانب مڑنے کا کہے۔آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کے ساتھ ٹیکتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے اس تمنا کو دل ہی میں دبا دیا۔

کار ایک سپیڈ بریکر پر آہستہ ہوئی سڑک کے بائیں جانب ایک چھپر ہوٹل بنا تھا اس کی نظر کڑاہی میں تلتے گرم پکوڑوں پر پڑی۔

''شہزاد کار ایک جانب کر کے روک لو۔'' وہ شاید زندگی میں پہلی بار براہ راست ڈرائیور کو مخاطب ہوا تھا۔

''جی دادا!'' ڈرائیور کے لہجے میں حیرانی بھری ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ہی اس نے انڈیکیٹر دے کار ایک جانب کر کے روک لی۔

''عظیم، پکوڑے اور چٹنی لے آؤ۔'' کبیر دادا کا اگلا حکم ڈرائیور اور عظیم کو مزید حیران کرنے والا تھا،مگر ان دونوں میں اتنی جرات مفقود تھی کہ کھل کر حیرانی کا اظہار کر سکتے۔عظیم سر ہلا کر نیچے اترا اور چھپر ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔محافظوں والی دونوں جیپیں بھی رک گئی تھیں۔امتیاز اور بخش نیچے اتر کر عظیم کی طرف بڑھے۔

امتیاز نے پوچھا۔''عظیم بھائی، خیر تو ہے کیوں رک گئے ہو؟''

عظیم مسکرایا۔''دادا نے پکوڑے لانے کو کہا ہے۔''

''کیا۔'' وہ دونوں حیرانی انداز میں چیخ پڑے تھے۔مگر عظیم ان کی کیا کا جواب دینے کے بجائے چھپر ہوٹل

کے مالک کی طرف بڑھ گیا جو باورچی، منیجر اور بیرے کی ذمہ داریاں بھی خود ہی نبھا رہا تھا۔

امتیاز نے دھیمے لہجے میں خیال ظاہر کیا۔ ''نمازن کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں، یقیناً اس نے کال کر کے کبیر دادا کو پکوڑے لانے کا حکم دیا ہوگا، اسی وجہ سے دادا گھر کے پاس جا کر آگے بڑھ گیا تھا۔''

''کبیر دادا کو حکم کون دے سکتا ہے۔'' بخش نے بھی اسی کے انداز میں سرگوشی کی تھی۔

عظیم وثوق سے بولا۔ ''نمازن کی آمد سے پہلے میرا بھی اسی بات پر یقین تھا۔''

''میں نہیں مانتا۔ بخش نے نفی میں سر ہلایا۔ اس وقت باقر اور رخسار بھی ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔

امتیاز نے کہا۔ ''چلو عظیم سے پوچھ لیتے ہیں کہ کبیر دادا نے اس طرف مڑنے سے پہلے نمازن سے بات کی ہے یا نہیں۔''

''کیا بحث شروع ہے۔'' باقر نے اشتیاق سے پوچھا۔

بخش اسے دبے لفظوں میں ساری بات بتانے لگا۔ اسی وقت انھیں عظیم واپس مڑتا ہوا نظر آیا اس نے ایک ہاتھ میں گرم بھاپ اڑاتے پکوڑوں کی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں چٹنی کی پلیٹ پکڑی ہوئی تھی۔ پکوڑوں کو بھیگنے سے بچانے کے لیے اس نے ایک الٹی پلیٹ ان پر رکھ دی تھی۔

بخش چہکا۔ ''دیکھ لو، دادا پکوڑے گھر نہیں لے جا رہا یہیں بیٹھ کر کھانا چاہتا ہے۔''

اس کی بات پر توجہ دیے بغیر امتیاز نے عظیم کو روکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا گھر کی طرف جاتے ہوئے دادا کو بیگم صاحبہ کی کوئی کال ملی تھی؟''

''ہاں، مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔'' عظیم اسے ہلکے سے جھڑکتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔

''سن لیا۔'' امتیاز نے فاتحانہ نظروں سے بخش کو گھورا۔

بخش نے دلیل پیش کی۔ ''وہ کوئی بھی بات کر سکتی ہے، شاید اس نے رات ماں کے گھر گزارنے کی اجازت مانگی ہو۔ اگر تمھاری بات سچ مانی جائے تو کبیر دادا کو پکوڑے گھر لے جانے چاہئیں تھے نہ کہ یہاں کھانے۔''

''نہیں۔'' امتیاز اس کی دلیل سے متفق نہیں ہوا تھا۔

''ایسا ہی ہے۔'' بخش مصر ہوا۔ وہ دونوں تکرار کرتے ہوئے جیپ کی طرف مڑ گئے تھے۔ باقر اور رخسار بھی

اپنی جیپ کی طرف بڑھ گئے۔اتنی دیر بھی آڑ کے بغیر گزار کر وہ اچھے خاصے بھیگ گئے تھے

کبیر دادا گرم پکوڑوں اور چٹنی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔زندگی میں پہلی بار اسے پکوڑے اتنے بھلے لگ رہے تھے۔بارش اور پکوڑوں کے تعلق کا راز اس پر پہلی بار منکشف ہوا تھا۔نہ جانے تناوش کا ساتھ اس پر اور کون کون سے سربستہ راز آشکارا کرنے والا تھا۔

پکوڑوں میں مرچیں ذرا تیز تھیں۔اچانک چشم تصور میں اسے تناوش پکوڑے کھاتی نظر آئی۔مرچوں کی زیادتی کی وجہ سے اس نے آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔اس عالم میں وہ اور بھی معصوم لگنے لگی تھی۔مگر وہ پکوڑے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔

جھرجھری لے کر اس نے سحر بھرے منظر کو دور جھٹکا اور کار کے باہر دیکھنے لگا۔ایک دفعہ پھر اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔تناوش ہی کی کال تھی۔کبیر دادا کا دل اس کی آواز سننے کو مچلنے لگا۔نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔یقیناً اس نے پکوڑے تیار کر لیے تھے اور اب اس کی منتظر تھی۔چاہتے ہوئے بھی وہ گھنٹی وصول نہ کر سکا۔رابطہ منقطع کرنے کا بٹن دبا کر اس نے تناوش کے ساتھ اپنے دل کو بھی مایوس کرنے کی ہمت کر ڈالی تھی۔شاید وہ خود سے ڈرنے لگا تھا کہ تناوش کی منتوں بھرے حکم کے سامنے وہ ہتھیار ڈال دے گا۔

"یہ واپس کر آؤ۔" اس نے پکوڑوں کی ادھ بھری پلیٹ عظیم کی طرف بڑھائی۔اور اس کے پلیٹ تھامتے ہی وہ تناوش کے پیغام دیکھنے لگا۔درجن بھر پیغام آئے ہوئے تھے۔

"اچھا میں پکوڑے بنانے جا رہی ہوں،کوئی معذرت اور دھمکی دھونس نہیں چلے گی،بس آپ آجائیں۔"

"آجائیں نا اب تو بارش شروع ہو چکی ہے۔"

"باورچی خانے کی کھڑکی سے نظر آنے والے قطرے آپ کی کمی کو مزید اجاگر کر رہے ہیں۔"

"کبیر،آجائیں نا پکوڑے بن گئے ہیں اور اگر آپ نہ آئے تو میں ایک پکوڑا بھی منہ میں نہیں ڈالوں گی۔"

"قسم سے اتنا دل کر رہا ہے پکوڑے کھانے کو،مگر میری ضد برقرار ہے۔"

"اُف،کتنا نخریلا ہے یہ لڑکا بھی۔"

"گھنٹی تو اٹھائیں نا.....پلیز پلیز ایک بار بات تو کر لیں....."

"اچھا میں آپ کے لائے ہوئے کپڑے پہن رہی ہوں، آپ کو ان کپڑوں میں زیادہ خوب صورت لگتی ہوں نا۔"

"یہ دیکھو، پہن لیے ہیں کپڑے۔ میک اپ کا سامان نہیں ہے ورنہ میک اپ بھی کر لیتی۔"

"پلیز آجائیں نا، ورنہ میں رو پڑوں گی..... آپ نے پانچ، چھے بجے تک لوٹنے کا کہا تھا اور اب ساڑھے چھے ہو گئے ہیں۔"

"کبیر، میں رو رہی ہوں، سچ میں رو رہی ہوں۔ آپ مجھے یاد آرہے ہیں۔ میں نے پکوڑے کھانے کی کوشش کی ہے، مگر مجھ سے آدھا پکوڑا بھی نہیں نگلا گیا۔" یہ آخری میسج تھا۔

کار آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ موبائل فون ایک جانب رکھتے ہوئے دوبارہ سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میسج آنا بند ہو گئے تھے۔ شاید وہ خفا ہو گئی تھی۔

وہ خود کو مخاطب ہوا۔ "ہوتی رہے خفا..... بھاڑ میں جائے جادوگرنی..... میں اس کے لیے اپنے مقام سے نیچے نہیں آسکتا..... میرے نزدیک اس کی اہمیت ایک رکھیل سے بڑھ کر نہیں ہے..... میں اسے اتنی بے تکلفی کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ مجھے نام سے بلانا شروع کر دے۔" ایک مخالف سوچ پہلے والے خیالات کے مقابل آگئی۔

"اس نے تم سے پوچھا کب ہے۔ اور بے تکلف تو وہ ہو گئی ہے..... تم اس کا سامنا کرنے کی ہمت تو چھوڑو اس کی کال سننے کی جرات نہیں کر سکتے..... وہ رکھیل نہیں رانی ہے..... اس کا رونا تمھیں دکھ دے رہا ہے۔"

اس نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیں "نہیں دے رہا ہے اس کا رونا دکھ..... مجھے اس کی پروا نہیں..... اگر پروا ہوتی تو میں گھر چلا گیا ہوتا۔"

"صاف کہو نا، اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" کوئی اس کے اندر ہنسا۔

"یہ غلط ہے۔" وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔

"جی دادا!" ایک دم عظیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ڈرائیور نے بھی کار کی رفتار مدہم کر دی تھی۔

"کچھ نہیں چلتے رہو۔" بائیں ہاتھ کی انگلیاں سر کے بالوں میں گھساتے ہوئے وہ اسے خیالوں سے دور

جھٹکنے لگا۔

یقیناً پاشا کا تجزیہ صحیح تھا۔ شکر تھا کہ اس نے بروقت کبیر دادا کو اس طرف متوجہ کر کے اس کے علاج کی طرف رہنمائی بھی کر دی تھی۔

''ایس پی صاحب دفتر سے تو اٹھ چکے ہوں گے۔'' عظیم کی آواز نے اسے خیالوں کے جنگل سے چھٹکارا دلایا۔

''کال کر کے معلوم کر لو۔''

اور عظیم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایس پی کے قریبی آدمی سے رابطہ کرنے لگا۔ معلومات لے کر وہ کبیر دادا کی طرف مڑا۔ ''وہ اپنے خفیہ اڈے میں ہے اور گھر جانے کے لیے اٹھنے والا ہے۔''

''وہیں جائیں گے۔ کال کر کے میری آمد کا بتا دو۔''

''جی دادا۔'' عظیم دوبارہ رابطہ کرنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ ایس پی ضمیر حسین اوڈھو کے سامنے تھا۔ ضمیر حسین اوڈھو نے منافقانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی کلمات کی ادائی کے بعد وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ ملازم شراب کی سربہ مہر بوتل، شیشے کے نفیس گلاس اور ٹرے میں برف کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھ کر سر جھکائے باہر نکل گیا۔ اب وہ اکیلے تھے۔

''گلاسوں میں برف ڈال کر ایس پی نے بوتل کا کاک اتار کر دونوں گلاس بھرے اور ایک گلاس اس کی جانب کھسکاتے ہوئے اس نے کبیر دادا کے چہرے پر سوالیہ نگاہیں دوڑائیں۔

شراب کے بھرے گلاس کو دیکھتے ہی اس کے کانوں میں تناوش کی آواز گونجی۔

''ایک بوتل میں چھے گلاس گندہ مشروب ہوتا ہے اور آج تقریب میں آپ نے سات گلاس پیے تھے، اس لحاظ سے کل جو بوتل ملے گی اس میں سے بھی ایک گلاس مشروب کم ہوگا۔''

''جی، کیسے تشریف آوری ہوئی۔'' اسے خاموش پا کر ایس پی نے لب کھولے۔

تناوش کی بات یاد کرتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہونے لگی تھی، ایس پی کی آواز سنتے ہی وہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دباتا ہوا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کل راؤ اجمل رحیم سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''تو.....'' ایس پی گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بے پروائی سے بولا، البتہ اس کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

کبیر دادا کے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی نمودار ہوئی۔ ''کیا واقعی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حرکتوں سے مجھے کوئی فرق پڑے گا۔''

''الزام لگانے کے لیے یقیناً کسی ثبوت کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔''

''کسی تھانیدار کی یہ ہمت کہ وہ کبیر دادا کو چھیڑنے کی جرات کرے۔''

ایس پی معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''پولیس کا تھانیدار اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوتا کبیر دادا۔''

''ہونہہ تھانیدار، میں پولیس ایس پی کو بھی جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں کجا تھانیدار۔''

''پھر شکایت لیے ایک ایس پی کے پاس کیوں بھاگے چلے آئے۔'' ایس پی کے استہزائیہ لہجے نے اس کے چہرے پر سرخی بکھیر دی تھی۔

''کسی واقف کار کو عبرت ناک موت سے بچانے کی کوشش کرنے اور شکایت لے کر آنے میں بڑا فرق ہے۔'' کبیر دادا کے زہریلے لہجے نے ایس پی ضمیر حسین کے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔ مگر جب وہ بولا تو دل میں اٹھنے والا خوف اس کے لہجے میں شامل نہیں تھا۔

''خیال رہے میں ایک گینگ کا سربراہ ہونے کے ساتھ ایس پی بھی ہوں۔''

''ہاں مگر مجھے ڈر ایمان دار پولیس والوں سے لگتا ہے۔''

''کیا میں بے ایمان ہوں؟'' ضمیر حسین تپ گیا تھا۔

''میرے نہیں کہنے سے فرق پڑتا تو میں جھوٹ بولنے کی کوشش ضرور کرتا۔'' وہ گلاس خالی کر کے دوبارہ بھرنے لگا۔

''کبیر دادا، آپ میری توہین کر رہے ہیں۔'' ایس پی کے لہجے میں غصہ بڑھنے لگا تھا۔

''یہ سوچنا کہ اخلاق حسین، نوشاد آفریدی اور آپ کے گٹھ جوڑ سے میں ناواقف ہوں تو بہت بڑی بھول ہے

۔آپ بس مجھے اس کام پر مجبور کر رہے ہیں جس سے روکنا آپ لوگوں کے بس سے باہر ہو جائے گا۔"

ایس پی بغیر لگی لپٹی بولا۔"اکیلے تمام کا مقابلہ کرلو گے۔"

"آزمالو۔" کبیر دادا کے لہجے میں شامل اطمینان نے ایس پی کے دل میں موجود اندیشوں کو بڑھا دیا تھا۔

"آپ یہی دھمکی دینے آئے تھے۔" اس نے ادھ بھرا گلاس شیشے کی میز پر رکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

"دھمکی وہ دیتے ہیں جو کچھ کرنا نہ چاہتے ہوں، میں تو موقع دینے آیا ہوں۔" دوسرا گلاس بھی خالی کر کے اس نے میز پر دھرا اور جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔"چلتا ہوں۔" اس نے الوداعی مصافحہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ایس پی بھی کینہ توز نظروں سے اسے گھورتا ہوا بیٹھا رہا۔

☆.....☆.....☆

کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظریں بے اختیار اندرونی دروازے کی طرف اٹھ گئیں، وہ گاڑیوں کی آواز سنتے ہی بھاگ کر وہاں آجایا کرتی تھی۔مگر اسے مایوسی ہوئی وہ شاید خفا ہو گئی تھی۔اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔اس کا جی چاہا کہ وہیں گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو تیز تیز ہارن بجانے کا کہے جب تک کہ وہ باہر نہیں آجاتی۔مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔کار سے نکلتے ہی اس کے کانوں میں شام کی آذان گونجنے لگی۔وہ خود تو جانے کتنے عرصے سے نماز کی لذت سے محروم تھا لیکن تناوش کے نماز پڑھنے کے بارے اسے اچھی طرح معلوم تھا ۔راحت ماسی کی زبانی اس نے تناوش کے پکا نمازی ہونے کا ذکر سنا تھا۔

"شاید وضو کر رہی ہو گی یا مصلے پر چڑھی ہو گی۔" جانے وہ کیوں خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔عجیب متضاد کیفیات میں گھر گیا تھا۔ایک طرف اس سے جان چھڑانے اور دور جانے کی تگ و دو میں تھا اور دوسری جانب اس کی خفگی اور ناراضی سے پریشان۔

ڈرائینگ روم عبور کر کے وہ خواب گاہ کے دروازے پر رکا اور پھر پٹ کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔مشکل سے مشکل صورت حال میں موت کے منہ میں ہاتھ ڈال کر بھی کبھی اس کے دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی تھی۔لیکن اس وقت جانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔یہ کیسا میٹھا خوف تھا، یہ کیسی لذت بھری کسک تھی، یہ

کیسا انوکھا احساس تھا۔اس کی عقل وشعور سے بالاتر،اس کی سمجھ بوجھ سے پرے،اس کے خیالات سے دور۔

خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی اس کی متلاشی نظروں کو وہ نرم وملائم اور نازک وجود بیڈ پر پڑا نظر آیا۔کبیر دادا کے تکیے پر سر دھرے وہ اوندھے منہ لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ایک رخسار تکیے پر ٹیکے سرخ گلاب کی کلی سے مشابہ دوسرا رخسار چھت میں جڑے انرجی سیورز کی روشنی میں دمک رہا تھا۔وہ یقیناً روتے ہوئے لیٹی تھی تبھی تو سرمہ بھری آنکھ سے ہلکی سیاہی مائل لکیر ناک کی جڑ تک پھیلی نظر آ رہی تھی۔جینز کی تنگ پتلون اور پھولدار گلابی قمیص اس کے جاذب نظر خدوخال کو اور زیادہ اجاگر کر رہی تھیں۔سیاہ زلفیں پشت پر یوں بکھری تھیں جیسے آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوں۔

بڑی مشکل سے اس کے سراپے سے نگاہیں چرا کر اس نے خواب گاہ میں نظریں دوڑائیں۔کھڑکی کے پردے اب تک ہٹے ہوئے تھے صوفے کے سامنے پڑی شیشے کی میز پر پکوڑوں کی بھری پلیٹ اور ساتھ چٹنی کی کٹوری رکھی تھی۔پلیٹ میں ایک ادھ کھایا پکوڑا ابھی موجود تھا۔کبیر دادا نے بے اختیار وہ ادھ کھایا پکوڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔وہ ٹھنڈا ٹھار پکوڑا ابھی اسے دکان کے گرم پکوڑوں سے بہت زیادہ لذیز اور مزیدار لگا تھا۔

وہ کھڑکی کے پردے برابر کرنے لگا،بارش رک گئی تھی مگر آسمان ابھی تک بادلوں سے ڈھکا نظر آ رہا تھا۔

پردے برابر کر کے وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔نا معلوم وہ کس وقت جاگتی۔اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں ابھرا۔اسے نماز کے لیے بھی تو جگایا جا سکتا ہے۔وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔اس کا ہاتھ ریشمی زلفوں کی طرف بڑھا مگر اتصال سے پہلے ہی اس نے ہاتھ کا رخ تبدیل کر کے اس کی کہنی کو پکڑ کر ہلایا۔

وہ فوراً جاگ گئی تھی۔

"آ گئے ہیں آپ۔" اٹھتے ہوئے اس نے توبہ شکن انگڑائی لی۔اس کی آواز میں خفگی یا ناراضی کا کوئی اثر موجود نہیں تھا۔

"شام کی آذان ہو گئی ہے۔" اسے آذان کے بارے مطلع کر کے وہ صوفے پر جا بیٹھا۔

"اچھا۔" اس کی سستی بھری حرکت ایک دم سرعت میں تبدیل ہوئی اور وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی

۔تھوڑی دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے غسل خانے سے باہر نکل رہی تھی۔کالج کے لباس کی آستینیں نیچے کھسکاتے ہوئے وہ گوری کہنیوں کو ڈھکتے ہوئے خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔کبیر دادا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھورتا رہا گیا تھا۔وہ بھی دروازے سے نکلنے تک کبیر دادا کو شوخی بھری مسکراہٹ سے نوازتی رہی۔

اس کی واپسی تک وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔اس کے دماغ میں نگی کی آمد کے بعد تناوش کے ردعمل کی سوچیں سرگرداں تھیں۔وہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ تناوش کا رویہ کیا ہونا تھا۔

"کیا وہ گھر چلی جائے گی؟" بہ ظاہر اس کا اور پاشا کا مطمح نظر پورا کرنے والی اس سوچ نے جانے کیوں اس کے دل کو اضطراب سے بھر دیا تھا۔

وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔"بہتر ہوگا کہ چلی جائے، میں پاشا کو کہہ دوں گا کہ اسے حفاظت سے کسی خفیہ مقام پر منتقل کر دے۔" پاکستان کے کسی بھی دوسرے شہر میں ایک اچھا گھر اسے اخلاق حسین اور نوشاد آفریدی جیسے کمینوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔وہاں پر وہ کسی بھی شریف اور محبت کرنے والے مرد سے شادی کر کے اپنی بقیہ زندگی پرسکون انداز میں گزار سکتی تھی۔

"پتا نہیں محبت کی دعوے دار کبھی مجھے یاد بھی کرے گی یا" جان چھٹی سو لاکھوں پائے" جیسی کہاوت کے مصداق شکرانے کے نوافل ہی ادا کرتی رہے گی۔" اس تلخ سوچ نے اس کے منہ میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔

"نہیں وہ ایسی نہیں ہے۔" دل کے کسی کونے سے ایک نحیف آواز برآمد ہوئی۔"ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے نہ آسکنے پر وہ بچوں کی روتے روتے سوگئی تھی تو ہمیشہ کے لیے دور جا کر کیوں نہیں یاد کرے گی۔"

"کچھ بھی ہے، اس کا دور جانا میرے لیے بھی فائدہ مند ہے اور اس کے لیے بھی بہتر۔یقیناً میری زندگی میں اس کی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس نے حتمی فیصلہ کیا۔

اسی وقت دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔نماز کے انداز میں چہرے اور سر کو ڈھانپنے والے دوپٹے سے بس چاند سا مکھڑا دمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔گہرے سیاہ بال اور صراحی دار گردن چھپ گئے تھے۔

"یہ پکوڑے اور چٹنی بھی آپ کو بددعا دے رہے ہوں گے۔" خفگی اور ناراضی بھرے الفاظ شوخی و شرارت بھرے لہجے میں ادا کر کے وہ اس کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

''بددعا دینے کے علاوہ تم کر ہی کیا سکتی ہو۔'' کبیر دادا نے منہ بنایا۔

''اللہ نہ کرے۔'' وہ اتنی سرعت سے بولی تھی کہ کبیر دادا حیران رہ گیا تھا۔''میں آپ کو بددعا دوں گی۔ایسا سوچنے سے پہلے مر نہ جاؤں۔''اس کے لہجے میں شامل خلوص کو تعارف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔یہ کہتے ہوئے اس نے کبیر دادا کے شانے پر سر ٹیک دیا تھا۔

''تم ذرا کھڑے ہو کر میری بات سنو۔'' کبیر دادا نے نگی کی آمد کے لیے میدان ہموار کرنا چاہا۔اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ متوحش ہو کر اس سے دور ہٹی اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''کک.....کیا بات ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''کھڑی ہو جاؤ تا کہ تمھیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔'' کبیر دادا کا بیگانا اور سرد لہجہ برقرار تھا۔

''جی۔'' وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر کسی چھوٹی بچی کی طرح اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔کالج کے کپڑوں میں وہ یوں بھی اپنی عمر سے چند سال چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔

''بار بار سمجھانے کے باوجود تمھیں میری بات کی سمجھ کیوں نہیں آ رہی۔آخر کیا مسئلہ ہے تمھارے ساتھ۔میرے نرم رویے اور نظر انداز کرنے کی عادت کا تم غلط مطلب لے رہی ہو۔تمھیں میرے مقام، شخصیت اور کردار کا بھی کوئی احساس ہے یا مجھے اسکول کا لڑکا سمجھ رکھا ہے۔رومانس بھرے پیغامات، بار بار گھنٹیاں کرنا، پکوڑے، بارش اور دوسری بکواسات۔یہ سب کیا ہے؟.....اور میرا نام تم کس خوشی میں لے رہی تھیں، دنیا مجھے کبیر دادا اور کبیر علی خان صاحب کہہ کر مخاطب کرتی ہے تم یوں کبیر کہہ رہی تھیں جیسے میں تمھارا ملازم ہوں۔کیا لگتا ہے کہ تم دنیا میں اکیلی خوب صورت لڑکی ہو اور تم جیسی میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی نہیں آئی۔تم جنت کی حور یا کوہ قاف کی اپسرا ہو۔یہ واہیات اور بھونڈے چونچلے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتے ہیں، خبردار جو آئندہ مجھے اس قسم کا کوئی پیغام بھیجا یا رومانس وغیرہ کا بھوت خود پر سوار کیا۔اگر یہاں رہنا ہے تو اسی طرح رہنا ہوگا جس کا وعدہ کر کے تم یہاں آئی تھیں۔یاد ہے تم نے بڑے عزم سے کہا تھا کہ ایک رکھیل کی طرح رہو گی بس نکاح پڑھا لوں۔اب نکاح پڑھا لیا ہے تو پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں۔طلاق کا لفظ منہ سے نکالنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے اور نہ میں کوئی مولوی یا تبلیغی جماعت کا نمائندہ ہوں کہ گناہ ثواب کے ڈر کو خود پر مسلط رکھوں۔آخری بار تنبیہ

کر رہا ہوں دوبارہ شکایت کا موقع نہ دینا۔ میں کیا کر رہا ہوں کیا کھا پی رہا ہوں کس سے واسطہ رکھ رہا ہوں اس سے تمھیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ جس دن یہاں تنگ آ جاؤ بتا دینا واپس گھر بھیج دوں گا۔'' کبیر دادا کے منہ میں جو آیا وہ کہتا چلا گیا۔ تلخ الفاظ اور سخت جملے سن کر بھی اسے توہین کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کبیر دادا کا تلخ لہجہ اسے سراسر مصنوعی لگ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ بے بس ہو گیا ہو۔ یا شاید یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

کبیر دادا کی بات ختم ہوتے ہی اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اس کی روشن آنکھوں میں شرارت اور شوخی جھلکی اور وہ پوچھنے لگی۔

''جواب دینے کے لیے بیٹھنے کی اجازت ہے یا یہ حالت برقرار رکھوں۔'' محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کبیر دادا کی تلخ باتیں ذرا بھی بری لگی ہیں۔

گہرا سانس لیتے ہوئے کبیر دادا اس نے بے ساختہ آنے والی ہنسی کو قابو کیا۔ اور کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

اپنے مخصوص انداز میں اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے وہ اطمینان بھرے لہجے پوچھنے لگی۔ ''کھانا لاؤں۔''

''تم میری باتوں کا جواب دینے والی تھیں۔''

''جواب تو ہے، مگر پھر آپ کہیں گے بدتمیزی کر رہی ہوں۔''

''تمیزداری کے ناٹک کو چھوڑو، مجھے جواب چاہیے۔''

''نکاح پڑھانے کے بعد مجھے بیوی کے حقوق حاصل ہو گئے ہیں اور جہاں تک کچھ مانگنے کا تعلق ہے تو ، بتائیں کیا مانگا ہے۔ پہلی ملاقات پر کہا تھا آپ کی بے لوث خدمت کروں گی میری سوچیں آپ سے شروع ہو کر آپ ہی پر ختم ہوں گی، وفادار بن کر رہوں گی، مخلص اور ہمیشہ خیال کرنے والی۔ اور یہی میں کر رہی ہوں۔ باقی پیغامات یہ سوچ کر بھیجے تھے کہ صبح سے تھکے ماندے جانے کہاں کہاں پھر رہے ہوں گے چلو گھر آ کر اس خوب صورت موسم سے تھوڑا سا لطف اندوز ہو جائیں گے۔ بارش میں پکوڑے اچھے لگتے ہیں وہ کھا لیں گے، مگر نیکی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں۔ اور نام اس لیے لیا تھا کہ اچھا لگتا ہے آپ کا نام لینا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ہر وقت کبیر کبیر الاپتی رہتی ہیں اگر دو تین بار پیغام میں لکھ دیا تو کون سی قیامت آ گئی، نہیں لکھوں گی آئندہ۔'' اس کی باتوں سے ذرا سا بھی نہیں لگتا تھا کہ کبیر دادا کے لیکچر نے اس پر کوئی اثر ڈالا ہے۔ یا وہ اس ان باتوں پر عمل کا کوئی ارادہ

رکھتی ہے۔

''پھر وہی بکواس۔'' کبیر دادا کو سچ مچ تپ چڑھنے لگا۔

''کوئی بکواس نہیں کر رہی آپ یونہی الزام دھر رہے ہیں مجھ غریب پر۔'' ناز بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ قالین پر بیٹھ کر اس کے جوتے کھولنے لگی۔ جوتے اتار کر ایک جانب رکھتے ہوئے وہ حسب عادت اس کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیک کر بیٹھ گئی۔

''الزام نہیں دھر رہا لو خود پڑھ لو اپنے پیغام، کیا کیا بکواس لکھتی رہی ہو۔'' کبیر دادا نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

''ہائے اللہ جی!..... اتنے پیارے لگے ہیں میرے پیغامات کہ بار بار پڑھنے کی خاطر انھیں مٹایا ہی نہیں۔'' موبائل فون پکڑے بغیر اس کا نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔

کبیر دادا کو لگا وہ سچ کہہ رہی ہے، وہ حقیقت میں تین چار دفعہ سے زیادہ ان پیغامات کو پڑھ چکا تھا اور ہر بار وہ پہلے سے زیادہ اچھے لگے تھے۔ جادو بھرے قہقہے اور آنکھوں سے پھوٹتی شرارت نے کبیر دادا کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس کی قوت گویائی گویا سلب ہو چکی تھی۔ کوئی بھی منظر اتنا خوشنما اور پیارا نہیں ہو سکتا جیسا اس وقت تناوش کا اپنی نظروں کے سامنے بیٹھا ہونا محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر اسے مشکل گھڑی سے انٹرکام کی گھنٹی نے نکالا۔

رسیور اٹھاتے ہی اس نے کہا۔ ''بولو۔''

چوکیدار نے کہا ''دادا، مس نگی آپ سے ملنے آئی ہیں۔''

اس نے دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ اپنے وقت سے گھنٹا بھر پہلے ہی آ گئی تھی۔ مگر کبیر دادا کو اس کی آمد سے تقویت ملی تھی۔ وہ تناوش کے لیے کبیر دادا کی طرف سے ایک جیتا جاگتا اور مدلل جواب ہی تو تھا۔

''آنے دو۔'' مختصراً کہتے ہوئے اس نے رسیور رکھ دیا۔

''کون ہے؟'' تناوش اسی ہیئت میں بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

''مہمان ہے اور یہیں آ رہی ہے۔''

''آ رہی ہے'' کے الفاظ نے تناوش کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ وہ اٹھ کر صوفے پر

بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس سے ڈرائینگ روم میں بھی تو ملاقات کی جا سکتی ہے۔“

مگر کبیر دادا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

”کس لیے آ رہی ہے۔“ تناوش کی کرید جاری رہی۔

اس سے نظریں چراتے ہوئے کبیر دادا بے گانے لہجے میں بولا۔ ”کون ہے، کیوں آ رہی ہے، کتنی دیر کے لیے آ رہی ہے۔ ان سب باتوں کا جواب تمھیں چند لمحوں تک مل جائے گا۔“

تناوش خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ نہ جانے کیوں اسے کسی بڑی گڑبڑ کے آثار نظر آنے لگ گئے تھے۔

خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ دھکیل کر گنگی اندر داخل ہوتے ہوئے چہکی.....

”یقیناً میں نے انتظار کی کوفت سے آپ کو بچا لیا ہے۔“ بغیر بازوؤں والی کھلے گلے کی کالے رنگ کی مختصر سی قمیص، گہرے سرخ رنگ کی تنگ شلوار، گلے میں جھولتا مفلر نما دوپٹا، پاؤں میں جدید فیشن کے سینڈل، کندھوں تک آتی ریشمی زلفیں جنھیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ گلے میں سفید موتیوں کا خوبصورت ہار، کانوں میں ہیروں جڑے ٹاپس، داہنی کلائی میں خوبصورت نگینوں سے مزین کنگن، بائیں بازو میں سنہری چین والی گھڑی، کندھے سے لٹکتا سنہری رنگ کا قیمتی پرس، گہرا میک اپ سر تا پا خوشبو میں ڈوبی وہ کاک کی ہوئی رائفل کی مانند لگ رہی تھی جس نے نشانہ نظر آتے ہی چل پڑنا ہو۔

اسے دیکھتے ہی تناوش کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

”صحیح کہا، آؤ بیٹھو۔“ ایک گہری نظر اس پر ڈالتے ہوئے کبیر دادا نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے باکی سے کبیر دادا اور تناوش کے درمیان بیٹھ گئی۔

”آپ کون؟“ اس نے بیٹھتے ساتھ تناوش کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

جوابی مصافحہ کرتے ہوئے وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ اس کا دل عجیب خوف سے بھر گیا تھا۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی گویا دل سینے سے باہر نکل آئے گا۔

"اسے بھی اپنے جیسا ہی سمجھ لو۔" کبیر دادا کی آواز نے اس کی سماعتوں میں زہر انڈیلا۔ایک دم اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی تھی۔

"اوہ، اچھا۔" نگی معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔

اس کے احساسات سے بے پروا بنتے ہوئے کبیر دادا نے ایک اور کاری وار کیا۔"تناوش، آج رات تم دوسرے کمرے میں سو جانا کیوں کہ نگی یہیں رات گزارے گی۔"

"جی۔" بہ مشکل اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

کبیر دادا نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔آنکھوں کے کٹورے پانی سے لبریز ہو گئے تھے۔اس کے گلابی ہونٹ تتلی کے نازک پروں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔کبیر دادا کی منت کرنا چاہتی، اس کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کے پوچھنا چاہتی ہو کیا یہ پرکٹی کبوتری مجھ سے خوب صورت ہے، کیا یہ فیشن زدہ فاحشہ مجھ سے زیادہ آپ کو پیار کرے گی۔آخر مجھ میں، میرے پیار میں ایسی کون سی کمی در آئی تھی کہ آپ نے اس کو بلا لیا۔مگر پھر وہ ساری ان کہی باتیں اپنے دل میں دباتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور نظریں جھکائے خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔آنکھوں میں بھرا پانی کسی بھی وقت چھلک سکتا تھا۔گلابی ہونٹ ابھی تک لرز رہے تھے۔دروازے کے قریب جا کر رکتے ہوئے اس نے لمبا گہرا سانس لیا ایک درد بھری سسکی اس کے ہونٹوں سے پھسلی تھی۔کبیر دادا پر شکایت بھری نگاہ ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ایک دم اس کا جسم لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے جواب دے دیا تھا۔دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر وہ نیچے کھسکتے ہوئے قالین پر بیٹھ گئی۔کافی دیر سے رکے ہوئے اشک کسی برساتی چشمے کی طرح ابلنے لگے۔

اسے پہلے دن سے کبیر دادا سمیت ہر آدمی نے بتا دیا تھا کہ کبیر دادا کا کردار کیسا ہے، مگر اس کے باوجود بے قابو ہوتی حالت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔کبیر دادا نے تو کبھی بھی یہ اقرار نہیں کیا تھا وہ اس کی زندگی میں آنے والی آخری لڑکی ہے یا یہ کہ وہ اسے پیاری ہے اور کبیر دادا کو اس کے جذبات کا احساس ہے۔اس کے برعکس وہ ہر آن ہر لمحہ اسے یہی احساس دلاتا رہا تھا کہ اس کی وہاں موجودی عارضی ہے اور اس کی اہمیت کبیر دادا کے نزدیک ایک رکھیل سے بڑھ کر نہیں ہے۔اس نے نکاح بھی اس کی ضد یا خواہش کو مدنظر رکھ کر پڑھایا تھا۔پھر اتنی کھلی ڈلی

وضاحت اور اعتراف کے بعد یوں غیر ہوتی حالت کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا، مگر وہ بے بس ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ کبیر دادا اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ بھائی کی موت کا بدلہ چاہنے والی کو اب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک عذاب میں جکڑی جا چکی ہے۔ اسے ایک گینگ کے سربراہ، ایک غنڈے، درجنوں آدمیوں کے قاتل، شرابی، بدکردار شخص سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ اکیلے کمرے میں ایک لڑکی کی موجودی اس کے دل کی دنیا کو زیروزبر کر گئی تھی۔ وہ تو لاشعوری طور پر کبیر دادا کو فقط اپنا ہی سمجھ بیٹھی تھی، اس نے تو سوچ لیا تھا کہ وہ بس مصنوعی بیزاری اور کوفت ظاہر کرتا رہے گا مگر نہ تو اسے گھر بھیجے گا اور نہ کسی دوسری لڑکی کی جانب متوجہ ہو گا۔ اپنی خوب صورتی اور کشش پر اسے پورا بھروسا تھا۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ کبیر دادا کے نزدیک اس کی حیثیت ایک لذیز پکوان جتنی تھی جو پیٹ بھرنے کے بعد اچھا نہیں لگا کرتا، ایک صاف و شفاف ٹشو جتنی تھی جس سے ہاتھ صاف کر کے ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے، ایک کھلونے جتنی تھی جس سے جی بھر کر کھیلنے کے بعد توڑ دیا جاتا ہے یا کسی کو بخش دیا جاتا ہے، ایک لباس جتنی تھی جو پسندیدہ ہونے کے باوجود مسلسل نہیں پہنا جا سکتا۔

اچانک راحت خالہ کسی کام سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی، اسے یوں دیوار سے پیٹھ لگائے روتا دیکھ کر وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا میری بچی!" اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے راحت خالہ نے تشویش بھری آواز میں پوچھا۔

وہ جواب دیے بغیر ایک دم اس کے گلے لگتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"کیا صاحب جی نے ڈانٹا ہے۔" راحت خالہ نے اندازہ لگایا۔ مگر وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"کچھ تو بتاؤ خالہ کی جان ہوا کیا ہے۔ کیوں اتنا رو رہی ہو۔" راحت خالہ گلوگیر ہونے لگی تھی۔

"خالہ آپ ٹھیک کہتی تھیں، میں وقت گزاری کے لیے لایا جانے والا ایک کھلونا ہی تو تھی۔ ان کی عیاشی کا وقتی سامان اور بس۔"

"اچھا اٹھو یہاں سے کسی ملازم نے دیکھ لیا تو جانے کیا سوچے گا۔" وہ اسے سہارا دے کر ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ "اب اصل بات بتاؤ۔"

"وہ اپنے کمرے ایک دوسری لڑکی کے ساتھ موجود ہیں اور مجھے یہ کہہ کر انھوں نے باہر بھیج دیا کہ آج کی

رات وہ اس کے ساتھ گزاریں گے، میں دوسرے کمرے میں سو جاؤں۔"

راحت خالہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔"آپ کو گھر سے نکل جانے کا تو نہیں کہا نا۔"

"نہیں۔"

"کیا صاحب جی آپ کو بہت پیارے ہیں، محبت کرنے لگی ہو ان سے۔" راحت خالہ نے اگلا سوال پوچھا۔

"پتا نہیں۔" ایک سسکی اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی۔"لیکن ان کے نزدیک ایک دوسری لڑکی برداشت نہیں ہو رہی۔"

"اچھا روتے نہیں ہیں۔ یقیناً ان کی نظروں میں آپ کی اتنی اہمیت تو ہے نا کہ آپ کو گھر نہیں بھیج رہے۔ باقی ایسی فاحشائیں کئی آئیں گی اور چلی جائیں گی آپ تو بس صاحب جی کی بے لوث خدمت کرتی رہیں ایک دن آئے گا کہ وہ ان لڑکیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں گے۔"

"جان بوجھ کر تو نہیں رو رہی۔" اس نے زوردار انداز میں ناک سے سانس اندر کھینچا۔

"اچھا میں آپ کے لیے کھانا بناتی ہوں، پھر نیند کی گولی کھا کر لیٹ جانا۔"

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"پھر بھی دو تین نوالے لے لو۔" وہ اس کے ماتھے پر بوسا دے کر باہر نکل گئی۔ ایک دفعہ پھر اس کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

تناوش کے غائب ہوتے ہی کبیر دادا کو لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ نگی کا وجود اسے ایک دم فراموش ہو گیا تھا، اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو تناوش کے لرزتے کانپتے ہونٹ، اشکوں بھری سیاہ آنکھیں اور دکھی چہرہ تھا۔ اس کا جی کر رہا تھا بھاگ کر جائے اور اس کے نازک وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لے، اس کی سیاہ آنکھوں میں بھرے نمکین پانی کو اپنے ہونٹوں سے خشک کر دے، اس کے پھڑ پھڑاتے ہونٹوں پر شوخی بھرا تبسم بکھیر دے۔

''تو کیسے دن گزرے ہیں جناب کے۔'' نگی کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچا۔

''ہوں.....کیا.....؟'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''وہ چلی گئی ہے جناب اور میں یہاں موجود ہوں۔'' نگی ایک نازیبا حرکت کرتے ہوئے کھل کھلائی۔ یوں بھی وہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ بہت بے تکلف ہو کر گزار چکی تھی۔ اس کی دوشیزگی کے پہلے خریداروں میں کبیر دادا بھی شامل تھا۔ اور پھر کبیر دادا ہی کی مرہون منت وہ ماڈلنگ میں اتنا آگے تک جا سکی تھی۔

''میں کپڑے تبدیل کر لوں۔'' کبیر دادا کے لہجے میں تو نہیں انداز میں ضرور بیزاری بھری تھی۔

''کچھ پینے پلانے کو نہیں ہے۔'' وہ اس کی بیزاری کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ یوں بھی کرائے کی عورتوں کو اگلے کے موڈ کی پروا نہیں ہوتی۔

کبیر دادا کی نگاہیں شراب کی تالا لگی شراب کی الماری کی جانب اٹھیں اور اس کے دماغ میں تناوش کی معصومیت بھری آواز گونجی۔ ''میں نے ناپے ہیں، اس گندے مشروب کی بوتل میں چھے گلاس ہوتے ہیں۔''

''مسکرانے کیوں لگے۔'' نگی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ تناوش کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے وہ بے ساختہ مسکرا پڑا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' سر جھٹک کر اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ ''عظیم دو بوتل وہسکی اور.....تم کیا لو گی؟'' عظیم سے بات کرتے کرتے وہ نگی سے پوچھنے لگا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''اسکاچ۔''

''اور ایک بوتل اسکاچ کی راحت خالہ کے ہاتھ بھیج دو۔''

''جی دادا۔'' عظیم مودبانہ لہجے میں بولا۔

ریسیور رکھ کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش کے آنے کے بعد سے اسے کپڑوں کی الماری کھولنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے بھی کام کرنے کے لیے ملازم موجود رہتے تھے، مگر تناوش کی خدمت گزاری تو محبت، خلوص اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی وہ اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند کرتی۔ ملازم کبھی یہ غور نہیں کرتے تھے کہ اس کی جرابیں یا انڈر ویئر کتنا میلا ہو گیا ہے۔ نہ خود وہ اتنا صفائی پسند تھا۔ کبھی

کبھی تو وہ ایک ہی جرابوں کے جوڑے میں ہفتہ ہفتہ گزار دیتا تھا۔مگر اب روزانہ دھلی ہوئی جرابیں بوٹوں میں ملتیں، صاف انڈر ویئر پہننے والے سوٹ کے ساتھ لٹکا ہوا ملتا۔الماری کھولتے ہی اسے تمام سوٹ ایک ترتیب سے لٹکے نظر آئے۔میلے سوٹ یقیناً اس نے ڈرائی کلین کے لیے بھجوا دیے تھے۔اس نے دوسری الماری کھولی شلوار سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔الماری کی دراز کھولنے پر اسے صاف ستھری تہہ کی ہوئی جرابیں نظر آئیں۔دراز سے اٹھتی خوشبو نے اس پر واضح کیا کہ وہ جرابوں پر خوشبو چھڑک کر رکھتی ہے۔تیسری الماری میں اسے تناوش کے چار پانچ سوٹ لٹکے نظر آئے دو کالج کی یونیفارم تھیں،ایک سرخ رنگ کا جوڑا جو اس نے پہلی رات پہنا تھا۔کبیر دادا کا لایا ہوا سوٹ بھی وہیں لٹکا تھا۔اس نے گہرا سانس اندر کھینچا تناوش کے وجود کی خوشبو اس کی رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔

”بے وقوف لڑکی تم نہیں جانتیں میں کیوں تمھیں دور کر رہا ہوں،میں تمھاری دنیا کا آدمی نہیں ہوں،تم صاف وشفاف شبنم کے قطروں سے دھلا ہوا گلاب کا پھول ہو اور میں ببول کا درخت۔یہاں تمھاری کوئی جگہ نہیں ہے۔آج رو رہی ہو مگر کل ضرور مسکراؤ گی۔آخر میں تمھیں دے ہی کیا سکتا ہوں۔جرم کی دنیا میں تم زیادہ دن خوش نہیں رہ پاؤ گی اور میں تو اس دلدل سے چاہ کر بھی نہیں نکل سکتا۔اس دنیا میں آمد کا راستہ بے شک کھلا ہے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔“

اس کا شب خوابی کا لباس تناوش کے کپڑوں کے ساتھ ہی لٹکا ہوا تھا۔کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر نکلا۔نگی بڑے انداز سے صوفے پر بیٹھی تھی۔کوئی بھی مرد اسے اس حالت میں دیکھ کر اپنی بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر قابو نہ پا سکتا،مگر عجیب بات تھی کبیر دادا پر اس کی ادائیں کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔اس کے لطیف جذبات جانے کہاں جا چھپے تھے۔اس کی نظروں میں تو بس تناوش کے پھڑ پھڑاتے لب اور ڈبڈبائی آنکھوں کا منظر ٹھہر چکا تھا۔وہ اسے اپنی سوچ سے جھٹک نہیں پا رہا تھا۔بہ قول شاعر.....

نظر سے دور رہ کر بھی کسی کی سوچ میں رہنا
کسی کے پاس رہنے کا طریقہ ہو تو تم جیسا

وہ صوفے کے دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

''بڑے خاموش خاموش سے ہو۔'' وہ کھسک کر اس کے قریب ہوئی۔

''کچھ نہیں یار۔'' کبیر دادا کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''کیا اچھی نہیں لگ رہی۔'' اس کا ہاتھ کبیر دادا کی چھاتی پر رینگنے لگا۔ اسے مردوں کو لبھانے اور اپنے بس میں کرنے کا طریقہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اس کا ملائم ہاتھ کبیر دادا کو لجلجے سانپ کی مانند محسوس ہوا۔ وہ خوشبو میں نہائی ہوئی تھی، اتنی تیز خوشبو بھی تناوش کے بدن کی قدرتی خوشبو کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی خوب صورت بھوری آنکھیں، میک اپ زدہ چہرہ ریشمی بال، گداز بدن کچھ بھی تو کبیر دادا کو متاثر نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے دل کو تو بس تناوش کی آخری نگاہ مسلے جا رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور کبیر دادا نے نگی کو نرمی سے دور کرتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ۔''

راحت خالہ ٹرے میں تین بوتلیں سجائے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے نظر بھر کر نگی کو دیکھا اور شیشے کی میز پر ٹرے رکھ کر واپس مڑ گئی۔ اس کی آنکھیں نگی کو دیکھتے ہوئے قہر برساتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

نگی نے کہا۔ ''کچھ کھانے کو بھی منگوا لو۔ یا بھوکا رکھنے کا ارادہ ہے۔''

''راحت خالہ بات سنو۔'' کبیر دادا راحت خالہ کو آواز دے کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کھاؤ گی؟''

وہ دلربائی سے بولی۔ ''کچھ اچھا سا منگوا لو۔''

''ڈرائیور کو بھیج کر تین، چار قسم کے اچھے کھانے منگوا لو۔'' اس نے چناؤ کی ذمہ داری راحت خالہ پر چھوڑ دی تھی۔

''جی صاحب جی۔''

''اور ہاں..... تناوش سے پوچھ کر اس کے کھانے کے لیے بھی کچھ منگوا لینا۔''

راحت خالہ کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ ''جی صاحب۔'' کہہ کر وہ دوبارہ مڑ گئی۔ یقیناً کبیر دادا کو تناوش

کا خیال تھا ورنہ یوں کیوں کہتا۔

"کتنا خیال رکھتے ہوئے اپنی دلھن کا۔" وہ برف لینے کے لیے مٹکتے ہوئے فرج کی طرف بڑھ گئی۔

کبیر دادا نے اس کے نظر بہکاتے وجود سے بے نیاز ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ "تناوش کا اداس چہرہ ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گیا۔ ڈبڈبائی آنکھیں اور لرزتے ہونٹ اسے بے کل کر رہے تھے۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ رو رہی ہو گی۔

برف لا کر نگی نے اپنے لیے اسکاچ اور اس کے لیے وہسکی کا جام تیار کیا۔

"کیا سوچ رہے ہو وہ اپنا جام اٹھا کر اس کے قریب کھسک آئی۔ اسی وقت کبیر دادا نے تناوش کے کپکپاتے ہونٹوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے دماغ میں ایک ترکیب ابھری۔ "نہیں اسے یوں اذیت دینا ٹھیک نہیں ہو گا، پہلے اسے پیار سے سمجھا دوں اپنے ساتھ رہنے کی قباحتیں اور نقصانات گنوا دوں، جب وہ یہ مان کر گھر جانے پر راضی ہو جائے گی پھر پاشا کو بھی اطمینان ہو جائے گا اور مجھے بھی۔ اب تو وہ رو رو کر خود کو بے حال کر دے گی۔" ایک میٹھی کسک اس کی دل میں جاگی اور نگی کو دور دھکیلتے ہوئے وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

"تم دور بیٹھ کر بھی تو بات کر سکتی ہو۔"

اس نے بے باکی سے پوچھا۔ "کیا مطلب، مجھے باتوں کے لیے بلایا ہے۔"

"تمھیں پاشا نے میرے پاس بھیجنے کا کیا معاوضا دیا ہے۔ یا پہلے کی طرح تمھارا اٹکا ہوا کوئی کام نکالا ہے۔" اسے دور نہ ہوتا دیکھ کر وہ خود اٹھ کر فوم کی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔

نگی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "گویا پاشا کا اندازہ ٹھیک تھا۔"

"اس مسئلے میں نہ پڑو تو بہتر ہو گا۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "سیٹھ مسکین میرے پیسے دینے میں اڑی کر رہا تھا اور فیروز ملک بھی وعدہ خلافی پر آمادہ تھا، دونوں کام ہو گئے ہیں۔"

"مجھ سے کوئی توقع؟"

وہ بے شرمی سے بولی۔ "ہاں، مجھے ڈھیر سارا پیار کرو۔"

وہ بیزاری سے بولا۔ ''اس موضوع کو رہنے دو کچھ اور مانگو۔''

''کیا دے سکتے ہو۔'' وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ کبیر دادا کا انداز اسے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اور پھر تناوش کی خوب صورتی اور کم عمری نے بھی اس پر واضح کر دیا تھا کہ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

''فیروز ملک نے کیا وعدہ خلافی کی ہے۔''

''ایک ڈراما سیریل میں مرکزی کردار دینے کا وعدہ کیا، دو راتوں کا منہ مانگا معاوضا وصول کیا اور اب ٹرخانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔'' اس نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''نادر حبیب خاکوانی کو جانتی ہو۔''

''ہائے اللہ جی، کس کٹھور کا نام لے دیا۔ ہم جیسوں کو تو گھاس ہی نہیں ڈالتا۔''

''موبائل فون ادھر کرو۔'' کبیر دادا نے میز پر رکھا اپنا سیل فون مانگا۔

''یہ لیں۔'' نگی نے موبائل فون اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔ اور خود اس کی کرسی کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

کبیر دادا، نادر حبیب کا نمبر ڈھونڈ کر رابطہ کرنے لگا۔ گھنٹی جاتے ہی اس نے سپیکر آن کر کے میز پر رکھ دیا تھا۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی۔

''اسلام علیکم کبیر صاحب۔'' خوشی سے چہکتی ایک آواز رسیور سے برآمد ہوئی۔ جو ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے پاس کبیر دادا کا موبائل فون نمبر محفوظ ہے۔

کبیر دادا نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔ ''خاکوانی صاحب کیسے مزاج ہیں۔''

''آپ کی کال کی خوشی ہضم نہیں ہو پا رہی۔''

''محبت ہے آپ کی لیکن میں نے ایک کام کے سلسلے میں زحمت دینا تھی۔''

وہ پر خلوص لہجے میں بولا۔ ''دعا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو روزانہ مجھ سے کام درپیش آتا رہے۔''

''لیکن میں نے تو سنا ہے آپ کسی کی سفارش وغیرہ قبول نہیں کرتے۔''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔'' خاکوانی خفیف ہونے لگا۔

”آج کل کس ڈراما سیریل پر کام ہو رہا ہے۔“

”دو ڈراما سیریل اکٹھی چل رہی ہیں کبیر صاحب! اپنا تو کاروبار ہی یہی ہے آہستہ، تیز لگے رہتے ہیں۔“

”نگی کو جانتے ہو۔“ کبیر دادا مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

”نگی.....“ وہ پرسوچ لہجے میں بولا۔ ”شاید نگینہ یا سمین نام ہے۔“

کبیر دادا نے سوالیہ نظریں نگی کی جانب اٹھائیں۔ اوپر نیچے سر ہلا کر اس نے خاکوانی کی تصدیق کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”ہاں وہی۔“ اور پوچھا۔ ”کیسی اداکارہ ہے؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”بہت اچھی..... بہترین اداکارہ ہے۔“

کبیر دادا ہنسا۔ ”اتنی تعریف کس لیے۔ اگر اتنی اچھی ہوتی تو آپ پہلے کسی ڈرامے میں کاسٹ نہ کر لیتے۔“

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ”پھر آپ کی سفارش کی خوشی کیسے ملتی۔“

”اچھا مذاق کے علاوہ، میری سفارش پر اسے کتنے ڈراموں میں مرکزی کردار مل سکتا ہے۔“

”تین ڈراموں میں اسے مرکزی کردار مل جائے گا اور اگر کارکردگی بہتر پائی تو اس کے بعد بھی محروم نہیں رہے گی۔“

”شکریہ خاکوانی صاحب۔ وہ کل آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

”یہ شکریے کا تھپڑ مارنا ضروری تھا۔“ وہ شکوہ کناں ہوا۔

”اب اس بات پر معذرت کر کے آپ کو مزید خفا نہیں کر سکتا، اس لیے اجازت۔“

خاکوانی نے ہنستے ہوئے ”خدا حافظ۔“ کہا اور کبیر دادا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”You are so sweet, I love you“ نگی نے رابطہ منقطع ہوتے ہی اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔

کبیر دادا اسے دور ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”تم چاہتی ہو کہ میں خاکوانی کو منع کر دوں۔“

”سوری..... سوری..... سوری۔“ وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

''اب تم پھوٹنے کی کرو، پاشا پوچھتا ہے تو بتا دینا ساری رات میرے ساتھ ہی تھیں۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور کبیر دادا کے۔ ''آجاؤ۔'' کہنے پر راحت خالہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ٹرالی پر کھانے لوازمات سجے تھے۔

''کھانا تو کھالوں نا۔'' اس نے راحت خالہ کو دیکھتے ہی پوچھا۔

کبیر دادا بے رخی سے بولا۔ ''گھر کھالینا۔'' یہ کہتے ہی اس نے اٹھتے ہوئے الوداعی مصافحے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس کے دل میں صبر ختم ہو گیا تھا۔ وہ جلد از جلد تناوش کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔

''اتنا کٹھور بھی کوئی نہ ہو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ لیکن اس کے چہرے پر چھائے تاثرات یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ بے حد خوش تھی۔ اس کی بلا سے کبیر دادا کا تناوش سے کیا دلی تعلق تھا اور پاشا کی کیا پریشانیاں تھیں۔ اسے ایک ہی دن میں اتنے فوائد حاصل ہو گئے تھے۔ اور یہ کافی سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ وہ کبیر دادا سے الوداعی مصافحہ کر کے چل دی۔ شیشے کی میز پر کھانے کے برتن سجاتی راحت خالہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ گلی کے باہر نکلتے ہی کبیر دادا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''راحت خالہ، وہ رو تو نہیں رہی تھی۔''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''جی صاحب۔''

''کیا جی صاحب۔'' کبیر دادا کی سمجھ میں اس کا جی صاحب کرنا نہیں آیا تھا۔

''روتے روتے آدھی ہو چکی ہے، دروازے کے باہر ہی بیٹھی تھی بڑی مشکل اٹھا کر ساتھ والے کمرے لے جا کر بٹھایا ہے، کافی دیر سمجھاتی رہی ہوں لیکن آنسو نہیں تھم رہے پگلی کے۔''

کبیر دادا کا دل عجیب قسم کے دکھ اور سرشاری کی ملی جلی کیفیت سے بھر گیا تھا۔ جہاں اس کا رونا تکلیف دینے والا تھا وہیں یہ سوچ کہ کسی کے لیے آپ اتنے اہم بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ پیٹھ پیچھے آپ کے لیے رو رہا ہے خوش کرنے والی تھی۔

''اچھا اسے لے آؤ کہ کھانا کھالے اور یہ بھی بتا دینا کہ دوسری لڑکی اپنے کسی کام کی غرض سے آئی تھی، کام

ہوتے ہی چلی گئی۔" راحت خالہ کو زندگی میں پہلی بار کبیر دادا نے اتنی لمبی اور تفصیلی بات کی تھی ورنہ اس کی گفتگو ہلکا سا سر ہلانے پر ہی مشتمل ہوتی تھی، یا زیادہ سے زیادہ چند الفاظ۔ اور وہ اس طرح کسی بات کی صفائی دے، ایسا تو راحت خالہ نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"جی صاحب!" وہ خوشی سے چہکتے ہوئے باہر نکل آئی۔ تناوش تک وہ قریباً دوڑتے ہوئے پہنچی تھی۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے خاموش بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر چہرے پر اسی طرح بارہ بج رہے تھے۔

"کتنے نصیبوں والی ہے میری بیٹی۔" اندر جاتے ہی راحت خالہ اس سے لپٹ گئی۔

"طنز کر رہی ہیں خالہ۔" وہ مزید دکھی ہونے لگی۔

"طنز کیوں کروں گی اور آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے سچ کہا تھا کہ آپ واپس جانے کے لیے نہیں آئیں۔"

"خالہ میرا مذاق اڑانا ضروری ہے کیا۔"

"مذاق نہیں اڑا رہی خالہ کی جان، حقیقت بیان کر رہی ہوں۔"

"کون سی حقیقت خالہ، یہی کہ میرا شوہر ایک دوسری لڑکی کے ساتھ خواب گاہ میں بند ہے اور مجھے اس نے شادی کی پانچویں رات ہی ٹھوکر لگا کر خواب گاہ سے باہر نکال دیا ہے۔"

"ہے نا پگلی، وہ ڈائن کب کی جا چکی ہے، اسے تو گھاس بھی نہیں ڈالی صاحب نے۔ اپنا کوئی کام کروانے آئی تھی، کام کرتے ہی صاحب نے کہا کہ وہ جا سکتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ کھانا کھا کر چلی جاؤں گی۔ صاحب جی نے کہا پھوٹنے والی کر دیہ کھانا وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر کھائے گا۔"

وہ بے یقینی سے بولی۔ "خالہ جی، کتنے جھوٹ بولیں گی مجھے تسلی دینے کے لیے۔"

"جھوٹ کیسا، صاحب جی آپ کو بلا رہے ہیں اور جانتی ہو کیا پوچھ رہے تھے۔"

"کیا؟" تناوش کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی ہلکورے لے رہی تھی۔

"پوچھ رہے تھے آپ رو تو نہیں رہیں، میں نے بھی کہہ دیا رو رو کر آدھی ہو گئی ہے میری بچی۔"

"اگر یہ سچ ہے تو آپ کو میرے رونے کی بات تو نہیں بتانا چاہیے تھی۔"

"کیوں نہ بتاتی، انھیں بھی تو تھوڑی تکلیف پہنچے۔"

وہ پوچھنے لگی۔ "تکلیف کیسی خالہ جی۔"

"جس سے محبت ہوتی ہے نا بیٹی، اس کو روتے دیکھنا جتنا تکلیف دیتا ہے اتنی تکلیف اور کسی چیز سے نہیں ملتی۔"

"خالہ جان، سچ کہیں وہ مجھے بلا رہے ہیں نا، آپ مجھے بہلا تو نہیں رہیں۔" خوشی اور دکھ کے امتزاج سے اس کا چہرہ عجیب سا منظر پیش کرنے لگا تھا۔

"اللہ پاک کی قسم بیٹی، بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" راحت خالہ نے اسے یقین دلانے کے لیے قسم کھائی۔ وہ خوشی سے لرزتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر واپس مڑتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"میں نہیں جاتی، کم از کم آج تو نہیں جاؤں گی ان کے پاس۔"

"پاگل تو نہیں ہوئی ہو۔" راحت خالہ نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے ماتھے پر بوسا دیا۔ "خالہ کی جان ایسا نہیں کرتے، نخرے کرنے کا، لاڈ اٹھوانے کا اور اپنی ہر بات منوانے کا بہت وقت پڑا ہے۔ فی الحال صاحب جی پر اپنی گرفت مضبوط کرو اور دیکھنا ایک دن صاحب جی خواب گاہ میں لڑکی بلانا تو کجا کسی غیر لڑکی کو نگاہ بھر کر دیکھنے سے پہلے آپ کی غیر موجودی کا یقین کرے گا۔"

"جاؤں۔" یہ پوچھتے ہوئے وہ کھل پڑی تھی۔ کبیر دادا کے متعلق اس کے اندازے غلط ثابت نہیں ہوئے تھے۔

"جاؤ نا پاگل، وہ بے چینی سے آپ کا منتظر ہے۔"

راحت خالہ کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم بھاگ پڑی، خواب گاہ کے دروازے پر لمحہ بھر رک کر اس نے گہرا سانس لیا اور دروازے کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ وہ تکیے کو گود میں لیے بیڈ پر بیٹھا دروازے کی طرف متوجہ تھا۔ ایک دم اس کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئی۔ دروازہ بند کر کے بھی وہ دو تین لمحے اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر اسے زور کا رونا آیا اور وہ اسی طرح کبیر دادا سے رخ

پھیرے نیچے بیٹھ کر رونے لگی۔

اسے روتے دیکھ کر وہ بے اختیار تکیے کو ایک جانب پھینکتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”رو کیوں رہی ہو ۔“ قریب آتے ہی اس نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

ایک دم اس سے لپٹتے ہوئے وہ چیخ پڑی۔ ”آپ آئندہ ایسا نہیں کریں گے..... آپ کسی لڑکی سے بات نہیں کریں گے..... آپ بے شک مجھے دھتکارتے رہنا، میری کوئی بات نہ ماننا، ہر بات پر میری بے عزتی کرنا مگر..... مگر کسی لڑکی کی طرف متوجہ نہ ہونا ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا..... میں مر جاؤں گی..... میں، میں بچ نہیں سکوں گی..... ہاں میں کہے دیتی ہوں میں زہر کھالوں گی..... سن رہے ہیں نا آپ..... آپ کی سمجھ میں آرہی ہیں میری باتیں۔“ اس کے منہ سے بے ربط باتیں نکل رہی تھیں۔

کبیر دادا کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، چپ کر جاؤ، کوئی بھی لڑکی نہیں آئے گی، لیکن تم بھی وعدہ کرو کہ ہر وقت رومانس نہیں جھاڑو گی۔“

”نہیں کرتی وعدہ..... پیغام بھی بھیجوں گی، اپنے ہاتھ سے کھانا بھی کھلانا پڑے گا، گندا مشروب بھی نہیں پینے دوں گی، آپ کو جلدی گھر لوٹ کر بھی آنا پڑے گا اور کبیر بھی کہوں گی۔ کبیر..... کبیر..... کبیر۔“ وہ اس سے چمٹی سسکیاں بھرتے ہوئے کہتی رہی۔

”اچھا جھگڑا ختم کرو، چلیں کھانا کھاتے ہیں۔“ کبیر دادا نے صلح کی پیش کش کی۔

پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے آنسو صاف کیے، مسکراتی آنکھوں کے آنسوؤں کی بھی اپنی کشش ہے۔ اشکوں سے دھلی کالی سیاہ آنکھوں نے کبیر دادا کو مسحور کر دیا تھا۔ تناوش کے لبوں پر ویسا ہی ملکوتی تبسم رقصاں تھا جیسا اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا۔

وہ میز کی طرف مڑی کھانے کے برتنوں کے ساتھ پڑی بوتلوں کو دیکھتے ہی وہ سرعت سے ان کی طرف بڑھی ۔اور تینوں بوتلوں کو اٹھا کر الماری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کبیر دادا کے لیے نگی نے جو گلاس بھرا تھا وہ ابھی تک ویسے ہی رکھا تھا۔ وہ گلاس بھی تناوش نے اٹھا لیا تھا۔ اس کی تیزی دیکھتے ہوئے کبیر دادا اپنی ہنسی کو نہیں روک پایا تھا ۔الماری کی چابی اس نے دھاگے میں پرو کر گلے میں ڈالی ہوئی تھی۔ تینوں بوتلوں کو تالا کر کے اس نے گلاس کا

مشروب غسل خانے میں گرایا اور گلاس دھو کر اس کے پاس لوٹ آئی۔

اس نے فوراً پوچھا۔ ''میری آج کی بوتل کہاں گئی۔''

وہ معصومیت سے بولی۔ ''پتا نہیں میری غیر موجودی میں کتنی بوتلیں پی لی ہوں گی۔''

''غضب خدا کا ایک گلاس بھرا تھا اس سے بھی گھونٹ نہیں لے پایا تھا جو محترمہ نے گرا دیا۔''

''ایک بوتل آدھی خالی تھی۔''

''وہ تو مہمان نے پی ہے۔''

''اتنا زیادہ کھانا کیوں منگوایا ہے'' یقیناً وہ اس لڑکی کے بارے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''میں نے سوچا بھوکا ہونے کی وجہ سے اتنا رو رہی ہو تو چلو کھلا پلا کے دکھ دور کر دیتا ہوں۔''

گہری نظروں سے اسے گھور کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبیر دادا کو ہاتھ سے کھلانے کا موقع جانے دیتی یوں بھی اس وقت کبیر دادا اس کی دل جوئی میں لگا ہوا تھا۔

کھانا کھا کر وہ برتن سمیٹنے لگی۔

کبیر دادا سنجیدگی سے بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا اس لیے میری آج کی بوتل لے آؤ۔''

''اچھا میں یہ برتن دھو کر آتی ہوں، پھر اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔''

''رہنے دو، میں پی لوں گا۔ بس بوتل دیتی جاؤ۔'' کبیر دادا اس کی چالاکیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ وہ ہزار بہانوں سے اسے شراب پینے سے روکنے کی کوشش کرے گی۔

''آ رہی ہوں نا، اتنے بے صبرے کیوں ہو جاتے ہیں آپ۔ خود کہہ رہے تھے کہ لڑکے نہیں رہے، حرکتیں دیکھیں بالکل بچوں والی ہیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' غیر متوقع طور پر کبیر دادا نے ضد چھوڑ دی۔ اور وہ خوشی سے سر ہلاتی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے خواب گاہ سے نکلتے ہی اس نے عظیم کا نمبر ملایا۔

''جی دادا!'' اس نے فوراً کال وصول کی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''تمھارے پاس وہسکی کی کوئی بوتل رکھی ہے۔''

''جی دادا!.....''

''فوراً میرے پاس لے آؤ۔'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دو منٹ بعد ہی عظیم دروازے کو کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں وہسکی کی سربمہر بوتل تھی۔ بوتل اس کے سامنے میز پر رکھ کر وہ واپس مڑ گیا۔

کبیر دادا نے فرج سے برف کے ٹکڑے نکالے اور اطمینان سے شغل میں لگ گیا۔ تناوش کے لوٹنے تک وہ آدھی سے زیادہ بوتل خالی کر چکا تھا۔

''یہ کہاں سے آئی ہے۔'' واپس آتے ہی اس نے تالہ کی ہوئی الماری کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

پتا نہیں۔'' اس نے چوتھا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی وہ میز کے قریب آئی اور پھر ایک دم جھپٹ کر بوتل اٹھاتے ہوئے بولی ۔''پوری بوتل تو نہیں پینے دوں گی۔''

''تناوش، بوتل مجھے دو۔'' گلاس نیچے رکھتے ہوئے وہ جارحانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''نہیں دوں گی۔'' وہ غسل خانے کی طرف بھاگی۔ کبیر دادا بھی جست لگا کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ غسل خانے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ کبیر دادا نے اس کے بازو کو پکڑ لیا۔

تناوش نے فوراً ہاتھ میں پکڑی بوتل غسل خانے کے فرش پر اچھالی شیشے کی بوتل کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' کبیر دادا کو سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ اس کا تلخ لہجہ سنتے ہی وہ کانپ گئی تھی۔

''بے ہودہ لڑکی۔'' اسے آہستہ سے دور جھٹکتا ہوا وہ بیڈ کی طرف مڑ گیا۔ تناوش وہیں کھڑی مسکین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

بیڈ پر لیٹ کر اس نے تناوش کی جانب پیٹھ موڑ لی تھی۔

چند لمحے اسے گھورنے کے بعد وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ شیشے کی کرچیاں اٹھا کر اس نے ٹوکری میں

ڈالیں اور فرش کی صفائی کر کے باہر نکل آئی۔ کبیر دادا اسی طرح کروٹ بدلے ہوئے لیٹا تھا۔ اسے اپنا رویہ غلط محسوس ہوا۔ الماری کے پاس جا کر اس نے ایک کھلی ہوئی بوتل اٹھائی اور بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ تپائی پر بوتل اور گلاس رکھ کر وہ کبیر دادا کے ساتھ بیٹھ گئی۔

وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا تھا۔ تناوش نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا، اس کی انگلیاں کبیر دادا کے بالوں میں پوری گھسی نہیں تھیں کہ کبیر دادا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ بھرپور ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ منمنائی۔ ''سوری، غلطی ہوگئی ہے۔''

وہ خاموش لیٹا رہا۔

''اچھا خفا تو نہ ہوں نا، آپ کے لیے نئی بوتل نکال کے لے آئی ہوں۔ مجھے تو بس اس لیے غصہ آ گیا تھا کہ میں نے کہا تھا آج اپنے ہاتھوں سے آپ کو گلاس بھر بھر کے دوں گی۔''

''بکواس بند کرو اور سونے دو۔''

''پلیز۔'' اس نے دوبارہ کبیر دادا کے بالوں میں انگلیاں گھسیڑنا چاہیں۔ پہلے کی طرح اس کے ہاتھ کو دور جھٹکتے ہوئے اس نے ہلکا سا دھکا دے کر اسے نیچے قالین پر پھینک دیا۔

وہ فوراً بیڈ پر چڑھ کر اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ''ناراض تو سونے نہیں دوں گی۔''

''دماغ خراب مت کرو سمجھیں۔'' کبیر دادا نے دھاڑتے ہوئے اسے پھر دور کر دیا۔

وہ روہانسی ہوتے ہوئے چلائی۔ ''معافی مانگ تو رہی ہوں، بوتل بھی لے آئی ہوں۔ اب بس کریں نا کتنی سزا دیں گے۔''

''مجھے، تمھاری بکواس نہیں سننا۔ دور رہو مجھ سے بے ہودہ لڑکی۔'' یہ کہتے ہی اس نے تپائی پر رکھی بوتل اٹھا کر غسل خانے کے دروازے کی طرف اچھال دی، جو لکڑی کے دروازے سے ٹکرا کر نیچے گری مگر دبیز قالین کی وجہ سے ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔

تناوش پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوئی مگر کبیر دادا نے دوبارہ دور دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر تم قریب آئیں تو میں کال کر کے دوبارہ نگی کو بلا لوں گا۔''

”میں اس کی جان لے لوں گی۔“ وہ اس کی دھمکی کی پروانہ کرتے ہوئے دوبارہ قریب ہوگئی اور پھر کبیر دادا کے بار بار دور کرنے کے باوجود اس کی جان نہ چھوڑی، یہاں تک کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”لگتا ہے آپ مجھ سے جان چھڑانے کی کوششوں میں ہیں۔ سچ کہتی ہوں، اپنی جان دے دوں گی مگر ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”تم بس ایک پاگل، احمق اور بے وقوف لڑکی ہو۔“

وہ فوراً بولی۔ ”جب جانتے ہیں کہ پاگل اور احمق ہوں تو میری غلطیوں پر ڈانٹتے کیوں ہیں، چپ کر کے میری مان کیوں نہیں لیتے۔“

”مان کیوں نہیں لیتے۔“ کبیر دادا نے منہ بگاڑ کر اس کا فقرہ دہرایا اور وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ سنجیدہ، متین اور رعب داب والے کبیر دادا کو اپنا رکھ رکھاؤ اور طنطنہ بھول گیا تھا۔ ایک کم عمر لڑکی اس کے اعصاب پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ کبیر دادا آنکھیں بند کر کے کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس سے تناوش کو خفا کیے بغیر واپس بھیجا جا سکتا ہو، کوئی ایسی تجویز جس سے وہ چھوٹی سی لڑکی اس کی سوچوں اور دماغ سے بھی نکل جاتی، مگر یہ کام اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ دل، دماغ کے خلاف مکمل طور پر میدان میں آ گیا تھا اور دل تو ایسا ہٹ دھرم، ضدی اور بااثر ہے کہ اپنی منوا کر ہی رہتا ہے۔

تناوش کی میٹھی گنگناہٹ اسے سپنوں کی دنیا میں دھکیل لے گئی۔ ایک ایسے جہان میں جہاں دنیا کے سارے جھگڑوں، فساد، خساروں، دکھوں، الجھنوں اور خوف وغیرہ کا دور دور تک نشان نہیں تھا بس وہ اور تناوش تھے، خوشیاں اور راحتیں تھیں، سکون اور اطمینان تھا۔

☆.....☆.....☆

”تو تم ناکام رہیں۔“ نگی کے کال وصول نہ کرنے پر پاشا اس کی کوٹھی ہی پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے اس نے پہلا فقرہ یہی کہا تھا۔

”تمھیں کیسے پتا چلا؟“ دماغ میں جھوٹ کو ترتیب دیتی نگی نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہا تھا دادا۔" اس نے نگی کے استفسار کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔ میرے مسائل پوچھے، فائدہ پہنچایا اور یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ پاشا کو کہہ دینا میں ساری رات اس کے ساتھ رہی ہوں۔"

"بھابی سے بات ہوئی تھی۔"

"بس مصافحہ کیا تھا، ورنہ تو مجھے دیکھتے ہی اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی گویا اس نے موت دیکھ لی ہو۔ آنکھوں میں آنسو اور کپکپاتے ہونٹ یقین مانو مجھے تو ترس آ رہا تھا اس کی حالت دیکھ کر۔ کسی کی محبت میں یوں پاگل ہو جانا بے وقوفی ہی تو ہے۔ چاہے مرد کبیر دادا جیسا ہی کیوں نہ ہو۔"

"اداکاری کر رہی تھی کمینی..... میرا مطلب کمینی بھابی۔" پاشا نے فوراً فقرے کی تصحیح کی تھی۔

"اگر اداکاری تھی تو آسکر ایوارڈ اس کا حق بنتا ہے۔ مجھ جیسی منجھی ہوئی اداکارہ بھی ایسی کارکردگی نہیں دکھا سکتی۔"

پاشا نے منہ بنایا۔ "تم بھی کبیر دادا کی طرح اس کی معصومیت سے متاثر ہو گئیں۔"

"وہ ہے ہی معصوم، صاف گو اور سیدھی سادی۔ تاثرات چھپانا اسے آتا ہی نہیں ہے ورنہ ایک غیر لڑکی کے سامنے یوں نہ کرتی۔"

"اسی کی حالت دیکھ کر کبیر دادا نے کیا ردعمل ظاہر کیا۔"

"کھویا کھویا، گم سم لگ رہا تھا۔ اسے کمرے سے چلے جانے کا خود کہہ دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی کبھی دروازے کو گھورنے لگتا اور کبھی چھت کو۔ مجھ جیسی لڑکی گویا اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ پیسے والے مجھے ایک رات کے پندرہ سے بیس لاکھ ہنسی خوشی ادا کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ شراب کے رسیا نے وہسکی کے بھرے ہوئے گلاس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور پھر اس سے زیادہ دیر صبر نہ سکا۔ تمہارے سامنے غلط بیانی کرنے کے عوض تین ڈراموں میں مرکزی کردار حاصل کر کے دیا اور رخصت کر دیا۔"

"گویا میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔"

نگی صاف گوئی سے بولی۔ "سچ کہوں تو تم ابھی تک کبیر دادا کی حالت کا اندازہ لگا ہی نہیں پائے۔ اس نے

چند لمحے مجھے صرف تمھاری وجہ سے برداشت کیا ورنہ وہ کبھی بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیتا۔"

"ہونہہ!" گہرا سانس لیتے ہوئے پاشا نے کہا۔ "جانتا ہوں۔ کبیر دادا کے نزدیک میری حیثیت چھوٹے بھائی کی سی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں انھیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ معصوم کمینی بھابی انھیں برباد کر دے گی اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"بات بہت بڑھ گئی ہے پاشا!..... اب اس مسئلے کا سادہ حل یہی ہے کہ کبیر دادا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔" نگی نے معقول مشورہ دیا۔

"نہیں ایک اور حل بھی ہے۔" پاشا نے ہاتھ میں تھامے گلاس سے باقی ماندہ شراب حلق میں انڈیلی اور جانے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔

وہ اس کی تقلید میں اٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ سوچ رہے ہو کہ کسی خوب صورت لڑکی کو بھیج کر کبیر دادا کے دل سے اس کی محبت نکال دو گے تو غلطی پر ہو۔"

پاشا نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی اسے رخصت کرنے ساتھ چل پڑی تھی۔ ڈرائینگ روم کے دروازے کے ساتھ رکتے ہوئے پاشا پیچھے مڑا۔ "ویسے کیا خیال ہے، اگر وہ معصوم کمینی ڈائن بھابی نہ رہے تو کبیر دادا کتنے دنوں میں سنبھل جائیں گے۔"

"کک..... کیا مطلب؟" نگی ہکلا گئی تھی۔

پاشا ہنسا۔ "اب موت تو کسی کو کسی بھی وقت آ سکتی ہے نا۔"

"اگر کبیر دادا کو معلوم ہو گیا کہ اس کا قاتل کون ہے تب؟" یقیناً نگی، تناوش کی موت کے حق میں نہیں تھی۔ وہ معصوم، گڑیا سی لڑکی اسے بھی بہت پیاری لگی تھی۔

پاشا تیقن سے بولا۔ "زیادہ عرصے خفا نہیں رہ سکیں گے خاص کر اس صورت میں جب انھیں اچھی طرح معلوم ہو گا کہ یہ قدم ان کی بہتری کے لیے اٹھایا گیا ہے۔"

"کوئی اور حل؟" نگی واضح مخالفت نہیں کر سکتی تھی۔

"میں فضول سوچوں میں دماغ نہیں تھکاتا۔" کہتے ہوئے پاشا چل پڑا۔

''اور ہاں۔'' کار کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اگر کبیر دادا کو یہ بات اس کمینی لڑکی کی موت سے پہلے معلوم ہو گئی، تب بھی ایک لڑکی مرے گی ضرور اب یہ خود سوچ لینا کہ کس لڑکی کی جان تمھارے لیے قیمتی ہے۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے کار آگے بڑھا دی۔ وہاں وہ اپنے محافظوں اور ڈرائیور کے بغیر ہی آیا تھا۔ کیونکہ کبیر دادا کے معاملے میں وہ اپنے آدمیوں پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

نگی پریشان نظروں سے اسے گھورتی رہ گئی۔ تناوش کو بچانے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، کہ اس کے نزدیک اپنی جان تناوش سے کئی گنا اہم تھی۔ بلکہ اپنی جان کا کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کرنا ایک مذاق ہی تو تھا۔

☆.....☆.....☆

ایس پی ضمیر حسین، نوشاد آفریدی اور اخلاق حسین کو گزشتہ دن کبیر دادا سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں کہہ رہا تھا۔ ''جلد سے جلد اسے لگام ڈالنے کی کرو ورنہ وہ ہم سب کو برباد کر دے گا۔''

''اتنا پھنے خان بھی نہیں ہے۔'' نوشاد آفریدی نے منہ بنایا۔

''آفریدی صاحب، بڑھکیں مارنے سے کام نہیں بنتا۔ اس دن اس نے ایک ہاتھ سے تمھیں زمین سے اٹھا کر دیوار سے لگا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے شہاب قصوری اور بابر حیات نے تمھیں اس کی گرفت سے آزاد کرایا تھا۔''

نوشاد آفریدی کھسیاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

ایس پی بغیر لگی لپٹی بولا۔ ''تو کس سے ڈریں، شاہ صاحب کو اس کی رکھیل سے معافی مانگنے کا مشورہ تو تم نے بھی دیا تھا۔ ایک گینگ کا سربراہ اسکول کی لڑکی سے معذرت کرتا پھر رہا ہے کیا یہ کبیر دادا کے ڈر کی وجہ سے نہیں تھا۔''

نوشاد آفریدی نے دانت پیسے۔ ''اس کا حساب کبیر دادا کے ذمہ بقایا ہے۔''

''تم لوگ بس زبانی جمع خرچ کرتے رہنا اور وہ من مانیاں کرتا رہے گا۔ شمشیر دادا، شہاب قصوری کو بڑا

بانٹ گیا تھا وہ خود کبیر دادا کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوتا ہے۔"

"تو کیا کریں۔" خاموش بیٹھے اخلاق حسین نے زبان کھولی۔

"یہی سوال میرا ہے۔" ایس پی نے سر پیٹا۔ "ایک اور شمشیر دادا کے استقبال کے لیے تیار رہو۔ تمھاری آمدن کا آدھا حصہ بغیر کسی محنت کے اس کی جیب میں جائے گا، اس سے پوچھے بغیر کوئی نیا کام دھندہ شروع نہیں کر سکو گے اور یاد رکھنا یہ جو اسکول کی چھوکری ہے نا تمھاری بیگمات اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی دکھائی دیں گے۔ اور اس کی آمد پر ہمیں کرسی چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

"وہ تو بس میرے بستر کی زینت بنے گی۔" نوشاد آفریدی تپتے ہوئے بولا۔

ایس پی استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اتنی جرات ہے کسی میں کہ اسے چھو سکے۔"

نوشاد آفریدی شاکی ہوا۔ "یار، تم مسلسل ہماری توہین میں لگے ہو۔"

"ہاں۔" ایس پی اثبات میں چیخا۔ "کیوں کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔ میں تمھاری اور اپنی آزادی چاہتا ہوں۔ ایس پی ہونے کے باوجود تھانیدار مجھ سے زیادہ کبیر دادا سے خوف کھاتے ہیں۔ مجھے یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ جلد از جلد اس کا بندوبست نہ کیا گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔"

اخلاق حسین نے مشورہ دیا۔ "اگر کاشف راجپوت اور پاشا کو ساتھ ملا لیں تو اس سے مقابلہ کرنا مشکل نہیں رہے گا۔"

"خواب دیکھنا بند کر دو۔ کبیر دادا کی طرف چلنے والی گولی کے سامنے پاشا اپنا سینہ تاننے سے بھی نہیں ہٹے گا۔ کاشف راجپوت کو بھی اس سے توڑنا مشکل ہے۔ وہ بہت پرانے دوست ہیں۔ اور کبیر دادا سے جو خطرات ہمیں محسوس ہو رہے ہیں اس میں کاشف راجپوت اور بہرام پاشا کے فائدے پوشیدہ ہیں۔ وہ کبھی بھی اس کے خلاف نہیں ہوں گے۔"

"اگر پاشا کو سربراہی کا لالچ دیا جائے تو.....؟" اخلاق حسین اپنی بات پر قائم تھا۔ "اقتدار کا لالچ تو بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل کروا دیتا ہے۔"

"اقتدار ہے کس کے پاس جو پاشا کو لالچ دیا جائے۔ کبیر دادا صرف لڑائی بھڑائی کا ماہر نہیں ہے لومڑ کی

طرح چالاک بھی ہے۔اپنے گینگ میں موجود طاقت ور آدمی کو اس نے بغیر دیر لگائے علاحدہ گینگ بنا کر دے دیا ۔گو پاشا جسمانی لڑائی میں اس سے کم تر ہے، مگر کبیر دادا جانتا تھا کہ ایک دن وہ پاشا سے کمزور ہو جائے گا اور اس وقت شاید پاشا اقتدار کی ہوس میں اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔اس لیے اس نے پہلے سے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا۔اور پاشا کو مزید زیر بار بھی کر دیا۔"

"میرا مطلب ہے ہم پاشا کو کہہ سکتے ہیں کہ کبیر دادا کے خاتمے کے بعد ہم تمام اسے شہاب قصوری کی جگہ سربراہ بنالیں گے۔" اخلاق حسین نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"ہونہہ!.....اور وہ ہماری بات پر یقین کر لے گا۔عقل کے دشمن ہم یہاں تین سربراہ بیٹھے ہیں۔پاشا ہم تین پر تو یقین کر کے کبیر دادا کے خلاف محاذ میں شامل نہیں ہوگا نا۔"

"تمھارا مطلب ہے ہمیں باقیوں کو ساتھ ملانا پڑے گا۔" اخلاق حسین نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

ایس پی نے اثبات میں سر ہلایا۔"ہاں، مگر پاشا کسی صورت کبیر دادا کے خلاف کام نہیں کرے گا، الٹا ہمارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔"

"آخر تم لوگ شمشیر دادا کو بلانے کی کوشش یوں نہیں کرتے۔" نوشاد آفریدی نے کئی بار دیا ہوا مشورہ دہرایا

ایس پی نے منہ بنایا۔"کیا کہہ کر بلاؤ گے کہ کبیر دادا نے اخلاق حسین شاہ کی توہین کی ہے اور وہ یہاں آ کر کبیر دادا کو قتل کر کے چلا جائے گا۔"

"اس کے ساتھ یہ بھی کہ وہ شہاب قصوری کی جگہ لینا چاہتا ہے۔جب تمام اس کے خلاف گواہی دیں گے تو یقیناً شمشیر دادا اسے سزا سنائے بغیر نہیں ٹلے گا۔" نوشاد آفریدی نے اپنے مشورے کی تائید میں دلیل دی۔

"کون سے تمام اس کے خلاف گواہی دیں گے۔زیادہ سے زیادہ اگر سارے متفق ہو سکتے ہیں تو اس بات پر کہ کبیر دادا نے شاہ جی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ورنہ فصیح الدین عرف فاصی ہتھ چھٹ کے ساتھ کبیر دادا کی اچھی خاصی تو تو میں میں ہوئی ہے مگر وہ بھی کبیر دادا کے خلاف اس حد تک جانے کو تیار نہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے ۔تم لوگوں کے قائم کیے ہوئے مقدمے پر بہت ہوا تو شمشیر دادا اسے تنبیہ کر دے گا۔ہمارا مسئلہ پھر بھی حل ہوتا نظر نہیں آتا۔خاص کر تم دونوں تو یونہی اس کی رکھیل پر رالیں ٹپکاتے رہ جاؤ گے۔" ایس پی نے حقائق کا پٹارہ کھولا۔

”یار، تمھاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں اور ہماری عقل تو اس معاملے میں جواب دے گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کیا جائے۔“ اخلاق حسین نے شکست تسلیم کرنے میں عافیت سمجھی تھی۔ نوشاد آفریدی کا بے بسی کے اثرات سے پر چہرہ بھی اس سے متفق نظر آرہا تھا۔

”میں جانتا تھا آخر یہی سننے کو ملے گا، لیکن میں تم دونوں کی طرح سویا ہوا نہیں ہوں۔ مجھے فکر ہے اور اس کی رکھیل کی آمد سے پہلے ہی مجھے کبیر دادا کھل رہا ہے۔ اور اب اس نے ایسے مواقع فراہم کر دیے ہیں کہ ہم اسے مزید الجھا سکیں۔ یاد رکھنا چالاک، عیار اور طاقت مرد بھی اگر مار کھاتا ہے تو کسی نازک اندام عورت کے ہاتھوں۔ پیار، محبت اور عشق وغیرہ ایسی لاعلاج بیماری ہے جو انسان کی صلاحیتوں کا بیڑا کر دیتی ہے۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بس اسی شخصیت کے گرد گھومتی رہتی ہیں جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ اور خوش ہو جاؤ کہ کبیر دادا کو یہ بیماری لگ گئی ہے۔ وہ چھوٹی سی چھوکری اس خبیث کے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ اس معاملے میں اس کا چہیتا پاشا بھی بہت پریشان ہے۔ شاہ جی کے ہاں پارٹی کے موقع پر میرے آدمی نے پاشا اور کاشف راجپوت کی باتیں سنی ہیں۔ پاشا کا موقف اس بارے بالکل واضح ہے وہ کبیر دادا کو اس چھوکری سے دور کرنے کی کوشش میں ہے۔ گزشتہ رات کبیر دادا کی پرانی منظور نظر نگی بھی اس کی کوٹھی میں جاتی دیکھی گئی لیکن ایک گھنٹے بعد ہی وہ واپس جا رہی تھی۔ چاہے اس کی آمد کا جو بھی مقصد ہو، مگر کبیر دادا، نگی جیسی لڑکی کے ساتھ رات گزارے بغیر اسے نہ جانے دیتا پر اس نے ایسا کچھ نہ کیا، کیوں کہ وہ خبیث اس چھوکری پر بری طرح فریفتہ ہے اور اس کی اسی کمزوری کو ہم اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔“

”کیسے؟“ دونوں بیک زبان مستفسر ہوئے۔

ایس پی فخریہ لہجے میں بولا۔ ”اس کیسے کی تلاش میں جانے کب سے اس خبیث کی نگرانی کروا رہا ہوں۔ یقیناً اس پر ہاتھ ڈالنا نہایت مشکل تھا لیکن اب اس نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ اگر یہ رکھیل اس کی زندگی میں نہ آتی تو شاید میں یہ منصوبہ نہ بنا پاتا۔“

”اب پھوٹ بھی دو۔“ نوشاد نے بے صبری کا اظہار کیا۔ اخلاق حسین بھی اشتیاق آمیز نظروں سے ایس پی کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم دونوں جانتے ہو کہ فصیح الدین شمشیر دادا کا ماموں زاد بھائی ہے۔"

اخلاق حسین بولا۔ "اتنا تو معلوم تھا کہ فصیح الدین، شمشیر دادا کا رشتہ دار ہے مگر رشتے کی نوعیت جاننے کی زحمت میں نے کبھی نہیں کی۔" نوشاد نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اخلاق سے اتفاق کیا تھا۔

"چلو میں نے بتا دیا ہے نا، اب منصوبہ یہ ہے کہ اگر کبیر دادا فصیح الدین کو اپنی رکھیل کی وجہ سے قتل کر دیتا ہے تو ہمیں شمشیر دادا کو بلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی بس اس تک یہ اطلاع پہنچانے ہی سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"بہت اچھی سوچ ہے، مگر یہ ہوگا کیسے۔ یونہی خواہ مخواہ تو کبیر دادا اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانے والا۔"

ایس پی معنی خیز انداز میں بولا۔ "اگر فصیح الدین اس کی لاڈلی کو اغوا کر کے اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہو اور کبیر دادا عین موقع پر پہنچ جائے تو اندازہ لگاؤ کیا ہوگا؟"

نوشاد نے کہا۔ "سوال تھا کہ یہ ہوگا کیسے؟"

"فصیح الدین عرف فاسی ہتھ چھٹ ہر شب اتوار اپنی ایک مخصوص کوٹھی میں گزارتا ہے۔ جو اس کا خفیہ عیاشی کا اڈہ ہے۔ رات کے آٹھ بجے ہی وہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے خاص آدمی نے وہاں پہلے سے ایک خوب صورت لڑکی پہنچائی ہوتی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں اس نے ایک اتوار کی شب بھی ناغہ نہیں کیا۔"

"تو....." وہ دونوں ابھی تک بھی اس کی بات نہیں سمجھے تھے۔

"اگر کبیر دادا کی رکھیل کو فصیح الدین کی کوٹھی میں پہنچا دیا جائے اور پھر کبیر دادا کو مطلع کر دیا جائے کہ اس کی چھمک چھلو اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے....." ایس پی نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اخلاق حسین جھلا کر بولا۔ "یار پولیسیئے میں دیوار کو ٹکر مار دوں گا..... اتنا سسپنس پھیلانے کے بہ جائے اگر مکمل منصوبہ ایک ہی بار بیان کر دو تو شاید ہمارے دماغوں پر اتنا بوجھ نہ پڑے۔"

ایس پی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اچھا سنو..... کبیر دادا کی لاڈلی ہر دوسرے تیسرے دن کبیر دادا کے گھر سے نکلنے کے بعد ماں کو ملنے اپنے گھر جاتی ہے۔ اور اس کی آمد سے پہلے واپس آ جاتی ہے۔ گھر جاتے ہوئے اس کے ہمراہ صرف ڈرائیور ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی اسے گھر چھوڑ کر واپس آ جاتا ہے۔ اس وقت اسے اغواء

کر کے فصیح الدین کے عیاشی کے اڈے پر پہنچانا نہایت آسان ہوگا....."

ضروری تو نہیں کہ وہ ہفتے کے دن ماں کو ملنے جائے۔" نوشاد آفریدی نے قطع کلامی کی۔

"کیا میری بات مکمل ہوگئی ہے۔" ایس پی خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"معذرت....." نوشاد نے فوراً ہاتھ بلند کر کے غلطی تسلیم کر لی تھی۔

"خیر میرا کہنے کا مطلب ہے وہ کبھی تو ہفتے کے دن جائے گی ہم اسی دن منصوبہ طے کر لیں گے۔ اور اگر تم دونوں سے صبر نہیں ہو سکتا تو اس ہفتے کو اس کی ماں سے کال کروا کر بھی اسے بلوایا جا سکتا ہے۔ اب اس کی ماں کو کیسے مجبور کیا جائے گا یقیناً اس بارے تمھیں معلوم ہوگا۔" ایس پی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یا یہ بھی بتا دوں۔"

اخلاق حسین نے کہا "سمجھ گئے، آگے چلیں۔" نوشاد نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بس اس رکھیل کے موبائل فون سے کبیر دادا کو میسج کر دیں گے کہ وہ رات کو ذرا دیر سے لوٹے گی۔ تاکہ کبیر دادا وقت سے پہلے ہی نہ بھاگتا پھرے۔ اور جس وقت فاضی صاحب کوٹھی میں داخل ہو جائے گا تب کبیر دادا کو کال کر کے بتا دیا جائے گا کہ اس کی لیلیٰ اغواء ہو چکی ہے۔ اغواء کرنے والے کا نام اور مقصد کیا ہے اور وہ کس جگہ موجود ہے۔ باقی کا کام وہ خبیث خود کرتا رہے گا۔" ایس پی نے مکمل منصوبہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"ایک سوال ہے۔" نوشاد نے اسکول کے بچوں کی طرح ہاتھ اٹھایا۔ اور ایس پی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یقیناً اس سے پہلے فصیح الدین کے پاس پہنچائی جانے والی لڑکیاں اپنی مرضی سے اور منہ مانگا معاوضا وصول کر کے وہاں آتی ہوں گی۔ کیا ایک بندھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران نہیں ہوگا۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ کبیر دادا کی رکھیل اسے دیکھتے ہی ہنستی مسکراتی اس کے گلے لگ جائے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں ضرور اسے اغواء کرانے کی کوشش کرتا۔ ہم جتنا بھی اس کی کردار کشی کریں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک گھریلو سادہ اور معصوم سی لڑکی ہے۔ شاہ جی کے گھر ہونے والی تقریب اس کا بھرپور جائزہ لے چکا ہوں، پوری تقریب میں میں نے اسے کسی غیر مرد سے بات کرتے تو کجا صرف متوجہ ہوتے بھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح فصیح الدین، فاضی ہتھ چھٹ کے نام سے مشہور ہے اور اچھا خاصا لڑاکا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ کبیر دادا ہی کو پچھاڑ دے۔"

"دنیا بہت ترقی کر گئی ہے آفریدی صاحب، آج کل ایسے نشے کا حصول کوئی مشکل کام نہیں جو آدمی کو بہ

ظاہر ہوش میں رکھتے ہوئے بھی ماحول کا ادراک نہیں ہونے دیتا۔ اور شراب کی خالی بوتل اور گلاس میز پر رکھ کر فصیح الدین کو یہ تاثر دیا جا سکتا ہے کہ اس کی آمد سے پہلے لڑکی نے کافی شراب نوشی کی ہے اس لیے ہوش مندی کی باتیں نہیں کر رہی۔ باقی فصیح الدین نے اسے کاروبار کے مشوروں کے لیے تو طلب کیا نہیں کہ اس کی ہوش مندی سے کوئی غرض رکھے۔ اور جہاں تک فصیح الدین کے کبیر دادا سے ٹکرانے کا مسئلہ ہے تو اس جیسے دس کے لیے بھی کبیر دادا کافی ہے۔ فاصی ہتھ چھٹ وہ چھوٹے موٹے غنڈوں کے لیے ہے۔ کبیر دادا کے لیے وہ کم سن بچے جتنی اہمیت رکھتا ہے۔ سچ کہوں تو کبیر دادا کو اگر کوئی قابو کر سکتا ہے تو وہ شمشیر دادا ہے اور کوئی نہیں۔"

نوشاد نے منہ بنایا۔ "بھاڑ میں جائے کبیر دادا، تم یہ بتاؤ اگر فصیح الدین نے اس کی رکھیل کو پہچان لیا پھر بھی مشکل ہو جائے گی۔ کیا وہ سوچے گا نہیں کبیر دادا کی رکھیل کا وہاں کیا کام۔"

ایس پی اطمینان سے بولا۔ "میرا خیال ہے فصیح الدین نے اب تک اسے نہیں دیکھا۔ شاہ جی کے گھر تقریب میں بھی اس کی بیوی اکیلی آئی تھی، اس نے کسی کام کی وجہ سے آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اور فرض کیا اس نے کبھی دیکھا بھی ہو تو سرسری نظر ڈالی ہو گی۔ یوں بھی اس رکھیل نے اپنا جسم یوں ڈھانپا ہوتا ہے جیسے ابھی نماز پڑھ کر آ رہی ہو۔ اور ایسی لڑکی جب بے لباس بستر پر پڑی ہو گی تو فصیح الدین بے چارے کو کون سی مشابہت مشکوک کرے گی۔"

"فصیح الدین کے لیے جو دلال لڑکیاں سپلائی کرتا ہے اس کا کیا؟" نوشاد کے سوالات جاری رہے۔

"وہ دلال نہیں دلالہ ہے اور لڑکی کو مطلوبہ کوٹھی تک پہنچانے کی ذمہ داری جس آدمی کو ملی ہوئی ہے اسے خریدنا ایک ایس پی کے لیے چنداں دشوار نہیں۔"

"وہ بعد میں بھانڈا ابھی تو پھوڑ سکتا ہے۔" نوشاد چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کر رہا تھا کہ معاملہ کبیر دادا جیسے موذی کا تھا۔

"صحیح کہا..... ایسے آدمی کبھی کبھار مسائل کھڑے کر دیتے ہیں اگر زندہ رہیں تو۔"

آخر میں نوشاد آفریدی کو تحسین آمیز لہجے میں کہنا پڑا۔ "کیا سارے ایس پی ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ایس پی ضمیر حسین فخریہ لہجے میں بولا۔ "اگر سارے ایسے ہوتے تو انھوں نے بھی اپنے گینگ بنا رکھے

ہوتے۔"

اخلاق حسین نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔"ویسے تم نے فصیح الدین اور کبیر دادا کے متعلق اتنی معلومات جمع کر رکھی ہے کیا باقیوں کے بارے بھی اتنے ہی باخبر رہتے ہو۔"

ایس پی نے قہقہہ لگایا۔"اگر باخبر نہ ہوتا تو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ تم دونوں کبیر دادا کی رکھیل پر بری طرح فریفتہ ہو۔"

وہ دونوں اس کے ساتھ ہی ہنس پڑے تھے۔

"مزید کوئی سوال؟" ایس پی کا انداز انھیں تحریک دینے والا تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ انھیں وہ منصوبہ مکمل طور پر قابلِ عمل لگ رہا تھا۔ دونوں کا سر نفی میں ہل گیا۔

"تو اس سنیچر کو منصوبے پر عمل کیا جائے گا یا انتظار کرو گے کہ وہ چھمک چھلو کب ہفتے کے دن گھر جاتی ہے۔"

اخلاق حسین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔"انتظار نام کی چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔" نوشاد آفریدی بھی اس سے متفق نظر آ رہا تھا۔ جبکہ ایس پی یوں بھی کب سے کبیر دادا کی جڑ کاٹنے کے منصوبوں میں جڑا تھا۔

وہ منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ ایس پی نے کوئی جزئیہ بھی فروگزاشات نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ مل کر کارروائی کی ترتیب طے کرتے ہوئے منصوبے کو حتمی شکل دینے لگے۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت خوب صورت صبح تھی۔ کبیر دادا ساڑھے نو دس بجے جاگا کرتا تھا۔ مگر تناوش نے نماز پڑھ کر ہی اس کے ساتھ اٹھکیلیاں شروع کر دی تھیں۔ دو تین دفعہ تو اس نے۔

"سونے دو یار۔" کہہ کر تناوش کی پیش قدمی اور جارحیت کو روکنا چاہا مگر پھر ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ایک لاڈلی محبوبہ کی طرح اسے چھیڑتی رہی۔

"اب کیا مسئلہ ہے؟" تنگ آ کر وہ اس کی جانب کروٹ لے کر پوچھنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں، بس بور ہو رہی تھی سوچا تھوڑی باتیں کر لیں۔"

"تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس وقت سوتا ہوں۔"

”رات آپ کو دس بجے سلا دیا تھا، میں اس کے بعد بھی کافی دیر جاگتی رہی اور اب بھی آپ سے کافی پہلے جاگی ہوں۔ آپ کی نیند ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔“

”کیوں کہ میں نے سارا دن مصروف رہنا ہوتا ہے جبکہ تم میرے جاتے ہی سو سکتی ہو۔“

تناوش نے منہ بسورا۔ ”ہاں جیسے آپ کی غیر موجودی میں مجھے نیند آ جاتی ہے نا۔“

”کیوں نہیں آتی۔“ کبیر دادا بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ شرما گئی تھی۔

”جھوٹی۔“ کبیر دادا نے اسے چھیڑا۔ ”کل جب میں لوٹا تو تم بے خبر سو رہی تھیں۔“

تناوش کا نقرئی قہقہہ گونجا۔ ”توبہ ہے، یہ لڑکا بھی کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں گنتا ہے۔“

”پھر وہی بدتمیزی۔“ کبیر دادا نے خفگی ظاہر کی۔

”بدتمیزی نہیں کرتی، جو محسوس ہوتا ہے کہہ دیتی ہوں۔“ وہ اس کی ناک کی پھننگ پکڑ کر مروڑنے لگی۔

”کسی دن اتنی مار کھاؤ گی کہ سارا شرارتیں بھول جائیں گی۔“

”اچھا کتنی.....“ اس نے شوخ نظریں گھما کر شرارتی لہجے میں پوچھا۔

”وقت آنے پر پتا چل جائے گا۔“

”جھوٹا۔“ وہ ہنستے ہوئے اس کے پیٹ میں گدگدی کرنے لگی۔ کبیر دادا بھی بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اور پھر اسے معلوم ہی نہ ہوا اس کھٹی میٹھی نوک جھوک میں گھڑی کی سوئیاں دس کا ہندسہ عبور کر کے آگے بڑھ گئی تھیں۔ تناوش کی باتیں ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں اور کبیر دادا جیسے خاموش طبع نے بھی جانے اتنی باتیں کیسے کر لی تھیں۔ اور اب بھی اس کا جی نہیں بھرا تھا۔ کسی کا ساتھ اتنا خوش کن، اتنا لذت بھرا، اتنا پر لطف بھی ہو سکتا تھا یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ خود پر جبر کر کے وہ بولا۔

”اچھا ناشتا لاؤ نا پھر جانا بھی ہے۔“

”آج نہ جائیں نا۔ تھوڑی دیر اور گپ شپ کر کے اکٹھے باہر جائیں گے۔ کھانا بھی باہر کھائیں گے۔ پھر مجھے شاپنگ کے لیے لے جانا۔ مجھے بہت سارا میک اپ کا سامان اور کپڑے خریدنے ہیں تاکہ میں روزانہ بجی

سنوری آپ کی آمد کا انتظار کیا کروں۔"

"تم میک اپ کے بغیر ہی ٹھیک لگتی ہو۔"

وہ تنک کر بولی۔ "نہیں لگتی ٹھیک، اگر لگتی تو کل وہ پرکٹی کبوتری یہاں نہ آئی ہوتی۔"

کبیر دادا ہنسا۔ "تو تمھارا خیال ہے وہ اس لیے آئی تھی کہ تم میک اپ نہیں کرتی ہو۔"

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ "ہاں..... ہاں..... ہاں میں آپ کو اچھی لگنا چاہتی ہوں، خوب صورت لگنا چاہتی ہوں، اتنی پیاری کہ آپ میرے علاوہ کسی کی طرف دیکھیں بھی ناں۔"

"ہے نا بے وقوف، پیار الگنا سجنے سنورنے کے مرہون منت تو نہیں ہوتا۔"

"آپ نے شاپنگ پر لے جانا ہے یا نہیں۔"

"مجھے بہت کام ہیں، تم ڈرائیور کو ساتھ لے جا کر شاپنگ کر آنا۔"

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ "آپ کے علاوہ کسی کے ساتھ بھی نہیں جا سکتی۔"

"خیر میں نہیں جا سکتا۔" حتمی انداز میں کہتے ہوئے وہ بستر چھوڑ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی تک اپنی عزت گنوانے کا حوصلہ اس میں نہیں آیا تھا۔ یوں اس کے ساتھ بازار میں پھرنے کی خبر پر پاشا نے تو آسمان سر پر اٹھانا تھا ہی باقی آدمیوں کو بھی ہنسنے کا موقع ہاتھ آ جاتا۔ اتنی سوجھ بوجھ بہ ہر حال اس میں موجود تھی۔ اسی لیے اس نے تناوش کی محبت کے جواب میں اعتراف محبت نہیں کیا تھا کہ پھر اس کی فرمائشیں اور زیادہ بڑھ جاتیں۔ ذرا سی توجہ دینے ہی پر اس کی جارحیت اور نخرے اتنے بڑھ گئے تھے، تو اعتراف محبت کے بعد تو وہ قابو ہی میں نہ آتی۔ وہ جتنی معصوم اور سادہ نظر آتی تھی اتنی تھی نہیں۔ پاشا کے بہ قول وہ چار سوبیس اسے انگلیوں پر نچائے گی اور اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کبیر دادا کی طرف سے ذرا سی ڈھیل ملنے پر وہ اچھی خاصی سر پر سوار ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تو تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی اسے جگا دیا تھا اور پھر یونہی لیٹے لیٹے دن بھر کا پروگرام بھی ترتیب دے دیا تھا گویا کبیر دادا فارغ ہی تو بیٹھا تھا۔ کہتے ہیں محبت میں کئی مراحل آتے ہیں، جس میں آخری مرحلہ ہوش و حواس کھو دینے کا ہوتا ہے۔ اور کبیر دادا فی الحال ہوش و حواس سے بے گانہ ہونے کے مرحلے تک نہیں پہنچا تھا۔ کیوں کہ اپنا اچھا برا ابھی تک اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

وہ ناراضی بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔کبیر دادا کے غسل خانے میں گھستے ہی اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بیڈ سے اٹھ کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔کبیر دادا کے پہننے کے لیے اس نے سوٹ الماری سے نکال کر باہر لٹکایا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

کبیر دادا کے تیار ہونے تک وہ ناشتا لے آئی تھی۔اسے مسلسل خاموش پا کر کبیر دادا پوچھے بنا نہیں رہ پایا تھا

"لگتا ہے ایمونیشن ختم ہو گیا ہے جو کلاشن کوف کی طرح تڑتڑ کرتی زبان چپ ہے۔"

وہ دکھی لہجے میں بولی۔"آپ کی شان میں تو فرق آجائے گا نا مجھے شاپنگ پر لے جاتے ہوئے۔"

"بالکل۔" کبیر دادا نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

وہ پھر منہ پھلا کر خاموش ہو گئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اس کی ٹائی باندھنے لگی۔ایسا کرتے ہوئے نہ تو وہ کبیر دادا سے آنکھیں ملا رہی تھی اور نہ چہرے پر ہنسی ہی کی کوئی رمق موجود تھی۔اس کا ناراضی سے پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر کبیر دادا مسکرانے لگا تھا۔اچانک اس کے دل میں شدت سے خواہش جاگی کہ اپنے سارے کام ملتوی کر کے تناوش کو شاپنگ پر لے جائے۔کتنی معصومیت اور چاہت سے کہہ رہی تھی کہ آپ کے لیے سجا سنورا کروں گی۔یقیناً نگی کی بھرپور سجاوٹ اور میک اپ دیکھ کر اسے بھی اسی کی طرح سجنے کا شوق چرایا تھا۔

"اگر سادگی میں اس کا یہ حال ہے تو سجنے سنورنے کے بعد تو کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑے گی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے متعلق، اس کی باتوں کے متعلق سوچنے لگتا۔

ٹائی باندھ کر وہ حسب معمول منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اس پر پھونکنے لگی۔

"اب جاؤں۔"

"جلدی آنا۔" آہستہ لہجے میں کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔اس کا دکھی لہجہ سن کر کبیر دادا کو کچھ ہونے لگا تھا۔ایک دم اس سے رخ پھیرتے ہوئے وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔کار میں بیٹھ کر بھی اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔وہ جادوگرنی اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔

خفیہ اڈے پر پہنچے اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ تناوش کی کال آنے لگی۔وہ چاہ کر بھی اس کی کال کو نظر انداز

نہ کر سکا۔

''جی۔'' اس نے لہجے میں بے اعتنائی سمونے کی پوری کوشش کی تھی۔

''امی جان کی طبیعت خراب ہے، اگر اجازت ہو تو گھر سے ہو آؤں۔''

''چلی جاؤ، بلکہ ایسا ہے ایک دو دن ان کے پاس ہی گزار لو۔'' کبیر دادا اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ اسے تناوش کی اتنی بھی ضرورت نہیں تھی۔

وہ فوراً بولی۔ ''مم..... میں لوٹ آؤں گی نا۔ ماں جی کی طبیعت اتنی زیادہ بھی خراب نہیں ہے اور پھر آپ کو بھی تھوڑا مسئلہ بنے گا۔''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''مجھے کیا مسئلہ بنے گا، چھوٹا بچہ تو نہیں ہوں۔ تم سے پہلے بھی تو زندگی گزر رہی تھی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس کی بے اعتنائی پر وہ جیسے بجھ سی گئی۔

کبیر دادا اس کی جانب سے کسی شوخ اور شرارتی فقرے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ اس کا اداسی بھرا لہجہ اسے دکھی کر گیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اور ہاں الماری کی چابی یاد سے تپائی پر رکھ دینا۔''

''جی نہیں، ایک بوتل نکال کر ریک پر رکھ جاؤں گی، دوسری بوتل کل دوبارہ آ کر نکال کر پھر لوٹ جاؤں گی۔'' اس کے لہجے کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

اطمینان بھرا گہرا سانس لیتے ہوئے وہ بولا۔ ''جانتی ہو میں تمھیں مس مصیبت کیوں کہتا ہوں۔''

''اس لیے کہ میں ہوں ہی مصیبت۔'' اس کے نقرئی قہقہے نے کبیر دادا کی سماعتوں میں رس گھولا۔

اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم نمودار ہوا۔ ''شکر ہے تمھیں اتنا تو معلوم ہے۔''

وہ ناز سے بولی۔ ''نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں، میں بہت پیاری، خوب صورت اور اچھی لڑکی ہوں۔ اور ایسا ہی سب سمجھتے ہیں۔''

''ایسا سمجھنے والوں میں کم از کم میں شامل نہیں ہوں۔''

وہ فہمائشی لہجے میں بولی۔ ''جھوٹ بولنے سے اللہ پاک ناراض ہوتے ہیں۔''

وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”میرے باقی کام تو اللہ میاں کو بہت راضی کرنے والے ہیں نا۔“

وہ سرعت سے بولی۔ ”پریشان کیوں ہوتے ہیں، توبہ کا دروازہ تو ہر وقت کھلا ہے۔“

”گھر جانے کی اجازت لینے کو فون کیا تھا یا گپیں ہانکنے کو، خود تو فارغ ہوتی ہو کسی دوسرے کو کام کرنے دیا کرو۔“

”فارغ نہیں ہوتی جناب، پڑھائی کر رہی تھی۔ امتحان سر پر ہیں۔“

”جو کرنا ہے کرو، لیکن میری جان بخشی کر دو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بات کو طول دے رہا تھا۔ تناوش کی باتوں سے نہ جانے کیوں اسے سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس کی چند منٹ کی گفتگو نے جیسے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، اپنا کام کریں، دن کا کھانا یاد سے کھا لینا۔ اور رات کو جلدی سو جانا، ایک بوتل باہر رکھ جاؤں گی اسی پر اکتفا کرنا یہ نہ ہو کل کی طرح دو تین بوتلیں اور منگوائی ہوں۔ میں راحت خالہ سے پوچھیں گی، اگر ایسا کیا نا تو جتنی بوتلیں منگوائیں گے اتنے دن بغیر پیسے گزارا کرنا پڑے گا۔“

”تم نے کچھ زیادہ پر پرزے نکالنے شروع نہیں کر دیے۔“

”جی نہیں، مجھے تو بس آپ کی صحت کا خیال ہوتا ہے۔“

”میں خود رکھ سکتا ہوں، تمھیں بڑی اماں بننے کی ضرورت نہیں۔“

”پتا ہے جب آپ غصہ کرتے ہیں نا.....؟“ فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبیر دادا کے چہرے مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”اچھا ماں کے پاس جا رہی ہو، شاید علاج وغیرہ کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑ جائے اس لیے کچھ رقم ساتھ لیتی جانا۔“

”موبائل فون میں ایزی لوڈ کرانے کے لیے تو پچاس روپے ہیں نہیں، آپ سے بات کرنے کے لیے بھی کمپنی سے ادھار لیا ہوا ہے، ماں کے پاس کون سے چیک لے جاؤں۔“ وہ شرارتی انداز میں ہنسی تھی، کبیر دادا کو اس کے لہجے میں طنز، گلے یا استہزاء کی ہلکی سی آمیزش بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود وہ خفیف ہو گیا تھا۔

خواب گاہ کی دائیں دیوار میں جو شیر کی تصویر لگی ہے اس کے نیچے ایک تجوری موجود ہے جس کے تالے کا

نمبر تیس، تیئس، صفر، دو ہے۔ تجوری کھول کر جتنی رقم چاہیے ہو نکال لو۔"

اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ "مطلب دو دفعہ تین سو دو، آپ کی کار کا نمبر بھی یہی ہے نا۔"

کبیر دادا کو اس کا مشاہدہ کافی گہرا لگا۔ "ہاں اور اب مجھے کچھ کام کرنے دو خدا حافظ۔" یہ کہتے ہی اس نے تناوش کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

گزشتہ کل وہ کافی ضروری کام نبٹا چکا تھا۔ اور آج اس کا ارادہ جلدی گھر لوٹنے کا تھا مگر تناوش کے گھر چلے جانے کے بعد اس کا دل ہی نہیں کر رہا تھا گھر لوٹنے کو۔ سہ پہر کو اس نے پاشا کو کال کر کے اپنے پاس بلا لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"پاشا صاحب، کیا ہو رہا تھا۔"

"وہی روزمرہ کے کام۔"

کبیر دادا نے اشتیاق سے پوچھا۔ "نگی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"آپ کا کیا خیال ہے، میں اتنا بچہ ہوں جو اس کے جھوٹ کا اعتبار کر لوں گا۔" پاشا نے منہ بنایا۔ "ویسے بھی مجھے عظیم سے رات سوا نو بجے ہی اطلاع مل گئی تھی کہ نگی واپس چلی گئی ہے۔"

کبیر دادا بیزاری سے بولا۔ "یہ الو کے پٹھے میرے ملازم ہیں یا تمھارے۔"

"ان غریبوں کو اصل بات معلوم ہی نہیں ہے تو کیا رازداری رکھتے۔"

کبیر دادا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے کرسی کو عقبی دیوار کی جانب گھمایا اور عقب میں موجود کھڑکی پر دونوں پاؤں رکھتے ہوئے اقرار کیا۔ "پاشا، تناوش کے بارے تمھارا اندازہ ٹھیک تھا۔"

پاشا کے چہرے پر حیرانی ابھری۔ "کیا کہہ رہے ہیں دادا۔"

"سچ کہہ رہا ہوں یار، وہ لڑکی بری طرح میرے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔ اب اس کے بغیر میرا وقت نہیں گزرتا۔ گھر سے نکلتے ہی واپسی کے پل شمار نا شروع ہو جاتا ہوں۔ پاس ہوتی ہے تو اس کی آواز کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ دور جاتی ہے تو اس کی صورت نظروں میں گھومتی رہتی ہے۔ ہنستی ہے تو میرا دل کھل اٹھتا ہے، اداس ہو تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے، میرے جوتے جرابیں وہی اتارتی ہے،

ٹائی وہی باندھتی ہے، کیا پہنوں گا یہ وہ طے کرتی ہے، گھر سے نکلتے وقت پتا نہیں کون کون سی دعائیں پڑھ کر مجھ پر پھونکتی رہتی ہے۔ دروازے تک الوداع کرنے آتی ہے، واپسی پر دروازے ہی پر ملتی ہے۔ اور تم جانتے ہو گے کہ میں رات کو تین چار بوتلیں شراب کی پی جاتا کرتا تھا، اب ایک بوتل سے زیادہ نہیں پینے دیتی کبھی کبھی ایک بوتل بھی پوری نہیں پینے دیتی اور میں اس کی ہر بات مانتا چلا جاتا ہوں۔ کبھی بیزاری یا غصے کا اظہار کروں بھی سہی تو وہ میرے غصے کو بالکل خاطر میں نہیں لاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔" وہ پاشا کی طرف مڑا۔ "پاشا میں بروقت اندازہ نہیں کر پایا یار، میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ چھچھوندر کی طرح گلے میں اٹک جائے گی۔"

"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں یا مذاق اڑا رہے ہیں۔" پاشا کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

"مذاق تو میری زندگی بننے والی ہے یار، اگر اس کا کوئی مناسب حل نہ سوچا گیا تو میں تو گیا کام سے۔"

"مشکل کیا ہے دادا، کچھ دے دلا کر طلاق دو اور نکال باہر کرو ڈائن کو اپنی زندگی سے۔"

"اتنا آسان ہوتا تو میں تمہارے سامنے بے بسی کا اظہار کرتا۔ معلوم ہے کل رات نگی کی آمد پر میں نے اسے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے میں نگی کے ساتھ رات گزاروں گا۔ یقین مانو وہ بغیر کوئی تکرار کیے دروازے کی جانب چل پڑی اور دروازے پر رک کر اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر میری جانب دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اس کے بعد میرے حواسوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تمام شوق اور دلچسپیاں مجھے بھول گئے تھے۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں نے فوراً نگی کو چلتا کیا اور اسے واپس بلا کر گویا یہ اعتراف کر لیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکی ہے۔ میرے اظہار محبت نہ کرنے کے باوجود اسے معلوم ہو گیا ہے وہ میری کمزوری بن چکی ہے۔"

"میں آپ کو پہلے سے متنبہ کر چکا تھا دادا۔" پاشا شاکی ہوا۔

"نہیں۔" کبیر دادا نے نفی میں سر ہلایا۔ "سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے پہلی نظر میں اسیر کر چکی تھی، بس مجھے ہی یہ سمجھنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ پہلی بار وہ مجھے اس وقت نظر آئی جب نے میں جسٹس ظہیر امجد کو ایک ہوٹل سے باہر روکا۔ وہ ایک جانب کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ کالج کے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی مجھے بہت عجیب لگی۔ اور اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب وہ میری کوٹھی پر پہنچ گئی۔ عظیم جیسے تیز اور چالاک آدمی کو الو بنا کر مجھے

خواب گاہ سے بلوالیا۔اس وقت مجھے تھوڑا سا شبہ ہوا کہ شاید وہ جسٹس ظہیر امجد کی طرف سے بھیجی گئی ہے، مگر جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو پتا چلا کہ معاملہ کچھ اور تھا۔اسے ایک سڑک چھاپ غنڈے سے بھائی کی موت کا بدلہ لینا تھا۔اور پھر اس نے خود کو بہ طور رشوت پیش کیا بس شرط یہ رکھی کہ مجھے، اسے نکاح پڑھا کر گھر لانا ہوگا۔مجھے معلوم نہیں کہ میں کیوں اس کی ساری شرائط مانتا گیا۔اب معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اسی وقت میرے دل میں اتر چکی تھی۔بہ ظاہر میں ایک خوب صورت اور پرکشش لڑکی کو چند دن اپنے بستر کی زینت بنانے کے لیے گھر لا رہا تھا ،مگر در حقیقت میرے دل نے مجھے دھوکا دیا۔اور اب میں سمجھا ہوں تو کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"دادا، میں جانتا ہوں کہ آپ کے تجربے اور سمجھ داری کے سامنے میری حیثیت ایک بچے سے بڑھ کر نہیں ہے۔لیکن عورت کے معاملے میں آپ اتنا نہیں جانتے، کیونکہ اس سے پہلے آپ کا واسطہ ہی ایسی لڑکی سے نہیں پڑا۔البتہ میں جانتا ہوں، ان عورتوں کی چالوں، ڈھکوسلوں اور مکاریوں کو۔یہ ڈائن بس اپنا فائدہ دیکھ کر آپ کو چمٹتی ہے۔اس کمینی کا محبت جتانا، چاہت کا اظہار کرنا، خدمتوں سے متاثر کرنا، آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا وغیرہ، تمام عیاشی کے زندگی کے حصول کی کوشش ہے۔میں مانتا ہوں کہ آپ خوب صورت ہیں اور عورت ذات کے لیے کشش رکھتے ہیں، مگر آپ سے آدھی عمر کی ڈائن کا یوں ایک دم آپ کی محبت میں مبتلا ہو جانا، کوئی چال تو ہو سکتی ہے محبت نہیں ہو سکتی۔"

کبیر دادا نے اسے ڈانٹا۔"کتنی بار کہا ہے کہ اس کے لیے یوں گھٹیا الفاظ استعمال مت کیا کرو۔"

"سوری۔" پاشا کا ندامت ظاہر کرنا بالکل مصنوعی تھا۔

"کاش میں تمھارا اندازے کو صحیح مان سکتا۔" کبیر دادا کے لہجے میں شامل بے بسی پاشا کو پریشان کر گئی تھی۔

اس نے پوچھا۔"اچھا آپ چاہتے کیا ہیں۔"

"اس کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں، ہنستا مسکراتا اور قہقہے لگاتے دیکھنا چاہتا ہوں، دنیا کی تمام نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا ہوں اور جو وہ چاہتی ہے وہی چاہتا ہوں۔اور پتا ہے آج میں نے اسے خواب گاہ میں موجود تجوری کا نمبر بھی بتا دیا ہے کہ اسے جتنی رقم چاہیے ہو وہاں سے لے لیا کرے حالانکہ تجوری کے بارے میں نے آج تک تمھارے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں کیا۔"

"دادا آپ کو معلوم ہے کہ عورت ذات اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد کس طرح مرد کے پاؤں سے زمین کھینچتی ہے۔اس وقت وہ نہ جینے کے قابل رہتا ہے نہ مرنے "جوگا"۔اور یاد رکھنا جلد ہی آپ کی تجوری کو اس نے خالی کر دینا ہے۔خدارا اس وقت مجھے مورد الزام نہ ٹھہرا دینا کہ پاشا نے آپ کی تجوری خالی کی ہے۔"

"وہ بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔دھوکا دینا تو اس معصوم کو آتا ہی نہیں ہے۔یقیناً میں نے اس کی آنکھوں میں محبت اور چاہت کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔اس کی ہر ادا، ہر عمل چیخ چیخ کر اس کے دل میں چھپی محبت کا اعلان کرتا ہے۔"

پاشا نے دریافت کیا۔"اگر وہ ڈائن، میرا مطلب ڈائن بھابی، خود ہنسی خوشی آپ کو چھوڑ کر چلی جائے؟"

اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کبیر دادا نے کہا۔"اگر ایسا ہو جائے تو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

پاشا نے کہا۔"یاد رکھنا، مکرنے نہیں دوں گا۔"

"وعدہ رہا، مگر یہ خیال رہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔اسے ذرا سی خراش لگنا بھی مجھے گوارا نہیں۔"

"مگر مجھے یقین ہے کہ کمینی بھابی کو آپ کی موت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا، الٹا تر کہ ملنے کی خوشی میں ناچتی پھرے گی۔"

"بس اس کا یہ روپ مجھ پر آشکارا کر دو۔جتنی رقم خرچ ہوتی ہے پروا نہیں۔دولت، بنگلہ، کاریں جو چیز اسے چاہیے دے دو، بس وہ مجھے خود آ کر صرف اتنا کہہ دے کہ وہ طلاق چاہتی ہے۔اس کی آنکھوں میں موجود ہلکی سی ندامت سے مجھے سکون مل جائے گا۔اس کے بعد تم اسے کسی دوسرے شہر میں منتقل کرا دینا تاکہ وہ نوشاد آفریدی وغیرہ کی انتقامی کارروائی سے بچ جائے۔"

پاشا اطمینان بھرے یقین سے بولا۔"آپ فکر ہی نہ کریں، بس چند دن دیں، مجھے یقین ہے وہ منت کر کے اپنی جان چھڑائے گی۔"

کبیر دادا آنکھیں بند کر کے وہ فقرے تصور کی آنکھ میں لانے لگا جو تناوش نے اسے جان چھڑانے کے ضمن میں بولنے تھے۔اگر پاشا کے تئیں وہ اتنی ہی چالاک و مکار تھی تو لازماً اپنے عمل کی توجیہ اس کے پاس موجود ہوتی

۔مگر کوشش کے باوجود اسے تناوش کے منہ سے کوئی ایسا فقرہ ادا ہوتا دکھائی نہ دیا۔وہ پہلے کی طرح شوخی و شرارت بھرے انداز میں اس کا ساتھ مانگنے پر مصر نظر آ رہی تھی۔

اسے خیالوں میں گم پا کر پاشا خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

''ارے اتنی بیمار تو نہیں تھی کہ تم بھاگی چلی آئیں۔'' تناوش کو دیکھتے ہی بشریٰ کہنے لگی۔''وہ بے چارہ بھی سوچتا ہوگا اس لڑکی کو میکے کے علاوہ کوئی کام نہیں سوجھتا۔''

''اگر بلانا نہیں تھا تو طبیعت کی خرابی کا کیوں بتایا۔اب اتنی بھولی بن رہی ہیں۔'' وہ سرہانے کی جانب بیٹھ کر ماں کا سر دبانے لگی۔

''اطلاع دینے کا مطلب بلانا ہوتا ہے۔''

''ہاں ناں۔'' وہ ماں کے ماتھے پر جھک گئی۔

''اچھا اپنے ان سے پوچھا تھا یا ویسے ہی بھاگی چلی آئیں۔''

''پہلے دن بغیر بتائے آئی تھی، خفا ہو رہے تھے اب ضرور پوچھتی ہوں۔''

''تم پر صحیح رعب جمایا ہوا ہے۔اس کا مطلب ہے کافی اچھا آدمی ہے۔''

''وہ بہت اچھے ہیں ماں جی!.....ابھی پتا ہے اپنی تجوری کا نمبر بتا کر مجھے کہہ رہے تھے کہ جتنی رقم چاہیے ہو نکال لوں۔''

''تو تمھیں پیسے دینے سے وہ اچھا ہو گیا ہے۔'' بشریٰ نے منہ بنایا۔''شاپنگ کے لیے تو ساتھ لے جا نہیں سکا کبھی۔''

''ماں جی تنگ نہ کیا کریں۔''

''نہ مانو۔'' بشریٰ بے پروائی سے بولی۔

تناوش منہ ٹیڑھا کر کے بولی۔''ایک جھوٹی تسلی نہیں دے سکتی اور کہتی ہیں ماں نہیں سہیلی ہوں۔''

بشریٰ ہنسی۔''جھوٹ کا فائدہ۔''

''بس مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کوئی ان کے خلاف بات کرے۔''

''اچھا اب آ گئی ہو تو چائے ہی لے آؤ۔''

تناوش سر ہلاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

ماں کے لیے چائے بنا کر وہ گھر کے کام کرنے لگی۔ بشریٰ سو گئی تھی۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیٹتے ہی کبیر دادا کا وجیہہ چہرہ آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔

''کبھی تو مانیں گے کہ میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔'' خیالوں ہی خیالوں میں وہ اس سے ایسی باتیں کرنے لگی جو ابھی تک سامنے نہیں کر پائی تھی۔ رات کے کھانے پر اس نے ایک دو نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔

بشریٰ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''جی نہیں چاہ رہا ماں جی!''

بشریٰ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اس نے تو ڈٹ کر کھا لیا ہوگا۔''

''تو۔'' وہ چڑتے ہوئے بولی۔

''میری بلا سے۔'' ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بشریٰ کھانا کھاتی رہی۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اپنی اور ماں کی چارپائی اس نے صحن ہی میں لگائی تھی۔

''ماں جی، کیا مرد کبھی محبت کا اعتراف کرتے ہیں۔''

بشریٰ ہنسی۔ ''ہاں، جنھیں کسی سے محبت ہو جائے وہ ایک منٹ نہیں لگاتے۔ یہ تو ہے ہی مردوں کا شعبہ، عورت بے چاری تو بس شرما کر چہرہ جھکا لیتی ہے اور اس کا اظہار محبت ہو جاتا ہے۔''

''تو وہ کیوں اپنی محبت چھپاتے ہیں۔''

''اسے محبت ہوگی تو اظہار کرے گا نا۔'' بشریٰ نے اسے چھیڑا۔ ''ضروری تو نہیں کہ ہر خوب صورت لڑکی سے محبت ہو جایا کرے۔''

''وہ بس اپنی محبت چھپاتے ہیں، ورنہ میری ہر بات مانتے ہیں۔ بس تھوڑا سا بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔''

”صاف ظاہر ہے وہ تم سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔“

”آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“ اس نے خفا ہو کر ماں کی جانب پیٹھ موڑ لی۔

بشریٰ ہنسی۔ ”خفا کیوں ہو رہی ہو۔“

”آپ بس مجھے تنگ کر رہی ہیں۔“

بشریٰ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی، اس وجہ سے اسے معلوم ہی نہیں کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔“

”ہاں ناں، یہی بات ہے ماں جی۔“ اس نے فوراً ماں کی جانب رخ پھیرا۔

”تو تم کس کالج میں محبت کی کلاسیں حاصل کرتی رہی ہو۔“

”کک..... کیا مطلب؟“ وہ ہکلائی۔

”بالشت بھر کی ہو اور تمھیں محبتوں کے بارے خوب معلوم ہے، وہ تم سے دگنی عمر کا ہو کر کچھ نہیں جانتا ..... بڑی آئی محبت پڑھانے والی پروفیسر۔“ بشریٰ نے اسے لتاڑا۔

”سو جائیں ماں جی، مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ منہ بسورے لیٹ گئی۔

بشریٰ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”سچ سننا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔“

وہ چلائی۔ ”ابھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گی، سمجھیں آپ۔“

”ارے میری شہزادی خفا ہو گئی۔“ بشریٰ نے اسے پچکارا۔

”نہیں ہوں میں شہزادی۔ اگر خوب صورت ہوتی تو وہ یہ نہ کہتے کہ دو تین دن گھر پر گزار لو، انھیں ذرا بھی تو محبت نہیں ہے مجھ سے۔“

”ارے ایسا کچھ نہیں ہے، میں مذاق کر رہی تھی۔“ بشریٰ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کہاں ممکن ہے کہ میری شہزادی کسی کو پیاری نہ لگے۔“

”آپ بس مجھے جھوٹی تسلی دے رہی ہیں۔“

”اچھا، اگر آج رات اس کی کال آ گئی بے شک کچھ بھی کہے یا پوچھے، تب تو سمجھ لینا کہ وہ تم سے محبت کرتا

ہے اور تمھیں یاد کر رہا ہے۔ دوسری صورت میں تمھاری سمجھ میں آجانا چاہیے کہ دیوار سے سر پھوڑ رہی ہو۔"

اس نے فوراً تکیے کے نیچے رکھا موبائل فون اٹھا کر اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کی کال آنے کی دعائیں کرنے لگی گویا کبیر دادا کی کال نہ ہو محبت کرنے نہ کرنے کا فیصلہ ہو۔

بشریٰ کو نیند آنے لگی تھی، وہ سو گئی۔ مگر تناوش کال کے انتظار میں جاگتی رہی۔ ایک دو بار خود اس کا جی چاہا کہ کبیر دادا کو کال کرلے مگر پھر اس کے دل کا حال جاننے کی تمنا میں وہ کال نہ کرسکی۔ گاہے گاہے وہ موبائل کی سکرین جلا کر وقت بھی دیکھ لیتی۔ ہندسوں نے پونے دو ہونے کا اعلان کیا۔ ایک دم اس کا دل رونے کو کرنے لگا۔ اور اس پہلے کہ وہ باقاعدہ رونے کا آغاز کرتی اچانک اسے گلی میں کسی کار کی آواز سنائی دی۔

"کاش یہ اس کی کار ہوتی۔" اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔ اچانک کار اس کے گھر کے سامنے رکی گئی۔ تناوش کا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اسی وقت گلی میں کتوں کے بھونکنے کی زوردار آواز بلند ہوئی۔ بشریٰ کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ وہ نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھنے لگی۔ "یہ کم بخت اتنا زیادہ کیوں بھونک رہے ہیں۔"

"امی جان! کوئی کار دروازے پر آکر رکی ہے۔ اور مجھے شک ہے آپ کے داماد جی آئے ہیں۔"

بشریٰ نے منہ بنایا۔ "لوگ سوتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں، تم نے جاگتے ہوئے یہی کام کرنا شروع کر دیا۔"

اس سے پہلے کہ وہ ماں کی بات کا جواب دیتی، موبائل فون بجنے لگا تھا۔ سکرین پر کبیر دادا کا نام جگمگا رہا تھا۔ فوراً کال وصول کرنے کا بٹن دبا کر اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "جی۔" اس کے ساتھ ہی ایک ہاتھ سے دوپٹا اپنے سر پر ٹھیک کرتی ہوئی وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

شام کی آذان کے وقت کبیر دادا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آج نمازن پھر کہیں گئی تھی۔" امتیاز نے ساتھ بیٹھے بخش کو للکارا۔

"مہربانی۔" بخش نے منہ بناتے ہوئے انکار میں سر ہلایا اور امتیاز قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ڈرائیور نے اس کا

ساتھ دیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی کھوجتی نگاہیں ڈرائینگ روم کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔آج چوکھٹ پھر خالی تھی۔لیکن گزشتہ کل اسے کم از کم یہ امید تو تھی وہ خواب گاہ میں موجود ہوگی آج تو یہ سہارا بھی چھن گیا تھا۔صبح ناشتے کے بعد سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اس کے باوجود اسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

پرتعیش سجی سجائی خواب گاہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔صوفے پر بیٹھ کر اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔محبت بھرے انداز میں یہ کام کرنے والی اپنی گھر میں بیٹھی تھی۔

ٹائی اتار کر وہ بوٹوں کے تسمے کھولنے جھکا۔

''صبر کرو نا میں کھولتی ہوں۔'' اسے لگا وہ سامنے بیٹھی اسے ڈانٹ رہی ہے۔بوٹ اتار کر وہ کافی دیر صوفے سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا۔اسی دوران دستک دے کر راحت خالہ اندر داخل ہوئی۔

''صاحب جی کھانا لگاؤں۔''

''نہیں تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔کبیر دادا بھی تھکے تھکے انداز میں کھڑا ہو گیا۔قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے اس کے دماغ میں دوبارہ ایک منظر ابھرا جب تناوش کے بٹن کھولنے پر اس نے کہا تھا۔''یہ بٹن میں ڈریسنگ روم میں جا کر بھی کھول سکتا ہوں۔''

''ہاں، مگر اس پر وقت صرف ہوگا۔اور جب میرے جیسی پیاری بیوی موجود ہو تو آپ کو یہ سب کرنے کیا ضرورت ہے۔''

''آجاؤ نا، وقت تو میرا اب بھی ضائع ہو رہا ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

سوٹ اتار کر اس نے نیچے قالین ہی پر پھینک دیا تھا۔''خود ہی اٹھاؤ گی۔'' اس کے دماغ میں ناراضی بھری سوچ ابھری اور ٹریک سوٹ نکال کر پہننے لگا۔تناوش کی آمد کے بعد سے وہ ایک مرتبہ بھی ورزش نہیں کر سکا تھا حالانکہ ہفتے میں دو دن سخت قسم کی مشقیں کیا کرتا تھا۔اس مقصد کے لیے اس نے گھر کا ایک کمرہ بہ طور جمنازیم مختص کر رکھا تھا۔جہاں، ورزش مشینیں اور ڈمبل، باربل وغیرہ رکھے تھے۔

ٹریک سوٹ پہن کر اس نے تناوش کے کپڑوں کی الماری کھولی۔لمحہ بھر اس کے کپڑوں کو دیکھنے کے بعد وہ

باہر نکل آیا۔تھوڑی دیر بعد وہ Punching Bag پر مکے برساتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔گھنٹا ڈیڑھ جم میں گزار کر وہ باہر نکل آیا۔پسینہ خشک کر کے اس نے جوس پیا اور غسل خانے میں گھس گیا۔نہا کر باہر نکلا تو راحت خالہ ایک بار پھر کھانے کا پوچھنے آئی ہوئی تھی۔

"راحت خالہ تم آرام کرو میں باہر جا کر ہی کھالوں گا۔"

وہ جی صاحب۔" کر کے واپس مڑ گئی۔وہ بھی عظیم کو تیار ہونے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔خواب گاہ کے اندر اسے بالکل آرام نہیں آ رہا تھا۔

رات بارہ بجے تک وہ یونہی مختلف اڈوں پر جا کر وقت کاٹتا رہا۔آج باہر بھی وقت نہیں گزر رہا تھا۔حالانکہ اس سے پہلے ایک دو بجنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔اپنی خواب میں داخل ہو کر وہ ٹی وی دیکھنے لگا۔صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کی آنکھیں ریک کی جانب اٹھیں اس کے اوپر رکھی بوتل کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تبسم کھلنے لگا۔ٹی وی بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گیا۔تیز روشنی بجھا کر اس نے دھیما بلب جلایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔دن کو بھی وہ آرام نہیں کر سکا تھا۔لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔رہ رہ کر اس کی نظریں تناوش کی خالی پڑی جگہ کی طرف اٹھ جاتیں۔

"اس کے بغیر ایک ہی رات اس طرح گزر رہی ہے، ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی تب کیا ہوگا؟" ایک روح فرسا خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوا۔

"شاید اس کی اصلیت کھل جانے پر مجھے قرار آ جائے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی وہ نیند کی دیوی کو منانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔تناوش کی معصوم ادائیں، ناز نخرے، پیش قدمی اور جارحیت اسے بے طرح یاد آ رہی تھیں۔سر کے بال ملائم انگلیوں کے لمس کو ترس رہے تھے۔

"میں اس کا عادی نہیں ہوں۔" اس نے پہلی بار یہی کہہ کر اس کے ہاتھ کو دور دھکیلا تھا۔

کتنے بھول پن سے اس نے کہا تھا۔"تو عادت ڈال لیں نا۔" اور اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب وہ عادی ہو گیا۔

جب کافی کوششوں کے بعد بھی نیند نہ آئی تو اچانک اسے خیال آیا کہ کسی اور لڑکی کو بلا کر اسے بھلانے کی کوشش کرے، مگر دل نے واویلا ہی مچا دیا تھا۔ تناوش کے بغیر اسے کوئی قبول نہیں تھی۔ جب نگی جیسی لڑکی اس کے جذبات ابھارنے میں ناکام رہی تھی تو کوئی اور کیا کارنامہ انجام دیتی۔

اور پھر اس سے رہا نہ گیا۔ بستر چھوڑ کر اس نے انٹرکام کا رسیور اٹھایا۔ اور چوکیدار کو بتانے لگا کہ الٰہی بخش کو کار لگانے کا کہے۔

وہ پوچھنے لگا۔ ''محافظوں کو بھی اٹھا دوں دادا۔''

''نہیں، الٰہی بخش کو کہو کار لگا کر وہ بھی واپس لوٹ جائے، میں اکیلا ہی جاؤں گا۔''

اس کی۔ ''ٹھیک ہے دادا۔'' سن کر کبیر دادا نے رسیور رکھ دیا۔ شب خوابی کا لباس اتار کر اس نے شلوار سوٹ پہنا اور باہر نکل آیا۔ الٰہی بخش کار کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کبیر دادا کے اندر بیٹھتے ہی ادب سے دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا۔

کار سٹارٹ ہوتے ہی چوکیدار نے سرعت سے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تناوش کی گلی میں موجود تھا۔ کوئی غیر مرئی طاقت جیسے اسے وہاں لے آئی تھی۔ گھر کے سامنے کار روک کر وہ باہر نکلا گلی میں گھومنے والے ایک دو آوارہ کتے اس کے قریب آ کر بھونکنے لگے تھے۔ ان سے بے پروا ہو کر اس نے موبائل فون نکالا اور تناوش کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ ششدر رہ گیا جب پہلی گھنٹی جاتے ہی کال وصول کر لی گئی تھی۔

''جی۔'' اس کی سریلی آواز نے کبیر دادا کے کانوں میں رس انڈیلا۔

''وہ .....وہ .....ہاں میری بوتل ختم ہو گئی ہے، چابی کہاں رکھی ہے میں نے دوسری بوتل نکالنا ہے۔'' گڑبڑاتے ہوئے اس نے بہانہ گھڑا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' اس نے مدھر ہنسی سے پوچھا۔

''میں .....میں نے کہاں ہونا ہے، بستر پر لیٹا ہوں۔'' اس نے فوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''اگر چابی ساتھ لے گئی ہو تو کسی کو تمھاری طرف بھیج کر منگوا لیتا ہوں۔''

''اچھا.....آپ بستر پر ہیں۔'' اس کی معنی خیز ہنسی ابھری۔ ''ویسے گھر میں کتے کب سے پال لیے ہیں، سپیکر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی ہے اور یہ آواز مجھے کافی جانی پہچانی لگ رہی ہے یوں جیسے میری گلی کے کتے ہوں، بلکہ وہ کم بخت اب بھی بھونک رہے ہیں۔''

''مم..... مجھے کیا پتا۔'' کبیر دادا منمنایا۔

''پھر کس کو پتا ہوگا۔'' وہ ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ سولہ سترہ کے چاند کی روشنی میں اس کا موہنا چہرہ دمک رہا تھا۔ موبائل فون کان سے ہٹاتے ہوئے وہ سبک روی سے اس کے قریب پہنچی۔ ''تو یہ ہے آپ کی خواب گاہ۔''

''میں تو بس چابی لینے آیا تھا۔'' کبیر دادا نے ایک بار پھر جھوٹ بول کر اپنی بے ساختگی اور بے چینی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

''سچ میں۔'' وہ شوخی سے ہنسی۔

''ہاں۔'' کبیر دادا خفیف ہو گیا تھا۔ کسی انجانی ڈور سے بندھا ہوا وہ وہاں پہنچ تو گیا تھا لیکن اب اسے اقرار کرتے ہوئے خفت محسوس ہو رہی تھی۔

بشریٰ خاتون دروازے پر نمودار ہوئی۔

''ماں جی، آپ دروازہ کنڈی کر دیں میں گھر جا رہی ہوں۔'' ماں کو دیکھتے ہی اس نے حیا آلود لہجے میں کہا۔

''بیٹا، خیریت تو تھی۔'' بشریٰ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کبیر دادا سے پوچھا۔

''خالہ، یہ الماری کی چابی ساتھ لے کر آ گئی تھی، میں ابھی گھر لوٹا تو سوچا چابی لے آؤں۔''

''ہاں تو چابی لے جائیں نا۔'' وہ دونوں کو تنگ کرنے کی خواہش میں تھی۔

''امی جان!'' تناوش نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا اور بشریٰ نے ہنستے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ کبیر دادا نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا تھا۔

''چلیں بیٹھیں، اس سے پہلے کہ وہ لوٹ آئیں۔'' تناوش نے شرارتی لہجے میں کہا اور کبیر دادا فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کھانا کھالیا تھا۔'' اس کے کار موڑتے ہی وہ کھسک کر قریب ہوئی اور اس کے کندھے پر سر ٹیک دیا۔ اس کی خوشبو سے کار کی اندرونی فضا مہک اٹھی تھی۔ کبیر دادا کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''ہاں..... ہاں کھالیا تھا۔''

ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ تیقن سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں آپ نے نہیں کھایا۔''

اس نے بے ساختہ پوچھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کیوں کہ مجھ سے بھی نہیں کھایا گیا۔'' وہ اپنی وارفتگی اور چاہت پہلے بھی نہیں چھپاتی تھی اور اب بھی بے باکی سے اظہار کر رہی تھی۔ مشکل تو کبیر دادا کو پیش آ رہی تھی جس کا رواں رواں اس کا متلاشی ہونے کے باوجود وہ اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔

''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں، تم گھر جا کر راحت خالہ سے پوچھ لینا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، لیکن مجھے ابھی کھانا کھانا ہے اور وہ بھی کسی ہوٹل میں۔''

''اس وقت۔'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی، سوئیاں دو کا ہندسہ عبور کر گئی تھیں۔

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''ہاں ابھی اور اسی وقت۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر مجھے ساحل سمندر پر لے جانا، میں چاند کی روشنی میں آپ کے ساتھ گھوموں گی۔''

''پاگل ہوئی ہو۔''

''لے جانا ہے کہ نہیں۔'' اس نے لاڈ بھری ناراضی سے پوچھا۔ اور کبیر دادا نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کار ساحل کی جانب موڑ دی وہیں کسی ہوٹل میں وہ اسے کھانا بھی کھلا سکتا تھا۔ رات کے اس وقت بھی سڑکوں پر اچھی خاصی ٹریفک رواں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک بڑے ہوٹل کی پارکنگ میں کار روک رہا تھا۔

ہوٹل کے ہال میں اس وقت بھی کافی گاہک نظر آ رہے تھے۔ کونے کی میز کا انتخاب کر کے اس نے نشست سنبھالتے ہوئے مینو کارڈ اٹھا لیا۔

''کیا کھاؤ گی؟''

وہ شوخی سے بولی۔ ''کوئی ایسی چیز جو آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلا سکیں۔''

''مستیاں نہ کرو یہ خواب گاہ نہیں ہوٹل کا ہال ہے۔''

تناوش نے منہ بسورا۔''وہاں کون سا آپ مجھے گلے سے لگا کر رکھتے ہیں۔''

کبیر دادا کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''ناشکری کہیں کی۔''

اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''اچھا بتاؤ نا کیا کھاؤ گی۔''

''کچھ بھی منگوا لو مگر اس کے بعد آئس کریم ضرور کھائیں گے۔''

اور کبیر دادا سر ہلا کر اپنی مرضی کا کھانا منگوانے لگا۔تناوش کے ساتھ چند لمحے بتاتے ہی اسے بھی سخت قسم کی بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔بیرے کے کھانا لانے تک وہ اس سے دن کی کارگزاری سننے لگی۔

''سویا رہا ہوں سارا دن کوئی کام ہی نہیں تھا۔''کندھے اچکاتے ہوئے اس نے ایک اور جھوٹ بولا۔

''اب مجھے جلائیں تو نہیں نا۔''تناوش نے منہ بسورا اور کبیر دادا کھل کھلا پڑا۔

''اس میں جلنے کی کون سی بات ہے بھلا۔''

''بس میں آپ سے نہیں بولتی۔''مصنوعی انداز میں منہ پھلاتے ہوئے وہ ہاتھوں کے پیالے میں اپنا من موہنا چہرہ رکھ کر کبیر دادا کو گھورنے لگی۔کبیر دادا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔اس کا جی چاہا سب سے بے نیاز ہو کر اسے بانہوں میں بھر لے۔وہ اتنی ہی معصوم،بھولی بھالی اور پیاری لگ رہی تھی۔اسی وقت بیرہ کھانے کی ٹرے اٹھائے نمودار ہوا۔

''اتنا زیادہ کھانا میں کیسے کھاؤں گی۔''بیرے کو میز پر برتن سجاتے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

''چلو،میں بھی تمہارا ساتھ دے دوں گا۔''کبیر دادا نے اسے تسلی دی۔اور پھر اسے خوب ڈٹ کر کھاتے دیکھ کر وہ معنی خیز لہجے میں بڑبڑائی۔

''جھوٹا۔''

''یہ جھوٹا کسے کہا۔''کبیر دادا نے اسے گھورا۔

وہ کھل کھلائی۔''جھوٹے کو۔''

''کتنا منع کرتا ہوں کہ بدتمیزی نہ کیا کرو۔''

وہ شرارت سے بولی۔''یہ بدتمیزی نہیں ہے کبیر جی اظہارِ حقیقت ہے۔''

''بدتمیز۔''اس مرتبہ کبیر دادا نے آئس کریم کا ادھ کھایا پیالہ اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔

''آئس کریم کھانا چھوڑا تو قسم سے اتنی زور زور سے رونا شروع کر دوں گی کہ پورا ہوٹل جمع ہو جائے گا۔''وہ فوراً دھمکی پر اتر آئی تھی۔

اس نے دوبارہ پیالہ قریب کرتے ہوئے کہا۔''پھر بکواس کیوں کرتی ہو۔''

''کروں گی بکواس۔کہوں گی،کبیر.....کبیر.....کبیر.....کبیر.....آپ مجھے روک کر دکھائیں۔''

''ایک تھپڑ سے ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔''

''اب تو اکیلے میں کہہ رہی ہوں،تھپڑ مارا تو سب کے سامنے بھی یہی کہوں گی۔''

''کیا.....''

وہ بے ساختہ بولی۔''کبیر۔''اور کبیر دادا ہنس پڑا تھا۔اسے ہنستے دیکھ کر ایک دم وہ شرما گئی تھی۔

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں،ہے نا۔''

''اچھا مذاق اڑانے والا بھی میں ہو گیا۔''

''اب سارا کپ خود ہی تو خالی نہ کریں نا۔''اس کے سامنے پڑا کپ اٹھا کر تناوش نے اپنے کپ میں بچی ہوئی تھوڑی سی آئس کریم اس کے سامنے رکھ دی۔

''اور منگوا لوں۔''اسے یوں شوق سے آئس کریم کھاتا دیکھ کر کبیر دادا نے بے ساختہ پوچھا۔

''نہیں اب چلتے ہیں۔''اپنا کپ خالی کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔کبیر دادا نے بیرے کو اشارہ کر کے بل منگوایا۔بل کے مندرجات پر ایک نظر ڈال کر اس نے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکالا۔''باقی تم رکھ لینا۔''کہہ کر وہ تناوش کو ساتھ لیے چل پڑا۔

''شکریہ سر۔''بیرے کی ممنونیت بھری آواز پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''جب گرل فرینڈ ساتھ ہوتی ہے تو لڑکے بڑی بڑی بخشش کیوں دیتے ہیں۔''

اس کی شوخ بات نے ایک بار پھر کبیر دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ ''تو تم میری گرل فرینڈ ہو۔''

''لڑکی بھی ہوں، دوست بھی ہوں، محبوبہ بھی ہوں اور بیوی بھی۔ اتنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی مجھے نظر انداز کرتے رہتے ہیں آپ۔'' اس نے منہ بسورا۔

''یہ محبوبہ اور دوست کب سے بن گئی ہو۔'' وہ کار کے نزدیک پہنچ گئے تھے جب کبیر نے یہ پوچھا۔

''کیا نہیں ہوں۔'' کبیر دادا کا ہاتھ پکڑ اس نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ کار پارکنگ میں جلتی روشنی اس کے روشن چہرے کو جگمگا رہی تھی۔ کالی سیاہ آنکھیں کبیر دادا پر جادو کرنے لگیں۔ وہ بے خود ہونے لگا تھا۔ دو تین لمحے یونہی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کبیر دادا کے منہ سے پھنسے پھنسے الفاظ برآمد ہوئے..... ''ہونا۔''

ایک خوب صورت مسکان اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی اور وہ مدھر لہجے میں بولی۔ ''کبیر.....''

کبیر دادا مکمل ہپناٹائز ہو چکا تھا بے ساختہ بولا۔ ''جی۔''

نہ جانے اس کی آنکھوں میں کتنی چاہت امڈ آئی تھی، تناوش نے فوراً شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ ''چلیں۔''

ایک دم جھری جھری لیتے ہوئے کبیر دادا نے خود کو اس منظر کے سحر سے نکالا اور کار کا دروازہ تناوش کے لیے کھول دیا۔ ''بیٹھو۔''

''وہ ناز بھرے انداز میں بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کر کے کبیر دادا گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور کار آگے بڑھا دی۔

''ساحل پر جائیں گے۔'' اس نے فوراً یاد دہانی کرائی۔

''ہونہہ۔'' کبیر دادا نے ہنکارا بھرا۔ کار میں خاموشی چھا گئی تھی۔ کبیر دادا اپنی بے خود ہوتی حالت پر خفت سی محسوس کر رہا تھا۔ خاموشی کو تناوش کی آواز نے توڑا، وہ پوچھ رہی تھی.....

''میرا کبیر کہنا آپ کو برا لگتا ہے۔''

''اگر میرا جواب اثبات میں ہو تو.....'' کبیر دادا نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے خود پر مصنوعی سنجیدگی طاری کی۔

''پھر میں جانو، شہزادہ، سرتاج وغیرہ کہہ کر پکار لیا کروں گی۔'' اس نے بھی اپنا لہجہ سنجیدہ ہی رکھا تھا، مگر الفاظ سے ٹپکتی شرارت نے کبیر دادا کو ہنسا دیا۔

''تم لاعلاج ہو.....''

کار کی فضا تناوش کے قہقہے سے گونج اٹھی تھی۔ ''بتایا نہیں۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''کبیر ہی ٹھیک ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ایک منظر ابھرا کہ تناوش اسے ''جانو، میرے شہزادے۔'' کہہ کر مخاطب کر رہی ہے۔ اور یہ سنتے ہوئے پاشا اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر خودکشی کر رہا ہے۔

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''میرا جو دل چاہے گا کہوں گی، بدلے میں آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''میں مس مصیبت اور دماغ چوس کے علاوہ بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اور تناوش اس کی بے بسی پر کھل کھلا دی۔

''ساحل پر اتنے ہوٹل کھلے ہیں یہاں بھی کھانا کھایا جا سکتا تھا۔'' سڑک کنارے ہوٹلز دیکھتے ہی وہ پوچھنے لگی

''مقصد کھانا کھانا تھا نا وہ پورا ہو گیا۔'' وہ کار کو آگے لے گیا۔ ایک جگہ پر اس نے کار سڑک سے کچے پر اتار ی اور ایک مناسب جگہ پر پارک کر دی۔

''ننگے پاؤں چلیں گے۔'' پاؤں سے چپل اتار کر وہ باہر نکل آئی۔ سر پر لیا دوپٹا اس نے مفلر کی طرح گلے میں لپیٹا اور اس کے گھنے سیاہ لمبے بال کالی گھٹا کی طرح اس کی کمر تک بکھر گئے۔ چاند کی روشنی میں اس کا حسن مزید نکھر آیا تھا۔ کبیر دادا بھی جوتے اتار کر باہر نکل آیا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی کی طرف بڑھ گئی، پاؤں سے پانی ٹکراتے ہی اس نے شلوار کے پائینچے اوپر کر لیے تھے۔ وہ کافی دور آ گئے تھے، وہاں دوسرے لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے اور اسی وجہ سے اس نے سر اور پنڈلیوں وغیرہ سے کپڑا ہٹانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی تھی۔

''آپ پہلے کبھی یہاں آئے ہیں۔'' وہ کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہیں اتنا فارغ دکھائی دیتا ہوں۔''

''آج فارغ تھے۔''

''اس سوال کا مقصد۔'' وہ چڑ گیا تھا۔

وہ لاڈ سے بولی۔ ''آپ سے یہ منوانا کہ میں آپ کو پیاری لگتی ہوں۔''

وہ اس کی طرف مڑا اگلے ہی لمحے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچا۔

''ہاں..... ہاں..... ہاں لگتی ہو پیاری، بہت زیادہ اور بھی کچھ پوچھنا ہے تو ایک بار پوچھ لو۔'' چاندنی میں نہائے ہوئے تناوش کے سحر انگیز وجود کے سامنے کبیر دادا نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اسے اپنا مقام، حیثیت اور شخصیت بھول چکی تھی۔ بس یاد رہا تھا تو دل کا واویلا جو تناوش کا نام جپ رہا تھا۔

''چھوڑیں نا کوئی آجائے گا۔'' ایک دم وہ شرما گئی، اس کی شوخی اور تیزی طراری کہیں کھو گئی تھی۔

اسے تنگ کرنے کے لیے شاید کبیر دادا مزید بھی پیش قدمی کرتا، مگر اسی وقت وہ روشنی میں نہا گئے۔ کوئی گاڑی سڑک سے اتر کر اسی طرف آرہی تھی۔ تناوش تڑپ کر اس کی آغوش سے نکلی۔ تیز روشنی سے بچنے کے لیے انھوں نے چہروں کے سامنے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھا کافی بدتہذیب اور اجڈ لگ رہا تھا۔ آنے والی گاڑی ان کی کار کے ساتھ رک گئی۔ تیز روشنی کے بجھتے ہی انھوں نے آنکھوں کے سامنے پکڑے ہاتھ ہٹائے روشنی کا اثر ختم ہوتے ہی انھیں کھلی چھت کی جیپ کا ہیولہ نظر آیا۔ اس میں چار آدمی سوار تھے۔ نیچے اترتے وقت وہ بے ہنگم قہقہے لگا رہے تھے۔ تناوش کا دل ناخوش گوار انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہیولوں کو اپنی جانب رخ کرتے دیکھ کر تناوش فوراً گلے میں جھولتا دوپٹا سر پر لپیٹ کر چھاتی پر پھیلانے لگی۔

''ارے رومانوی سین تو ختم ہو گیا ہے۔ ہیرو صاحب نے ہیروئین کو اپنے بازوؤں کے گھیرے سے آزاد کر دیا ہے۔'' ایک واہیات آواز تناوش کے کانوں میں پڑی اور اس نے فوراً کبیر دادا کا ہاتھ پکڑ لیا گویا اس کا سہارا چاہ رہی تھی۔ وہ آوارہ گردوں کی کوئی ٹولی تھی جو اکیلے جوڑے کو دیکھ کر لوٹنے چلے آئے تھے۔ ایسے گروہ اکیلے آدمیوں کو لوٹنے کے ساتھ عورتوں کی عزت خراب کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔

''ڈر گئی ہو۔'' آنے والوں سے بے نیاز وہ چاہت بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ کبیر دادا کو ایسے سڑک چھاپوں سے کیا خوف ہو سکتا تھا جس کی ساری زندگی ہی ایسے حالات کا سامنا کرتے گزری ہو۔

وہ نڈر لہجے میں بولی۔ ''نہیں، آپ کی موجودگی میں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔''

''اگر تم سے کچھ نہیں ہو پا رہا تو اس بلبل کو ہمارے حوالے کر دو بھائی۔'' وہ دور ہی سے اپنے اندر کی غلاظت کا اظہار کرتے آ رہے تھے۔

''اچھا، سب سے پہلے کون سا سورما اپنا طاقت کا مظاہرہ کرے گا۔'' وہ چار پانچ قدم دور تھے جب کبیر دادا کی اطمینان بھری آواز ابھری۔

آگے والے دونوں آدمی ٹھٹک کر رکے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے گویا آنکھیں پھاڑ کر کبیر دادا کی جانب دیکھا۔ ''کک..... کک..... کبی..... کبیر دادا.....'' ہکلاتی اور پھنسی پھنسی آواز ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔ اگلے ہی لمحے دونوں کا جسم رعشے والے مریض کی لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ عقب میں آنے والوں کے کانوں میں جب کبیر دادا کی آواز پڑی وہ بھی ہکا بکا کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کی آواز سنتے اور شکل دیکھتے ہی کبیر دادا انھیں پہچان گیا تھا وہ اس کے اپنے ہی آدمی تھے۔

''تو تم لوگ رات کو یہ کام بھی کرتے ہو۔'' ان کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کبیر دادا پھنکارا۔

''مم..... ماف..... کر دیں دادا.....'' آگے والے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے کہ کبیر دادا کا ہاتھ گھوما، چہرے پر پڑنے والے تھپڑ نے اسے ریت پر اچھال دیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگلے منٹ میں باقی تینوں بھی بھرپور تھپڑ کھا کر اس کے ساتھ لیٹے نظر آ رہے تھے۔

''غلطی ہو گئی دادا..... معاف کر دیں دادا..... آئندہ ایسا نہیں کریں گے دادا.....'' ہر ایک کی زبان پر مختلف الفاظ رقصاں تھے، مگر تمام کا مطلب معذرت کرنا ہی تھا۔ قریب ہو کر کبیر دادا نے فٹ بال کو کک مارنے کے انداز میں ان پر چند ٹھوکریں برسائیں۔ وہ واویلا کرتے ہوئے لیٹے رہے اٹھنے کی جرات کسی نے نہیں کی تھی۔

''نوید، اڈے انچارج کو کال کر کے یہیں بلا لو، اس کی آمد تک کان پکڑ کر مرغا بنے رہو۔ میں ذرا آگے تک جا رہا ہوں واپسی پر اسے یہاں موجود ہونا چاہیے۔ اور اسے کال بھی مرغا بنے بنے کرو گے۔''

کبیر دادا کی بات ختم ہوتے ہی انھوں نے اس سرعت سے مرغا بنتے ہوئے کان پکڑے تھے کہ تناوش کھل کھلا پڑی۔ نوید نامی آدمی اسی ہیئت میں کان پکڑے اپنے اڈے کے انچارج کو کال کرنے لگا۔ کبیر دادا تناوش کو لے کر ان سے دور ہٹنے لگا۔

''یہ لوگ آپ سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں، حالاں کہ اتنے پیارے اور نرم دل ہیں آپ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بھول پن سے پوچھنے لگی۔

وہ مسکرایا۔ ''پاگل، تم نے کبیر دادا کا صرف ایک ہی روپ دیکھا ہے۔''

''میں اپنے کبیر کے سارے روپ دیکھ چکی ہوں۔''

''پھر بھی ڈر نہیں لگتا۔''

وہ معصومیت سے بولی۔ ''بہت لگتا ہے، آپ کے دور جانے کا، بچھڑنے کا، روٹھنے کا، کسی اور لڑکی طرف متوجہ ہونے کا اور مجھے دھتکار دینے کا ڈر ہر وقت میرے دل کو لرزاتا رہتا ہے۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''صحیح کہا، جس دن سے تم میری زندگی میں آئی ہو میری یہی کوشش رہی ہے، کاش میں اس میں کامیاب ہو گیا ہوتا۔''

''اللہ پاک نہ کرے ایسا ہو۔ مر جاؤں گی اور پھر روتے رہیں گے آپ۔'' اس دھمکی سے کبیر دادا پر منکشف ہوا کہ شاید پاشا کی کوششیں بے کار جائیں۔ اتنے خلوص بھرے لہجے میں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کی آمد کے بعد تناوش کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات نمودار ہوئے اور اسے بغیر کسی شک وشبے کے یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے سمجھانے سے باز نہیں آیا تھا۔

''تم کسی اور سے شادی کر کے گھریلو زندگی گزار سکتی ہو، ایسی شرافت بھری زندگی جس کی تم حق دار بھی ہو۔ ایک شریف اور باکردار مرد ہر وہ خوشی، ہر وہ سکون اور اطمینان تمھاری زندگی میں لے آئے گا جس کی تم حقدار بھی ہو، میرے ساتھ سوائے خواری اور کچھ بھی نہیں ملنے والا۔''

''اگر آئندہ ایسا کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے زندگی میں پہلی بار اس انداز میں دھمکی دی تھی

''کیا کہا۔'' کبیر دادا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''وہی جو آپ نے سنا۔'' ہنس کر کہتے ہوئے وہ بھاگ پڑی۔ وہ بھی اس کے بچپنے میں دلچسپی لیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ تناوش کی رفتار کافی تیز تھی، مگر وہ جتنی بھی تیز ہوتی کبیر دادا کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جلدی ہی تناوش کو جا لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتا تناوش۔ ''ہائے۔'' کہتے ہوئے ریت پر

لیٹ گئی۔

''کیا ہوا؟'' کبیر دادا پریشان ہو کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

''پاؤں میں موچ آ گئی ہے، اُف..... بہت درد ہو رہا ہے۔'' ٹخنے پر زور دیتے ہوئے وہ کراہی۔

''دکھاؤ مجھے۔'' گھٹنے ساحل کی گیلی ریت پر ٹیکتے ہوئے وہ اس کا ٹخنہ سہلانے لگا۔

تناوش نے کراہتے ہوئے اس کے کندھے پر ماتھا رکھ دیا تھا۔

''کس نے کہا تھا بھاگو۔'' اس نے پریشانی بھرے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

''اب غصہ تو نہ کریں نا، ہائے درد ہو رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہو جائے گا، روتے نہیں ہیں۔'' اس کی روتی آواز سن کر کبیر دادا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ کو تو بس ڈانٹنا ہی آتا ہے۔''

''اچھا نہیں ڈانٹتا۔'' وہ پیار بھرے انداز میں اسے پچکارنے لگا۔

''میں نہیں بولتی، آپ کی وجہ سے میرے پاؤں میں موچ آئی ہے۔ ہائے اللہ جی، اب میں کیسے چلوں گی۔''

''کچھ نہیں ہوتا اور اب اٹھو چل سکتی ہو یا نہیں۔'' کبیر دادا نے بازو سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

''نہیں چل سکتی۔'' وہ پاؤں پر بالکل زور نہیں دے رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' کبیر دادا نے اطمینان سے اسے بازوؤں میں بھر کر اوپر اٹھا لیا۔

ایک دم خوش ہوتے ہوئے اس نے کبیر دادا کے گلے میں بانہیں ڈال کر سر اس کی چھاتی پر رکھ لیا۔ کبیر دادا کو وہ پھول کی طرح ہلکی لگی تھی۔ کبیر دادا واپس چل پڑا۔

''کیا میرا وزن بہت زیادہ ہے۔''

''ہاں۔'' کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گلاب کے پھول سے تھوڑا سا زیادہ ہوگا۔'' وہ اس کی ''ہاں'' سن کر منہ پھلاتے ہوئے اسے ناراضی بھری نظروں سے گھورنے لگی تھی، مگر اگلا فقرہ سن کر خوشی سے کھل اٹھی۔

''ہائے اللہ جی!..... یہ لڑکا بھی، اکیلی لڑکی دیکھ کر کیسے پٹا رہا ہے۔''

کبیر دادا ترکی بہ ترکی بولا۔ ”تم میری بیوی ہو محترمہ۔“

وہ کہاں ہار ماننے والی تھی فوراً بولی۔ ”اسی لیے تو میں بھی حیران ہوں کہ آپ بیوی پر کیوں ٹھرک جھاڑ رہے ہیں۔“

کبیر دادا کھسیاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمھیں یونہی تو دماغ چوس نہیں کہتا۔“

وہ مصر ہوئی۔ ”اچھا بتائیں نا، کیا سچ میں میرا وزن بہت زیادہ ہے۔“

”کہہ تو دیا ہے پھول کی طرح ہلکی لگ رہی ہو۔“

”تو پھر پہلے اٹھاتے نا، مجھے موچ آنے کا بہانہ تو نہ کرنا پڑتا۔“

”کیا..... یہ بہانہ ہے۔“ اس نے رکتے ہوئے تناوش کو گھورا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے نیچے والا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھایا اور اوپر نیچے سر ہلا دیا۔ اس عالم میں وہ کبیر دادا کو ننھی بچی ہی لگی تھی۔

”دل کرتا ہے نیچے پھینک دوں۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”سچ مچ چوٹ لگ جائے گی اور ہر وقت اٹھا کر پھرانا پڑے گا۔“

”اچھا اتر و نیچے۔“ کبیر دادا نے بادل نخواستہ اسے نیچے اتارا وہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ لگتے ہوئے بولی۔

”اپنے موبائل سے میری تصویر ہی کھینچ لیتے کتنی پیاری لگ رہی ہوں۔“

”اتنی خوب صورت بھی نہیں ہو۔“ کبیر دادا نے اسے چڑایا۔

”ٹھیک ہے نہیں کھنچواتی۔“ اس نے دور ہونے کی کوشش کی مگر کبیر دادا نے فوراً ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے قریب سمیٹ لیا۔ ”مذاق کر رہا تھا دماغ چوس۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے قیمتی موبائل فون سے دھڑا دھڑ اس کی تصویریں اتارنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ مختلف پوز بنا کر تصویریں کھنچواتی رہی پھر شرارتی لہجے میں بولی۔

”اچھا اب بس کریں نا، اتنی زیادہ تصویروں کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔“

”اجازت مانگی کس نے ہے۔“ کبیر دادا نے کہا۔

”بس دھونس جماتے رہنا، یہ نہیں کہ چھوٹی سی بچی کا ذرا سا مان ہی رکھ لیں۔“

''اچھا جی، نہیں کھینچتا۔ اب چلیں۔'' وہ موبائل فون جیب میں ڈال کر اسے ساتھ لیے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان آدمیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ چاروں آدمی مرغا ہی بنے ہوئے تھے۔ ایک پانچواں آدمی ان کے ساتھ کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ اڈہ انچارج تھا۔ اس نے وہاں پہنچنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

''صنوبر، یہ تمام صبح سورج ابھرنے تک یونہی کان پکڑے رہیں گے اور تم یہیں کھڑے ہو کر ان کی نگرانی کرو گے، اگر کسی نے بھی کان چھوڑے یا تم نے بیٹھنے کی کوشش کی تو ورثاء کو کفن دفن کی ہدایت کرنا نہ بھولنا۔''

''جی دادا!'' اس نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

''خیر تمھاری باقاعدہ کلاس تو میں کل لوں گا۔'' کبیر دادا کا گھمبیر لہجہ مخالف کا پتا پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ ''غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے بھی کچھ اصول ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے بارے اڈے پر آ کر روشنی ڈالوں گا۔''

''غلطی ہو گئی دادا، معاف کر دیں۔'' کان پکڑے نوید کی کراہتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ باقی بھی پکارنے لگے۔ ''معاف کر دیں دادا، ایک موقع دے دیں دادا۔''

''زندہ چھوڑ کر، موقع ہی تو دے رہا ہوں۔''

''آج انھیں معاف کر دیں۔'' خاموش کھڑی تناوش نے ایک دم کبیر دادا کا ہاتھ تھام کر التجا کی۔

''تم بیچ میں دخل نہ دو۔'' کبیر دادا نے اس کی طرف سخت نظروں سے گھورا۔

''میں کہہ رہی ہوں ناں انھیں ایک اور موقع دے دیں۔'' وہ مصر رہی۔

''اٹھو اور دفع ہو جاؤ۔'' اس مرتبہ کبیر دادا تناوش کا حکم نہیں ٹال سکا تھا۔

وہ چاروں کھڑے ہو کر اپنی جیپ کی طرف بھاگ پڑے تھے۔

''تم بھی۔'' کبیر دادا نے صنوبر کو کہا اور وہ بھی ان کے پیچھے بھاگ پڑا۔

ان کے غائب ہوتے ہی اس نے تناوش سے پوچھا۔ ''اب چلیں یا صبح کی آذان یہیں سننا ہے۔''

''چلیں۔'' کبیر دادا کو محبت پاش نظروں سے گھورتی ہوئی وہ کار کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

"یار، تمھارے پاس کوئی اور موضوع نہیں ہے۔" کاشف راجپوت نے سامنے بیٹھے پاشا کی بات سنتے ہی بیزاری ظاہر کی۔

پاشا مصر ہوا۔ "دادا، آپ میری بات تو مکمل ہونے دیں۔"

"اچھا بولو۔" کاشف نے گویا بادل نخواستہ کہا۔

"کبیر دادا نے خود اعتراف کر لیا ہے، اب تو آپ بھی مان جائیں۔"

"اچھا مان لیا، لیکن میں کر کیا سکتا ہوں، جب کبیر دادا خود اس مسئلے کو حل نہیں کر پا رہا تو میں کیا کروں گا۔"

"مجھے پکا یقین ہے کہ وہ کمینی، کبیر دادا کو جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا رہی ہے۔"

"تو وہ نہ پھنسے۔" کاشف راجپوت نے منہ بنایا۔

"شکار کبھی پھنسنا نہیں چاہتا، شکاری اپنی چالوں اور مہارت کو بروئے کار لا کر شکار کو اپنے بس میں کرتا ہے۔"

"چلو مان لیا وہ دوغلی ہے اور کبیر دادا کو جھوٹی محبت کے جال میں پھانس رہی ہے، کبیر دادا نے بھی تمھیں کھلی چھوٹ دے دی ہے۔ لیکن اب کیا لائحہ عمل اپناؤ گے۔ کیا وہ لڑکی تمھاری آفر کو قبول کرتے ہوئے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کرے گی اور کبیر دادا کی زندگی سے دفع ہو جائے گی یا کوٹھی بنگلے کار وغیرہ کے بدلے کبیر دادا کی زندگی سے نکلنے پر تیار ہو جائے گی۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" پاشا نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"تو عمل کرو نا اپنے منصوبے پر، کبیر دادا کی غیر موجودگی میں گھر چلے جاؤ اور اس سے اطمینان سے بات کر لو۔ لیکن یاد رکھنا، اگر تمھارے تئیں وہ اتنی ہی چالاک اور تیز ہے تو آسانی سے کوئی آفر قبول نہیں کرے گی۔"

"جانتا ہوں، اسی لیے اسے موقع دوں گا کہ وہ ہنسی خوشی میری آفر قبول کر لے۔ دوسری صورت میں ماں بیٹی کا عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا کر کبیر دادا کو کہہ دوں گا کہ میری آفر قبول کر کے دونوں ماں بیٹی کہیں چلی گئی ہیں اور چونکہ ندامت کی وجہ سے وہ آپ کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی اس لیے وہ آپ کو ملنے نہیں آ سکی۔"

"یار، کیوں غریب کی زندگی کے پیچھے پڑے ہو۔ وہ معصوم، بھولی بھالی اور گھریلو لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیاں

جس سے شادی کرلیں اس کی ساری خامیوں کو بغیر کسی کراہیت کے قبول کرلیتی ہیں۔ان کا مقصد زندگی ہی شوہر کا آرام وسکون اور خدمت گزاری ہوتا ہے۔یہ جو تمھیں اس کی مکاریاں اور چالاکیاں نظر آرہی ہیں نا، یہ اس کی فطرت ہے۔اس نے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے کبیر دادا کا ہاتھ تھاما۔اور جب ہر قدم پر معاشرے کی زیادتیوں کا شکار لڑکی کو تحفظ اور سہارا ملا تو وہ جی جان سے تحفظ فراہم کرنے والے کی خدمت میں جت گئی۔اپنا سب کچھ اسی کو سمجھنے لگی۔اور یقین مانو جب کوئی عورت خلوص دل سے کسی کا خیال رکھتی ہے،اس کے کام کرتی ہے اور گھریلو زندگی کے ہر مرحلے میں مرد کو مصروف عمل نظر آتی ہے تب مرد کا دل بھی اس کی طرف کھنچتا ہے۔وہ اسے پاؤں کی جوتی نہیں سر کا تاج سمجھنے لگتا ہے اور یہی کبیر دادا کے ساتھ ہوا ہے جسے تم اس معصوم لڑکی کی چالاکیاں سمجھنے لگے۔رہنے دو بے چاری کو کبیر دادا کے پاس۔باقی گینگسٹرز نے بھی تو شادیاں کی ہوئی ہیں نا۔تھوڑا عرصہ تو گزرنے دو،نئی نویلی دلھن کے نخرے شوہر ہنسی خوشی برداشت کرلیتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ نئی جوانی کا بخار اترتا ہے مرد سنبھل جاتا ہے اور اس کی پرجوش محبت میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔"

"میں آپ سے بالکل متفق نہیں ہوں، کیونکہ کوئی گھریلو لڑکی اتنی جلدی کبیر دادا کو اپنے قابو میں نہیں کرسکتی۔شادی کو ہفتہ نہیں ہوا،اور کبیر دادا کو اس کے علاوہ کچھ سوجھتا نہیں۔اگر شروعات میں یہ حالت ہے تو آگے چل کر جانے وہ کیا غضب ڈھائے۔"

"پاشا،تمھارا سنکی اور خبطی پن جانے کب ختم ہوگا۔ایک بار جو خیال تمھارے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے اسے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں دادا،وہ ایسی ہی ہے۔اور میں اسے بے نقاب کرکے رہوں گا۔"

"اگر کسی دن کبیر دادا کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ خود اسے چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ پاشا نے اسے قتل کیا تھا۔سوچو اس وقت کیا ہوگا۔"

"کبیر دادا جانتے ہیں کہ وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں،باقی میں اس ڈائن کو ایک موقع دوں گا کہ کبیر دادا کی جان چھوڑ دے۔اگر اس نے میری بات نہ مانی تب میں انتہائی قدم اٹھاؤں گا۔"

"اچھا اسے قتل کرنے سے پہلے ایک بار پھر مجھ سے مشورہ کرلینا۔" کاشف راجپوت نے گویا بات ختم

کرنے کا اعلان کیا۔

"آپ وعدہ کریں کبیر دادا کو یہ بات نہیں بتائیں گے۔"

"پاشا، تم صرف کبیر دادا کے نہیں میرے لیے بھی چھوٹے بھائیوں جیسے ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کبیر دادا تم سے متنفر ہو۔ باقی تم ایک بار کوشش کر کے دیکھ لو، ہو سکتا ہے اس وقت تک میں کوئی مناسب حل سوچ لوں۔ یقیناً اس لڑکی کا قتل اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جب کبیر دادا کے دل میں اس کی محبت کا خیال بیٹھا ہوا ہے تو اس کی موت کبیر دادا کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ اور ایسے معاملوں میں انسان ساری زندگی نہیں سنبھل پاتا۔ شاید وہ خود کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا بیٹھے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔"

"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔" پاشا حقیقتاً پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"ڈرا نہیں سمجھا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے دادا، میں آپ کو بتا کر ہی یہ انتہائی قدم اٹھاؤں گا۔" پاشا نے کھڑے ہو کر الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

☆.....☆.....☆

رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے وہ صبح تاخیر سے جاگا تھا۔ تناوش بھی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ دن کے بارہ بجے کبیر دادا کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے پہلو میں بے خبر سوتی دکھائی دی۔ نیند کی حالت میں اس کی معصومیت اور زیادہ اجاگر ہو گئی تھی۔

"اٹھنا نہیں ہے۔" کبیر دادا نے اس کے گالوں کو تھپتھپایا اور وہ جاگ گئی۔

"نہیں۔" وہ کروٹ تبدیل کر کے اس کے قریب ہو گئی۔

"بارہ بج رہے ہیں محترمہ۔"

"تو کیا، ساری رات بھی تو آپ نے سونے نہیں دیا نا۔"

"ویسے غلط بیانی اور الزام لگانے کا کوئی ڈپلوما کیا ہوا ہے یا قدرتی ہی ایسی ہو۔"

"رات کو دو بجے جا کر مجھے بے آرام کرنے والا کون ہے..... آپ۔ کھانا کھلانے کے لیے ہوٹل پر لے

جانے والا کون ہے.....آپ۔ساحل سمندر پر مجھے گود میں اٹھا کر وقت ضائع کرنے والا کون ہے.....آپ۔گھر واپسی پر.....'' وہ جلد بازی میں مزید کوئی راز افشا کرنے والی تھی، کہ ایک دم چپ ہوگئی۔

''کہو ناں خاموش کیوں ہوگئی ہو۔'' کبیر دادا نے اسے چھیڑا۔

وہ حیا آلود لہجے میں بولی۔''رہنے دیں۔''

''رہنے کیوں دیں بات تو مکمل کرو۔'' کبیر دادا کو اسے چھیڑنے میں مزا آرہا تھا۔

''تنگ نہ کریں نا۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا کہ کبیر دادا کو ماننے ہی بنی۔

''اچھا، اب گپوں کا وقت نہیں ہے، مجھے سچ میں دیر ہوگئی ہے۔جلدی سے اٹھ کر کچھ کھانے کو لاؤ۔'' اس کا سنجیدہ لہجہ سن کر وہ سر ہلاتی ہوئے اٹھی، مگر بستر چھوڑنے سے پہلے وہ اس کے چہرے پر جھک کر شرارت کرنا نہیں بھولی تھی۔

ناشتا وغیرہ کر کے کبیر دادا رخصت ہوگیا اور وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔ظہر کی آذان سن کر اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور پھر پڑھنے بیٹھ گئی۔اسی وقت راحت خالہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی۔

''بیٹی، پاشا صاحب آپ کو ملنے آیا ہے۔''

''پاشا صاحب؟'' اس نے حیرانی سے دہرایا۔

''صاحب جی کا بہت چہیتا ہے بالکل ان کے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔'' راحت خالہ نے مختصر الفاظ میں پاشا کا مکمل تعارف کرایا۔

''اچھا۔'' کتابیں بند کر کے اس نے دوپٹا سر پر لپیٹا اور ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''اسلام علیکم بھائی جان۔'' اس نے گردن میں ہلکا سا خم کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھے خوش شکل جوان کو سلام کہا۔

پاشا نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا مگر اس نے کھڑے ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

دوسرے صوفے پر نشست سنبھال کر اس نے راحت خالہ کو چائے لانے کا کہا اور خوش گوار لہجے میں بولی۔''بھیا، کیسے تشریف آوری ہوئی۔''

''بس یونہی۔'' پاشا نے کندھے اچکائے۔ تناوش کو دیکھتے ہی وہ خود کو نروس سا محسوس کرنے لگا تھا۔ نفاست سے دوپٹا لپیٹے ہوئے وہ واقعی معصوم اور بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ رہی سہی کسر اس کے خلوص بھرے لہجے نے پوری کردی تھی۔

''اس دن تقریب میں آپ کو دیکھا تھا، لیکن کبیر نے آپ کا تعارف ہی نہیں کرایا۔'' اس نے بے تکلفی سے کبیر دادا کا نام لیا۔ پاشا حیران رہ گیا تھا۔

''شاید انھوں نے ضروری نہ سمجھا ہو۔''

''آج تو ان سے ضرور جھگڑا کروں گی، یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ مجھے اپنے بھیا ہی سے متعارف نہ کرایا۔''

''چلیں میں خود آ گیا ہوں نا۔'' پاشا اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر ڈرائینگ روم میں لگی تصویروں کو گھورنے لگا۔ تناوش کے قریب آنے کے بعد اسے بات کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''بہت اچھا کیا۔ روزانہ چکر لگا جایا کریں، میرا کوئی بھائی نہیں ہے آپ کی آمد سے میری زندگی کا بہت بڑا خلا پر ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اسے اپنے مقتول بھائی شاہ نواز کی یاد آئی اور اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''ضرور۔'' پاشا نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیری۔

''آپ نے شادی نہیں کی بھیا۔''

''میں کبیر دادا کو آزاد کرانے آیا ہوں اور یہ میری شادی کرانے پر تلی ہے۔'' پاشا نے دل ہی دل میں کہا، جبکہ ہونٹوں سے نکلا۔ ''ابھی تک تو نہیں ہوئی۔''

''ٹھیک ہے اپنے بھیا کے لیے میں خود دلھن ڈھونڈوں گی۔'' اس نے فوراً مستقبل قریب کے منصوبے کا اعلان کیا۔

اسی وقت راحت خالہ نے ان کے سامنے چائے کے برتن اور کھانے کے لوازمات لا کر رکھے۔

''ٹھیک ہے خالہ، بھیا کی چائے میں خود بنالوں گی۔'' راحت خالہ کو پیالی کو ہاتھ لگاتا دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر میز کے قریب آ گئی۔

راحت خالہ سر ہلاتی ہوئی واپس مڑ گئی۔

''چینی کتنی بھیا۔'' پیالی میں گرم دودھ انڈیلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''دو چمچ۔''

چینی ملا کر اس نے پتی کا ساشے اندر ڈالا اور پیالی اس کی جانب کھسکا دی۔

''شکریہ۔'' وہ کوشش کے باوجود بہن نہیں کہہ سکا تھا۔

اپنے لیے چائے کی پیالی بنا کر وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''معذرت بھیا، وقت تو کھانے کا تھا، میں نے چائے منگوالی۔''

وہ دماغ میں تمہید کے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے مخاطب کرنے پر جلدی سے بولا۔ ''کوئی بات نہیں کھانا میں کھا کر آیا تھا۔''

''اپنے بھیا کو بھی بتا دیں نا کہ جلدی کھانا کھا لیا کریں، ناشتا کر کے گئے ہیں اور اب شام کو کھائیں گے ۔میری تو سنتے ہی نہیں ہیں۔'' وہ مسلسل باتیں کرتے ہوئے پاشا کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

وہ ہنسا۔ ''میں نے کوئی ایسا مشورہ دے کر بے عزت ہونا ہے کیا۔''

''آپ کو بھی ڈانٹتے ہیں۔'' تناوش نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''نہیں۔'' پاشا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ٹھاک پٹائی کرتے ہیں۔''

اس کی بات پر تناوش کی مترنم ہنسی سے ڈرائینگ روم گونج اٹھا تھا۔ ''اس کا مطلب میں یونہی شاکی ہوں۔ ان کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔''

''اچھا میں ایک خاص مقصد سے حاضر ہوا تھا..... بہن۔'' بڑی مشکل سے بہن کا لفظ منہ سے نکالتے ہوئے اس نے مطلب کی بات کی طرف قدم بڑھائے ورنہ ہر گزرتے لمحے وہ اسے اچھی سے اچھی لگتی جا رہی تھی۔ اسے سچ مچ لگنے لگا تھا کہ وہ کوئی ساحرہ ہے اور اگر اس نے جلدی مطلب کی بات نہ چھیڑی تو اسے مقصد سے ہٹا دے گی۔ اس کے ساتھ چند لمحے گزرا کر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ کبیر دادا کی زندگی کے لیے نہایت خطرناک تھی۔

''حکم کریں بھیا۔'' وہ چائے کی خالی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''پیشگی معذرت کرنا چاہوں گا کہ آپ کو یقیناً میری باتوں سے تکلیف پہنچے گی۔''

وہ پرخلوص لہجے میں بولی۔ ”بڑے بھائی، معذرت کا لفظ منہ سے نکال کر شرمندہ ہی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بڑے بھائی کا چھوٹی بہن کو آپ جناب کہنا بھی کچھ جچتا نہیں ہے۔“

”شکریہ بہن، مگر کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جن سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔ کبیر دادا نے میرے ذمہ یہ کام لگا کر مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔“

”آپ بے فکر ہو کر بات کریں بھیا، ایسی کوئی بات نہیں۔“ تناوش کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ کسی انجانے اندیشے سے اس کا دل لرزنا شروع ہو گیا تھا۔

”تمھاری یہاں آمد اور کبیر دادا سے شادی کن حالات میں ہوئی، دادا مجھے تفصیل سے بتلا چکے ہیں۔ ان کا مقصد تمھیں دلاور شیخ جیسے سڑک چھاپ سے نجات دلانا تھا، اسی چکر میں کچھ بڑے لوگ دادا کے اس اقدام کے مخالف ہو گئے اور دادا ان کے شر سے نجات دلانے کے لیے تمھیں دوسرے دن گھر نہ بھیج سکے۔ سچ کہوں تو کبیر دادا کا خمیر ہی ایسی مٹی سے اٹھا ہے جو پیار محبت کی آلودگی سے پاک ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا صرف ایک ہی مصرف ہے اور اس مقصد کے لیے انھیں نئی، کم عمر اور خوب صورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یقین مانیں وہ تمھاری عادتوں اور حرکتوں سے سخت بیزاری اور کوفت محسوس کرتے ہیں، مگر تمھارا دل ٹوٹنے کے خیال سے کچھ کہہ نہیں پاتے۔ آج ہی بتا رہے تھے کہ بعض اوقات ماحول کو دیکھ کر وہ مزاحیہ انداز میں تمھاری محبت کا اقرار کر چکے ہیں، مگر وہ بس دل لگی کے طور پر تھا۔ تم ان کے جوتے اتارتی ہو، انھیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی ہو، صبح، شام رخصت کرتے وقت دعا پڑھ کر ان پر پھونکتی ہو اور ایسی ہی چند اور حرکتوں سے وہ سخت نالاں ہیں۔ اور اسی وجہ سے دوسرا دن ہے وہ مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ تمھیں رخصت کر دوں۔ یہ بات انھوں نے خود اس لیے نہیں کی کہ تمھارا دل نہ ٹوٹ جائے۔“ یہ کہتے ہوئے پاشا نے مزاحیہ انداز اپنایا۔ ”حالانکہ میرے کہنے سے بھی تو تمھارا دل ٹوٹے گا نا۔ خیر یہاں سے جانے کے لیے تمھیں جتنی دولت درکار ہو مجھ سے بے جھجک مانگ سکتی ہو۔ باقی جہاں تک تمھاری حفاظت کا تعلق ہے تو انھوں نے مجھے چھوٹ دی ہے کہ تمھیں پاکستان کے کسی بھی شہر میں منتقل کر سکتا ہوں۔ وہاں پر اچھی رہائش گاہ اور کار وغیرہ خرید کر دینا بھی میری ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی مطالبہ ہے تو تم بے تکلفی سے اظہار کر سکتی ہو، مگر اب مزید یہاں نہیں رہ سکتیں۔“

پاشا کے الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھے جو اس کے کانوں میں قطرہ قطرہ کر کے ٹپکایا جا رہا تھا۔ ''اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ بہ مشکل بولی۔ ''آپ کو بھائی کہنے کے بعد کسی گستاخی کے اظہار پر مجھے شرمندگی ہوگی۔''

''شکریہ، مگر میں اظہارِ حقیقت سے تو پیچھے نہیں ہٹ سکتا ناں اور سچ یہی ہے کہ کبیر دادا تمھیں مزید برداشت نہیں کر سکتے۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ خود کہہ دیتے، وہ تو تھوڑی دیر پہلے بہت پیار سے رخصت ہو کر گئے ہیں۔''

''وجہ میں بتا چکا ہوں۔ بلکہ گزشتہ رات وہ تمھیں گھر سے اٹھانے گئے تھے تو اس کی وجہ محبت نہیں تمھاری حفاظت کا خیال تھا۔ انھیں اڑتی اڑتی ہوئی اطلاع ملی تھی کہ کوئی تمھیں اغواء کرنے کی کوشش میں ہے پس وہ تمھیں گھر سے اٹھا لائے۔ اور تمھیں ڈر نہ لگے اس وجہ سے تمھاری تالیف قلب میں لگ گئے۔ بہ قول ان کے تم نے ویسے بھی ایک دو دن میں چلے جانا ہے۔'' پاشا کو کبیر دادا کا رات کو تناوش کو لینے کے لیے جانا اور صبح کی آذان کے وقت لوٹنے کی بابت چوکیدار وغیرہ سے معلوم ہو گیا تھا۔ اسی معلومات کو اس نے اپنے حق میں استعمال کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''اگر محبت نہیں ہے تو میری حفاظت کا اتنا خیال کیوں۔'' تناوش منمنائی۔

''تمھیں کسی گینگسٹر کی انا کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ اور گینگسٹر بھی ایسا، کہ زیر زمین حلقوں میں ان کے مخالف بھی دادا کے لاحقے کے ساتھ جن کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے ایک دفعہ جب انھوں نے تمھاری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی ہے تو کسی زمینی طاقت کو تمھیں نقصان پہنچانے کی اجازت دیں گے؟ تمھاری حفاظت کوئی محبت وغیرہ نہیں ان کی انا اور نام کا معاملہ ہے۔''

تناوش سسکی۔ ''وہ ایسے نہیں ہیں۔''

اچانک پاشا کے دماغ میں ایک ترکیب ابھری۔ وہ فوراً بولا۔ ''ثبوت دے سکتا ہوں۔''

''کیسا ثبوت؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کبیر دادا کا یوں کسی تیسرے کو درمیان میں لانے کے عمل نے اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اگر وہ خود یہ الفاظ کہتا تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ اور نہ وہ اس کے کہنے پر جانے پر تیار ہوتی مگر بھائی کہنے کے باوجود اس سے پاشا کی باتیں برداشت نہیں ہو پا رہی تھیں۔

''اچھا خاموشی سے سننا، گو یہ کام میں دادا کی مرضی کے خلاف کر رہا ہوں مگر تمھیں یقین دلانے کے لیے شاید یہ ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل فون نکالا اور کبیر دادا کا نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملتے ہی پاشا نے سپیکر آن کر دیا تھا۔

''جی پاشا صاحب!'' کبیر دادا کی پر رعب آواز ابھری۔

''دادا، پوچھنا یہ تھا کہ مس تناوش جسے آپ اپنے لیے مصیبت سمجھتے ہیں کو کتنی رقم دے سکتا ہوں، میرا مطلب اگر بات پانچ دس کروڑ تک پہنچ جائے تو؟''

''پیسوں کی میرے پاس کوئی کمی نہیں، بس اس سے جان چھڑا دو یار۔'' کبیر دادا نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز میں کہا تھا مگر تناوش کی سماعتوں میں ایک زوردار چھناکا ہوا، گویا تانبے کا برتن بلندی سے پختہ فرش پر گرا ہو۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبیر دادا کا یہ کہنا تناوش کی ذات پر اس کے اعتماد کا اظہار تھا کہ وہ کوئی بھی قیمت لے کر اسے نہیں چھوڑے گی۔ دوسرا وہ پاشا کو بھی یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ تناوش سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ حالاں کہ گزشتہ شب اس کے دل سے تناوش کو علاحدہ کرنے کا خیال نکل چکا تھا۔ جبکہ پاشا نے تناوش کو مختلف انداز میں بات کر کے کبیر دادا سے ایک ہی فقرہ اگلوا کر اپنی ساری بات کی تصدیق کروا دی تھی۔

''شکریہ دادا، بس یہی پوچھنا تھا امید ہے جلد ہی کوئی خوش خبری سناؤں گا۔'' اس نے کبیر دادا سے زیادہ بات چیت کی کوشش نہیں کی تھی کہ لمبی بات سے بھانڈا پھوٹ بھی سکتا تھا۔

رابطہ منقطع کرتے ہی اس نے تناوش کی طرف دیکھا جس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹ زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک دم پاشا کے دل میں دکھ کی لہر اٹھی۔ اس کا دل چاہا کہ اس لڑکی کو حقیقت بتا دے۔ جس کی حالت مرنے والی ہو گئی تھی، مگر پھر کبیر دادا کو نجات دلانے کی خواہش اس کی رحم دلی پر غالب آ گئی۔

اضطرابی انداز میں ہاتھ مروڑتے ہوئے وہ کراہی۔ ''آپ اپنے بھیا کے ساتھ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں، ہے نا۔''

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے بہن، اصل میں کبیر دادا تمھارا سامنا نہیں کرنا چاہتا اسی وجہ سے اس نے مجھے

درمیان میں ڈالا ہے۔اور میں تم سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ اگر تمھارے دل میں کبیر دادا کی ذرا سی عزت موجود ہے تو ان کے سامنے آ کر انھیں نادم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔گو اس کے بعد بھی وہ تمھیں یہاں رکھنے پر تیار نہیں ہوں گے، مگر پھر بھی میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ تم ان کے سامنے نہیں آؤ گی۔اور امید ہے ایسے آدمی کی بات نہیں ٹالو گی جسے تم بھائی کی جگہ دے چکی ہو۔" پاشا نے اس کے دل میں موجود بھائی کے جذبات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا۔

"میں کیا کروں۔" وہ آنسوؤں کو مزید نہیں روک پائی تھی۔

"دیکھو بہن رونے دھونے سے کام نہیں بنے گا۔بس یہ سوچیں کہ اب تمھیں کہاں جانا ہے۔تاکہ میں اس شہر میں تمھاری رہائش کا بندوبست کر دوں۔یہاں کبیر دادا سے علاحدہ ہوتے ہی تمھیں خطرے گھیر لیں گے۔"

"ان سے علاحدہ ہو کر زندہ کون رہنا چاہتا ہے۔" اس نے سسکی بھری۔

"بے وقوف نہ بنو، بات زندگی موت کی نہیں ہے۔تم نہیں جانتی کہ کراچی میں کس قسم کے درندے بھرے پڑے ہیں۔وہ بھیڑیے تمھاری جان نہیں عزت کے دشمن ہیں۔اور میں نہیں چاہتا کوئی تمھارے دوپٹے کی طرف میلا ہاتھ بڑھائے۔یہی کچھ کبیر دادا کی بھی خواہش ہے۔اس لیے گھر جا کر اپنی امی جان سے مشورہ کر لو تاکہ میں مطلوبہ شہر میں تمھاری رہائش کا بندوبست کر دوں۔اور فکر نہ کرنا اس سے اچھا مکان لے کے دوں گا اور مستقبل کے لیے بھی مستقل آمدن کا کوئی بندوبست کروں گا۔آخر تمھیں بہن کہا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے۔کچھ بھی نہیں۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

"بے وقوفوں کی سی بات نہ کرو پگلی۔نہ تم کبیر دادا کے لیے بنی ہو نہ وہ تمھارے لیے۔تم دونوں کا مزاج ،طبیعت، عادات بالکل مختلف ہیں۔اور پھر تم نمازی پرہیزی لڑکی ہو اور وہ ٹھہرے گینگسٹر جو شراب بھی پیتے ہیں ،لڑکیوں سے غلط تعلقات بھی رکھتے ہیں، قاتل بھی ہیں تو ایسے میں نبھاہ کیسے ہوگا۔یہ بات وہ بھی جانتے ہیں اور تمھیں بھی معلوم ہوگی۔اس لیے یہ رونے دھونے کا نہیں شکر کا مقام ہے۔"

"کیا آپ ہمارے گھر کا اچھے داموں سودا کروا کر ہمیں اس کے بدلے دوسرے شہر میں گھر لے کے دے سکتے ہیں۔"

"کہا نا پیسوں کی فکر نہ کرو۔" پاشا کا دل خوشی سے دھڑکا اسے لگا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا ہے۔ تناوش کا کانٹا بہت خوش اسلوبی سے نکل رہا تھا۔

"نہیں بھیا، امی جان کبھی بھی حرام کے پیسے کو قبول نہیں کریں گی، بس آپ ہمارے گھر کا سودا کروا کر ہمیں دوسرے شہر میں منتقل کروا دیں۔"

"ٹھیک ہے یہ بھی ہو جائے گا۔"

"مجھے گھر تک چھوڑ دیں گے۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔" پاشا خوش دلی سے بولا۔

"اچھا میں اپنا سامان سمیٹتی ہوں۔" وہ بوجھل قدموں سے خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ گھنٹا بھر پہلے وہ جانے کن خوش کن خیالوں میں گم تھی اور اب اس کا دل جیسے کند چھری سے کاٹا جا رہا تھا۔ کبیر دادا کے بارے اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ اور حقیقت بس اتنی ہی تھی کہ اسے تناوش کے ان چھوئے اور پرکشش بدن کی طلب تھی۔ اسی وجہ سے اس نے تناوش کی مدد کی تھی اور اسی وجہ سے اس کی جھولی میں قرب کی چند راتیں ڈالی تھیں۔ خوب صورت عورتوں کے لیے مرد ذات یونہی نرم دل بن جاتی ہے اور وہ کبیر دادا کی اس نرمی کو محبت اور چاہت سمجھ بیٹھی تھی۔

اپنے کپڑے اور کتابیں دو مختلف لفافوں میں ڈال کر اس نے حسرت بھری نگاہ اس خواب گاہ پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔ وہاں گزارے چند دن اس کی زندگی کا حاصل تھے۔ ایک غریب بے توقیر لڑکی ایسی خواب گاہ اور کوٹھی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی اور وہ عارضی طور پر سہی اس کی مالکن بننے کی لذت سے تو بہرہ مند ہو چکی تھی۔ کبیر دادا کا لایا ہوا لباس اور الماری کی چابی اس نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔

"دونوں شاپر ڈرائنگ روم میں رکھ کر وہ راحت خالہ سے الوداعی ملاقات کے لیے باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ تناوش کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ کام کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔ قریب جاتے ہی وہ۔ "خالہ۔" کہہ کر اس سے لپٹ کر سسک پڑی۔

"کیا ہوا خالہ کی جان۔" راحت خالہ پریشان ہو گئی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتی تھیں خالہ، وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتے۔ جس مرد کو نت نئی حسینائیں دستیاب ہوں وہ میرے جیسی ایک پر کب قانع رہ سکتے ہیں۔“

راحت خالہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا پھر کوئی کلموہی آ گئی ہے۔“

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”نہیں خالہ، انھوں نے پاشا بھائی کی زبانی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم سنا دیا ہے۔“

”کک..... کیا..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ راحت خالہ ہکلا گئی تھی۔

”ایسا ہی ہوا ہے خالہ۔ بس دعاؤں میں یاد رکھنا اور اگر مجھ سے کوئی غلطی یا گستاخی ہو گئی ہو تو بیٹی سمجھ کر معاف کر دینا۔“

”میری پیاری بیٹی۔“ راحت خالہ آنکھوں میں آنسو بھر کر اس کی پیشانی چومنے لگی۔ تناوش ایک جھٹکے سے اس سے علاحدہ ہو کر باہر نکل گئی۔ پاشا ڈرائینگ روم میں اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ ڈرائینگ روم سے باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھی سے نکل آئے تھے۔ اس سے گھر کا پتا معلوم کر کے پاشا اس سمت چل پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے آنسو روکے بیٹھی تھی۔

”اچھا گھر جاتے ہی ماں سے مشورہ کرنا تاکہ کل پرسوں میں تمھیں یہاں سے کسی دوسرے شہر میں منتقل کر دوں۔ کبیر دادا کی تمھیں طلاق دینے کی خبر پھیلتے ہی تمھارے لیے خطرے کا آغاز ہو جائے گا۔“

”کک..... کیا وہ طلاق دیں گے۔“ اس کی آنکھیں دوبارہ بہنے لگی تھیں۔ ”مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ ٹھیک ہے میں ساری زندگی انھیں چہرہ نہیں دکھاؤں گی مگر انھیں کہیں مجھے طلاق نہ دیں۔ میں بس ان کے نام ہی پر بقیہ عمر گزارنا چاہتی ہوں۔“

”یہ نہ ہو میں تمھارے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دوں۔“ پاشا نے پیار بھرے انداز میں اسے ڈانٹا۔ ”بے وقوف یوں اپنی زندگی کن کے لیے برباد کر رہی ہو، ان کے لیے جنھوں نے رات گزارنے کے لیے نئی لڑکی کو بلاوا بھیج دیا ہے۔ کل دوسری ہو گی اور پرسوں تیسری۔ انھیں شاید تمھارا نام بھی دو تین دنوں میں بھول جائے۔ جن کی خواب گاہ روزانہ نت نئی لڑکیوں سے سجی رہے گی انھیں کوئی تناوش کیسے یاد رہ پائے گی۔ یاد رکھنا بہنا، محبتیں اس ماحول میں پنپتی ہیں جب غم غلط کرنے کے لیے جذباتی سہارا نہ ملے۔ ان کی زندگی میں سینکڑوں لڑکیاں آ کر جا

چکی ہیں اور ہزاروں چشم بہ راہ ہیں۔آج بنت حوا نے خود کو کتنا سستا کر دیا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔بس خریدار کے پاس رقم ہونا چاہیے شکل وصورت کی کوئی قید نہیں۔کبیر دادا تو صورت کے لحاظ سے بھی امیر ہیں۔تو ایسے شخص کے لیے اپنی زندگی برباد نہ کرو۔طلاق کے بعد چند ماہ تو عدت گزارنا پڑتی ہے اس کے بعد امید ہے تم سنبھل جاؤ گی۔کوئی ایسا ویسا لڑکا دیکھ کر شادی نہ کر لینا، مجھے کال کر کے مشورہ ضرور لینا میں خود لڑکے کے خاندان اور کردار وغیرہ کی پڑتال کروں گا اور پھر تمھاری شادی کراؤں گا۔"

"بھیا۔" وہ سسک پڑی۔"میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔"

پاشا نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل تھامتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔"پاگل نہیں بنتے ہیں بہنا ،یقین مانو تم تھوڑے عرصے بعد ہی اس بے وقوفی پر ہنسا کرو گی۔"

ایک تلخی سی اس کے اندر سے ابھری۔"اپنی اور ان کی حیثیت دیکھ کر تو اب بھی ہنسی آتی ہے۔"

"کیا میں یہ یقین کر سکتا ہوں کہ تم ان سے رابطہ نہیں کرو گی۔" پاشا نے یقین کرنا چاہا۔

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔"کبھی نہیں کروں گی، کبھی بھی نہیں۔اگر ان کی کال آئی تو بھی وصول نہیں کروں گی۔"

"شاباش، اب ذرا اپنا موبائل فون ادھر کرو۔"

"یہ لیں۔" اس نے پرانا سا موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔اس نے کبیر دادا کا نمبر مٹا کر تمام بھیجے گئے اور وصول کیے ہوئے پیغامات اور کالیں وغیرہ مٹائیں اور اپنا نمبر محفوظ کر کے موبائل فون اس کی جانب بڑھا دیا۔

"میں نے کبیر دادا کا نمبر مٹا دیا ہے اور اپنا نمبر محفوظ کر دیا ہے۔اسی طرح میرے پاس بھی تمھارا نمبر آ گیا ہے۔اب کوئی بھی مسئلہ وغیرہ ہوتا ہے تو مجھے کال کر دینا۔"

وہ گھبرا کر بولی۔"مم.....مگر ان کا نمبر کیوں مٹا دیا ہے۔"

پاشا نے صفائی سے جھوٹ بولا۔"ایسا انھوں نے کہا تھا۔وہ نہیں چاہتے تم ان سے رابطہ کر سکو۔" تناوش سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

اس کے گھر کے سامنے کار روک کر وہ بولا۔"دیکھو گھر جا کر رونا نہیں، خالہ یونہی پریشان ہو جائیں گی

۔اوران سے یاد سے مشورہ کر لینا، میں بعد میں کال کر کے معلوم کر لوں گا۔اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔"

وہ اضطرابی انداز میں ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔"بھ..... بھیا کیا ان کی تصویر مل سکتی ہے۔"

پاشا نے افسوس بھرے انداز میں دائیں بائیں سر ہلایا۔وہ خفیف انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے کل ان کی تصویر بلکہ بہت ساری تصویریں دے دوں گا اور کچھ؟"

"شکریہ بھائی۔" وہ باہر نکل کر عقبی نشست پر پڑا اپنا سامان اٹھانے لگی۔

☆.....☆.....☆

تناوش کو گھر چھوڑتے ہی اس نے دوبارہ کبیر دادا کی رہائش گاہ کا رخ کیا اور خواب گاہ میں جا کر تصویر کے عقب میں چھپی تجوری کھول لی۔اس میں بھرے کروڑوں روپے ایک کالے لفافے میں ڈال کر وہ خواب گاہ سے باہر نکلا اور اوپری منزل پر موجود ایک بند کمرے کے دروازے پر جا کر رک گیا۔وہ تالا کیا ہوا کمرہ کافی عرصے تک اس کے استعمال میں رہ چکا تھا۔اور یہاں سے جانے کے بعد بھی یہ کمرہ اسی کے نام پر مختص تھا۔تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور کپڑوں کی الماری میں رقم چھپا کر باہر نکل آیا۔کوٹھی سے نکلتے ہی وہ کبیر دادا کو کال کرنے لگا۔وہ ساحل والے اڈے سے اٹھ کر گھر جانے کی تیاریوں میں تھا۔

"دادا آپ تھوڑی دیر وہیں رک کر میرا انتظار کریں ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔"

"یار، یہ بات چیت بعد میں نہیں ہو سکتی۔" کبیر دادا کو تناوش کے پاس جانے کی جلدی تھی۔گزشتہ دو دن وہ مسلسل اپنے گھر جاتی رہی تھی اور آج وہ خوش قسمتی سے گھر پر موجود تھی۔کبیر دادا جلد از جلد گھر جا کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔

"دادا کہا نا بہت ضروری مسئلہ ہے، ایک بہت بڑی خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا جلدی آؤ۔" وہ گویا بادل نخواستہ مان گیا تھا۔

پاشا کو وہاں پہنچنے میں گھنٹا لگا تھا۔کبیر دادا بیزاری اور کوفت کا روپ دھارے اس کا منتظر تھا۔

نشست سنبھالتے ہی وہ چہکا۔"مبارک ہو دادا، کام ہو گیا۔"

"کیا، کون سا کام؟" اس کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی تھی اور دل کسی اندیشے سے دھڑکنے لگا تھا۔

"بھابی چلی گئی ہے اور وہ کل پرسوں تک وہ ماں سے مشورہ کر کے اس شہر کا نام بتا دے گی جہاں انھوں نے منتقل ہونا ہے۔"

"یار میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" کبیر دادا نے بیزاری بھرے لہجے میں اسے جھڑکا۔

پاشا اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "میں بھی۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب میں جا سکتا ہوں۔" کبیر دادا نے نشست چھوڑی۔

"میری بات مکمل نہیں ہوئی دادا۔"

"بکو۔" نہ جانے کیوں کبیر دادا کو بے اطمینانی محسوس ہونے لگی تھی۔

"یہ سچ ہے، لیکن اس مکار نے فوراً مجھے بھائی بنا کر جذباتی طور پر دھونس جمائی اور یہ وعدہ لے لیا کہ وہ آپ کا سامنا نہیں کرے گی۔"

"کیسے نہیں کرے گی سامنا۔" کبیر دادا کی آواز میں شامل غصے نے پاشا جیسے نڈر کو بھی لرزا دیا تھا۔

"دادا، آپ اپنے کہے سے پھر رہے ہیں۔"

"نہیں یہ طے ہوا تھا۔ اور میں نے کہا تھا کہ میں اس کی آنکھوں میں ندامت دیکھنا چاہتا ہوں، میں خود کانوں سے سن کر یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر جانے پر ہنسی خوشی راضی ہے۔"

"اس کی مرضی میں آپ کو سنوا سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ آپ کو وعدہ کرنا پڑے گا کہ آپ اس سے بات نہیں کریں گے۔"

"سناؤ۔" کبیر دادا اپنی غیر ہوتی حالت پر مشکل سے قابو پائے ہوئے تھا۔ پاشا نے فوراً تناوش کا نمبر ملا کر سپیکر آن کر دیا۔

"اسلام علیکم بھیا۔" کال وصول کرتے ہی اس کی مدھر آواز ابھری۔ پاشا کو یوں بھیا کہنے پر کبیر دادا کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

"وعلیکم اسلام بہنا، کیا ماں جی سے مشورہ کر لیا ہے کہ کس شہر میں منتقل ہونا ہے۔"

وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ''ابھی تک نہیں کیا۔''

''اچھا جلدی بات کرو، کیونکہ تمھیں یہاں کافی خطرہ ہے اور میں جلد از جلد تمھیں کسی محفوظ جگہ پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ باقی پریشان نہ ہونا تم نے جو کام بتایا ہے وہ ہو جائے گا۔ خواہ مخواہ نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے بڑا بھائی بنا لیا ہے تو بھائی بن کر دکھاؤں گا۔'' پاشا نے اس کی کبیر دادا کی تصویریں مانگنے والی بات کو ندامت سے جوڑ کر کبیر دادا کی سوچوں کو من چاہا رخ دیا۔

''شکریہ بھیا۔'' تناوش بھولے پن سے اس کی چال میں آ گئی تھی۔

''اور فکر نہ کرنا، جیسے ہی کبیر دادا نے طلاق دی میں اسٹام پیپر پر ان کے دستخط کرا کر تمھارے حوالے کروں گا۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے۔''

''بھیا.....'' تناوش یقیناً کچھ الٹا سیدھا اگلنا چاہتی تھی۔ پاشا نے فوراً پیار بھرا انداز اپناتے ہوئے اسے جھڑکا۔

''اب بس ایک لفظ بھی نہ کہنا اس متعلق اور وعدہ کرتا ہوں کبیر دادا تمھارے سامنے نہیں آئے گا۔ اپنا خیال رکھنا خدا حافظ۔'' اس نے تناوش کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ کبیر دادا کا ٹوٹو بدن میں لہو نہیں کی زندہ مثال بنا بیٹھا تھا۔ ساری گفتگو سن کر اسے پاشا پر ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا۔

''دادا آپ پریشان نظر آ رہے ہیں۔'' موبائل فون جیب میں ڈالتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔

کبیر دادا اسے جواب دیے بغیر میز کی چکنی سطح پر نظریں جمائے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔

''دادا آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ہنسی خوشی جانا چاہے گی تو آپ نہیں روکیں گے۔ اب آپ نے اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔ اسے طلاق بھی چاہیے اور وہ آپ کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی۔''

''سامنا تو اسے کرنا پڑے گا۔'' کبیر دادا نے جیسے خود کلامی کی تھی۔ موت سے آنکھیں ملانے والا ایک لڑکی کی بے وفائی پر اپنے شاگرد سے نگاہ نہیں ملا پا رہا تھا۔

اسی وقت پاشا کے موبائل فون پر پیغام کی گھنٹی بجی۔ تناوش نے پیغام بھیجا تھا، وہ پڑھنے لگا.....

''بھیا، پلیز انھیں کہہ دیں نا کہ مجھے طلاق نہ دیں۔ بے شک ساری زندگی انھیں منہ نہیں دکھاؤں گی۔ پلیز

وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔"

"بے وقوف ہو تم۔" اس نے فوراً ہی جواب دے کر وہ پیغام مٹا دیا۔

"بھیا، پلیز اگر مجھے بعد میں لگا کہ طلاق لینا ضروری تھا تو میں اس وقت آپ کو کہہ کر طلاق لے لوں گی، مگر فی الحال نہیں۔ پلیز انھیں کہیں نا کہ اگر انھوں نے مجھے طلاق دی تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے دوسرے میسج کا جواب لکھ کر بھیجا اور دوسرا پیغام بھی مٹا دیا۔

"اسی کے پیغام ہیں۔" کبیر دادا کو جانے کیسے اندازہ ہوا تھا۔

"ہاں۔" پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر ایسے نہیں جو آپ کو پڑھائے جا سکیں۔ وہ بے چاری ڈری ہوئی ہے۔ مجھے بار بار وعدے یاد دلا رہی ہے، منتیں کر رہی ہے۔ اور کیوں نہ کرے آپ کا خوف اب تک ہمارے دلوں سے نہیں نکل سکا وہ بے چاری تو چھوٹی سی لڑکی ہے۔"

"وہ چھوٹی سی لڑکی، عملوں کی پوری ہے۔" کبیر دادا نے دانت پیسے۔

"دادا اگر اسے نادم اور شرمندہ کر کے آپ کی انا کو تسکین مل سکتی ہے تو چلیں ابھی اس کے پاس چلتے ہیں۔ وہ ایک غریب بے سہارا لڑکی ہے، زندگی میں سوائے محرومیوں، حسرتوں اور پوری نہ ہونے والی خواہشوں کے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ پہلی بار اے سی میں سوئی، پہلی بار فرج کا ٹھنڈا پانی چکھا، ناشتے میں باسی روٹی کھانے والی، شہد، جام، انڈے، مکھن وغیرہ سے لطف اندوز ہوئی۔ اتنا آرام دہ بستر دیکھا۔ پر تعیش خواب گاہ اور آرام دہ باتھ روم کی سہولت محسوس کی۔ ملازموں کی سی زندگی گزارنے والی کو ملازموں پر حکم چلانے کا موقع ملا اور بے چاری اس زندگی کے حصول کی خواہش میں جی جان سے جت گئی۔ میرے سامنے بھی پہلے تو اس نے اپنی محبت وغیرہ کا ڈھنڈورا پیٹا، لیکن جب میں نے اسی طرح کی کوٹھی، کار اور منہ مانگی دولت دینے کا وعدہ کیا تو اپنے دعوے پر قائم نہ رہ سکی اور پھر آپ کا سامنا نہ کرنے کی شرط پر ہنسی خوشی طلاق لینے پر آمادہ ہو گئی۔ اب آپ اسے کس بات پر شرمندہ کریں گے۔ یہی پوچھیں گے کہ وہ جھوٹی محبت ظاہر کرتی رہی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا لے گی اور آپ کی انا کو تسکین مل جائے ہے نا۔"

کبیر دادا خاموش بیٹھا رہا۔

”دادا یقین مانیں اس طرح بس میں اس کی نظروں سے گر جاؤں گا۔ کچھ بھی ہے اس کو میں نے بہن کہا ہے ۔اور یقین مانیں اس کی باتیں سن کر وہ مجھے دھوکا باز نہیں لگی۔ گو وہ آپ سے جھوٹی محبت جتاتی رہی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس شادی کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ گو اس کے پس پردہ عیش و آرام کی زندگی کا حصول تھا۔ اب آپ کے بغیر اسے یہ زندگی مل رہی تھی تو اس نے آمادگی ظاہر کرنے میں دیر نہ لگائی۔ میں نے بھی اس سے سچ اگلوانے کے لیے بڑے وعدے اور قسمیں کھائیں کہ اسے آپ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

کبیر دادا نے گہرا سانس لے کر پاشا کی باتوں کو ہضم کرنے کی کوشش کی مگر اس کے اندر عجیب قسم کی آگ سلگ رہی تھی۔ تناوش ایسے کیسے جا سکتی تھی۔ اب جبکہ وہ اس کی محبت پر اعتبار کر بیٹھا تھا تو اس نے ایک دم اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہیں۔“ پاشا پھر اس کی سوچوں میں مخل ہوا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے، اسے دوسرے شہر میں منتقل کرو۔ اس کے لیے بہت اچھی کوٹھی خریدنا، کالے رنگ کی مرسڈیز لینا اور اتنی رقم دینا کہ اسے کسی سے مدد کی ضرورت باقی نہ رہے۔“

پاشا مسکرایا۔ ”رقم تو میرا خیال ہے اس نے حاصل کر لی ہے، کیونکہ خواب گاہ سے نکلتے وقت دو تین کالے لفافے اس نے پکڑے ہوئے تھے۔ اور ایک بڑے لفافے میں مجھے بڑے نوٹوں کی گڈیوں کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔ مزید گھر جا کر تسلی کر لینا۔“

”دو اڑھائی کروڑ تو ہوگا۔“ کبیر دادا کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اچھا یہ حساب کتاب تو بعد میں کرتے رہیں گے۔ پہلے آپ وعدہ کریں کہ اسے تنگ نہیں کریں گے، میرا مطلب اسے کال وغیرہ بھی نہیں کریں گے۔“

”کہہ دیا نا ٹھیک ہے۔“ کبیر دادا چڑ گیا تھا۔

”اچھا آپ اپنا موبائل فون مجھے دیں۔“ پاشا نے اس کی طرف ہاتھ پھیلایا۔

کبیر دادا نے میز پر پڑا موبائل فون اس کی طرف دھکیل دیا۔ پاشا نے فوراً تناوش کا نمبر کالیں اور پیغامات وغیرہ مٹا کر موبائل فون واپس کبیر دادا کی طرف بڑھا دیا۔

”میں نے اپنی بہن کا نمبر مٹا دیا ہے۔اگر اس کا دل چاہا تو آپ کو کال کرلے گی ورنہ آپ اسے کال نہیں کرسکیں گے۔“

”تمھارا دماغ درست ہے۔“ کبیر دادا دھاڑا۔

”پہلے میری پٹائی کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں اس کے بعد جواب دوں گا۔“

”اس کا نمبر تو نہیں مٹانا چاہیے تھا۔“

”کرنا کیا ہے اس کے نمبر کا۔اگر اسے ضرورت ہوگی تو خود ہی کال کرلے گی۔شاید ندامت وغیرہ کے اظہار کے لیے کال کر بھی لے جو کافی مشکل دکھائی دے رہا ہے۔البتہ آپ کو ہلکا ہونے کی اجازت میں ہرگز نہیں دوں گا۔کبیر دادا ایک چھوٹی سی چھوکری سے محبت کی بھیک مانگتا پھرے یہ مجھے گوارا نہیں۔“

”تم بس بکواس کرسکتے ہو۔“ کبیر دادا نے اسے جھڑکا۔

”نصیحت سمجھیں، مشورہ جانیں یا بکواس کہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔آپ کی صلاحیتوں کو زنگ لگانے والی، آپ کو مقصد سے دور کرنے والی اور آپ کی کامیابی و ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا آج میں نے ہٹا دیا ہے۔اور فکر نہ کرنا اسے بہن کہا ہے تو اس کے لیے کوٹھی کار وغیرہ کا بندوبست میں اپنے پیسوں سے کرلوں گا۔“

”چلنا چاہیے۔“ اس کی بات کا جواب دیے بغیر کبیر دادا کھڑا ہوگیا۔

”مہربانی فرما کر اس کے گھر کا رخ نہ کرلینا۔“ پاشا آخری لمحوں میں اسے نصیحت کرنے سے نہیں چوکا تھا۔البتہ تناوش کو طلاق دینے کا ذکر اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا کہ وہ کبیر دادا کو تھوڑا سا موقع دینا چاہتا تھا۔یوں ایک دم اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں تھا۔اپنی پہلی محبت کو وہ اتنی جلدی تو نہیں دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔

”بھاڑ میں جائے یار۔“ کبیر دادا غم و غصے میں کھولتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بھاں بھاں کرتی ہوئی ماں سے جا لپٹی۔

”کیا ہوا میری شہزادی کو۔“ بشریٰ اسے ساتھ لپٹائے چارپائی پر بیٹھ گئی۔مگر وہ جواب دیے بغیر سسکیاں

بھرتی رہی۔

اس کے ہاتھوں میں تھامے سامان کو دیکھتے ہی بشریٰ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

''اچھا اتنا نہیں روتے، میری شہزادی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی ہے، اتنے رشتے آئیں گے کہ حساب رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر میری گڑیا اپنی پسند کا شہزادہ چنے گی اور آرام سے بقیہ زندگی گزارے گی۔

وہ چیخی ''مجھے ان کے علاوہ کوئی نہیں چاہیے، کوئی بھی نہیں، نہ شہزادہ نہ بادشاہ یا وزیر۔''

بشریٰ اسے سمجھانے لگی۔ ''ہے نا پاگل، ایک غنڈے موالی سے وفا اور محبت کی توقع رکھنا بے وقوفی ہی تو ہے۔ شکر کرو اس نے اتنی آسانی سے تمھاری جان چھوڑ دی۔''

''نہیں چھڑانا مجھے اپنی جان، قید رہنا چاہتی ہوں ان کے پاس۔ آپ چلیں ان سے بات کریں کہ وہ مجھے طلاق نہ دیں۔ میں ان کی ملازمہ بن کر پڑی رہوں گی، کوئی خواہش کوئی تمنا نہیں کروں گی۔ وہ جو مرضی آئے کرتے رہیں مگر مجھے خود سے دور نہ کریں۔ میں انھیں شراب پینے سے بھی منع نہیں کروں گی۔ چلیں نا ماں جی چلیں ان کے پاس وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔'' وہ سسکیاں بھرتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔

''ایسا نہیں بولتے میری جان، اسے محبت نہیں کہتے۔ اگر اس کی نظروں میں تمھاری ذرا سی بھی وقعت ہوتی تو تمھیں یوں کیوں دھتکارتا۔ اپنی رہی سہی عزت گنوانے سے کیا ملے گا۔ جب اسے تم سے محبت ہی نہیں ہے تو میری منت کس کام کی۔ یاد ہے نا کیا کہا تھا کہ، ایسے با اختیار اور صاحبِ حیثیت لوگوں کے لیے ہم غریب مخمل میں ٹاٹ کے پیوند جتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس نے بس تمھاری صورت دیکھ کر شادی کی حامی بھری تھی۔ اور صورت کے پجاری کا دل چند دنوں ہی میں سیر ہو جایا کرتا ہے۔ اب اسے کسی نئی صورت اور تازہ جوانی کی تلاش ہو گی تم اس کے لیے باسی ہو گئی ہو میری شہزادی۔ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہوتی تو اسے معلوم ہوتا نا کہ اس نے کس ہیرے کو ٹھوکر ماری ہے۔''

''نہیں ہوں میں ہیرا، ایک بے حیثیت پتھر سے بھی کم اوقات ہے میری۔ ان کی ملازمہ بننے کے لائق بھی نہیں۔ نہ دیتے بیوی کے حقوق اپنی خدمت تو کرنے دیتے۔ اس بہانے انھیں دیکھتی تو رہتی نا۔'' وہ سسکیاں بھر بھر روتی رہی۔

بشریٰ خاتون کی آنکھیں بھی بیٹی غم میں بھر آئی تھیں، مگر وہ رو کر اپنی بیٹی کے دکھ کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے تسلیاں دیتی رہی، سنہرے مستقبل، ان دیکھے شہزادے اور آرام دہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے بارے باتیں کر کے اس کا ذہن بٹاتی رہی۔ گھنٹے ڈیڑھ میں اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ بشریٰ تھوڑی دیر اس کا سر گود میں لیے بیٹھی رہی اور پھر اسے چارپائی پر لٹا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے چائے بنانے سے پہلے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ تناوش ہڑبڑا کر موبائل فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ پاشا کی کال نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ کسی ان ہونی کی امید میں اس نے کال وصول کرنے کا بٹن دبا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔ گفتگو کے اختتام پر اس کی مایوسی دو چند ہو گئی تھی۔

پھر اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ پاشا کو پیغام لکھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

کار سے اترتے ہی اس کی نظریں دروازے کی چوکھٹ کو دیکھنے لگیں جہاں، سیاہ نشیلی آنکھوں میں محبت کی شمعیں روشن کیے، خوب صورت ہونٹوں پر پیار بھری مسکان سجائے وہ اس کی منتظر کھڑی ہوتی تھی۔

خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ شراب کی الماری کے تالے میں دھاگا پروئی چابی لگی ہوئی تھی۔

''بس اتنا ہی خیال رکھنا تھا۔ اب شراب نوشی مجھے نقصان نہیں پہنچائے گی یا اب تمہارا مطمح نظر پورا ہو گیا ہے۔'' کبیر دادا کے دماغ میں شکوہ کرتی سوچ ابھری اور وہ تجوری کی طرف بڑھ گیا۔ تالہ کھولتے ہی پاشا کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ پیسوں کے نام پر وہاں پھوڑی کوڑی بھی دکھائی نہ دی۔ البتہ اس کے ضروری کاغذات وغیرہ کو اس نے نہیں چھیڑا تھا۔

''تو تمہیں دولت چاہیے تھی، بہت ساری۔'' اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ضرور ملے گی اور بھی ملے گی مگر سکون نہیں ملے گا، کبھی بھی نہیں، یقیناً تم مجھ سے بھی بڑی گنیکسٹر نکلیں کہ مجھے چاروں شانے چت کر دیا۔'' اس کے دماغ میں تناوش کا فقرہ گونجا۔

''کبیر کو دادا کہتے ہو تو مجھے دادی کہا کرو۔'' اس وقت اس کے فقرے پر ہنسنے والے کو آج محسوس ہو رہا تھا کہ

وہ واقعی تناوش دادی ہی نکلی تھی۔

وہ ڈریسنگ روم میں داخل ہوا۔اس کی الماری خالی تھی صرف کبیر دادا کا دیا ہوا لباس وہ وہیں چھوڑ گئی تھی۔

''اتنے پیسے لے گئی ہو اپنے پرانے لباس ہی چھوڑ جاتیں۔''اس کی سوچیں شا کی ہوئیں۔

اپنے ترتیب سے لٹکے ہوئے سارے لباس اس نے الماری سے باہر نکال کر پھینک دیے۔ دراز میں موجود خوشبو میں بسی جرابیں بھی نیچے قالین پر بکھیر دیں۔''نہیں چاہیے تمھاری کوئی خدمت۔''غصے میں کہتے ہوئے اس نے ڈریسنگ روم میں ترتیب سے رکھی تمام اشیاء بکھیر دی تھیں۔''ہاتھ بھی نہ لگانا میری چیزوں کو دفع ہو جاؤ، بڑی آئی محبت جتانے والی.....تم جانتی نہیں میں کبیر دادا ہوں، دنیا مجھ سے ڈرتی ہے۔اور تمھاری یہ جرات کہ مجھے کبیر کہو۔دوبارہ ایسا کہنے کی کوشش بھی کی تو گردن توڑ دوں گا تمھاری۔''وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکل آیا۔

''تمھارا کیا خیال ہے میرے ہاتھ نہیں ہیں، اپنے بوٹ نہیں اتار سکوں گا۔''میز پر بوٹ رکھ اس نے جھک کر باری باری دونوں جوتوں کے تسمے کھولے اور جوتے اتار کر بوٹ ریک کی طرف اچھالتا ہوا چلایا۔''کھول لیے، کیا میرے ہاتھ گھس گئے ہیں یا سانس چڑھ گیا ہے۔ ٹائی بھی کھول لوں گا۔''ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اتارتے ہوئے اس نے قالین پر پھینک دی۔کوٹ بھی اتار کر دور اچھال دیا۔''بچہ نہیں ہوں، سب کام کر سکتا ہوں، بڑی آئی اپنی خدمت سے متاثر کرنے والی، نہیں چاہیے تمھاری خدمت، تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔نہ گھر میں کوئی جگہ ہے اور نہ میری زندگی میں۔''

صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''کھانا نہیں کھاتے تو چائے کی پیالی پی لو.....تھکے ہوئے آئے ہو۔''اس کے دماغ میں تناوش کی آواز گونجی

''کھانا کچھ نہیں چاہیے۔''وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ راحت خالہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

''جی صاحب جی۔''

منہ سے کچھ کہے بغیر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس جانے کا کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''نہیں پیوں گا چائے، کھانا بھی نہیں کھاؤں گا، ہفتہ ہفتہ جرابوں کا ایک ہی جوڑا پہنے رکھوں گا تین تین

بوتلیں شراب کی بھی پیوں گا۔تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے ٹوکنے والی۔ہاں بتاؤ نا تم کون ہو مجھے روکنے والی۔کبیر دادا عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے، کئی آئیں اور کئی گئیں اگر تم خود دفع نہ ہوتیں تو کل پرسوں تمھیں بھی ٹھوکر مار کر بھیج دیتا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا رہا۔آنکھیں بند کرتے ہی وہ چھلانگ لگا کر پھر خیالوں میں آدھمکی.....اس کے بازو پر سر رکھ کر وہ اس کی چھاتی پر ملائم ہاتھ پھیر رہی تھی۔

وہ پوچھنے لگا۔"یہ تناوش بھلا کیسا نام ہے؟"

اس کی مترنم ہنسی گونجی۔"کبھی قرآن پڑھا ہو تو پتا چلے نا جناب کو بائیسویں پارے کی سورہ سبا میں میرا نام ذکر ہوا ہے، پکڑے نہ جانا، ہاتھ نہ آنا، ناممکن الحصول۔پتا نہیں آپ کے قابو میں کیسے آگئی۔"

اس نے منہ بنایا۔"جی مجھے کسی کو قابو کرنے کا کوئی شوق نہیں۔"

وہ وارفتگی سے بولی۔"مگر مجھے تو آپ کے قابو میں آنے کا شوق ہے نا۔"

"جھوٹی، دورغ گو، غلط بیاں دھوکے باز .....بکواس کرتی ہے۔" وہ پھر غم و غصے میں بڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔اس کی نظر شراب کی الماری کی طرف اٹھی اور وہ اسی طرف بڑھ گیا۔اکٹھی تین بوتلیں ہاتھ میں پکڑ کر وہ واپس صوفے پر آن بیٹھا۔

"کسی میں اتنی جرات نہیں کہ مجھے شراب نوشی سے روک سکے۔جتنی مرضی ہو گی پیوں گا۔بوتل کھول کر اس نے گلاس میں انڈیلنے کا تکلف کیے بغیر بوتل منہ سے لگالی۔تلخ سیال نے اس کی چھاتی میں آگ جیسی سلگا دی تھی۔مگر وہ غٹاغٹ پیتا رہا۔ایک بوتل خالی کر کے اس نے دوسری بوتل کھول لی۔اور دوسری کے ختم ہونے پر تیسری کو ہونٹوں سے لگالیا۔ایک دم خالص شراب کی اتنی مقدار معدے میں انڈیلنے سے اس پر مدہوشی چھانے لگی۔وہ چوتھی بوتل لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھا، لڑکھڑاتے قدموں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔وہ لہراتا ہوا قالین پر گرا۔اس کا سر بڑی مشکل سے بیڈ سے ٹکرانے سے بچا تھا۔ایک دو لمحہ اسی طرح پڑے رہنے کے بعد وہ سر جھٹکتا ہوا بیڈ کا کنارہ پکڑ کر اوپر اٹھا اور پھر اوندھے منہ ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔

"قریب نہ آنا، مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں، میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔" اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی ہے۔"اپنے گندے ہاتھ میرے سر سے دور رکھو، میں کہہ رہا ہوں دور رکھو اپنے ہاتھ

۔" وہ ایک ہاتھ سے اسے دور جھٹکنے لگا۔ وہ شاید جلدی سے پیچھے ہٹ گئی تھی تبھی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ نہیں سکا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ اپنا ہاتھ پیچھے کرتا وہ دوبارہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی، اس کی شوخ، مترنم اور چنچل ہنسی کبیر دادا کو غصہ دلانے لگی۔ مگر اس میں اسے دور ہٹانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ "دور ہو جاؤ..... پرے ہو جاااااؤوو....." اس کی آواز نیند میں ڈوب گئی۔

"بس اتنی ہی محبت تھی تمھاری۔" اسے قیمتی کار سے اترتے دیکھ کر کبیر دادا نے طعنہ دیا۔ "دھوکے باز کہیں کی، مطلبی خود غرض۔ میرے جذبات سے کھیلتے ہوئے تمھیں ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔"

وہ گھبرائے بغیر استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والا قاتل، شرابی اور بدکردار شخص مجھے اخلاق سکھا رہا ہے واہ۔"

وہ چلایا۔ "بکواس بند کرو۔"

"ورنہ کیا کرلو گے، مجھے بھی قتل کردو گے..... لو چلاؤ گولی، ڈرتی نہیں ہوں تم سے۔ جو کر سکتے ہو کرلو۔"

"تمھارے جیسی گھٹیا عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"تعریف کرنے کا شکریہ۔" اس کی گنگناتی ہنسی نے کبیر دادا کے کانوں میں رس انڈیلا۔ اتنا غصہ ہونے کے باوجود وہ اس کی ہنسی سے خود کو متاثر ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

"تمھیں یہاں بھی تو عیاشی بھری زندگی مل سکتی تھی، پھر تم نے دور جانے کا فیصلہ کیوں کیا۔" اس مرتبہ اس کے لہجے میں غصے کے بجائے شکوے کا عنصر نمایاں تھا۔

اس نے کندھے اچکائے۔ "کسی کی ملازمہ بن کر رہنا کون پسند کرتا ہے مسٹر کبیر۔"

"ملازمہ اور بیوی میں فرق ہوتا ہے۔"

"نام کی حد تک، کام دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے اور جب آزادی کی زندگی میسر ہو تو کیا ضرورت ہے قید میں رہنے کی۔"

"پلیز....." وہ منتوں پر اتر آیا۔

"ہاہاہا۔" اس نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔ "تم تو بہت بڑے دادا ہو، اتنی جلدی گھٹنے ٹیک دیے۔" بے پروائی سے

کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی اور کبیر دادا حسرت بھری نظروں سے اسے گھورتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

''تھوڑا سا تو کھالو۔'' ماں نے نوالہ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔

''دل نہیں چاہ رہا ماں جی۔'' اس نے ماں کا ہاتھ دور دھکیل دیا۔

''ایسا نہیں کرتے میری جان، زندگی کی خوشیاں کسی ایک ہی شخص سے تو نہیں جڑی ہوتیں۔ تمھیں اتنے خوب صورت، وجیہہ اور پرکشش جوان ملیں گے کہ وہ غنڈہ تمھیں یاد بھی نہیں آئے گا۔''

وہ سسکی۔ ''بھولے گا تو یاد آئے گا نا۔''

''کیا وہ اکیلا مرد ہے دنیا میں۔'' بشریٰ نے ہلکے سے ڈانٹا۔

''ابو جان بھی تو اکیلے مرد نہیں تھے ماں جی! پھر آپ نے بھرپور جوانی کیوں ضائع کر دی۔'' طنز کے بجائے اس کے لہجے میں شکوہ چھپا تھا۔

''کیونکہ وہ مجھے چاہتے تھے، اتنا جتنا آج تک کسی نے کسی کو بھی نہیں چاہا ہوگا۔ اتنی توجہ دیتے تھے کہ اتنی توجہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ ایسے محبوب کا سوگ منانے کے لیے تو میری ایک زندگی بھی کم ہے، اگر مجھے دس زندگیاں اور ملیں تو اپنے رفیق کی یاد میں گزار دوں، مگر تم کس بل بوتے پر اپنے غنڈے کا تقابل میرے شوہر سے کر رہی ہو یہ زیادتی ہے میری جان، کیونکہ میرے شوہر کو تو مجھ سے موت نے چھینا ہے۔ اور تمھارے موالی نے ٹھوکر مار کر تمھیں اپنی زندگی سے دور کیا ہے۔''

''وہ نادم ہیں، اسی لیے تو میرا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ اور..... اور انھیں میری فکر ہے۔ وہ چاہتے ہیں میں کسی محفوظ مقام پر اپنی زندگی گزاروں، اسی وجہ سے انھوں نے پاشا بھائی کو کہا ہے کہ میرے حوالے بہت ساری دولت کر دے، مجھے گاڑی بنگلہ خرید کر دے۔ میں نے تو آپ کی وجہ سے منع کر دیا کہ امی جان کو حرام کی دولت نہیں چاہیے۔''

''سچ میں، میری شہزادی اتنی سیانی ہوگئی ہے۔'' کھانے کے برتن ایک طرف کر کے اس نے تناوش کو اپنی گود میں گھسیٹ لیا۔

''میں جھوٹ نہیں بولتی ماں جی۔''

''اس کا مطلب میں یونہی سوچ رہی تھی کہ میری شہزادی عیش و آرام کی زندگی چھن جانے کی وجہ سے پریشان ہے۔''

''میں ان کے ساتھ جھونپڑی میں بھی رہنے کو تیار ہوں ماں جی، اور یقین مانیں میں انھیں گناہ کی زندگی سے نکالنے کا سوچے ہوئے تھی۔ آہستہ آہستہ شراب نوشی کی عادت ان سے چھڑا رہی تھی، باقی کام بھی وہ ضرور چھوڑ دیتے، مگر پھر انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔'' آخری جملے کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''شاید وہ تمھاری بہتری چاہتا ہے، اسی لیے خود سے دور کر دیا۔'' بشریٰ نے اسے تسلی دی۔

''مجھے نہیں چاہیے یہ بہتری، میں انھیں کسی بھی چیز، کسی بھی کام سے منع نہیں کروں گی بس اپنے ساتھ رکھ لیں، خود سے دور نہ کریں۔''

''بیٹی!..... پتا ہے محبت ایک بہت قیمتی اور اعلا جذبہ ہے۔ اور کسی کی محبت میں پاگل ہو جانا فطرتی معاملہ ہے۔ انسان کے بس سے باہر ہے کہ وہ کسی کی محبت کو اپنے دل سے نکال پھینکے۔ لیکن محبت ہو جانے کے بعد اپنے افعال اور حرکات پر قابو پانا ضرور انسان کے بس میں ہوتا ہے۔ تمھیں اس سے محبت ہے ہزار بار کرو، تمھیں وہ پیارا لگتا ہے ضرور لگا کرے، مگر اپنے پاگل پن کو دل سے باہر نہ آنے دو بیٹی۔ خود کو اتنا نہ گراؤ کہ پاتال میں جا گرو۔ اگر کسی کو تمھاری محبت کی پروا نہیں تو کیوں اپنی محبت کی ناقدری کرواتی ہو، کیوں اپنے قیمتی جذبات کو سستا بنا کر پیش کرتی ہو، کیوں اپنی ذات کی نفی کرنے پر تل گئی ہو۔ اس کی محبت کو بے شک دل سے نہ نکالو، مگر وہ تمھیں اپنی زندگی سے دور کر رہا ہے تو دور ہو جاؤ۔ محبت خوراک نہیں کہ بھیک میں مل جائے، ہیرے جواہر نہیں کہ دولت سے خریدی جائے، زمین جائیداد نہیں کہ ورثے میں حاصل ہو، سلطنت، حکومت نہیں کہ بزور بازو چھین لی جائے۔ یہ تو خودرو پودے کی طرح پنپنے والا جذبہ ہے جو بغیر محنت، کھیتی باڑی اور پانی لگانے کے کسی بنجر زمین میں بھی اگ آتا ہے۔ جیسے آپ کسی کی محبت کو دل سے نکال نہیں سکتیں، یونہی کسی کے دل میں زبردستی محبت ڈالی بھی نہیں جا سکتی۔ بیٹی چھوڑ دو اس کے خیال، اگر وہ تم سے دور خوش رہ سکتا ہے تو اس کی خوشی میں خوش رہو۔ یہی تو محبت کا فلسفہ ہے۔''

''میں انھیں دور رہ کر دکھاؤں گی ماں جی۔ وہ ضرور پچھتائیں گے، دیکھنا ایک دن انھیں میری یاد آئے گی ، جب وہ بکھریں گے اور انھیں سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوگا، جب وہ روئیں گے اور آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں ہوگا، جب وہ اکیلے ہوں گے اور ساتھ نبھانے والا کوئی نہیں ہوگا اور تب.....تب وہ میرے پاس آئیں گے اور میں.....میں انھیں سمیٹنے کے لیے اپنی آغوش وا کردوں گی، میں انھیں کوئی طعنہ نہیں دوں گی ماں جی، کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ گزرا وقت بالکل بھی یاد نہیں دلاؤں گی۔ بس کہہ دوں گی کہ میں تو کب سے منتظر تھی آپ نے خود ہی دیر کردی۔'' نمکین پانی اس کے گالوں پر بہنے لگا۔

''پھر وہی بے وقوفی، اٹھو اور تھوڑا سا کھانا کھالو۔'' اسے گود سے اٹھا کر بشریٰ زبردستی اسے کھانا کھلانے لگی ۔طوعن و کرھن اسے چند نوالے نگلنے پڑے تھے۔ کھانے کے بعد بشریٰ اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی ۔چائے پیتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

''ماں جی پاشا بھائی کہہ رہے تھے کہ یہاں ہماری جان کو خطرہ ہے، کیونکہ میری وجہ سے کافی خطرناک لوگ ان کے خلاف ہوگئے تھے اور اب جب میں ان کی زندگی سے نکل گئی ہوں تو وہ خطرناک لوگ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے پاشا بھائی کہہ رہے تھے کہ ماں کے ساتھ مل کر سوچ لو کہ کس علاقے میں رہنا ہمیں پسند ہے وہ اس گھر کے بدلے ہمیں وہاں گھر بنا کر دے دیں گے۔''

''میں نے بھی کچھ ایسا ہی سوچ رکھا ہے بیٹی، صبح مولوی صاحب کے پاس جا کر اس بارے مشورہ لوں گی ۔اور اب تو ہمارا گھر بھی اچھے داموں بک جائے گا۔ اتنا کام تو تمھارا کم بخت شوہر ہنسی خوشی کروا دے گا نا۔''

''ماں جی وہ بنگلہ لے کر دینے کو تیار ہے آپ ہاں تو کریں۔''

''مجھے نہیں چاہیے حرام کی دولت، بس ہمارا اپنا پیسہ کافی ہے۔''

''پھر انھیں کوس کیوں رہی ہیں۔'' تناوش خفا ہونے لگی۔ کبیر دادا کے خلاف وہ کچھ بھی تو نہیں سن سکتی تھی۔

''تو اور کسے کوسوں، اپنی شہزادی کی آنکھوں میں آنسو لانے والے کو دعائیں تو نہیں دے سکتی۔''

''ماں جی، میں نے انھیں معاف کردیا ہے آپ بھی کردیں۔ اور یاد رکھنا اگر انھیں کچھ ہوگیا تو آپ کی بیٹی بھی زندہ نہیں رہ پائے گی۔''

بشریٰ بولی۔ ”ٹھیک ہے، لیکن اس شرط پر کہ تم کوئی بے وقوفی کی حرکت نہیں کرو گی۔ نہ تو اسے ملنے کی کوشش کرو گی اور نہ کال پر بات کرنے کی۔“

وہ مایوسی سے بولی۔ ”پاشا بھائی نے ان کا موبائل فون نمبر میرے موبائل فون سے مٹا دیا ہے۔“

بشریٰ تحسین آمیز لہجے میں بولی۔ ”بہت اچھا کیا ہے اس لڑکے نے۔“

”اگر انھوں نے کال کی پھر میں بات کروں گی۔“ ایک عجیب سی حسرت اس کے لہجے میں ابل رہی تھی۔

”ہاں ہاں کر لینا۔“ بشریٰ جان چھڑاتے ہوئے بولی۔ ”اب آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔“ وہ خود بھی لیٹ گئی۔

تناوش آنکھیں بند کر کے بھی جاگتی رہی۔ گاہے گاہے وہ موبائل فون کی سکرین پر بھی نگاہ دوڑا لیتی۔

”کیا پتا مجھے یاد کر رہے ہوں، ہو سکتا ہے انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا ہو، شاید اپنے فیصلے پر پچھتا رہے ہوں۔“ دل کے کسی کونے میں اب بھی امید باقی تھی کہ کبیر دادا کی کال آئے گی۔ رات گئے گلی سے کوئی کار گزری اور وہ چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ پڑی، مگر کار رکے بغیر آگے گزر گئی تھی۔ وہ گال بھگوتی واپس چارپائی پر لوٹ آئی۔ اس کی ماں گہری نیند میں تھی ورنہ اسے ضرور ڈانٹتی۔

☆.....☆.....☆

رات گئے اس کی آنکھ کھلی، وہ اسی طرح اوندھے منہ بیڈ پر پڑا تھا۔ سر نہایت بھاری ہو رہا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ دیوار پر ٹنگی گھڑی دو بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ شاور کھول کر وہ بغیر کپڑے اتارے تیز دھار پانی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ پتلون قمیص اتار کر غسل خانے کے فرش پر پھینکتے ہوئے وہ تولیہ لپیٹ کر باہر نکل آیا۔ اس کا رویہ بچکانہ سا ہو رہا تھا، یوں جیسے تناوش کو اس کی ساری حرکتیں نظر آ رہی ہوں اور اس کے یوں کرنے پر وہ اس کے کپڑے اور سامان وغیرہ سمیٹنے کے لیے بھاگی چلی آئے گی۔

ڈریسنگ روم میں گھس کر اس نے کپڑے پہنے اور تولیہ ایک طرف اچھال کر باہر آ گیا۔ دوپہر کو جاگنے کے بعد اس نے تناوش کے ہاتھوں سے ناشتا کیا تھا اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کھا سکا تھا، لیکن اتنی دیر گزر جانے کے

بعد بھی اسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے ایل ای ڈی آن کی اور مختلف چینل تبدیل کرنے لگا۔ کوئی پروگرام بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ریموٹ میز پر پھینک کر وہ موبائل فون کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔

"کیا پتا اس کی کال آئی ہو۔ ہو سکتا ہے اسے ندامت محسوس ہو رہی ہو۔" دماغ میں خیال ابھرا اور وہ قالین پر پڑے کوٹ کی جانب بڑھ گیا۔ کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکال کر اس نے تاریک سکرین پر ایک نگاہ دوڑائی۔ سکرین کے اوپری کونے میں چھوٹی سی بتی جل بجھ کر کسی مس کال یا پیغام آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ سکرین روشن کیے بغیر اس نے دھڑکتے دل سے سوچا.....

"کیا اسی کی کال آئی ہے، شاید نادم ہو اور دور جا کر اسے میری کمی محسوس ہوئی ہو۔ اگر اس نے سچ میں مجھے بلایا ہو تو کیا اسے لینے جاؤں گا؟" اس نے دل میں جھانکا فوراً ہی جواب موصول ہوا تھا۔

"ہاں لینے تو جاؤں گا، مگر ذرا موڈ بنا کر۔ بات نہیں کروں گا۔ کار کا ہارن سن کر وہ بھاگتی ہوئی آئے گی، میں بس خاموشی سے اس کے لیے دروازہ کھول کر چپ چاپ بیٹھا رہوں گا۔ اور جب وہ ندامت ظاہر کرتے ہوئے دھیمے لہجے کہے گی، کبیر معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تب بھی میں کوئی جواب نہیں دوں گا اور خاموش بیٹھا کار ڈرائیو کرتا رہوں گا۔ اس کی جانب دیکھوں گا بھی نہیں۔" دل نے نہ دیکھنے کی بات پر احتجاج کیا۔ اس نے جلدی سے اپنی سوچ کی تردید کی۔ "سیدھا تو نہیں البتہ شیشے میں چوری چوری اس کے چہرے پر نگاہ ڈال لوں گا۔ اسے منتیں کرنے دوں گا۔ اور وہاں سے اسے سیدھا ساحل سمندر پر لے جاؤں گا۔ کار سے اتر کر میں اس کی طرف توجہ کیے بغیر ریت پر آگے بڑھ جاؤں گا۔ وہ مجھے منانے کے لیے میرے پیچھے بھاگے گی اور پھر پاؤں میں موچ آنے پر نیچے گر جائے گی۔"

دل نے واویلا کیا۔ "پاؤں میں موچ نہیں آنا چاہیے اسے درد ہو گا۔ نازک سی گڑیا کہاں برداشت کر پائے گی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک، وہ موچ آنے کا بہانہ تو کر سکتی ہے نا، بس طے ہو گیا وہ موچ آنے کا بہانہ کرے گی اور میں بھاگ کر اسے بازوؤں میں بھر کے سینے سے لگا لوں گا۔ وہ میرے گلے میں بازو ڈال کر کہے گی، پلیز معاف

کر دو نا، نہیں تو میں رونا شروع کر دوں گی اور میں مسکراتے ہوئے پوچھوں گا، آئندہ ایسا کرو گی۔ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر کہے گی کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں بس اس دفعہ معاف کر دو۔ میں فوراً اسے معاف کر دوں گا۔ اور جب گھر لوٹ کر آئیں گے تو خواب گاہ کی حالت دیکھتے ہی وہ سر پیٹ لے گی اور جلدی جلدی تمام سامان کو ترتیب سے رکھنا شروع کر دے گی۔ تب میں صوفے پر بیٹھ کر اس کی حالت پر زور زور سے ہنسوں گا۔ سارا سامان ترتیب سے رکھ کر جب وہ شراب کی خالی بوتلوں کو دیکھے گی تو خوب لڑے گی۔ مگر میں بھی صاف کہہ دوں گا کہ یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ نہ تم دور جانے کا سوچتیں نہ مجھے ایسا کرنا پڑتا۔" سارا منصوبہ سوچتے ہوئے اس نے سکرین روشن کرنے والا بٹن دبایا اور شیخ چلی کے سر پر رکھا انڈوں کا ٹوکرا دھڑام سے نیچے جا گرا۔ عظیم کے نمبر سے مس کال آئی ہوئی تھی۔ گہرا سانس لے کر اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"کبھی بھی معاف نہیں کروں گا کبھی بھی نہیں..... نہ کال وصول کروں گا، نہ اس کا بھیجا پیغام پڑھوں گا اور اگر وہ خود یہاں آ گئی تو راحت خالہ کو کہہ کر اسے گھر سے نکال دوں گا بے شک روتی رہے۔ اسے معلوم نہیں کہ کبیر دادا کتنا سخت دل ہے۔ مجھے لڑکیوں کی کیا پروا..... جتنی چاہیے تناوشیں اکٹھی کر لوں۔ کل کی چھوکری مجھ سے ٹکرانے چلی ہے ہونہہ!" اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا اور ایک دم اپنے ہاتھوں پر ماتھا ٹیک دیا۔ اسے لگا آنکھوں میں پانی جمع ہو رہا ہے۔

"اپنے موبائل سے میری تصویر ہی کھینچ لیتے کتنی پیاری لگ رہی ہوں۔" اس کے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے فوراً تصویروں والا فولڈر کھول لیا۔ وہ ہنستے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک تصویر میں وہ زبان نکال کر اسے چڑا رہی تھی۔ ایک میں اس نے دونوں آنکھیں سختی سے میچی ہوئی تھیں۔ دو تین تصویروں میں وہ سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اس کی روشن مسکراتی آنکھیں جھوٹی سنجیدگی کا راز فاش کر رہی تھیں۔

"نہیں چاہئیں تمھاری تصویریں، ساری کی ساری ڈیلیٹ کر دوں گا۔" غصے میں وہ اس کی تصویروں کو ڈیلیٹ کرنے کی غرض سے "سلیکٹ" کرنے لگا۔ تمام تصاویر مارک کر کے اس نے ڈیلیٹ کے آپشن کی طرف انگلی بڑھائی، مگر اسے دبانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کی سماعتوں میں تناوش کی سرگوشی گونجی۔

”میری تصاویر کو موبائل فون سے تو مٹا دو گے، مگر دل پر نقش تصویر کو کیسے کھرچو گے۔“

اس نے موبائل فون ہاتھ سے رکھ دیا۔ ”مجھے معلوم تو کرنا چاہیے آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو میری جدائی سے ڈرتی تھی، میرے طلاق دینے سے خوف کھاتی تھی، کسی دوسری لڑکی کے میرے قریب آنے پر اس کا سانس رکنے لگتا تھا۔ اب کیا ہوا۔ کیا اب میری جدائی قابل برداشت ہوگئی۔ یہ پوچھنا تو بنتا ہے۔ اس سے مزید صبر نہ ہوسکا اور وہ انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر چوکیدار کو کل والا حکم دہرانے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں تین کے ہندسے کو چھو رہی تھیں۔

”یقیناً گہری نیند میں ہوگی، یہ جانے بغیر کہ کوئی کس شدت سے اسے یاد کر رہا ہے۔ کیا پتا ترس کھا کر میرے ساتھ چلی آئے۔“ اسے یوں لگا جیسے وہ تناوش سے محبت کی بھیک مانگنے جا رہا ہے۔ اس کی انا، خودداری اور بڑی شخصیت ہونے کے زعم کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہوگئی تھی۔ وہ چھوکری جو کل تک اس کی نظر کرم کی محتاج رہا کرتی تھی آج آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی کوئی ایسی ملکہ لگ رہی تھی جس تک اس کی رسائی ہی ممکن نہ ہو۔

”کیا ہوگیا ہے تمھیں، تم کبیر دادا ہو، ایک بہت بڑے گینگ کے سربراہ۔ تمھیں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ اس سے کئی گنا خوب صورت اور کم عمر لڑکیاں تمھیں مل سکتی ہیں پھر اس کے سامنے جھکنے کی تذلیل کیوں برداشت کر رہے ہو۔“ تناوش سے متنفر کرنے والی ایک تلخ سوچ اس کے دماغ میں ابھری مگر دل خم ٹھونک کر میدان میں آگیا

”اس سے بہتر تو کیا اس جیسی دوسری بھی اللہ پاک نے نہیں بنائی۔ پھر کوئی کیسے اس کی جگہ سنبھال سکتا ہے۔ اور بالفرض اس جیسی صورت کسی کو مل بھی گئی ہو تو کیا وہ اس کی طرح شوخ، چنچل اداؤں والی بھی ہوگی، ویسا ہی خدمت کرنے کا فن جانتی ہوگی، اتنا ہی خیال رکھنے والی ہوگی؟“ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب نفی میں تھا۔ وہ پاؤں میں ہوائی چپل ڈالتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس کا دل اتنی شدت سے تناوش کو دیکھنے، اس سے بات کرنے کی خواہش میں مچل رہا تھا جیسے اسے نہ دیکھنے پر اسے موت ہی تو آجائے گی۔ باہر نکل کر وہ اپنے دھیان میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا کہ اچانک اس کے کانوں میں پاشا کی آواز گونجی۔

”ڈرائیو میں کروں گا۔“ کبیر دادا ششدر رہ گیا تھا۔

''تم..... یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔''اس کوٹھی میں ایک کمرہ ابھی تک میرے سامان سے اٹا پڑا ہے اور وہاں رات گزارنے کے لیے یقیناً مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو جاؤ آرام کرو۔''

پاشا نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں کہیں بھی جاؤں۔''

پاشا نے نفی میں سر ہلایا۔''میرا ساتھ آپ کو سہولت دے گا۔''

''میں بس اتنا پوچھوں گا کہ اسے یہاں پر کیا تکلیف تھی۔اور کوئی طعنہ نہیں دوں گا نہ غصہ کروں گا۔بس مختصر سی بات کر کے واپس آجاؤں گا۔''وہ پاشا کے سامنے یوں صفائی دینے لگا جیسے وہ اس کا بڑا ہی تو ہو۔

''دو ٹکے کی لڑکی کے دروازے پر کبیر دادا رات کے تین بجے محبت کی بھیک مانگنے جائے گا۔''

''نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔میں بس اس سے تھوڑی سی بات کروں گا اور پھر واپس آجاؤں گا۔میرے دل میں ایک پھانس اٹکی ہے وہ اس سے بات کر کے نکل جائے گی۔''

''کیا میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔کیا میں آپ کا خیال نہیں رکھتا، کیا میری ذات کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں، کیا میرے وعدے، میرے الفاظ کی آپ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔''پاشا جذباتی ہو گیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے یار، تم بات کو غلط رخ دے رہے ہو۔''کبیر دادا اس کی بات سن کر خفیف ہو گیا تھا۔

''جانتا ہوں وہ آپ کو پیاری لگتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دھوکے باز کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر آپ اپنے مقام ہی کو فراموش کر دیں۔آپ بس وقتی پسندیدگی کو محبت سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں اور بالفرض آپ اس سے سچی محبت کرتے ہیں تب بھی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ محبوب کی مرضی پر راضی رہا جائے۔وہ دور جا کر خوش ہے تو آپ اسے کیوں خوش نہیں رہنے دیتے۔یقین مانیں وہ آپ کو دیکھ کر گھبرا جائے گی، پریشان ہو جائے گی۔وہ ڈرتی ہے آپ سے۔آپ اس کی نظر میں ایک گینگسٹر ہیں، ایک قاتل، شرابی اور بدکردار شخص ہیں۔پہلے وہ دولت اور عیش و آرام کے لالچ میں یہاں ٹکی تھی اب اسے یہ سب کچھ آپ کے بغیر میسر ہو گیا ہے اس

لیے اسے کسی غنڈے موالی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "بیٹھو۔"

پاشا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ "کہاں جانا ہے؟" اس نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ساحل سمندر پر چلو۔" کبیر دادا نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور وہ دھم سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ کودی۔ وہ جلدی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آنکھیں بند کرنا بھی اس کے لیے کارِ دار بن گیا تھا۔

دل نے مطعون کیا۔ "کاش میں نے پاشا کو یہ نہ کہا ہوتا کہ اسے منہ مانگی رقم وغیرہ دے کر میری زندگی سے دور کر دے۔"

دماغ نے پوچھا۔ "تو کیا ساری زندگی اس دھوکے باز کی جھوٹی محبت میں ڈوبے رہتے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس کی جھوٹی یا سچی محبت سے جب انسان کو دوسرے کے دل کا حال معلوم ہی نا ہو۔ بھلے وہ عیش و آرام کی وجہ سے مجھ پر ناز و ادا کی بارش کرتی مجھے آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے نہ کہ پیڑ گننے سے۔" دل کا احتجاج جاری رہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں دادا۔" پاشا اس کی سوچوں میں مخل ہوا۔

"کچھ نہیں یار، بس حیران ہو رہا ہوں کہ کوئی اتنی اچھی اداکاری بھی کر سکتا ہے۔"

"عورت ذات کو مالک نے جسمانی طور پر کمزور ضرور بنایا ہے، مگر اس کمزوری کے بدلے اسے مکاری کی ایسی صفت عطا کر دی جو مرد کی طاقت سے کئی گنا زیادہ پر اثر ہے۔ عورت کو اپنے احساسات چھپانے میں بلا کی مہارت ہے۔ یہ ذات جھوٹی محبت کا اظہار بھی اس صفائی سے کرتی ہے کہ مخالف کو یقین کرنا ہی پڑتا ہے اور جب تک اسے حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ سرتاپا اس مکار کے عشق میں ڈوب چکا ہوتا ہے۔ اب اس کا انحصار عورت کی ترجیحات پر ہوتا ہے کہ اس کا فائدہ، متاثر مرد کے ساتھ رہنے میں ہے یا دور ہونے میں۔ اگر تو اس کے ساتھ رہنے میں فائدہ ہو تو وہ یہ ڈراما جاری رکھتی ہے۔ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں بے چارے کے قدموں سے ایک منٹ میں زمین کھینچ لیتی ہے۔ آپ شکر کریں کہ بروقت مجھے ساری بات بتا دی اور اس کی جھوٹی محبت کا

راز فاش ہو گیا ورنہ زندگی کے کسی اور موقع پر وہ آپ کو کوئی نا قابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔"

کبیر دادا کے دماغ میں تلخ سوچ ابھری۔ "مجھے تو حالیہ نقصان بھی نا قابل تلافی ہی لگ رہا ہے۔" مگر منہ سے وہ یہ اقرار نہیں کر سکا تھا۔

"یہاں کھانا کھائیں گے۔" کل والے ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے پاشا کو مطلع کیا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے کار ہوٹل کی پارکنگ میں موڑ دی۔

وہ میز آج بھی خالی پڑی تھی جہاں اس نے گزشتہ رات تناوش کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ وہ پاشا کو لے کر اسی میز کی طرف بڑھ گیا۔ نشست سنبھالتے ہوئے پاشا بولا۔

"میرا خیال ہے آپ کھانا نہیں کھا سکے ہیں۔"

"صحیح کہا۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو کیا منگواؤں؟" پاشا مینیو کارڈ کھول کر دیکھنے لگا۔

"کچھ بھی۔" مختصراً کہتے ہوئے وہ شیشے کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ گلاس منہ سے لگاتے ہوئے اس کے دماغ میں تناوش کی مدھر آواز گونجی۔ "کوئی ایسی چیز جو آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلا سکیں۔"

وہ خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب ہوا۔ "آ جاؤ نا ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے کھلایا کروں گا۔" اس کا جواب اسے سنائی نہیں دیا تھا۔ یقیناً اب کبیر دادا کی بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بیرے کے آنے تک وہ خاموش بیٹھا رہا پاشا نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بیرے نے کھانا لا کر ان کے سامنے رکھا۔ پاشا کو بھی کھاتے دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"تم نے بھی نہیں کھایا تھا۔"

"جی۔" کہہ کر پاشا کھانے کو جڑ گیا۔ کبیر دادا نے چند نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ مگر پاشا نے خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر وہ پاشا کے ساتھ ساحل پر آ گیا۔ ریت پر ننگے پاؤں گھومتے ہوئے وہ بے اختیار ہو کر پاشا کو گزشتہ شب کی باتیں بتانے لگا، تناوش کا پاؤں میں موچ آنے کا بہانہ سناتے ہوئے وہ ہنس پڑا تھا۔

اس کی بات کے اختتام پر پاشا نے منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔ ”مرد کو پھانسنے اور اس کے دل میں جگہ بنانے کے ہزاروں لاکھوں گُر یہ ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نکلتی ہیں۔“

کبیر دادا نے اس کی بات پر تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ سورج طلوع ہونے تک وہ وہیں گھومتے رہے اور پھر کبیر دادا کے کہنے پر واپس لوٹ آئے۔

☆.....☆.....☆

”یوں ہنگامی طور پر کیوں بلایا ہے، بہت اہم کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“ نوشاد آفریدی بوتل سے وہسکی انڈیلنے لگا

ایس پی ضمیر حسین بولا۔ ”شاہ جی کو آنے دیں پھر بات کرتا ہوں۔“

”خیریت تو ہے نا۔“ نوشاد آفریدی کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی در آئی تھی۔

”وہی کبیر دادا والا معاملہ ہے یار۔“ پلیٹ میں پڑے خشک فروٹ میں سے کشمش کا دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے ایس پی نے اسے تسلی دی۔ اسی وقت اخلاق حسین سلام کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔

آئیں شاہ جی۔“ دونوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

رسمی کلمات کے بعد ایس پی مطلب کی گفتگو پر آ گیا۔ ”تم دونوں تو اس دن کے بعد اپنے منصوبے کو بھول ہی گئے ہو، لیکن میں مسلسل اسی کام میں جتا ہوں۔“

نوشاد آفریدی نے کہا۔ ”بھول نہیں گئے، اپنے لیڈر پر مکمل اعتماد ہے۔“

ایس پی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال تازہ ترین خبر یہ ہے کہ آج ہفتہ ہے اور خوش قسمتی سے وہ رکھیل کل سے اپنے گھر میں موجود ہے۔ شاید شام تک گھر ہی میں رہے۔ ہم نے عصر کے وقت اسے اغواء کرنا ہے، اگر اس سے پہلے اس نے گھر جانے کی کوشش کی تو اسی وقت اٹھوا لیں گے۔“

اخلاق حسین نے پوچھا۔ ”باقی کے انتظامات تو مکمل ہیں نا؟“

ایس پی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، سارا انتظام ہو گیا ہے۔“

نوشاد نے پوچھا۔ ”تو اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“

”آپ دونوں نے فصیح الدین کے نمبر دو تیمور علی کو قابو میں کرنا ہو گا، یہ نہ ہو فصیح الدین کی موت کے بعد ایک

نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے اور اصل معاملہ درمیان ہی میں رہ جائے۔" ایس پی نے یاد دہانی کرائی۔

اخلاق حسین نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "آج نوشاد آفریدی کے ہاں ایک تقریب رکھیں گے۔ اس میں تیمور علی بھی خصوصی طور پر مدعو ہوگا، پاشا اور کاشف راجپوت کو بھی بلائیں گے۔ صرف کبیر دادا کو دعوت نہیں دی جائے گی کیونکہ نوشاد آفریدی اور اس کی ان بن کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اور پھر فصیح الدین کی موت کی خبر مجھے وہیں پر ملے گی۔ جسے فوراً تیمور علی اور پاشا وغیرہ کے سامنے بیان کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں اور نوشاد مل کر اس معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں گے، یقیناً پاشا اور کاشف راجپوت بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ اس طرح یہ اطلاع بروقت تمام گینگ کے سربراہوں کے پاس بھی پہنچ جائے گی۔"

"زبردست۔" ایس پی نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ "یقیناً تقریب میں میری حاضری بھی لازمی ہونا چاہیے۔"

"نہیں، تمھیں منصوبے کی تکمیل کی طرف دھیان دینا ہوگا۔" اخلاق حسین نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔" ایس پی نے اس کی بات سے مکمل اتفاق کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی نماز پڑھ کے اسے نیند آ گئی تھی۔ وہ دن چڑھے تک سوتی رہی یہاں تک دھوپ نے اسے صحن سے اٹھ کر کمرے میں جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کمرے میں اسے نیند نہ آ سکی۔ بشریٰ نے اندر جھانکا اور اسے چھت کی کڑیوں کو گھورتے دیکھ کر کہنے لگی۔

"اب اٹھ کر ناشتا کر لو۔"

"جی ماں جی۔" وہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے چل دی۔ بشریٰ نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔

غم جتنا بھی ہو، انسان اپنے جسم کی ضروریات سے مسلسل آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا۔ اسے بھی زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت کھانے کی حاجت ہو رہی تھی۔ چائے کے ساتھ اس نے پراٹھے کے چند نوالے لیے۔ اس کے بعد ماں کے منع کرنے کے باوجود وہ گھر کے کاموں کو جت گئی۔ فارغ لیٹنے سے دماغ میں عجیب و غریب خیالات چکرانے لگتے تھے۔ بارہ بجے کے قریب اسے پاشا کی کال وصول ہوئی وہ اسے گھر کے دروازے پر بلا رہا تھا۔

''اندر آئیں نا بھیا۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔

''اس وقت جلدی میں ہوں، بس تمھیں یہ دینے آیا تھا۔'' اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ تناوش کی جانب بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' تناوش نے ڈبہ پکڑ لیا۔

''موبائل فون ہے۔''

''میں اس کا کیا کروں گی بھیا۔'' اس نے ڈبہ پاشا کی جانب واپس بڑھایا۔

''اس میں کبیر دادا کی تصاویر اور وڈیوز میں نے بھر دی ہیں، اگر نہیں چاہیے تو واپس رکھ لیتا ہوں۔'' ابھی تک پاشا نے ڈبہ واپس لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''شکریہ بھیا۔'' اس نے خفیف انداز میں سر جھکا لیا۔

پاشا نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو ماں جی سے مشورہ لیا؟''

''ہاں پوچھا تھا۔ تھوڑی دیر تک امی جان، مولوی صاحب سے مشورہ کرنے جائیں گی، میں ان شاء اللہ رات کو کال کر کے بتا دوں گی۔''

اور پاشا ہاتھ لہراتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''کون تھا بیٹی۔'' غسل خانے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی وہیں سے اس نے آواز دی۔

''پاشا بھائی تھے ماں جی، جانے کے بارے پوچھنے آئے تھے۔'' وہ رکے بغیر کمرے میں گھس گئی۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس نے سرعت سے ڈبہ کھولا۔ اور قیمتی سیل فون باہر نکال لیا۔ اگلے چند سیکنڈ میں وہ کبیر دادا کی تصاویر دیکھ رہی تھی۔ اس میں کبیر دادا کی ورزش اور تربیت وغیرہ کی کافی وڈیوز پاشا نے بھر دی تھیں۔ وہ باری باری تمام کو دیکھتی رہی۔ کسی میں کبیر دادا Punching Bag پر مکے برسا رہا تھا، کسی میں خالی ہاتھ لڑائی کے مختلف پوز بنا رہا تھا۔ ایک وڈیو میں کبیر دادا اسے ایک لمبے تڑنگے اور موٹے تازے دیو نما حبشی کے ساتھ بھی نظر آیا۔ اس کے سامنے کبیر دادا بھی چھوٹا بچہ نظر آ رہا تھا۔ اور اس سے باتیں کرتے ہوئے کبیر دادا کا لہجہ کافی مودبانہ لگا تھا۔

بشریٰ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''واہ جی، یہ موبائل کب خرید لیا۔''

''ابھی پاشا بھائی دے کر گئے ہیں۔''

''تم نے تو کہا تھا ان سے کوئی تحفہ وغیرہ نہیں لوگی۔'' ماں نے اسے مطعون کیا۔

''اس میں ان کی تصاویر ہیں ماں جی۔''

''تو کیا۔''

''تو یہ کہ مجھے اپنے بھیا نے دیا ہے۔'' اس نے ایئر فون کانوں میں لگاتے ہوئے گویا اعلان کیا تھا کہ وہ ماں کی مزید نصیحت نہیں سننا چاہتی۔

بشریٰ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ماں نے پوچھا۔ ''بیٹی مولوی صاحب کے گھر چلوگی۔''

''آپ ہو آئیں ماں جی، میں شاید مولوی صاحب کا سامنا نہ کر پاؤں۔'' نماز پڑھ کر وہ دوبارہ موبائل فون لے کر بیٹھ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں، تم دروازہ کنڈی کر دو۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے ماں کے پیچھے بڑھ گئی۔ ماں کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ کنڈی کیا اور پھر چارپائی پر آن لیٹی۔ اپنی دسترس اور نظروں سے دور کبیر دادا کو چند انچ کے فاصلے پر مسلسل دیکھنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگر اس موبائل فون میں کبیر دادا کی تصاویر اور وڈیوز نہ ہوتیں تو اس نے کبھی بھی پاشا سے سیل فون نہیں لینا تھا۔ لیکن کبیر دادا کی تصاویر اور وڈیوز کے بعد وہ سیل فون اس کے لیے نہایت قیمتی ہو گیا تھا۔ جانے کتنے گلے شکوے تھے جو وہ اس کی تصاویر سے کر چکی تھی۔ درجنوں تصاویر میں صرف ایک تصویر ایسی تھی جس میں وہ ہنس رہا تھا اور وہی تصویر اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ لاک سکرین اور وال پیپر پر اس نے وہی تصویر لگا دی تھی۔

''اللہ پاک کرے ہمیشہ یونہی ہنستے رہیں۔'' ہزاروں لاکھوں شکوں کے باوجود بے ایمان دل سے دعائیں ہی نکل رہی تھیں۔

عصر کی آذان اس کے کانوں میں پڑی اور وہ سیل فون چارجنگ پر لگا کر وضو کرنے چل دی۔ نماز پڑھ کر وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے لگی تھی کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''آئی ماں جی۔'' دعا مانگنا واپسی پر موخر کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کنڈی کھولتے ہوئے اس کی زبان چل رہی تھی۔ ''اتنی دیر لگا دی۔'' اور پھر جونہی اس نے دروازہ کا پٹ کھولا اچانک دو آدمی اندر گھس آئے۔

''کک.....کون ہو تم.....کیا بات ہے۔'' وہ گھبراتے ہوئے ہکلائی۔

''خاموش۔'' ایک آدمی نے اسے ڈانٹتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر نازک لڑکی میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ ایک مرد کا مقابلہ کر پاتی۔ دوسرے آدمی نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور جیب سے ٹیکہ نکال کر اس کی سوئی بے دردی سے تناوش کے بازو میں گھونپ دی۔

وہ۔ ''اوں.....اوں.....'' کر کے دوسرے کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ٹیکہ لگ جانے کے بعد بھی اس نے تناوش پر اپنی گرفت ہلکی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے ساتھی سے پوچھ رہا تھا۔

''کتنی دیر میں اثر شروع ہو جائے گا۔''

''بس چار، پانچ منٹ میں۔''

تناوش کی مزاحمت آہستہ آہستہ مدہم پڑتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلانے لگے تھے۔ وہ اپنی سوچ کو بھی مرتکز نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید اس کی یادداشت ختم ہو گئی تھی۔ اسے وہ ماحول، وہ بدمعاش، کبیر دادا کی جدائی اور اپنا آپ تک بھولنے لگا۔ مگر وہ مکمل بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ بس اسے اپنے اعضاء پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اسے شدت سے کسی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

''کام ہو گیا شاکر!'' ٹیکہ لگانے والا اپنے ساتھی کو مخاطب ہوا۔ اور شاکر نے ایک دم تناوش کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

وہ لہرا کر گرنے لگی تھی کہ ٹیکہ لگانے والا اسے تھامتے ہوئے شاکر پر غرایا۔ ''بے وقوف، بغیر سہارے کے یہ گر جائے گی۔''

''سوری یار۔'' اس نے ندامت ظاہر کی۔

تناوش کا سر کسی نئے شرابی کی طرح گھوم رہا تھا۔ اس نے خود کو تھامنے والے کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکان ابھر آئی تھی۔

''چلو۔'' وہ تناوش کو تھام کر دروازے کی طرف بڑھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بیمار کو سہارا دے کر جا رہا ہو۔ شاکر نے جلدی سے عقبی کا نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ تناوش کو آرام سے عقبی سیٹ پر بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جبکہ شاکر تناوش کے ساتھ بیٹھ کر اسے سہارا دینے لگا۔ گھر کا دروازہ انھوں نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ گلی میں کوئی خاص آمد و رفت نہیں تھی۔ جو ایک دو راہگیر گزر رہے تھے انھوں نے بھی ان کی کارروائی کو شک کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔

شاکر کے ساتھی نے کار آگے بڑھا دی۔

''یار نعیم!..... یہ کچھ زیادہ ہی خوب صورت اور پرکشش نہیں ہے۔'' شاکر نے بے اختیار، تناوش کے حسن کا قصیدہ پڑھا۔

''تو۔'' نعیم نے عقبی شیشے پر نظر دوڑا کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

شاکر ندیدے پن سے بولا۔ ''بہتی گنگا میں اگر ہم بھی ہاتھ دھو لیں تو کسی کا کیا بگڑے گا۔''

نعیم کے لبوں پر بے اختیار گالی ابھری۔ ''الو کے پٹھے، جانتے بھی ہو یہ کس کی منظور نظر ہے۔''

وہ نعیم کی گالی کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔ ''میری بلا سے یار، جب اغواء کر لیا ہے تو اس کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے۔''

''باقی یہ رہ جاتا ہے کھوتے کے سر، کہ یہ کبیر دادا کی رکھیل ہے اور اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ ہم نے اس کی رکھیل کے بارے ایسا سوچا بھی تھا تو یقیناً ہمیں کراچی کے کسی کونے میں تو اس درندے سے پناہ نہیں ملے گی۔''

''مم..... مگر تم نے پہلے یہ بات نہیں بتائی۔'' شاکر خود پر لدی جانے والی تناوش سے ایک دم دور ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ اسے کسی محبوبہ کی طرح سنبھالے بیٹھا تھا۔

نعیم ہنسا۔ ''پھر تم نے میرے ساتھ کب آنا تھا۔''

شاکر منمنایا۔ ”یار، تم نے بہت بڑے خطرے میں ڈال دیا ہے۔“

نعیم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو ہم کم سے کم وقت میں اسے مطلوبہ مقام تک پہنچا کر درمیان سے ہٹ جائیں گے۔ پھر کبیر دادا جانے اور اس کی چھمک چھلو کو اغواء کرانے والا جانے۔“

”ویسے کس نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا کہ ایسی لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا۔“

”وہ بھی کوئی چھوٹا موٹا غنڈہ نہیں، فاصی ہتھ چھٹ ہے۔“

”یار سانڈوں کی لڑائی میں ہم رگڑے جائیں گے۔“ اتنے بڑے بڑے غنڈوں کا نام سن کر شاکر کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

”یار ٹھیک پندرہ سے بیس منٹ بعد ہم اس لڑکی کو ایک کوٹھی میں چھوڑ کر رخصت ہو جائیں گے۔ بعد میں فاصی ہتھ چھٹ جانے اور کبیر دادا، ہمیں ان سانڈوں کی لڑائی سے کچھ نہیں لینا۔“

”کار تھوڑا تیز چلاؤ نا۔“ شاکر اس انداز میں تناوش سے دور ہو رہا تھا جیسے وہ چھوت کی مریضہ ہو۔

”اوں..... سونے دو نا..... کیا کر رہے ہو۔“ تناوش نے خمار آلود آواز میں بڑبڑا شاکر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ مگر اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹوں پر خوب صورت مسکان چھائی ہوئی تھی۔

شاکر نے پوچھا۔ ”ٹیکے کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔“

”تین چار گھنٹے بعد ہی اس کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلے گی۔ مگر مدہوشی کے دوران اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہوگا اسے بعد میں بھی یاد رہے گا۔“ نعیم نے تفصیلی جواب دیا تھا۔

”بیڑا غرق۔“ شاکر ایک دم کار کے دروازے کی طرف سمٹا اور تناوش سیٹ پر اڑی ترچھی لیٹی رہ گئی۔ اس کی تیزی دیکھتے ہوئے نعیم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”ذلیل آدمی، اسی لیے اس مصیبت کو سنبھالنے کا کام میرے ذمہ چھوڑ دیا، حالانکہ میں تم سے اچھا ڈرائیور ہوں۔“

”تو تم چسکے نہ لو نا، انسان کے بچوں کی طرح اسے سنبھالو۔“ نعیم نے اسے لتاڑا۔

”بھاڑ میں گیا سنبھالنا۔“

''سونے دو نا..... نیند آ رہی ہے، قریب آؤ نا۔'' تناوش مدہوشی بھرے انداز میں بڑبڑاتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک پوش علاقے میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی مگر خوب صورت اور عمدہ طرز تعمیر کے نمونے پر بنائی گئی کوٹھی کے سامنے نعیم نے کار روک دی۔ ہارن کے جواب میں ایک چوکیدار نے باہر جھانکا۔

نعیم نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔ ''شکیل صاحب کو کہیں مال پہنچ گیا ہے۔''

چوکیدار بغیر کچھ کہے غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ یقیناً اسے پہلے سے ہدایت کر دی گئی تھی۔

نعیم کار اندر لے گیا۔ اندرونی عمارت کے سامنے کالی پتلون اور سفید قمیص میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ نعیم نے کار اس کے ساتھ جا کر روک دی۔ وہی اس کا مطلوبہ آدمی شکیل تھا۔

''لے آئے ہو۔'' اس نے کار کے رکتے ہی نیچے جھک کر عقبی نشست کی طرف نظر دوڑائی۔

''جی سر۔'' نعیم خوش دلی سے کہتا ہوا نیچے اتر گیا۔

''بہت خوب۔'' شکیل نے سراہنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ''اب اسے اندر لے آؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' نعیم نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر تناوش کو بازوؤں سے تھام کر نیچے اتارا اور سہارا دے کر کوٹھی کے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ شاکر نے اس کا ہاتھ بٹانے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے اندر اٹھنے والی غلیظ خواہش کبیر دادا کا نام سنتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ تناوش کی صورت بہ قول شاعر ایسی تھی کہ

.....

ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

مگر شاکر کے دیکھنے کی خواہش پر بھی کبیر دادا کی ہیبت سوار تھی۔ وہ ایسا ہی پر رعب اور ہیبت ناک تھا۔ بڑے بڑے غنڈے اس کا نام سن کر کانپنا شروع ہو جایا کرتے تھے، شاکر غریب تو کسی شمار میں ہی نہیں تھا۔ نعیم کی تسلی دینے کے باوجود ابھی تک اس کا دل کسی انجان اندیشے سے لرز رہا تھا۔

نعیم، شکیل کی رہنمائی میں تناوش کو لے کر ایک خوب صورت اور پر تعیش خواب گاہ میں داخل ہوا۔ کمرے کے وسط میں پڑے ہوئے جہازی سائز کے خوب صورت گول بیڈ پر اسے لٹا کر وہ شکیل کی طرف متوجہ ہوا۔

''سر، ہمارا کام پورا ہوا۔''

''بالکل۔'' شکیل نے درمیانی نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔''

''میں نے آپ کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا سر۔'' نعیم نے ہنستے ہوئے اس سے مصافحہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ شاکر بڑی بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔

شکیل دھیرے قدموں سے چلتا ہوا تناوش قریب ہو گیا۔ ''کتنی حسین اور پیاری ہو تم۔'' وہ اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تناوش مدہوشی کی کیفیت میں پڑی تھی۔ ہونٹوں پر تبسم بکھیرتے وہ خلا میں تکتی رہی۔

''اگر تم اس درندے کی رکھیل نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی اس موقع کو ضائع نہ کرتا۔ مگر سچ کہوں تو مجھے جان بہت پیاری ہے۔'' تناوش کے سر سے دوپٹا اتارتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔ تناوش کے کالے سیاہ بال، کالے ہی رنگ کے پراندے میں جکڑے ہوئے تھے۔

شکیل بے ساختہ بولا۔ ''جیسے اس پراندے کی جرات نہیں کہ ان بالوں سے خود کو آزاد کرا پائے یونہی تمھیں دیکھنے والا تمھاری صورت کے سحر سے خود آزاد نہیں کرا سکتا ہوگا۔ حقیقت میں جتنا سنا تھا تم اس سے کچھ زیادہ ہی پیاری ہو اور فاضی صاحب اگر مرنے سے پہلے تمھیں حاصل کر لیتا ہے تو یقیناً یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ حرکت کرتے رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ تناوش کے جسم سے سارا لباس علاحدہ کر دیا تھا۔ وہ شرم و حیا والی کبھی غیر مردوں کے سامنے سر کے بال کھولنے پر تیار نہیں ہوتی تھی، اس وقت ایسی حالت میں پڑی تھی کہ کپڑے کا تار بھی اس کے بدن پر موجود نہیں تھا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یقیناً اس حالت پر موت کو ترجیح دیتی۔ شکیل زیادہ دیر عقل و خرد سے بے گانہ کرنے والے نظارے کی تاب نہیں لا سکا تھا۔ اس نے فوراً ایک خوب صورت پینٹی کوٹ اسے پہنایا اور بے قابو ہوتے سانسوں کو سنبھالتا ہوا الماری کی طرف بڑھ گیا۔ شراب کی دو بھری بوتلیں نکال کر اس نے ایک میں سے شیشے کا آدھا گلاس بھر کر تپائی پر رکھا تھوڑی سی شراب تناوش کے چہرے پر چھڑکائی اور بقیہ کی دونوں بوتلیں بیت الخلاء میں جا کر خالی کر دیں۔ خالی بوتلوں کو ادھ بھرے گلاس کے ساتھ تپائی پر رکھ کر وہ باہر نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایس پی ضمیر حسین کو تناوش کے پہنچ جانے کی بابت اطلاع دے

رہا تھا۔

''بہت خوب، شکیل صاحب۔'' ایس پی تحسین آمیز لہجے میں بولا، فصیح الدین کے وہاں آتے ہی غائب ہو جانا۔ اس کے بعد تمھارا کام بس اتنا رہ جائے گا کہ کبیر دادا کا خیر خواہ بنتے ہوئے اسے کال کرنا ہوگی اور جب وہ اپنا کام کر گزرے تو مجھے مطلع کر دینا۔ بے جھجکے اسے اپنے بارے میں بتا دینا۔ یقیناً کبیر دادا تمھارے اس کام سے خوش ہوگا۔ کبیر دادا کو خبردار کرنے کے بعد مجھے ضرور مطلع کرنا۔ باقی فصیح الدین کے خاتمے کے بعد تیمور علی گینگ کا سربراہ اور اس کے دست راست تم ہو گے۔ فکر نہ کرو تیمور علی سے میری بات چیت ہو چکی ہے، کبیر دادا بھی تمھاری سفارش ضرور کرے گا۔''

''شکریہ سر، میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''شکریہ کی کوئی بات نہیں جگر، فاصی کے ساتھ میرا بھی کوئی ادھار پھنسا تھا، اس میں تمھارا فائدہ نظر آیا تو تمھیں بھی ساتھ شامل کر دیا۔ یہ دنیا کا قانون ہے بھائی کہ کچھ لے دے کے اصول پر کام چلتا ہے۔ اور میرے بدلہ لینے کی خواہش میں سب سے زیادہ فائدہ تمھیں پہنچ رہا ہے۔ ذرا سی محنت اور کوشش سے تم ایس پی ضمیر حسین اور کبیر دادا جیسے آدمی پر احسان کرنے والے بن جاؤ گے۔ میں تمھیں قانون کی گرفت میں آنے سے محفوظ رکھوں گا تو کبیر دادا، کسی غنڈے کو تمھاری طرف ٹیڑھی نگاہ سے نہیں دیکھنے دے گا۔ اس کے ساتھ ہماری طرف سے جو نقد انعام ملے گا وہ بونس میں ہے۔''

وہ عقل مندی سے بولا۔ ''سر، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اور میں نے خوب سوچ سمجھ کر ہی آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''شاباش اور میری یہ نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا کہ جرم کی دنیا میں کوئی بھی کام کرتے وقت ہمیشہ اپنا فائدہ مدنظر رکھنا، کیوں کہ سب سے پہلے تمھاری اپنی ذات ہے، اس کے بعد کسی اور کا نمبر آتا ہے۔ چاہے میرے ساتھ ہی کیوں نہ واسطہ پڑے۔'' ایس پی نے چکنی چپڑی باتوں سے اسے مزید شہہ دی۔

وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''سر، آپ تو میرے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔''

”آئندہ ایسی پاگلوں والی بات نہ کرنا، بے وقوف آدمی پہلے میں نے اپنا فائدہ سوچا ہے۔اس کے بعد تمھارا نمبر آیا ہے۔تم بھی پہلے اپنا فائدہ سوچنا۔ہاں اس کے بعد اگر میری لیے کوئی گنجائش کر سکو تو مجھے بھی اس کام میں پیچھے نہیں پاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے سر، شکریہ سر۔“

”خدا حافظ۔“ کر کے ایس پی نے رابطہ منقطع کر دیا۔شکیل خود کو فصیح الدین کے گینگ کا نمبر ٹو بنا دیکھ رہا تھا ۔کبیر دادا کی ہمدردی حاصل کرنے کے بعد تو ممکن ہی نہیں تھا کہ تیمور علی یا کوئی دوسرا تیسرا اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا۔وہ دل ہی دل میں خود کو شاباش دینے لگا کہ ایس پی ضمیر حسین کے مشورے پر اس کام میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹھیک آٹھ بجے فصیح الدین کو اپنے خاص آدمی شکیل کی کال موصول ہوئی۔”سر، مال کافی دیر کا پہنچا ہوا ہے اور آج تو کشمالہ بیگم نے بڑی خاص چیز بھیجی ہے۔“

”اچھا۔“ فصیح الدین نے دلچسپی سے پوچھا۔”کیا پچھلی دفعہ والی سے زیادہ خوب صورت ہے۔“

شکیل نے ایس پی کے سکھائے ہوئے الفاظ دہرائے۔”سر آج تک ایسی نہیں آئی۔خوب صورت ،پرکشش اور کم عمر بس دو چھوٹی چھوٹی خامیاں ہیں ایک بلا کی مے نوش لگتی ہے، کہ جس وقت سے پہنچی ہے ایک بوتل خالی کر کے دوسری کو جڑی ہے اور دوسرا ذرا بے باک ہے، آتے ہی لباس اتار کر فقط پینٹی کوٹ میں لیٹی ہے ۔گورے بدن پر کالا پینٹی کوٹ، یقین مانیں اگر آپ کا ڈر نہ ہوتا تو مجھ سے ضرور کوئی گستاخی ہو گئی ہوتی۔“

”ہاہاہا۔“ فصیح الدین نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔”عجیب بات کر رہے ہو یار، کم سن بھی، بلا کی مے نوش بھی اور بے باک بھی۔بہ ہر حال میری نظر میں یہ خوبیاں ہیں۔اور گستاخی کیسی کل تمھارے حوالے کر دوں گا۔“

”شکریہ سر، خوشی ہوئی۔اور آپ کس وقت پہنچ رہے ہیں میں نے ذرا کام سے جانا تھا۔“

فصیح الدین نے کہا۔”میں بس تمھاری طرف نکل ہی رہا ہوں۔آج مصروفیت کی وجہ سے تھوڑی دیر ہو گئی ہے ورنہ آٹھ بجے تک وہاں پہنچ جایا کرتا ہوں۔“

شکیل کی۔ ''میں منتظر ہوں سر!'' سن کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ خوب صورت، کم سن اور پرکشش کے الفاظ نے اس کی اشتہا بڑھا دی تھی۔ پہلے بھی کشمالہ اس کے پاس گئی گزری لڑکیاں نہیں بھیجا کرتی تھی، مگر شکیل نے کبھی کسی کی تعریف نہیں کی تھی۔ آج تو اس نے خصوصی طور پر لڑکی کی خوب صورتی کا ذکر کیا تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ کشمالہ سے بات کر کے اس کا شکریہ ادا کر دے مگر پھر اس نے یہ کام اس لڑکی سے ملاقات تک موخر کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار تیزی رفتاری سے مخصوص کوٹھی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ شکیل اسے دروازے کے قریب ہی منتظر ملا تھا۔

''سر، آپ کے منہ سے اس کی تعریف کل سن لوں گا اس وقت اجازت دیں۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' وہ دھڑکتے دل سے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دونوں محافظ چوکیدار کے ساتھ ہی رک گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر پر تعیش بیڈ کی طرف اٹھی جس پر وہ قتالہ عالم لیٹی تھی۔ آنکھوں میں خمار، ہونٹوں پر مسکان، مختصر پینٹی کوٹ سے چھلکتا سنگ مرمر سا شفاف بدن۔ ایک دفعہ تو لرز کر رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے کشمالہ بیگم، تم انعام کی حق دار ٹھہریں۔ اور تم بھی بے بی، کم از کم ایک سال تک تو تمھاری خدمات میرے حوالے ہی رہیں گی۔'' تناوش خمار آلود نظروں سے اسے گھورتی رہ گئی تھی۔

''شاید کچھ زیادہ ہی چڑھا گئی ہو۔'' وہسکی کی دو خالی بوتلوں کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ ''بہ ہر حال دس پندرہ منٹ تک سنبھل سکتی ہو تو ٹھیک ہے نہیں تو مدہوشی میں بھی قابل قبول ہو۔'' اس کا گال تھپتھپاتا ہوا وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ نہاتے ہوئے وہ بے ساختہ گنگنا رہا تھا۔ نہا کر وہ ہلکے پھلکے کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ پرہوس نظروں سے تناوش کے خوشنما بدن کو دیکھتے ہوئے اس نے گھنٹی بجائی۔ کوٹھی کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے اس نے مستقل ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ وہی اسے رات کا کھانا اور صبح سویرے ناشتا وغیرہ پیش کرتی تھی۔ اسے فصیح الدین کے پسندیدہ پکوان اور وہاں آنے کے اوقات وغیرہ کا اچھی طرح پتا تھا کہ برسوں سے وہاں نوکری کر رہی تھی۔

گھنٹی کے جواب میں وہ چند منٹ بعد ہی گرما گرم کھانے کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ دیسی گھی میں تلے قیمہ

بھرے کباب، نمکین گوشت اور روسٹ دیسی مرغ اس رات کی مخصوص خوراک ہوتے تھے۔ میٹھے میں عمدہ قسم کی کھیر جس میں پسے ہوئے بادام، پستہ، اخروٹ وغیرہ شامل ہوتے تھے۔

کھانے کے برتن شیشے کی میز پر سجا کر ملازمہ الماری کی طرف بڑھی اور وہاں سے وہسکی کی سربہ مہر بوتل نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"آجاؤ بے بی!" اس نے پیار بھرے انداز میں تناوش کو پکارا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"خفا ہو جانِ من، اتنے نخرے کس لیے۔" اس کی بکواس جاری رہی۔ تین چار دفعہ پکارنے کے بعد بھی جب وہ قریب نہ آئی تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانے کھاتے ہوئے بھی اس کی پرہوس نگاہیں تناوش پر گڑی رہیں۔ کھانا کھا کر اس نے ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ وہ دروازے ہی پر موجود تھی چراغ کے جن کی طرح فوراً نمودار ہوئی۔ جب تک فصیح الدین رات کے شغل میں مصروف نہیں ہوتا تھا وہ یونہی دروازے پر موجود رہتی۔ وہ برتن سمیٹنے کو بڑھی۔

"پہلے ایک گلاس میں خالص لیموں نچوڑ کر لے آؤ، ہماری خوب صورت مہمان کچھ زیادہ ہی چڑھا گئی ہے۔"

وہ "جی صاحب۔" کہہ کر واپس مڑ گئی۔ فصیح الدین جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگا۔ گو ہمیشہ اسے کوئی جلدی نہیں ہوا کرتی کہ اس کے پاس پوری رات کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن نہ جانے اس لڑکی میں ایسی کون سی کشش تھی کہ وہ جلد از جلد اس کے قریب جانا چاہتا تھا۔

ملازمہ جلد ہی لیموں نچوڑ کر لے آئی تھی۔

"پلاؤ اسے۔" وہ بوتل سے آخری گلاس بھرنے لگا۔

ملازمہ نے سہارا دے کر تناوش کو اٹھایا اور اس کے منہ سے گلاس لگا دیا۔ نچوڑے ہوئے لیموں پینے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں ہوش مندی کی چمک ابھرنا شروع ہو گئی تھی، شاید دوائی کا اثر ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کھٹے پانی نے اس کے دماغ پر چھائے ہوئے خمار کو کم کرنے میں اور بھی تیزی دکھائی تھی۔ ملازمہ کے برتن سمیٹ کر نکلنے تک اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہو بار بار

سر کو جھٹکتے ہوئے وہ نیند کو بھگانے کی کوشش میں لگ گئی۔

فصیح الدین آخری گلاس معدے میں انڈیل کر مستی سے لہراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ شراب کی بوتل سے زیادہ نشہ تو اسے دیکھ کر چڑھ رہا تھا۔

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ ''یقین نہیں آتا کوئی لڑکی اتنی بھی خوب صورت ہو سکتی ہے۔ تم آج تک کہاں چھپی تھیں۔''

آہستہ آہستہ شعور کی طرف آتی تناوش کو اس کے ہاتھ کا لمس ناگوار محسوس ہوا۔ اس نے کمزوری سے اپنا ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔

''کیا ہوا جانِ من، اتنا اعراض کس لیے؟'' فصیح الدین نے ایک دم اسے اپنی آغوش میں سمیٹا۔

''چھوڑو مجھے۔'' دونوں ہاتھ اس کے چھاتی پر رکھتے ہوئے اس نے فصیح الدین کو دور دھکیلا اور اس کوشش میں ایک جانب گر پڑی۔

''نشہ نہیں اترا میری جان۔'' فصیح الدین اس کی حالت سے لطف اندوز ہونے لگا۔

دوائی کا اثر کافی حد تک اتر گیا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر فصیح الدین کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مم..... میں کہاں ہوں۔'' اس کے لہجے میں وحشت بھری تھی۔

فصیح الدین نے قہقہہ لگایا۔ ''ارے اتنی جلدی بھول گئی ہو، ابھی تو پارٹی شروع بھی نہیں ہوئی۔''

''کک..... کون ہو تم..... میں یہاں کیسے؟'' وہ بے اختیار بیڈ کے دوسرے کونے کی طرف کھسکی اور اسی وقت اس کی نظر اپنے جسم پر پڑی۔ ''کک..... کپڑے، میرے کپڑے۔'' وہ وحشت زدہ انداز میں سمٹ گئی۔

''پہنے تو ہوئے ہیں۔'' فصیح الدین نے اس کے ناکافی لباس کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اس کی حالت سے لطف لے رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے تئیں وہ نشے میں تھی۔

اسی وقت تناوش کی نظر تکیے کے ساتھ پڑے اپنے لباس پر پڑی اس نے جھپٹ کر کپڑے اٹھا لیے۔

''جان من، ابھی پہننے نہیں اتارنے کا وقت ہے۔'' فصیح الدین پچکارتے ہوئے کپڑے اس کے ہاتھ سے لینے لگا۔

''چھوڑو میرے کپڑے، ذلیل کمینے .....کون ہو تم .....چھوڑو۔'' وہ مکمل ہوش میں آ گئی تھی اور خود کو اس حالت میں دیکھ کر حواس باختہ ہو رہی تھی۔

''ارے تم تو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو.....اور میرے پاس وقت تو کافی ہے مگر اتنا صبر نہیں ہے کہ تمھارے نشہ ختم ہونے کا انتظار کروں۔'' اس نے ایک دم آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی، مگر اسے دھکا دے کر تناوش بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

''تم نے ضرور ورزش کروانی ہے جانِ من۔'' وہ بھی جارحانہ انداز میں بیڈ سے اتر گیا تھا۔

''مخ.....خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو.....تمھیں اللہ کا واسطہ۔'' تناوش گڑگڑانے لگی۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو جانِ من کوئی پہلی بار تو نہیں ہے کہ تمھیں ڈر لگے۔ تمھارا تو کاروبار ہی یہی ہے۔''

تناوش ایک دم دروازے کی طرف دوڑی مگر فصیح الدین نے چھلانگ لگا کر اسے پکڑ لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے محافظ وہ تماشا دیکھیں۔ اسے دھکا دے کر بیڈ پر گراتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھا۔

''شاید تمھیں زبردستی ہی میں مزہ آتا ہے۔'' پرہوس لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھا۔

''خدا کے لیے چھوڑ دو۔'' تناوش نے اس کے سامنے ہاتھ باندھ لیے تھے۔ اور پھر فصیح الدین کو بے نیازی سے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ چلائی..... ''بچاؤ.....بچاؤ.....کوئی ہے۔''

''میں ہوں نا۔'' وہ اس کے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر اس کی طرف بڑھتا گیا۔

''کبیر.....کبیر آ جاؤ نا۔'' اس کے دل نے شدت سے کبیر دادا کو یاد کیا۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا نا میری حفاظت کا، کہاں ہو آ جاؤ نا، دیکھو میری خاطر نہیں اپنی انا اور زبان کی پاسداری کے لیے ہی آ جاؤ.....یا اللہ پاک میرے کبیر کو میری حالت کی خبر تو دے دے۔ یا اللہ اسے میری نجات کا وسیلہ بنا کر بھیج دے۔ یا اللہ اسے بتا تو دے کہ اس کے دھتکارنے پر میں کس طرح بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئی ہوں۔'' کہتے ہیں مشکل گھڑی میں اللہ پاک یاد آتا ہے اور پھر وہ شخص یاد آتا ہے جس سے انسان بہت محبت کرتا ہو۔ وہ بھی اللہ پاک سے کبیر دادا کو وہاں لانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اور مناجات کے ساتھ اس کی حرکت بھی نہیں رکی تھی۔ وہ بیڈ کے دوسری جانب اتر گئی۔

فصیح الدین بیڈ سے گھوم کر اس کی طرف بڑھا اور وہ بھاگ کر دوسری جانب گھوم گئی۔

وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ ”اُف..... تمھارا تو پتا نہیں مگر مجھے چوہے بلی کے اس کھیل میں بڑا مزہ آرہا ہے۔“

”تمھیں اللہ کا واسطہ..... سو ہنڑیں رسول کا واسطہ..... مجھے جانے دو۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر دہائی دی۔ یہ کہتے ہوئے وہ کوشش کر کے پھر دروازے کی جانب بھاگی، فصیح الدین نے دو چھلانگوں میں اسے جالیا تھا۔

”اب پکڑی گئی ہو اور کھیل شروع۔“ فصیح الدین نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑا۔

”چھوڑو مجھے..... ذلیل کمینے..... بچاؤ..... بچاؤ۔“ مچل کر اس سے جان چھڑانے کے ساتھ وہ زبان سے چیخنا بھی شروع ہو گئی تھی۔ مگر فصیح الدین کا اس بھاگ دوڑ سے دل بھر چکا تھا۔ مچلتی حسینہ کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے وہ مکروہ لہجے میں بولا۔

”اب بس بھی کرو نا جانِ من اتنی بے رخیاں بھی اچھی نہیں ہوتیں۔“ تناوش کے گڑگڑانے، چیخنے چلانے اور اسے برا بھلا کہنے کی وہ مطلق پروا نہیں کر رہا تھا۔

”خدا کے لیے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو..... معافی دے دو۔“ تناوش نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے باندھ دیے تھے۔

”جانِ من، تم چھوڑنے کی چیز تو نہیں ہو.....“ اس نے پرہوس لہجے میں کہتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچا۔ تناوش نے چیختے ہوئے آنکھیں بند کر لیں تھیں، اس کی بدبختی اور بدنصیبی پر فصیح الدین کی ہوس کی مہر ثبت ہونے میں کوئی شبہ بقایا نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے سارا دن گھر ہی پر گزارا تھا۔ راحت خالہ نے ناشتے اور دوپہر وغیرہ کے کھانے کی بابت پوچھا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر اس نے سامان سمیٹنے کی کوشش پر وہ غصے و بیزاری بھرے لہجے میں بولا۔ ”راحت خالہ، رہنے دو۔“

”صاحب جی!.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے۔

''کہہ دیا نا۔'' قطع کلامی کرتے ہوئے اس نے راحت خالہ کو کمرے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ سر جھکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''نہیں ہے ضرورت ترتیب کی، ایسے ہی رہے گا میرا کمرہ، کسی کو ضرورت نہیں میرا خیال رکھنے کی..... نفرت کرتا ہوں میں تم سے..... سن رہی ہو نا، مجھے تم سے نفرت ہے، بے حد نفرت۔'' موبائل سکرین پر اس کی فوٹو لاتے ہوئے وہ بے ربط باتیں منہ سے نکالتا رہا۔

''اب تمھاری کال بالکل بھی وصول نہیں کروں گا، تمھارے کپڑے بھی پھینک دوں گا۔'' جینز کی پتلون اور پھول دار قمیص اس نے اپنے ساتھ بیڈ پر رکھی ہوئی تھی۔ ''تمھاری ساری تصاویر اپنے موبائل فون سے مٹا دوں گا..... تم مجھے نہیں جانتیں، میرا نام کبیر علی خان ہے اور لوگ مجھے کبیر دادا کہتے ہیں..... کبیر دادا کو کسی کی پروا نہیں، کسی کی بھی نہیں..... تمھاری بھی نہیں۔'' تناوش کی گنگناتی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔

''ہنس لو..... مگر میں تمھیں بھلا کر دکھاؤں گا..... کبیر دادا نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی، کبیر دادا ہارنا نہیں جانتا..... اگر تم سمجھتی ہو کہ تمھارے دروازے پر محبت کی بھیک مانگنے آؤں گا تو بھول ہے تمھاری..... کبیر دادا کو جھکنا نہیں آتا..... اور تم جیسی دو ٹکے کی چھوکری کے لیے میں اپنے مقام سے نیچے آنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تمھیں اپنی زندگی سے دفع کر چکا ہوں۔ اگر تم نہ جاتیں تو ایک دو دن بعد تمھیں خود ٹھوکر لگا دیتا..... بس افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے پہلے ہی یہ کام کر لینا چاہیے تھا۔''

اس کے کان میں تناوش کی سرگوشی گونجی۔ ''لڑکی بھی ہوں، دوست بھی ہوں، محبوبہ بھی ہوں اور بیوی بھی۔ اتنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی مجھے نظر انداز کرتے رہتے ہیں آپ۔''

''خاموش..... بند کرو بکواس، نہیں ہو تم میری دوست اور تم جیسی لڑکی کو محبوبہ بناتی ہے میری جوتی۔ بڑی آئی کبیر دادا کے دل میں جگہ بنانے۔'' موبائل آنکھوں سے دور کرتے ہوئے اس نے ایک طرف رکھا اور آنکھیں بند کر دیں۔ ہنستی مسکراتی تناوش جھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ دھمکی۔ وہ کچھ گنگنا رہی تھی، شاید اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبیر دادا کے سانس بوجھل ہونے لگے جانے کتنے گھنٹوں سے وہ سو نہیں سکا تھا۔ نیند میں وہ اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی رہی۔ ویسے ہی شوخی اور شرارت بھرے انداز میں، وہی محبت، چاہت اور

خلوص سے لبریز رویہ، اسی طرح اپنا آپ اس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار، پہلے کی طرح اس کا خیال رکھنے والی۔

آنکھ کھلنے پر اسے خواب گاہ میں اندھیرا چھایا نظر آیا۔ جاگتے ہی خواب کے خوب صورت مناظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔

"کہاں چلی گئی ہو تناوش!..... آجاؤ نا، میں ہارا اور تم جیتیں، بس کر دو اب برداشت ختم ہو گئی ہے۔ تم بن، تم سے دور، تمھارے علاوہ نہیں رہ سکتا۔ تم جو کہو گی وہی کروں گا۔ تم کہتی تھیں کہ تمھیں چندا، گڑیا اور جانو کہوں ..... آجاؤ یہی کہوں گا۔ تم میری گود میں لیٹنا چاہتی تھیں، قسم سے پوری رات گود میں لے کر بیٹھا رہوں گا۔ میرے ساتھ شاپنگ پر جانے کی خواہاں تھیں، جب بھی کہو گی لے کر جاؤں گا۔ میرے ہاتھ سے پہلا نوالہ کھانے کی خواہش تھی، وعدہ کرتا ہوں پورا کھانا اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔ میری شراب نوشی کی عادت بری لگتی تھی، آ کر آزما لو تمھارے سامنے کبھی نہیں پیوں گا، ساحل سمندر پر میرے بازوؤں میں سما کر سیر کرنا چاہتیں تھیں، میں بھی اب یہی چاہتا ہوں، ایک موقع تو دے دو تمھیں اٹھا کر میلوں چلوں گا۔ جب کہو گی کام پر نہیں جاؤں گا، جب چاہو گی ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں گے۔ تم میرا اعتراف سننا چاہتیں تھیں، ہر لمحہ اقرار کروں گا کہ تم دنیا کی خوب صورت ترین، پیاری ترین گڑیا ہو، نہ تم جیسی کوئی تھی اور نہ ہو گی۔ آجاؤ نا گڑیا بس ایک موقع دے دو میں ساری زیادتیوں کا ازالہ کر دوں گا، تمھارے ساتھ بارش میں بھی بھیگوں گا دونوں مل کر چٹنی اور پکوڑے کھائیں گے۔" پتا نہیں کون کون سے خیال اس کے دماغ میں آ رہے تھے۔

چند لمحے کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے بیڈ چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹریک سوٹ پہن کر جم میں داخل ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ رسی کود کر اس نے جسم کو گرم کیا اور پھر Punching Bag پر مکے برسانے لگا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں اس کے چہرے اور گردن پر بہہ رہا تھا۔ مسلسل آدھا گھنٹا بیگ کی پٹائی کر کے اس نے گلاؤز اتارے اور گہرے سانس لیتا ہوا جم سے باہر نکل آیا۔ اچانک اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ سکرین پر ابھرنے والا بغیر نام کا نمبر اس کا دل دھڑکا گیا تھا۔ اسے لگا تناوش کا فون ہے۔ دل ہی دل میں اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہو کر اس نے کال وصول کرنے والا بٹن دبا دیا۔

"اسلام علیکم!..... کیا میں کبیر دادا کو مخاطب ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔" نامانوس سی آواز نے

اس کے دل میں مایوسی بھر دی تھی۔

"بولیں۔" اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"دادا، میں شکیل احمد بات کر رہا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے، مگر میں آپ کا بہت بڑا معتقد ہوں۔ آپ ہمیشہ سے میرے ہیرو رہے ہیں۔"

"شکریہ اور میں تھوڑا مصروف ہوں اس لیے اجازت چاہوں گا۔"

"کال نہ کاٹنا دادا، بہت ضروری بات کرنا ہے۔"

"بولو۔" اس نے کوفت زدہ انداز میں کہا۔

"آپ کی بیوی کو فصیح الدین نے اغواء کر لیا ہے اور وہ اس وقت اس کے عیاشی کے اڈے پر ہے۔"

"کیا....." ایک دم اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ "اور تم میری بیوی کو کیسے جانتے ہو۔"

وہ تیز لہجے میں تفصیل بتاتا ہوا بولا۔ "جانتا ہوں دادا، شاہ جی کے گھر میں ہونے والی تقریب میں میں نے بھابی کو سرخ رنگ کا دوپٹا لپیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ بدقسمتی سے میں فصیح الدین صاحب کے عیاشی کے اڈے کا انچارج ہوں۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے دو آدمی انھیں لے کر میرے پاس آئے تھے۔ وہ بے ہوش تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ اور اب کوٹھی سے باہر نکل کر آپ کو کال کر رہا ہوں۔ جلدی آئیں دادا، بھابی کی عزت خطرے میں ہے۔ فصیح الدین اس کے ساتھ اکیلے کمرے میں موجود ہے، مجھ میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکوں۔"

"اگر یہ جھوٹ ہوا تو....."

"دادا، یہ تحقیقات کا وقت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں آپ ڈرنے والے نہیں ہیں۔ میری غلط بیانی سے شاید آپ کو اتنا نقصان نہ ہو لیکن میرے سچے ہونے پر، جیسا کہ میں ہوں اگر آپ نے سرعت سے اقدام نہ کیا تو شاید ساری عمر پچھتاتے رہیں۔"

"پتا بتاؤ۔" اس کے لہجے میں آگ کی سی تپش تھی۔

شکیل نے فوراً مطلوبہ کوٹھی کا پتا دہرا دیا۔ رابطہ منقطع کرتے ہوئے وہ باہر کی طرف بھاگا۔

"عظیم ..... عظیم گاڑیاں نکالو۔" ملازموں کے کوارٹرز کی طرف بھاگتے ہوئے وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔اس کے محافظ جس حالت میں تھے کمروں سے نکل کر باہر بھاگتے چلے آئے۔

"گاڑیاں نکالو..... وقت نہیں ہے۔" وہ دھاڑا۔اس کے ڈرائیور شہزاد نے سرعت سے گیراج میں کھڑی مرسڈیز باہر نکالی۔اس کے ساتھ والی نشست پر جگہ سنبھالتے ہوئے وہ چلایا۔"جلدی چلو اورنگ زیب کالونی میں جانا ہے۔" شہزاد نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کار بھگا دی۔چوکیدار بھی کبیر دادا کے چلانے کی آواز سن چکا تھا اس نے دروازہ کھولنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

اس کے محافظ اورنگ زیب کالونی کا نام سن چکے تھے وہ فوراً اپنی جیپیں نکالتے ہوئے پیچھے چل پڑے۔

"تیز چلو..... کسی اشارے پر رکنے کی ضرورت نہیں بس چلتے جاؤ۔" کبیر دادا کے لہجے میں شامل غصہ اور بے صبری سے شہزاد کا دل دہلا جا رہا تھا۔وہ پوری رفتار سے مرسڈیز کو بھگائے گیا۔

ان کے عقب میں آنے والی جیپ میں امتیاز بڑے یقین سے دعوا کر رہا تھا۔"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ یہ نمازن کا معاملہ ہے۔"

"یار تمھارے دماغ میں ہر وقت وہی گھسی ہوتی ہے۔" بخش نے اسے جھڑکا۔

"شرط لگا لو۔" امتیاز نے اسے للکارنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" غصے بھرے لہجے میں کہتے ہوئے بخش نے چپ سادھ لی تھی۔

شہزاد بڑی مہارت سے گاڑیوں کو اوورٹیک کرتا ہوا مطلوبہ سمت میں روانہ تھا۔

"شہزاد تیز چلو....." گہرے سانس لیتا ہوا کبیر دادا نہایت غصے اور بے چینی میں دکھائی دیتا تھا۔اسے اتنا پریشان شہزاد نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

مسلسل بیس منٹ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ اورنگ زیب کالونی کی کشادہ سڑک پر مڑے۔وہاں رش کم تھا۔شہزاد نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

"بلاک نمبر تین گلی نمبر دو مکان نمبر پچیس اے۔" اس نے مکمل پتا دہرا دیا۔

شہزاد نے بلاک نمبر تین کی گلی نمبر دو میں کار موڑ دی۔چوڑی گلی میں چوتھے نمبر پر ان کا مطلوبہ مکان تھا۔اس

نے جونہی ہی کار گیٹ کے سامنے جا کر روکی، محافظوں کی جیپیں بھی اس کے پیچھے پہنچ گئی تھیں۔

اسی وقت عظیم پچھلی جیب سے باہر نکل کر دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔

وہ عظیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہ کس کا مکان ہے۔''

عظیم سرعت سے بولا۔ ''فصیح الدین کا۔''

''ہوشیار رہنا۔'' کہہ کر وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت ذیلی کھڑکی کھول کر چوکیدار باہر نکل آیا تھا۔

''جی صاب.....'' اس نے پوچھنے کے لیے لب کھولے، مگر اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے کبیر دادا کا بازو گھوم چکا تھا۔ کنپٹی پر لگنے والا مکا اسے سوال و جواب کی دنیا سے بہت دور لے گیا تھا۔

کبیر دادا فوراً اندر داخل ہوا۔ سیمنٹ کی روش پر اسے فصیح الدین کی کار کھڑی نظر آئی تھی اور اس کے ساتھ کرسیاں ڈال کر اس کے دونوں محافظ بیٹھے تھے۔ گاڑیوں کے رکنے کی آواز وہ سن چکے تھے اور اس وقت دروازے ہی کی جانب متوجہ تھے۔ کبیر دادا کو دندناتے ہوئے اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ چہروں پر حیرانی بھرے تاثرات سجائے کھڑے ہو گئے تھے۔

''کبیر دادا، آپ یوں کیسے ایک دم.....'' اس کے قریب پہنچنے پر ایک محافظ نے سوال کرنا چاہا۔ مگر کبیر دادا کے پاس اس وقت سوال جواب اور وضاحتوں کا وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دم اچھلا، ایک محافظ کی ٹھوڑی پر اس کا دایاں مکا اور دوسرے کی پسلیوں میں اس کا گھٹنا زوردار انداز میں لگا۔ وہ دونوں۔ ''اوغ اور ہائے.....'' کی مختلف آوازیں نکالتے ہوئے ڈھیر ہو گئے تھے۔ وہ ان کا انجام دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا۔ امتیاز اور بخش اس کے پیچھے پیچھے چلتے آ رہے تھے۔ اندرونی عمارت میں داخل ہوتے ہی وہ ڈرائنگ روم سے گزر کر آگے بڑھا۔ شاید مطلوبہ کمرہ ڈھونڈنے میں اسے تھوڑی دیر لگ جاتی مگر اچانک ہی ایک کمرے کے اندر سے.....

''خدا کے لیے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو..... معافی دے دو۔'' کی آواز ابھری۔ تناوش کی آواز وہ کیسے نہ پہچانتا۔ اس کی نس نس میں بجلیاں بھر گئی تھیں۔ وہ دوڑتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا، اسی وقت اس کے کانوں میں تناوش کی چیخ گونجی اور دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر اسے کھولتا ہوا وہ اندر گھس گیا۔ اندر کے منظر نے اس کے

غصے کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ فصیح الدین چیختی چلاتی تناوش کو کھینچ کر گلے سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تناوش اس وقت ناکافی لباس میں تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر فصیح اس طرف متوجہ ہوا۔ کبیر دادا کو دیکھتے ہی اس نے تناوش کو چھوڑ دیا تھا۔ اندرونی منظر پر نگاہ ڈالتے ہی امتیاز پارٹی دروازہ بند کر کے باہر رک گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فصیح الدین جیسے تین چار پر بھی کبیر دادا بھاری تھا۔ اور کبیر دادا کی بیوی کو ناکافی لباس میں دیکھ کر ان کا اندر داخل ہونا لازماً معیوب تھا۔

''کبیر دادا تم۔''

''اپنی موت کیوں نہیں کہتے۔'' اس کے لہجے میں شامل تپش نے فصیح الدین کو لرزا دیا تھا۔

''کیا ہوا اور یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' ابھی تک اس کی سمجھ میں کبیر دادا کی آمد نہیں آئی تھی۔

''تم نے بہت بری موت کا انتخاب کر لیا ہے فصیح الدین۔'' دانت پیستے ہوئے کبیر دادا کا بازو رگھوما، زوردار تھپڑ نے فصیح الدین کو دو گز دور فرش پر اچھال دیا تھا۔

تڑپ کر اٹھتے ہوئے اس نے کبیر دادا پر حملہ کر دیا۔ آخر اپنی عرفیت، فاصی ہتھ چھٹ کا ثبوت تو اس نے دینا تھا۔ اور یہ کوشش اسے مہنگی پڑی تھی۔ اپنے سر کو چند انچ حرکت دے کر کبیر دادا نے اس کا وار ہوا میں اڑایا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ پاتا، اس کی کلائی پر گرفت جماتے ہوئے کبیر دادا نے اسے کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔

اپنے دونوں ہاتھ سامنے ٹیک کر فاصی نے اپنا سر دیوار سے لگنے سے بچایا، مگر اس سے پہلے کہ وہ پیچھے مڑ پاتا، کبیر دادا کی زوردار ٹھوکر اس کے کندھوں کے بیچ لگی۔ اس مرتبہ وہ اپنا سر دیوار سے لگنے سے نہیں بچا سکا تھا۔ اس کے ماتھے سے بے اختیار خون بہنے لگا۔

دھاڑ مارتے ہوئے وہ پیچھے مڑا اور ایک بار پھر کبیر دادا کو چوٹ پہنچانے کی کوشش کی، مگر کبیر دادا اس وقت چھلاوا بنا ہوا تھا۔ اپنی جان حیات کی بے حرمتی اس سے کہاں ہضم ہو سکتی تھی۔ فاصی کے حملے کو ناکام بناتے ہوئے کبیر دادا نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور بازو کے سیدھا ہوتے ہی اس کی ہتھیلی کا اندرونی حصہ زوردار انداز میں فاصی کے کہنی کے جوڑ سے ٹکرایا۔ ''کٹاک۔'' کی آواز کے ساتھ فاصی کے منہ سے زوردار چیخ برآمد

ہوئی۔اس کا بازو کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ گیا تھا۔اس کی چیخ سے بے پروا کبیر دادا نے اس کے دوسرے بازو کو پکڑ کر مروڑا، وہ بے اختیار الٹا گھوم گیا تھا۔اس کی پیٹھ پر دائیں لات ٹیکتے ہوئے کبیر دادا نے اس کے بازو کو پیچھے کھینچا۔اس مرتبہ فاصی ہتھ چھٹ کے منہ سے پہلے سے بھی زوردار چیخ نکلی تھی۔اس کے دوسرے بازو کا جوڑ کندھے سے نکل گیا تھا۔اس کا جسم درد اور تکلیف کی شدت سے مسلسل کانپ رہا تھا۔کبیر دادا اس کی اذیت سے بے پروا اپنے کام میں لگا ہوا تھا اس کے کانوں میں تو بس اپنی تناوش کی چیخ اور گڑگڑانا ہی گونج رہا تھا۔فاصی کو گردن سے پکڑ کر اس نے ایک ہی ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا۔اس کے دونوں بازو بے ہنگم انداز میں دائیں بائیں لٹک رہے تھے۔

''ک..... کک..... کبیر..... تت..... تم نے اچھا نہیں کیا۔'' فاصی کے ہونٹوں سے خرخراتی آواز نکلی۔

''جانتے ہو تم نے کس کو چھونے کی کوشش کی ہے۔کبیر دادا کی عزت کو۔فصیح الدین تم جینے کا حق تو اسی وقت کھو چکے تھے جب تم نے میری بیوی کے بارے غلط سوچا تھا، لیکن تمھاری اتنی جرات کہ اسے اس حال تک لے آئے۔اسے بے لباس کر دیا۔'' یہ کہتے ہی کبیر دادا نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں سیدھی کر کے اکڑاتے ہوئے ایک دم فصیح الدین کی آنکھوں میں گھسیڑ دی تھیں۔اس کے منہ سے خرخراتی ہوئی چیخ برآمد ہوئی اور کبیر دادا نے اس کے گلے پر دباؤ بڑھا دیا۔اس کے پاؤں زور زور سے ہلنے لگے تھے۔اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔چند لمحے پہلے ایک بے بس حوا زادی کی چیخوں اور آہ زاری سے لذت کشید کرنے والا عبرت ناک انجام سے دوچار ہو گیا تھا۔

اس کا سانس نکلتے ہی کبیر دادا نے اسے گھما کر بیت الخلا کے دروازے کی طرف اچھالا، وہ دروازہ کھولتا ہوا آدھا بیت الخلا کے اندر اور آدھا باہر پڑا رہ گیا تھا۔

اس کے مرتے ہی کبیر دادا کے چہرے کے عضلات اعتدال پذیر ہونے لگے۔اس نے سر گھما کر دیکھا تناوش کپڑے پہن چکی تھی۔کبیر دادا کو دیکھتے ہی ہر خوف اور ڈر اس کے دل سے رخصت ہو گیا تھا۔اللہ پاک نے اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا تھا۔

''کاش میں نے آپ کی آمد کے ساتھ آپ کے ساتھ کی دعا بھی مانگ لی ہوتی۔'' تناوش کے دل میں حسرت جاگی، کبیر دادا کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا تھا۔کبیر دادا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس

سے کیا بات کرے۔ بس اس کے اندر ایک شکوہ کرتی سوچ ابل رہی تھی۔

''دیکھ لیا مجھ سے دور جانے کا انجام، اکیلی لڑکی کے ساتھ یہ درندے ایسا سلوک کرتے ہیں۔ میرے لیے نہیں تو اپنی حفاظت کے لیے تو تم میرے ساتھ رہ سکتی تھیں۔''

دوسری جانب تناوش کے دل میں شور بپا تھا۔ ''دیکھ لیا خود سے دور کرنے کا انجام، کیسے بے عزت اور خوار ہو رہی ہوں۔ ایک ظالم نے کتنا رلایا اور ستایا ہے، اگر اپنی ملازمہ بنا کر ہی رکھ لیتے تو کوئی اپنا گندا ہاتھ تو میری جانب نہ بڑھاتا۔''

''چلو.....'' وہ مختصراً کہتا ہوا باہر کی جانب مڑ گیا۔ اس کے سامنے آتے ہی وہ خود کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ ایک دم اپنی ساس سے بات کرنے کا ہو گیا تھا۔ شاید وہ جہاں دیدہ عورت تناوش کی مشکلات کو سمجھتے ہوئے اسے کبیر دادا کے ساتھ جانے پر مجبور کر دیتی۔

تناوش سر پر دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔ رہ رہ کر اس کے ہونٹ کبیر دادا سے بات کرنے کے لیے لرزتے مگر پھر وہ رک جاتی۔ کیا معلوم وہ اسے جھڑک دیتا یا دھتکارتے ہوئے دفع ہو جانے کا کہتا۔ ایک دفعہ وہ پاشا کی زبانی دھتکارے جانے کی اذیت سہہ چکی تھی اب وہی باتیں کبیر دادا کی زبانی سن کر یقیناً وہ اپنے آنسو نہ روک پاتی۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے بات نہیں کرنے والی تھی۔ دوسرے شہر جانے سے پہلے وہ ایک بار ضرور اس سے ملنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

امتیاز اور بخش باہر دروازے ہی پر کھڑے تھے۔ جبکہ باقر اور رخسار فصیح الدین کے بے ہوش پڑے محافظوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ عظیم وہاں موجود ملازمہ سے کچھ پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ کبیر دادا کو باہر نکلتے دیکھ کر وہ ملازمہ کو چھوڑ کر جلدی سے کبیر دادا کے پیچھے چل پڑا۔

''ان کا کیا کرنا ہے دادا۔'' باقر نے فصیح الدین کے محافظوں کی جانب اشارہ کیا۔

''چھوڑ دو۔'' کبیر دادا رکے بغیر رکے آگے بڑھ گیا۔ ڈرائیوروں نے گاڑیاں موڑ کر کھڑی کی ہوئی تھیں۔ عظیم نے آگے بڑھ کر عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ کبیر دادا وہاں بیٹھے بغیر دوسری جانب گھوم گیا۔ یقیناً اس نے تناوش کے لیے خالی دروازہ چھوڑا تھا۔ تناوش خاموشی سے اندر گھس کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کبیر دادا کے بیٹھتے ہی

عظیم ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور شہزاد نے کار آگے بڑھا دی۔

"دیکھ لیا کیا کہا تھا۔" امتیاز اپنے اندازے کی درستی پر بخش کو مخاطب تھا۔

"یار، پتا نہیں تمھیں کیسے اندازہ ہو جاتا ہے۔" بخش نے کھسیانے انداز میں سر ہلایا۔

امتیاز فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "جگر، کبیر دادا اتنا پریشان اور بدحواس اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔اور انسان کی ایسی حالت تب ہی ہوتی ہے جب اس کی عزت پر بنی ہو۔"

"ویسے یہ نمازن ہر وقت کسی نہ کسی کے ہاتھوں پھنسی رہتی ہے۔" بخش بھی امتیاز کی تقلید میں تناوش کو نمازن کہنے لگا تھا۔

"یہ بھی تو دیکھو کہ اسے جس نے بھی میلے ہاتھ سے چھونے کی کوشش کی وہ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا ہے۔ دلاور شیخ، خاور شیخ اور اب فاصی ہتھ چھٹ جیسا آدمی بھی نہ بچ پایا۔"

بخش نے کہا۔ "ویسے فاصی کی موت پر کافی ہنگامہ کھڑا ہوگا۔"

امتیاز ہنسا۔ "کبیر دادا، ایسے ہنگاموں کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا دیتا ہے۔"

"صحیح کہا۔" بخش نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

کار کے آگے بڑھتے ہی عظیم نے پوچھا۔ "دادا کہاں جانا ہے۔"

کبیر دادا نے کہا۔ "تناوش کے گھر۔"

تناوش کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے اس کے دل میں ذرا سی امید بقایا تھی کہ شاید اسے خوابوں کی جنت میں جانے کا موقع مل جائے، مگر اس کی یہ خواہش شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکی تھی۔

تمام اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ اس سے پہلے ہمیشہ تناوش نامحسوس انداز میں کھسکتے ہوئے کبیر دادا کے ساتھ لگ کر بیٹھ جایا کرتی تھی، آج کبیر دادا کا رواں رواں دستِ دعا بنا اس کی قربت کا متمنی تھا۔ مگر وہ سیٹ کے دوسرے کنارے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو کبیر دادا کے دل کی حسرتوں کو بڑھا رہی تھی۔

تناوش کے گھر تک وہ خاموش بیٹھے رہے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔ اور نہ

وہ چاہتے ہوئے اپنے دل کا حال بیان کر سکی تھی۔

تناوش کے گھر کے سامنے کار رکتے ہی وہ نیچے اترتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ یہیں انتظار کرو۔''

اس کی دیکھا دیکھی تناوش بھی نیچے اتر گئی تھی۔ دروازے کے پٹ میں جھری دیکھتے ہوئے وہ دستک دینے کا ارادہ ترک کر کے دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا۔ تناوش بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ مگر اسے کبیر دادا کے اپنے گھر میں داخل ہونے حیرانی ضرور ہو رہی تھی۔

''شاید، امی جان کو میری شکایت کرنے جا رہا ہو۔'' اس نے سوچا، مگر اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ۔'' آخر کیا شکایت کرے گا؟..... میں کوئی اپنی مرضی سے تو وہاں نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے اغواء کر کے لے گئے تھے۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔'' ذہن کے گھوڑے دوڑاتے وہ اس کے پیچھے چلتی رہی۔ بشریٰ کمرے ہی میں گھسی تھی۔ جونہی کبیر دادا تناوش کو لیے گلا کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا، پریشانی سے سر پکڑے بیٹھی بشریٰ خوشی سے چیختے ہوئے بیٹی کی طرف بڑھی۔

''تم کہاں تھیں میری جان۔'' وہ ماں کے ساتھ لپٹ کر خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ اتنا قریب آ کر اس کا محبوب پھر واپس لوٹنے والا تھا۔

کبیر دادا نے بھی بشریٰ کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تناوش کے اغواء کی بابت جان کر وہ پریشان ہو جائیں۔

بشریٰ بیٹی کو تسلی بھرے چند الفاظ کہہ کر کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو اسے آپ لے گئے تھے۔'' کبیر دادا کی خاموشی کو اثبات جانتے ہوئے اس کی بات جاری رہی۔ ''مگر کیوں؟..... آپ نے تو اسے دھتکار دیا تھا پھر ساتھ لے جانے کا خیال کیسے آیا، جس لڑکی کو آپ گھر نہیں رکھ سکتے اس کے ساتھ عیاشی کرنے اور اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت آپ کو کس نے دی ہے۔ کیا اسی لیے ہماری مدد کی تھی کہ اس کے بعد ہمارا تماشا بنا دو، آپ سے تو وہ دلاور شیخ ہی بہتر تھا جو میری بیٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا.....''

''ماں جی نہیں.....'' تناوش نے تڑپ کر ماں کو روکنا چاہا، جبکہ کبیر دادا ششدر کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا

۔وہ ساری باتیں اس کے سر سے کافی اوپر گزر رہی تھیں۔

''تم خاموش رہو۔'' بیٹی کو جھڑک کر وہ کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''آپ بھرے مجمع میں نکاح پڑھوا کر میری چاند سی معصوم بیٹی کو دلھن بنا کر لے گئے اور چار دن کسی گاہک کی طرح اسے نوچ کھسوٹ کر دھتکار دیا۔ کیا آپ کے آفر کیے ہوئے روپے میری بیٹی کے دکھ درد کا درمان ہو سکتے ہیں۔ جانتے ہو وہ معصوم دو دن سے کیسے تڑپ رہی ہے۔ کیسے گڑگڑا رہی ہے کہ آپ کے پاس جا کر منت کروں کہ میری بیٹی کو بیوی نہیں ملازمہ ہی بنا کر رکھ لو، تنخواہ بھی نہیں لے گی، کسی حق کا مطالبہ نہیں کرے گی بس اسے خود سے دور نہ کرو۔ کیا جواب دیتی اپنے جگر کے ٹکڑے کو، کیسے بہلاتی، کیسے تسلی دیتی۔ جبکہ کسی محبت کرنے والے کے دل کو تسلی تو اس کے محبوب کا ساتھ ہی دے سکتا ہے نا اور یہاں معاملہ ایک بڑے آدمی کا تھا جسے نہ تو لڑکیوں کی کمی ہے اور نہ کسی کی پرخلوص محبت سے کوئی غرض۔'' بشریٰ سانس لینے کو رکی اور پھر اس کی بات جاری رہی۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چند ٹکے دے کر میری بیٹی کے دکھوں کا مداوا کر دیں گے یا کوئی گاڑی بنگلہ دے کر ہماری جھولی خوشیوں سے بھر دیں گے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ خاص کر حرام کی دولت کا ایک روپیا نہیں چاہیے ہمیں..... اور اب گزارش یہ ہے کہ میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو اسے اپنے دکھوں اور غموں کے ساتھ رہنے دو۔ جتنی عیاشی کرنا تھی آپ نے کر لی، میری بیٹی نے پورا پورا معاوضا ادا کر دیا ہے۔ امید ہے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آئندہ آپ یہاں نظر نہیں آئیں گے۔''

''امی جان!'' تناوش دکھ بھرے لہجے میں چیخ پڑی تھی۔

''بکواس بند کرو، ورنہ اپنے ہاتھوں سے تمھارا گلا گھونٹ دوں گی۔'' بشریٰ کو سخت غصہ آیا ہوا تھا۔ ''یہ بے حیائی اور بے غیرتی نہیں تو کیا ہے، دو دن پہلے گھر سے نکالا، آج دل چاہا تو پھر اٹھا کر لے گیا اور چند گھنٹوں بعد دوبارہ واپس چھوڑنے آ گیا۔ کیا طوائف ہو تم یا اتنی بے غیرت ہوگئی ہو کہ جسے اپنی عزت حیا اور شرم کا کوئی پاس نہیں ہے۔''

''مجھے بات کرنے کی اجازت ہے خالہ۔'' بشریٰ کے ہونٹوں کی حرکت رکتے ہی اس نے دھیمے لہجے میں

پوچھا۔

''آپ کو بات کرنے سے کون روک سکتا ہے صاحب جی!..... باقی آپ نے جو فلسفہ بیان کرنا ہے وہ مجھے پہلے سے معلوم ہے، ہر زور آور کا آخری فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ، مستند ہے اس کا فرمایا ہوا۔''

''خالہ جان!..... آپ مجھے الزام دیے جائیں گی یا اپنی بیٹی سے کچھ پوچھنے کی زحمت بھی کریں گی۔ آپ کو حرام کا ایک روپیا نہیں چاہیے اور آپ کی بیٹی میری تجوری سے کروڑوں روپے نکال کے لائی ہوئی ہے۔ آپ کو میری ملازمہ بن کر رہنے کا کہنے والی خود کوٹھی اور کار ملنے کی خوشی میں مجھے ٹھوکر مار کر آئی ہے۔ اسے عیش و آرام کی زندگی درکار تھی کبیر کا ساتھ نہیں۔ اور پھر اتنی جرات بھی مفقود ہے کہ میرا سامنا کر سکے۔ اور جہاں تک آج اسے ساتھ لے جانے کی بات ہے تو یہ خود آپ کو بتا دے گی کہ اسے کیسے اغواء کیا گیا۔ میں تو بس بروقت اس کی جان بچانے پہنچا تھا اور وہیں سے سیدھا یہاں لے آیا۔''

''آپ ٹھیک نہیں کہہ رہے ہیں۔'' آنکھوں میں حیرانی بھرے تناوش گلوگیر لہجے میں بولی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبیر دادا اس پر چوری جیسا گھٹیا الزام لگائے گا۔ ''میں اللہ پاک کی قسم کھاتی ہوں میں نے آپ کی تجوری کو ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ اور میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جب آپ پاشا بھائی کو کہہ رہے تھے کہ کسی بھی قیمت پر مجھ سے آپ کی جان چھڑوا دیں۔ اسی وجہ سے پاشا بھائی نے کوٹھی وغیرہ کی بات کی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ آپ ابھی پاشا بھائی سے تصدیق کر سکتے ہیں۔'' اس کی سیاہ آنکھیں آبشار بن گئی تھیں۔ اس کا معصوم، سیدھا اور سچا لہجہ ایسا نہیں تھا جو کبیر دادا کے دل پر اثر نہ کرتا۔ وہ الجھ گیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پاشا اس سے غلط بیانی کرتا یا اس کی تجوری سے پیسے نکالتا، پھر وہ خود اپنے کانوں سے تناوش کے الفاظ سن چکا تھا۔ یہ ساری الجھن پاشا ہی دور کر سکتا تھا۔ یا تو تناوش، عیش و آرام کی زندگی گزارنے کی خواہش کو ماں سے چھپا کر کوئی کھیل کھیل رہی تھی یا پاشا کوئی ڈنڈی مار رہا تھا۔ تناوش کا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے جھوٹا سمجھ سکتا۔ پاشا سے اصل بات معلوم کرنے کی خواہش میں وہ تناوش کی بات کا جواب دیے بغیر ایک جھٹکے سے پیچھے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

تناوش تیز سسکی بھرتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی تھی۔ ''چلے گئے ہیں نا، اب کبھی نہیں لوٹیں گے۔ میں جانتی

ہوں وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ مجھے ملازمہ رکھنے پر بھی راضی نہیں ہیں ماں جی!.....ان کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنی انا اور اپنی زبان کی پاسداری میں میری عزت بچانے آئے تھے کیوں کہ مجھے کسی دوسرے کے ہاتھوں نقصان پہنچنے پر ان کی ناک کٹ جاتی اور وہ اپنی اونچی ناک بچانے کے لیے مجھ پر احسان کرنے چلے آئے۔"

"چپ کر جا میری جان، اتنا نہیں روتے۔" بشریٰ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر تسلی دینے لگی۔ مگر دل بے ایمان تسلیوں سے کہاں مانا کرتا ہے۔

"امی جان، آپ کو اتنے سخت الفاظ تو استعمال نہیں چاہئیں تھے نا۔ پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتیں کہ میں ان کے ساتھ کس مقصد سے تھی۔ وہ تو مجھے بچانے آئے تھے۔ ایک غلیظ، بدکردار درندے کے چنگل سے مجھے چھڑانے آئے تھے، آپ کی بیٹی کی طرف بڑھنے والا گندہ ہاتھ کاٹنے آئے تھے، آپ کی بیٹی کی طرف اٹھنے والی میلی آنکھوں کو پھوڑنے آئے تھے اور آپ نے ان کی بے عزتی کر دی۔ جانتی نہیں آپ کی بیٹی کتنی بدنصیب، سبز قدم اور جنم جلی ہے۔ پیدائش کے ساتھ ایسی پیچیدگیاں لائی کہ آپ دوبارہ ماں ہی نہ بن سکیں، بابا کہنا سیکھا تو پیار کرنے والے ابو جان منہ موڑ گئے، جوان ہوئی تو پیارے بھیا روٹھ گئے اور شادی کے ایک ہفتے بعد ماں کے دروازے پر آن بیٹھی....."

وہ سسکیاں بھرتے کبھی کبیر دادا کی شکایت کرنے لگتی، کبھی ماں کو گلہ کرنے لگتی اور کبھی اپنی بدنصیبی کا رونا رونے لگتی۔ بشریٰ بھی آنکھوں میں پیدا ہونے والی نمی کو روکے اسے مسلسل پچکار کر تسلیاں دے رہی تھی۔

"ماں جی کیا میں خوب صورت نہیں ہوں۔" ہچکیاں بھرتے ہوئے اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"پگلی نہ ہو تو.....تم تو شہزادی ہو شہزادی۔"

"پھر انھیں اچھی کیوں نہیں لگتی ماں جی۔"

"اچھا لگنے کا انحصار صورت پر تو نہیں ہوتا میری جان۔ اور چھوڑو جانے دو اگر اسے تمھاری ضرورت نہیں تو تم کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔"

"مجھے تو ان کی ضرورت ہے نا ماں جی۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے میری جان، کچھ عرصہ بعد تمھیں اس بے وفا کا نام بھی بھول جائے گا۔ یہ شہر ہم یوں بھی چھوڑ دیں گے۔ اور پھر دیکھ لینا میں اپنی شہزادی کے لیے کیسے راج کمار کا رشتہ ڈھونڈتی ہوں۔ اس کے ساتھ مل کر نئی زندگی گزارنا۔“

تناوش ہولے سے بڑبڑائی.....

زندگی اب کے میرا نام نہ شامل کرنا
گر یہ طے ہے کہ یہی کھیل دوبارہ ہوگا
جس کے ہونے سے میرا سانس چلا کرتا تھا
کس طرح اس کے بغیر اپنا گزارا ہوگا

”اب اپنی ان پڑھ ماں کو شاعری سنائے گی۔“ بشریٰ نے ہنس کر اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا، مگر وہ آنکھیں نم کیے ماں کی گود میں لیٹی رہی۔

☆.....☆.....☆

”سر، کام ہو گیا ہے۔“ ایس پی کو شکیل احمد کی کال موصول ہوئی۔

”شاباش.....“ تحسین آمیز نعرہ بلند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اور تم اس وقت کہاں ہو۔ ذرا صورت حال پر روشنی ڈالو۔“

شکیل تفصیل بتاتا ہوا بولا۔ ”وہیں کوٹھی میں موجود ہوں۔ جونہی کبیر دادا اپنا کام ختم کر کے چلا گیا میں فوراً اندر گھس گیا۔ فاسی صاحب کے دونوں محافظ اور چوکیدار بے ہوش پڑے ہیں ایک خوفزدہ ملازمہ تھر تھر کانپتی باورچی خانے میں چھپی ہے، جبکہ فاسی صاحب باقی نہیں رہے۔ کبیر دادا نے بہت درندگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے دونوں بازو توڑ دیے، آنکھیں پھوڑ دیں۔ بے چارے کی لاش اوندھے منہ بیت الخلا میں پڑی ہے۔“

”تم تھوڑی دیر وہیں ٹھہرو، میرا ایک آدمی آ رہا ہے پھر تمھارا کام ختم ہو جائے گا۔ اور فاسی گینگ کا نمبر ٹو بننے کی پیشگی مبارک باد قبول ہو۔“

”بہت بہت شکریہ سر۔“ شکیل احمد خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

مزید کوئی بات کیے بغیر ایس پی نے رابطہ منقطع کیا اور ایک دوسرا نمبر ملانے لگا۔

''جی سر۔'' کال فوراً ہی وصول کر لی گئی تھی۔

''وقت آ گیا ہے، وہ اندر ہی ہے۔ بے ہوش پڑے محافظوں سے کوئی تعرض نہ کرنا۔ ملازمہ اور شکیل کا ٹکٹ کاٹ دو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کہتے ہی رابطہ کاٹ دیا گیا۔

ایس پی گھومنے والی کرسی سے ٹیک لگا کر اس کی جوابی کال کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ بعد ہی اسے اطلاع مل گئی تھی۔

''کام ہو گیا ہے۔'' مختصر الفاظ میں کہتے ہی کال کٹ گئی تھی۔

''واہ، بہت خوب۔'' نعرہ بلند کرتے ہوئے وہ اخلاق حسین کا نمبر ملانے لگا۔

''جی جناب۔'' اسے اخلاق حسین کی آواز کے ساتھ لوگوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

ایس پی خوشی سے چہکا۔ ''بے چارہ فاصی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''اوہ نو..... بہت افسوس ہوا یہ سن کر، کیسے ہوا یہ سب؟'' اس نے دائیں بائیں بیٹھے آدمیوں کو سنانے کی غرض سے جان بوجھ کر ایسے فقرے ادا کیے تھے۔

''سارے ثبوت ختم کر دیے ہیں۔ فاصی کے دونوں محافظوں کو کبیر دادا بے ہوش چھوڑ کر گیا ہے لازماً دونوں نے اس کی شکل دیکھی ہو گی۔ وہی بتائیں گے کہ یہ کام کس کا ہے۔ تم بس اہم آدمیوں کو لے کر موقع پر پہنچو۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر اخلاق حسین نے کال کاٹ دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ نوشاد اور نقیب اللہ جان اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا شاہ جی۔'' نوشاد آفریدی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''بہت برا ہوا یار، ایس پی ضمیر حسین صاحب بتا رہے ہیں فصیح الدین کو ان کی اورنگ زیب کالونی والی کوٹھی میں کسی نے بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ ہمیں وہاں جانا چاہیے۔''

''چلیں۔'' نوشاد آفریدی فوراً کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ بعد سرگوشی میں یہ بات تمام گینگ کے بڑوں تک پہنچ

گئی تھی۔ تقریب کو عورتوں کے حوالے کر کے وہ اپنی اپنی کار میں مطلوبہ سمت کو روانہ ہو گئے۔ پولیس وہاں پہلے سے پہنچی ہوئی تھی۔ فصیح الدین کے دونوں محافظ اور چوکیدار پولیس کی حراست میں تھے۔ ایس پی بہ ذات خود وہاں موجود تھا۔ اس نے تمام کو پہلے تو فصیح الدین کی مسخ لاش دکھائی اور پھر ایک علاحدہ کمرے میں لے جا کر بولا۔

''نہایت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ کام کبیر دادا کا ہے۔ فصیح الدین کے دونوں محافظ ہمیں بے ہوش پڑے ملے۔ انھی سے پتا چلا کہ کبیر دادا اپنے محافظوں کے ہمراہ وہاں آیا تھا۔ دونوں محافظوں کو بھی کبیر دادا ہی نے بے ہوش کیا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' پاشا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کبیر دادا کسی پر چھپ کر وار نہیں کرتے۔''

''پاشا ٹھیک کہہ رہا ہے، مجھے بھی یہ کوئی سازش لگتی ہے۔'' کاشف راجپوت نے فوراً اس کی تائید کی تھی۔

''کیا بچکانہ باتیں کر رہے ہو یار۔'' ایس پی نے منھ بنایا۔ ''دونوں محافظوں کی اتنی جرات کہ بغیر کسی خوف کے کبیر دادا کا نام بک دیں۔''

''ایک منٹ میں دادا سے بات کرتا ہوں۔'' پاشا موبائل فون نکال کے کبیر دادا کا نمبر ملانے لگا۔

''فوراً میرے پاس پہنچو۔'' کال وصول کرتے ہی کبیر دادا بغیر رسمی کلمات کی ادائی کے بولا۔

''ٹھیک ہے دادا آ رہا ہوں، لیکن ایک بری خبر ہے فصیح الدین کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''میں نے کیا ہے، تم یہاں پہنچو بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے دادا میں آ رہا ہوں۔'' پاشا فون جیب میں ڈالتا ہوا ایس پی کی جانب متوجہ ہوا۔

''دونوں محافظ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ انھیں پولیس کے پاس نہ جانے دیں۔''

ایس پی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ''پاشا صاحب، آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں دونوں محافظوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر چکا ہوں۔''

''میں دادا کے پاس جا رہا ہوں اور میرا خیال ہے کل کے دن بیٹھک رکھ لیں۔'' پاشا مشورہ چاہنے کے انداز میں شہاب قصوری کی طرف متوجہ اور شہاب قصوری کے سر ہلانے پر وہ باہر نکل گیا۔

شہاب قصوری کہنے لگا۔ ''تقریباً تمام ہی یہاں موجود ہیں۔ کل ایک بجے اس مسئلہ پر بات چیت ہو گی۔''

''فصیح الدین کی جگہ، تیمور علی آجائے گا۔'' نوشاد آفریدی نے مشورہ چاہا۔ ''وہ فصیح الدین کا نمبر ٹو تھا۔''

شہاب قصوری نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، اگر تمام راضی ہیں تو اسی کو بانٹ دو۔''

اخلاق حسین نے لقمہ دیا۔ ''یہ ضروری بھی ہے، ورنہ تو باقی کے تمام سربراہ اس کے گینگ پر قبضہ کرنا چاہیں گے اور خطرہ ہے کہ اس سے جھگڑا جڑ پکڑے گا۔''

''میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔'' ایس پی کمرے وہاں سے نکل کر اس طرف چل دیا جہاں تیمور علی موجود تھا۔ ایس پی کے علاوہ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ اس تمام منصوبے میں تیمور علی پیش پیش رہا تھا۔ اس کا مطمح نظر گینگ کی سربراہی کا حصول تھا۔ اور اب ایس پی اسے یہی خوش خبری سنانے جا رہا تھا۔ اس بارے تو ایس پی نے نوشاد آفریدی اور اخلاق حسین کو بھی بے خبر رکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کو بے چینی کے عالم میں ڈرائنگ روم کے اندر ٹہلتے دیکھ کر پاشا نے سمجھا شاید وہ فصیح الدین کے قتل کی وجہ سے پریشان ہے۔

''کیا ہوا تھا۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

اسے دیکھتے ہی کبیر دادا کے قدم رک گئے تھے۔ ''تجوری سے رقم کس نے نکالی تھی۔'' اس نے پاشا کے سر پر بم پھوڑا۔

''یقیناً، فاضی ہتھ چھٹ نے تو نہیں نکالی ہوگی۔'' پاشا اطمینان بھرے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کھڑے ہو کر بات کرو۔'' کبیر دادا کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ پاشا کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

''جی۔'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''تجوری سے پیسے کس نے نکالے تھے؟'' کبیر دادا نے سوال دہرایا۔

''اس بارے ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔''

''میں سچ سننا چاہتا ہوں۔'' کبیر دادا کی آنکھوں سے چھلکتی سرخی نے پاشا کو احساس دلا دیا کہ اسے کچھ نہ

کچھ سن گن ضرور تھی۔

''تمام رقم اوپر میری الماری میں پڑی ہے۔'' اس نے سچ اگل دیا۔

''کیا تناوش نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا اور کوٹھی، کار وغیرہ کے حصول کی خواہش ظاہر کی تھی۔'' کبیر دادا نے اگلا سوال پوچھا۔

پاشا کو معلوم ہو گیا کہ تمام بات کھل گئی ہے۔ یقیناً اسے تناوش ہی نے ساری بات بتائی تھی۔ ''نہیں، وہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی، یہ سارا میرا ہی منصوبہ تھا۔ مجھے اس کا آپ کے قریب رہنا پسند نہیں تھا، آپ بھی اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے یہ ڈراما ترتیب دینا پڑا۔'' پاشا نے لولے لنگڑے دلائل کا سہارا لینے کے بجائے حقیقت بیان کر دی۔

''یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا کہ اسے خراش نہیں آنا چاہیے۔'' کبیر دادا کی آواز میں شامل غصہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

''ہاں .....'' پاشا نے کچھ کہنے کے لب کھولنے چاہے، مگر چہرے پر پڑنے والے تھپڑ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

''گھٹیا انسان، اس کی حفاظت کس نے کرنا تھی۔'' کبیر دادا کے اگلے تھپڑ نے اسے فرش پر اچھال دیا تھا۔

وہ قالین سے اٹھ کر باچھوں سے رستا خون صاف کرنے لگا۔

''تمھاری بے پروائی اور گندے منصوبے کی وجہ سے اس غلیظ قاصی نے میری بیوی کو بے لباس کیا، اس کے پاکیزہ بدن کو چھوا، جس کے بال کبھی غیر مرد نے نہیں دیکھے وہ کپڑوں کے بغیر اپنی عزت بچانے کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اور یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے تمھاری وجہ سے۔'' کبیر دادا نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ پاشا نے ان ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر پڑا مار کھاتا رہا۔ فصیح الدین کی موت کا معمہ بھی حل ہو گیا تھا۔ اچانک راحت خالہ باورچی خانے سے نکل کر بھاگی۔

''صاحب جی!..... خدا کے واسطے بس کریں۔ وہ مر جائے گا۔ بس کریں صاحب جی۔'' وہ کبیر دادا کے قدموں سے لپٹ گئی۔

وہ گہرے گہرے سانس لیتا ہوا پیچھے ہٹا۔ ”راحت خالہ اس بے غیرت کو کہو، میرے گھر سے دفع ہو جائے اور اس کے بعد میں اس کی منحوس صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

راحت خالہ روتے ہوئے بولی۔ ”ابھی چلا جاتا ہے صاحب جی، آپ کمرے میں جا کر آرام کریں۔“

مگر کبیر دادا تیز قدموں سے باہر کی طرف چل پڑا۔ اس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ تناوش نے بے وفائی نہیں کی تھی، اس نے نہ تو کبیر دادا کو جھوٹ بولا تھا اور نہ اسے دھوکا دیا تھا۔ اسے دولت نہیں کبیر دادا کا ساتھ درکار تھا۔ ایک دکھ دینے والی سوچ اس کے دماغ میں گونجی۔ ”جانے وہ کتنا روتی رہی ہوگی، کیسے مجھے آوازیں دیتی رہی ہوگی، کیسے کیسے صفائیاں پیش کرتی رہی ہوگی اور میں اسے دھوکے باز سمجھ کر کوستا رہا۔ مرسڈیز میں بیٹھ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، عظیم اس کے ساتھ جانے کے بھاگا تھا، مگر وہ اسے ہاتھ سے واپس جانے کا اشارہ کر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ڈرائینگ روم میں راحت خالہ چیختے ہوئے ملازموں کو بلا رہی تھی۔ عظیم اسی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پاشا کو زخمی حالت میں بے ہوش پڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

”کیا ہوا۔“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”سیڑھیوں سے گر گئے ہیں۔ اب انھیں کمرے میں لے جانا ہوگا۔“ راحت خالہ نے اصل بات بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

عظیم بچہ نہیں تھا کہ اس کے جھوٹ سے بہل جاتا مگر اس نے کریدنے کے بجائے ملازموں کو، پاشا کو اٹھانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پاشا کو اس کے کمرے میں منتقل کر دیا۔ راحت خالہ وہیں اس کی تیمارداری کرنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

تناوش کے گھر کے سامنے کار روک کر وہ چند لمحے اسٹیئرنگ ویل پر سر ٹیکے بیٹھا رہا۔ تناوش کا سامنا کرتے ہوئے اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ انجانے میں اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھا تھا۔ وہ جو اسے رگ جاں سے زیادہ قریب لگنے لگی تھی اسے دکھ دے بیٹھا تھا۔

اس کے دماغ میں تناوش کا آخری لہجہ گونجا.....

''آپ ٹھیک نہیں کہہ رہے ہیں۔ میں اللہ پاک کی قسم کھاتی ہوں میں نے آپ کی تجوری کو ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ اور میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جب آپ پاشا بھائی کو کہہ رہے تھے کہ کسی بھی قیمت پر مجھ سے آپ کی جان چھڑوا دیں۔ اسی وجہ سے پاشا بھائی نے کوٹھی وغیرہ کی بات کی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ آپ ابھی پاشا بھائی سے تصدیق کر سکتے ہیں۔''

کتنا ناراض اور درد و غم سے بھرا لہجہ تھا اس کا۔ جانے وہ اسے معاف کرنے پر تیار ہوتی یا نہیں۔ بہ ہر حال کچھ بھی تھا وہ اس سے ایک بار معافی ضرور مانگنا چاہتا تھا۔ وہ کار سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کا ایک پٹ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انھیں دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ ماں بیٹی پریشان ہی اتنی زیادہ تھیں اور پریشانی میں ایسی بے پروائیاں تو ہو جایا کرتی ہیں۔ ماں بیٹی رات کو چارپائیاں صحن میں ڈال لیا کرتیں، لیکن اس دن انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم من من وزنی ہو رہے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی اس کی نظر تناوش پر پڑی وہ ماں کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ وہ گلا کھنکار کر دروازے کے اندر داخل ہوا۔

اس پر نظر پڑتے ہی تناوش اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنی سیاہ آنکھوں میں حسرت بھرے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''خالہ میں تناوش سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بشریٰ کو مخاطب ہوا۔

''کر لو بیٹا!'' وہ سر ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرنا اس جہاں دیدہ عورت کو نہیں بھولا تھا۔ اس کے باہر جاتے ہی وہ تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں طلاق نہیں لینا چاہتی۔'' اس نے سسکی بھرتے ہوئے ایسے انداز میں کہا کہ کبیر دادا کے دل پر زوردار گھونسا لگا تھا۔ وہ ابھی تک بے اعتباری میں پڑی تھی۔ جانے کبیر دادا کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں کھول دیے یوں جیسے اسے گلے لگنے کی دعوت دے رہا ہو۔ تناوش کے چہرے پر چھائی اذیت بھری حسرت نے حیرانی اور پھر بے پایاں خوشی کا روپ دھارا اور وہ چارپائی سے اٹھ کر اس کے جانب دوڑی اگلے ہی لمحے اس کا نازک، ملائم اور خوشبودار وجود کبیر دادا کی بانہوں میں تھا۔

”کبھی نہیں دوں گا میری جان، کبھی بھی طلاق نہیں دوں گا، ہمیشہ پاس رکھوں گا اپنی تناوش کو..... مجھے معاف کردو انجانے میں تمھیں دکھ دے بیٹھا۔ تم میرا اقرار سننے کی خواہاں تھیں نا، لو میں اقرار کرتا ہوں کہ تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری، ہر شیئے سے زیادہ عزیز اور ہر شخص سے زیادہ میرے دل کے قریب ہو۔ تم چاہتی تھیں کہ تمھیں محبت بھرے القاب سے پکاروں تمھیں چندا، گڑیا، جانو کہوں۔ ایسے ہی پکاروں میری گڑیا، میری چندا، میری شہزادی۔“ کبیر دادا نے بڑے زور سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ ”تم میری گود میں لیٹنا چاہتی تھیں نا، ساری رات لٹاؤں گا میری گڑیا۔ تم میرے ہاتھ سے پہلا نوالہ کھانا چاہتی تھیں، اب پورا کھانا کھلاؤں گا تمھیں میری شراب نوشی بری لگا کرتی تھی نا، وعدہ کرتا ہوں کبھی تمھارے سامنے نہیں پیوں گا۔ دوسری لڑکیوں کا میرے قریب آنا برا لگتا تھا۔ اب کوئی نہیں آئے گی، کسی اور سے ملنا تو درکنار کسی اور کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ بس ایک بار مجھے سچے دل سے معاف کردو۔“

”معاف تو نہیں کروں گی۔“ اس نے کبیر دادا کی چھاتی سے چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی پرکشش آنکھوں سے اس وقت بھی لگاتار آنسو بہہ رہے تھے مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔

وہ اپنے لبوں سے اس کے آنسو چنتے ہوئے بولا۔ ”بہت دکھ دیے ہیں اپنی گڑیا کو ہے نا۔ وعدہ کرتا ہوں اب کبھی ان پیاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔“

”مجھے شاپنگ کرائیں گے نا۔“ اس نے ناز بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جس وقت کہو گی اسی وقت لے چلوں گا۔“

”ساحل سمندر پر لے جائیں گے۔“

”روزانہ لے جاؤں گا اور تمھیں پاؤں میں موچ آنے کا بہانہ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔“

”رات کو جلدی گھر آئیں گے۔“

”بھاڑ میں جائیں کام، رات کو کہیں جاؤں گا ہی نہیں۔“

”صبح کام پر جانے سے پہلے کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ گپ شپ کریں گے۔“

”میں تو تین گھنٹے کا سوچے ہوئے تھا، اگر تم یہ چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ مرضی بہر حال تمھاری چلے گی۔“

”گھر میں شراب کی بوتل نظر نہیں آئے گی۔“ وہ ساری باتیں منانے پر تل گئی تھی۔

”جب نظر آئے اسی وقت توڑ دینا۔“

”کبیر کہہ کر بلاؤں گی۔“

وہ مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن کبھی کبھی تو سرتاج کہہ لوگی نا۔“

”ہر وقت کہوں گی کبیر، میرے سرتاج، میرے مالک، میرے سائیں، میرے سب کچھ۔“

کبیر دادا نے اسے بازوں میں بھر کر اٹھایا اور چارپائی پر لا کر لٹا دیا۔ وہ خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

”اب تو معاف کر دیا ہے نا۔“

”سوچوں گی۔“ وہ ناز سے مسکرائی۔

”تو سوچنے کے لیے کتنا وقت چاہیے۔“

”یہی کوئی پچاس ساٹھ سال۔“

وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں، پچاس ساٹھ سال بعد آجاؤں گا تمھاری رائے لینے۔“

”رو دوں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”تو پھر معاف کر دو نا تاکہ میں کہیں بھی نہ جاؤں۔“

”نہیں کروں گی معاف اور کہیں جانے بھی نہیں دوں گی۔“

”زیادتی تو ہے..... لیکن اپنی ملکہ کا حکم ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا۔“ کبیر دادا نے بے بسی ظاہر کی۔

”ہا..... ہا..... ہا۔“ تناوش کے سریلے قہقہے سے کمرے کی فضا بھی گنگنا اٹھی تھی۔ ”میں بھلا اپنے کبیر سے خفا ہو سکتی ہوں۔“

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ کبیر دادا فوراً اس سے دور ہو گیا۔ بشریٰ کی آواز سنائی دی۔

”بیٹا، کھانا تیار ہے اور تناوش نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“ اس نے دروازہ کھولے بغیر کہا تھا۔

”لے آؤ ماں جی! میں نے بھی نہیں کھایا۔“ کبیر دادا نے پہلی بار اسے یوں پکارا تھا۔

''ابھی لائی بیٹا۔'' بشریٰ کی آواز میں خوشی بھری تھی۔

''میں تو نہیں کھاؤں گی۔'' تناوش نے اس کا منھ چڑایا۔

کبیر دادا نے کہا۔ ''نہ کھاؤ مجھے تو کھلاؤ گی نا۔ یقین مانو دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔''

''کیا..... کیوں؟'' وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔

''تمھارے بغیر سانس لینا دشوار ہو گیا تم کھانے کو رو رہی ہو۔''

''اتنی پیاری لگتی ہوں۔'' اس نے ہاتھوں کے پیالے میں کبیر دادا کا چہرہ بھر لیا۔

''نہیں اتنی سے تھوڑا زیادہ۔''

''کبیر.....'' تناوش کے لہجے میں بلا کی چاہت موجزن تھی۔

وہ وارفتگی سے بولا۔ ''جی.....''

اور پھر وہ مسلسل۔ ''کبیر..... کبیر..... کبیر..... کبیر..... کبیر..... کبیر..... کبیر.....'' کہتی گئی اور وہ۔ ''جی..... جی..... جی..... جی..... جی..... جی..... جی..... جی.....'' کی گردان کرتا گیا

دروازے پر ہونے والی دستک نے انھیں خاموش کرا دیا تھا۔ بشریٰ بیٹی کے چہرے چھائی بے پایاں خوشی دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ اس نے من کی مراد پالی ہے۔

''آپ لوگ کھانا کھائیں، میں دو تین کام نبٹا لوں۔'' کھانے کی ٹرے ان کے درمیان رکھ کر وہ باہر نکل گئی

''وعدہ بھول تو نہیں گیا نا۔'' نوالہ توڑنے سے پہلے ہی تناوش اسے یاد دلانے لگی۔ اور کبیر دادا نے مسکراتے ہوئے نوالہ اس کے منھ کی طرف بڑھا دیا۔

کھانے کے بعد کبیر دادا اسے بتا رہا تھا کہ پاشا نے کس طرح ان کے درمیان غلط فہمی پیدا کی تھی۔

''بھیا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' ناراض ہونے کے باوجود تناوش نے اسے احترام ہی سے پکارا تھا۔

''اچھا اٹھو نا گھر چلیں۔''

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاؤں میں تو موچ آئی ہوئی ہے۔''

''تو کیا۔'' کبیر دادا نے کھڑے ہو کر اسے بانہوں میں بھرنا چاہا۔

''نہ کریں نا، امی جان دیکھ لیں گی۔'' وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ کبیر دادا مسکرا دیا تھا۔

''اچھا امی جان سے اجازت تم لینا، مجھے تو شرم آرہی ہے۔''

''بہت بڑی بے شرم تو میں ہوں نا۔'' تناوش نے اسے زبان نکال کر چڑایا۔

کبیر دادا مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے پھر میں دو تین دنوں بعد تمھیں لینے آجاؤں گا۔''

وہ چلائی۔ ''جان لے لوں گی اپنی۔''

''تو پھر پوچھو نا۔''

''آئیں، پوچھ لیتی ہوں.....'' یہ کہتے ہی وہ چلائی۔ ''ماں جی۔''

''ہاں بیٹا۔'' وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔

''آپ کے داماد جی مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، میں نے کہا بھی ہے کہ دو تین دن ماں جی کے ساتھ گزار کر آجاؤں گی، مگر یہ نہیں مان رہے۔ اس لیے اجازت دیں۔''

بشریٰ اس کی ماں تھیں۔ ترکی بہ ترکی بولیں۔ ''کبیر بیٹے کو میں منالوں گی، تم لیٹو آرام کرو۔''

''تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔'' منہ بناتے ہوئے تناوش آگے بڑھی اور ماں سے لپٹ گئی۔

''سدا خوش رہو میری جان۔'' بشریٰ نے اس کے ماتھے پر بوسا دیا۔ اور وہ کبیر دادا کے ہمراہ چل پڑی۔ کار کے قریب پہنچتے ہی کبیر دادا نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اس کے نشست سنبھالتے ہی گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں ایک پھولوں والے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تناوش کے لیے گجرے خریدے اور اس کی ریشمی کلائیوں میں پہنا دیے۔

تناوش خوشی کے ساتویں آسمان پر اڑ رہی تھی۔ کبیر دادا سے اتنی محبت ملنے کا اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے کار اندرونی عمارت کے سامنے روکی اور نیچے اترنے سے پہلے بولا۔

''نیچے نہ اترنا میں خود تمھارے لیے دروازہ کھولوں گا۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''اتنی محبت نہ دو کبیر..... ایسا نہ ہو سنبھالی نہ جاسکے۔''

”تم نہیں جانتیں، تمھارے بعد یہ دل کن حسرتوں کا شکار رہا۔ میں تو اپنے تئیں تمھیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا تھا۔ اب اتنی آسانی سے واپس مل گئی ہو تو کچھ نخرے تو اٹھانے دو نا اپنی لاڈلی بیوی کے۔“ یہ کہتے ہی وہ نیچے اتر گیا تناوش محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبیر دادا گھوم کر دوسری طرف آیا اور دروازہ کھول کر اسے بازو سے پکڑ کر نیچے اترنے میں مدد دینے لگا۔ تناوش کی آنکھوں میں اپنا دلھن بن کر آنا گھوم گیا جب اس کی طرف دیکھے بغیر کبیر دادا اندر کی جانب چل پڑا تھا۔ اور پھر اس کے خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد اسے کبیر دادا کی سخت باتیں سننا پڑیں تھیں کہ وہ اس کے آدمیوں کے سامنے رومانس نہ جھاڑا کرے۔ آج وہ اپنے ملازموں کے سامنے ہی اس کے ناز نخرے اٹھا رہا تھا۔

وہ نزاکت سے باہر آ گئی۔

”اگر کہو تو میں فوراً مان جاؤں گا کہ تمھارے پاؤں میں موچ آئی ہوئی ہے۔“

”مجھے لاج آئے گی۔“ اس نے حیا سے آنکھیں جھکا لیں۔

”بس، ساری مستیاں اور تیزی طراری ختم ہو گئی۔“ کبیر دادا نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما اور ساتھ چلا کر کمرے میں لے جانے لگا۔ تناوش گویا ہواؤں میں اڑتی ہوئی اس کے ساتھ بڑھ گئی۔

خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔ ”یہ کیا؟“ وہ چاروں طرف بکھرے سامان کو دیکھتے ہوئے کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ اطمینان سے صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”تمھارے بغیر اپنی یہی حالت ہے۔“

اسے شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ سامان کو ترتیب سے رکھنے میں مصروف ہو گئی۔ کبیر دادا ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا اسے محبت بھری نظروں سے گھورتا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”یار، کیا مصیبت ہے ابھی سونے کے لیے لیٹا تھا۔“ نوشاد آفریدی کی جھلاتی ہوئے آواز نے اخلاق حسین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ وہ اس کی جھلاہٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ ”میں بس تمھاری کوٹھی پر پہنچنے ہی والا ہوں۔“

''ایسی بھی کیا مصیبت آن پڑی ہے۔''

''یہ باتیں کال پر بتانے والی نہیں ہیں حضرت، ورنہ میں گھر بیٹھے تمھیں کال کر سکتا تھا۔''

''اچھا میں منتظر ہوں۔'' نوشاد آفریدی رابطہ منقطع کر کے پہلو میں لیٹی نغمہ بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''معذرت جان من، شاہ جی کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملنے آرہا ہے اس لیے تم سو جاؤ۔'' سلیپنگ گاؤن پہن کر وہ ڈرائینگ روم میں نکل آیا۔ اس کے ملازم اخلاق حسین سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے اس نے گیٹ پر اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اخلاق حسین اس کے سامنے موجود تھا۔ رسمی کلمات کی ادائی کے بعد وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ نیند بھگانے کے لیے وہ پہلے سے ملازم کو کافی بنانے کا کہہ چکا تھا۔ بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی ملازم نے انہیں کافی پیش کر دی تھی۔

''فرمائیں شاہ صاحب، کون سی بات تمھیں آرام نہیں کرنے دے رہی۔''

''یار نوشاد، اتنی موٹی شست بھی نہ رکھو۔ تمھیں بالکل اندازہ ہی نہیں ہے کہ حالات کون سا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔''

''اچھا ہوا کیا ہے؟''

اخلاق حسین نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''کھوتے کا سر ہوا ہے۔ کیا فصیح الدین کا قتل تمھارے نزدیک کوئی بات نہیں ہے اور اس قتل کے بعد کبیر دادا کے لیے جو گڑھا کھودا جا چکا ہے اس سے تم لاعلم ہو۔''

''یہ ایسی انوکھی اطلاع تو نہیں جو مجھے بستر سے اٹھا کر بتائی جائے۔ باقی خوش قسمتی سے ہم اس سازش میں ہم برابر کے شریک تھے۔''

''سارا منصوبہ کس کا تھا۔''

نوشاد نے کہا۔ ''ایس پی کا۔''

اخلاق معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''تو تمھارا کیا خیال ہے، یہ ایس پی کبیر دادا کے بعد اپنی سازشوں سے رکنے والا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' نوشاد کے لہجے میں حیرانی تھی۔

اخلاق نے لہجے میں طنز سمویا۔ ”خان اگر گینگسٹر بھی ہو تو پٹھانی والے جراثیم اس میں موجود ہی رہتے ہیں۔“

”گویا تم ایس پی سے خطرہ محسوس کر رہے ہو۔“ نوشاد نے دوجمع دوچار کیا۔

”کیا تمھیں نہیں ہو رہا۔ بھول گئے ایس پی کے الفاظ کہ ہماری نگرانی بھی کراتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ ہم دونوں ہی کبیر دادا کی رکھیل پر بری طرح فریفتہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جانے ہمارے بارے کون کون سی معلومات اس نے اکٹھی کر رکھی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فصیح الدین کے بعد ہم دونوں میں سے کسی ایک کی باری ہو۔ بلکہ کبیر دادا کے ساتھ تمھاری دشمنی کا چرچا ہے، میں تو صلح کر چکا ہوں اور اس کے بعد اسے اپنے گھر تقریب میں بلا کر بھی اعلا ظرفی کا ثبوت دے چکا ہوں۔“

نوشاد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایس پی ہمارا دوست ہے یار!“

”وہ صرف ہمارا استعمال کر رہا ہے۔ ہم کبیر دادا کے خلاف ہیں اور اسے کبیر داد سے سب سے زیادہ خطرہ ہے پس وہ ہمارے قریب ہو گیا۔ اور یاد رکھنا، اس کے فصیح الدین سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے۔ پھر کیا کیا اس کے ساتھ۔“

نوشاد شکست تسلیم کرتا ہوا بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، تم مجھے ڈرانے میں کامیاب ہو گئے ہو، اب یہ بتاؤ کرنا کیا ہے۔“

”جن دو آدمیوں نے کبیر دادا کی رکھیل کو اغواء کیا تھا میں انھیں جانتا ہوں۔“ اخلاق حسین نے گویا انکشاف کیا تھا۔

”تو.....“ نوشاد آفریدی نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”تو یہ خان صاحب، کہ ان دونوں کے بارے اگر پاشا کو معلوم ہو جائے تو اسے سازش کے بارے بھی معلوم ہو جائے گا اور یہ بھی کہ سازش کس کی ہے۔“

نوشاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس سے کبیر دادا کو اپنے خلاف بے گناہی کا ثبوت ہی ملے گا اور کچھ نہیں ہو گا۔“

اخلاق حسن ہنسا۔ ”کبیر دادا بچے گا تو اپنے خلاف بے گناہی حاصل کرے گا نا۔“

”یار میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ نوشاد الجھ گیا تھا۔

''اچھا اب بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ہم نے مل کر شمشیر دادا کو کراچی بلانا ہے۔ اور یہاں آ کر اگر وہ کبیر دادا سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اسے قتل نہیں بھی کرتا تب بھی وہ اس کی رکھیل کو معاف نہیں کرے گا، خاص کر اسے دیکھنے کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ شمشیر دادا جیسے عورتوں کے شکاری سے یہ چھوکری بچ جائے۔ اب یہاں دو باتیں متوقع ہیں۔ پہلی یہ کہ کبیر دادا اپنی رکھیل کو بچانے کے لیے شمشیر دادا کے قدموں میں گر جائے گا، مگر میں جانتا ہوں اس طرح بھی اس نے ایک بار تنہائی میں اس کے ساتھ وقت ضرور گزارنا ہے۔ اگر تو کبیر دادا جان بچانے کی خواہش میں یہ بے غیرتی برداشت کر لیتا ہے تو اس کی جان بچ جائے گی اور جوں ہی شمشیر دادا واپس جاتا ہے، اگر کبیر دادا تک ایس پی کی سازش کی ساری بات پہنچائی جائے تو سوچو وہ ایس پی کے ساتھ کیا کرے گا۔ دوسرا اگر وہ غیرت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنی چھمک چھلو کے لیے شمشیر دادا سے ٹکرا جاتا ہے تب اس کی موت یقینی ہے اور شمشیر دادا کے جانے کے بعد ہم پاشا تک اس سازش کی کہانی پہنچائیں گے وہ کبیر دادا کا بدلہ لے گا۔ دونوں صورتوں میں ایس پی تو گیا کام سے۔''

''تو اس بارے کل بھی بات ہو سکتی تھی۔''

''اتنا وقت نہیں ہے جگر، ایس پی نہایت کایاں شخص ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں کو ختم کرا دے تمھیں دونوں کو منظر عام سے ہٹانا ہوگا۔ چند دن انھیں اپنے پاس قید رکھ لو۔''

نوشاد نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے ایس پی نے اب تک انھیں ختم کرا دیا ہو۔''

اخلاق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں فی الحال زندہ ہیں، البتہ کل کا معلوم نہیں ہے۔''

''ان کے بارے تمھیں کیسے معلوم ہوا؟'' نوشاد نے حیرانی ظاہر کی۔

''تمھارا کیا خیال ہے میں ایس پی کے سامنے بھولا بنا بیٹھا رہا تو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ خان صاحب میں گینگ کا سربراہ ہونے کے ساتھ ایم این اے بھی ہوں۔ اور تمھیں شاید معلوم نہ ہو کہ ایس پی نے فصیح الدین کو صرف کبیر دادا کو پھنسانے کے لیے نہیں مروایا۔ اس کے پسِ پردہ تیمور علی کو فاصی گینگ کا بڑا بنانے کی خواہش بھی شامل ہے۔ تیمور علی اس ساری کارروائی میں اس کے ساتھ شامل رہا ہے۔ بھولے بادشاہ اس نے ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں۔''

"کیا.....؟" نوشاد کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا تھا۔ "مگر وہ تو ہمیں کہہ رہا تھا کہ تیمور علی کو سنبھالیں اور جھگڑا وغیرہ نہ ہونے دیں۔"

"اسی طرح تو ہمیں اس پر یقین آنا تھا کہ تیمور علی اس کام میں ملوث نہیں ہے۔"

"مگر تیمور علی کی بابت ہمیں لاعلم رکھنے میں کیا حکمت ہے۔"

اخلاق نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "تیمور علی کو زیر بار کر کے اس نے فاصی گروپ پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔ بہ ظاہر تیمور علی سربراہ ہوگا مگر حقیقت میں اب فاصی گروپ بھی ایس پی کے قبضے میں ہے۔ اصل میں ایس پی خود ہی بڑا بننے کے چکروں میں ہے۔ کبیر دادا چونکہ اس کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا ہے تبھی وہ کبیر دادا پر الزام لگا کر اسے رستے سے ہٹانے کا خواہاں ہے اور باقیوں کے دماغ میں بھی وہ یہی گھسیڑتا رہتا ہے کہ کبیر دادا ایسا چاہتا ہے۔ کبیر دادا کا کانٹا نکال کر وہ باقیوں کی جانب متوجہ ہوگا۔"

"جب تمھیں یہ سب کچھ معلوم ہے تو باقیوں کے سامنے یہ بات کیوں نہیں رکھتے۔" نوشاد پوچھے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "کیوں کہ فی الحال میں بھی کبیر دادا کے خاتمے کے چکروں میں ہوں۔ کبیر دادا کی موت کے بعد ایس پی کو بتاؤں گا کہ شاہ جی کیا چیز ہے۔"

"اگر کبیر دادا بچ گیا پھر۔"

"اسے محبت کا روگ لگ چکا ہے۔ وہ جان دے دے گا اپنی چھمک چھلو سے علاحدہ نہیں ہوگا۔ وہ لڑکی بری طرح اس کے اعصاب پر سوار ہے۔"

"اچھا میرے لیے کیا حکم ہے؟" نوشاد نے گویا بات ختم ہونے کا اعلان کیا۔

"تمھیں کون حکم دے سکتا ہے خان صاحب۔ ایک تمھی تو قابل اعتبار دوست ہو۔"

"جانتا ہوں شاہ جی۔" نوشاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک کا نام نعیم اور دوسرے کا شاکر ہے۔ اصل پرزہ نعیم ہے اور یہ نعیم، تیمور علی کا خاص آدمی ہے۔ دوسرا بس ایک سڑک چھاپ ہے جس سے نعیم کبھی کبھار کام لیتا رہتا ہے۔"

''کہاں ملیں گے۔'' نوشاد نے اگلا سوال پوچھا۔

ان دونوں کے پتے نوشاد کو بتا کر اخلاق حسین کھڑا ہو گیا۔ ''ان دونوں کا ابھی بندوبست کرو اور کسی ایسی جگہ پر انھیں قید کرنا جہاں ایس پی کو شک نہ گزرے۔ باقی ایس پی سے بنا کر رکھنی ہے۔ اسے اپنا لیڈر اور بڑا وغیرہ کہہ کر خوش کرتے رہو۔ کیونکہ اسے ذرا بھی شک ہو گیا کہ ہم اس کے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں تو چوکنا ہو جائے گا۔ اور ابھی کی ملاقات کی خبر بھی کل گپ شپ کے دوران اس کے سامنے رکھ دینا ہے۔ موقف یہ اختیار کرنا کہ میں تمھیں رات کو جگا کر اس بات پر زور دے رہا تھا کہ جلد از جلد شمشیر دادا سے بات کرو۔ اور تم نے رات گئے شمشیر دادا کو بے آرام نہ کرنے کا مشورہ دے کر اس کام کو صبح تک اور ایس پی سے مشورے تک مؤخر کر دیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' نوشاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور ہاں۔'' الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اخلاق کو خیال آیا۔ ''جہاں ان دونوں کو قید رکھتے ہو وہاں کا رخ نہ کرنا۔ کیوں کہ ایس پی باقاعدگی سے ہماری نگرانی کرواتا ہے۔ اس بات کا اعتراف اس نے جان بوجھ کر یا بھولے پن سے ہمارے سامنے کر دیا تھا۔''

''اب اتنا بچہ بھی نہیں ہوں۔'' نوشاد نے منہ بنایا اور اخلاق حسین ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''اٹھیں نا۔'' کبیر دادا کو اپنے گالوں پر تناوش کے ٹھنڈے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ وہ نماز پڑھ کر بستر پر لوٹی تھی۔

''تھوڑی دیر تو سونے دو نا۔'' وہ آنکھیں بند کیے ہوئے نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

تناوش اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''صبح دم دو گھنٹے کی گپ شپ کرنے کے وعدے کی تکمیل کا وقت آن پہنچا ہے سرتاج۔''

''گڑیا، آٹھ بجے اٹھ کر دس بجے تک باتیں کر لیں گے نا۔'' کبیر دادا اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

تناوش کی ملائم انگلیاں اس کے بالوں میں گھسیں اس کے ساتھ ہی وہ گنگنائی۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں آپ کو

آٹھ بجے جگاؤں گی۔"

"تمھیں نیند نہیں آرہی۔" کبیر دادا نے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کے روشن چہرے پر نگاہ دوڑائی۔

"سوگئی تو شاید دیر سے آنکھ کھلے، پھر آپ کو جانے کی جلدی ہوگی اور آپ اطمینان سے گپیں نہیں ہانک سکیں گے، کیوں کہ اب آپ نے سارے کام دن ہی دن میں نمٹانے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔"

"تم اتنا گہرائی میں سوچتی رہتی ہو۔" سونے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کبیر دادا نے اسے قریب کھینچا۔

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "خود بہ خود ہی ایسی سوچیں آتی ہیں، نہ جانے کیسے کیسے الٹے سیدھے خیال دماغ میں پلتے رہتے ہیں۔ اپنی بے بضاعتی اور کمتری کا احساس کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ آپ سے بچھڑنے، دور ہونے اور دھتکارے جانے کا خوف ہر وقت دل دھڑکاتا رہتا ہے۔"

"پاگل ہو تم۔" کبیر دادا نے اس کے سر پر لپٹا ہوا دوپٹا اتارتے ہوئے اس کے ریشمی بالوں کو بکھیرا۔ "شاید جانتی نہیں تم میرے لیے کیا ہو، وہ شاعر کہتا ہے نا.....

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے
نشاطِ جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

"حقیقت یہی ہے کہ تم اس وقت میرے دل پر قابض ہوگئی تھیں جب پہلی بار تم پر نظر پڑی۔ اور اس کے بعد دل و دماغ کا جھگڑا شروع رہا یہاں تک کہ حسب روایت دل جیت گیا۔ اور دماغ کو مانتے ہی بنی کہ میری زندگی کے لیے میری گڑیا، میری چندا، میری تناوش اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سانس لینا۔"

وہ ناز سے مسکرائی۔ "شاعری اور جھوٹ بولنا، ایک ساتھ شروع کر دیا ہے۔"

"کیا میری محبت جھوٹ ہے۔" کبیر دادا نے اس کی جھیل ایسی آنکھوں میں غوطہ لگایا۔

"جانتے ہیں آپ کی آمد سے پہلے میں اس جسٹس سے مدد مانگنے جا رہی تھی۔ اور پھر آپ وہاں آئے، میری دنیا ہی بدل گئی۔ زندگی میں اتنا اچھا کبھی کوئی نہیں لگا تھا جتنے آپ لگ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ

کون سی ایسی کشش تھی جس نے مجھے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پھر آپ چلے گئے۔ میں بھی چاند کو چھونے کی حسرت دل میں لیے آگے بڑھ گئی۔ لیکن شاید اللہ پاک نے میرے دل میں اٹھنے والی خواہش کو دعا سمجھتے ہوئے قبول فرما لیا تھا۔ ایک دم آپ کی کار میری نظروں کے سامنے سے گزر کر کوٹھی میں داخل ہوئی اور میں بھی ہمت و جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے چوکیدار کے پاس پہنچ گئی۔" یہ کہتے ہوتناوش کی آنکھوں میں عظیم کو تھپڑ لگنے کا منظر ابھرا اور وہ ہنستی چلی گئی۔" یاد ہے عظیم کو میری وجہ سے کیسے تھپڑ پڑا تھا۔ بے چارہ آخر وقت تک مجھ پر شک کرتا رہا اور جب میں یہ کہہ کر چل پڑی کہ ٹھیک ہے آپ جانیں اور آپ کا دادا..... تب اس نے جھجکتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی۔ اور اس کی دستک سے میری قسمت کا دروازہ تو کھل گیا، لیکن اس بچارے کو مار پڑ گئی۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔ کبیر دادا محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" یہ کبیر دادا کی آنکھوں سے پھوٹتی چاہت ہی تھی جس نے تناوش کو شرمانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"سچ کہو، تم ہو اتنی پیاری یا مجھے لگ رہی ہو۔"

وہ وارفتگی سے بولی۔" بس آپ کو لگتی رہوں، اتنا میرے لیے کافی ہے۔"

"آج شاپنگ کے لیے چلو گی۔"

اس کے چہرے پر بے پایاں خوشی ابھری۔" ڈھیر سارا میک اپ کا سامان لوں گی، چوڑیاں، کنگن اور منہدی بھی۔ غرارہ، لہنگا اور ساڑھی بھی خریدوں گی۔ دو انگوٹھیاں، ایک لاکٹ جس میں آپ کی تصویر ڈال کر گلے میں لٹکاؤں گی، ایک پرس، شولڈر بیگ، سینڈل، جوتے اور..... اور..... باقی جانے سے پہلے لسٹ بنا لوں گی۔"

کبیر دادا نے دل میں اٹھنے والی درد کی لہر کو بڑی مشکل سے سہا تھا۔ اس کی معصوم خواہشات سن کر وہ خود کو اس کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کتنے غریب گھرانے کی ہے کبیر دادا نے کبھی اس کی خواہشات کو جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے دوران تقریب اخلاق حسین کی بیٹی فرحانہ اور شہاب قصوری کی بیٹی رخسانہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس کے سامنے انھوں نے تناوش کے لباس اور موبائل فون وغیرہ کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ مگر اس وقت کبیر دادا کے سر پر اپنے مقام اور حیثیت کا بھوت سوار تھا۔

''آپ خاموش کیوں ہو گئے، مجھے یہ سب لے دیں گے نا؟'' جانے وہ کبیر دادا کی خاموشی کو کیا سمجھ رہی تھی

''اگر اتنی تھوڑی سی چیزیں لینا ہیں تب تو میں ساتھ نہیں جاؤں گا۔ کچھ اور چیزیں بھی اس لسٹ میں ڈالو نا۔''

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' اس نے منہ بسورا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' اس نے تناوش کی ناک کی پھننگ کو پکڑ کر ہولے سے مروڑا۔

''کتنی دفعہ کہا ہے میری ناک سے پکڑ کر نہ مروڑا کریں۔'' روہانسی ہو کر وہ اس کی چھاتی پر مکے مارنے لگی۔

وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے ناک نہیں مروڑنے دینا تو شاپنگ پر ساتھ نہیں جاتا، چلی جانا عظیم کو ساتھ لے کر۔''

''اچھا آہستہ آہستہ مروڑ لیں۔'' اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے وہ فوراً راضی ہو گئی تھی۔

کبیر دادا نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔ اور وہ جھینپ کر نیچے دیکھنے لگی۔ اسی گپ شپ کے دوران کبیر دادا کی نگاہ گھڑی پر پڑی جس کی سوئیاں دس بجے سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ تناوش کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

''اچھا دس بج گئے ہیں چلو ناشتا تیار کرو۔'' کبیر دادا نے اسے گھڑی کی طرف متوجہ کیا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے وہ اٹھ گئی اس کا رخ ڈریسنگ روم کی طرف تھا۔ کبیر دادا کے پہننے کا لباس ہینگر میں لٹکا کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ راحت خالہ اسے باورچی خانے میں مصروف نظر آئیں۔ اسے تناوش کی واپسی کا معلوم نہیں تھا۔ تناوش کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ ابھری اور اس نے بھاگ کر اسے پر شفقت آغوش میں سمیٹ لیا۔ ''میری پیاری بیٹی کس وقت آئی ہے۔''

''خالہ جان، میں رات کو لوٹی ہوں۔''

''میرا خیال ہے پاشا صاحب کی پٹائی کرنے کے بعد صاحب جی آپ کو لینے چلے گئے تھے۔''

''کیا.....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''انھوں نے بھیا کی پٹائی کی ہے۔''

''مار مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔ یہ تو میں وہاں موجود تھی۔ صاحب کے قدموں سے لپٹ گئی تب وہ پیچھے ہٹے۔''

''اتنا غصہ کرتے ہیں نا۔'' تناوش دکھی ہوگئی تھی۔

راحت خالہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''صاحب جی! آپ کی وجہ سے غصہ تھے۔''

''جانتی ہوں خالہ جان۔'' تناوش کے ہونٹوں پر خفیف تبسم ابھرا۔

''جب آپ یہاں سے چلی گئی تھیں، صاحب جی تو بالکل ہی بستر کے ہو گئے تھے۔ نہ کھانا، نہ ناشتا اور نہ کہیں جانا۔ میں کہتی تھی نا میری شہزادی بیٹی صاحب کو اپنا بنا لے گی۔''

''خالہ جان، آپ بھی امی جان کی طرح باتیں کرنے لگی ہیں۔'' تناوش شرما کر ناشتا بنانے لگی۔ جبکہ راحت خالہ ہنستے ہوئے اسے کبیر دادا کی حالت کے بارے بتانے لگی۔ تناوش سرشاری کی کیفیت میں راحت خالہ کی باتیں سننے لگی۔ دل ہی دل میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''خالہ جان اگر مجھے پتا ہوتا میرے کبیر پر کیا گزر رہی ہے تو اڑ کر یہاں نہ پہنچ جاتی۔''

ناشتا تیار کر کے اس نے ٹرالی میں ڈالا اور خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ کبیر دادا بھی تیار ہو چکا تھا۔ ناشتا کر کے وہ کہنے لگا۔

''میں سہ پہر کو لوٹوں گا تیار رہنا پھر شاپنگ پر چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے اس کی ٹائی باندھنے لگی۔ ٹائی باندھ کر اس نے دعا پڑھ کر پھونکی اور کہنے لگی۔ ''جلدی آنا۔''

کبیر دادا سر ہلاتا ہوا چل پڑا۔ وہ اس سے ایک قدم پیچھے ہی تھی۔

خواب گاہ سے نکلتے ہی کبیر دادا کی نظر صوفے پر بیٹھے پاشا پر پڑی۔ اس کے سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''تمہیں کہا تھا نا اپنی منحوس شکل دوبارہ نہ دکھانا۔'' وہ غصے سے بپھرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ پاشا نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تناوش نے بھی پاشا کو دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کبیر دادا اس کے قریب پہنچتا وہ بھاگ کر پاشا اور اس کے درمیان میں آ گئی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ۔'' اس نے دونوں ہاتھ کبیر دادا کی چھاتی پر رکھ کر اسے روکا۔

''تم ہٹو درمیان سے، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔'' کبیر دادا نے اسے ڈانٹ کر ہٹانا چاہا۔

”آپ میرے بھائی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“ وہ بھی ڈٹ گئی تھی۔

”تناوش، مجھ سے تھپڑ کھاؤ گی۔“

”ماریں، روکا کس نے ہے۔“ وہ ڈرنے پر تیار نہیں تھی۔

کبیر دادا غصے میں چلایا۔ ”تمھیں کہا ہے نا میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔“

”یہ آپ کا نہیں میرا بھی معاملہ ہے۔“

”یہ شخص یہاں نہیں رہ سکتا۔“

”ٹھیک ہے میرا بھائی نہیں رہ سکتا تو مجھے بھی یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ تناوش ضد پر اڑ گئی تھی

”دماغ خراب ہوا ہے تمھارا۔“ کبیر دادا نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر دھکیلا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ بھاگ کر دروازے تک پہنچی اور اسے گھر سے نکلتا ہوا دیکھنے لگی۔ کبیر دادا نے گیٹ کے قریب جا کر ایک دفعہ مڑ کر دیکھا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی جلدی سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے چھائی ناراضی تناوش کی نظر سے اوجھل نہیں تھی۔ کبیر دادا کے غائب ہوتے ہی وہ پیچھے مڑی۔ پاشا اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دھیمے قدم رکھتے ہوئے اس کے قریب پہنچی۔ اور ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

”بھیا، معذرت خواہ ہوں میری وجہ سے انھوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی۔ اگر میں کل رات یہاں ہوتی تو انھیں کبھی بھی ایسا نہ کرنے دیتی۔“

پاشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

وہ دوبارہ بولی۔ ”بھیا، قسم لے لو، میں نے انھیں کچھ بھی نہیں بتایا، اصل میں کل مجھے دو آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ مجھے ہوش آیا تو ایک کمرے میں تھی اور ایک مرد مجھ سے بے ہودہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے وہ وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے اس آدمی کو قتل کر دیا اور مجھے میرے گھر لے گئے۔ وہاں امی جان نے کچھ گلے شکوے کیے تب انھوں نے کہا کہ میں نے ان کی تجوری سے پیسے نکالے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ بے شک آپ سے پوچھ لیں کہ میں نے پیسے نہیں نکالے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر چلے گئے۔ اور گھنٹے ڈیڑھ بعد آ کر مجھے واپس لے آئے۔“

پاشا کے ہونٹوں پر ندامت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم سچ مچ اتنی بھولی ہو؟“

”میں سمجھی نہیں بھیا۔“

”پاگل، وہ پیسے میں نے نکالے تھے تاکہ تمھیں دادا کی نظروں سے گرا سکوں۔ میں نے انھیں یہ بھی کہا تھا کہ تم طلاق لینا چاہتی ہو، یہ بھی کہ تم ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو، ان کے موبائل فون سے تمھارا نمبر بھی میں نے ڈیلیٹ کیا۔ پرسوں رات کو وہ تمھاری طرف جانا چاہتے تھے تب بھی انھیں میں نے وہاں جانے سے روکا“

”سب جانتی ہوں۔“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

”پھر بھی میرے لیے انھیں ناراض کر دیا۔“

”تو کیا، اپنے بھیا کی توہین ہوتے دیکھتی رہتی۔“

پاشا کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ ”میری نیت بری نہیں تھی گڑیا۔“

”یہ بھی معلوم ہے۔“ تناوش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”مجھے معاف کر دینا گڑیا، میری وجہ سے تمھیں بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔ اور کبیر دادا نے بہت اچھا کیا جو میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ مجھے اتنی غفلت نہیں برتنا چاہیے تھی۔“

”اگر دوبارہ معافی تلافی کی بات کی تو پکی پکی خفا ہو جاؤں گی۔ بڑے بھائی ایسا کہتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ اور معافی تو مجھے مانگنا چاہیے جو بڑے بھائی کے فیصلے سے انحراف کرنے والی بنی۔“

”میں تمھیں جادوگرنی سمجھتا تھا اور سچ کہوں تو بالکل ٹھیک سمجھتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم مجھے اتنی عزیز، اتنی پیاری اور اتنی اپنی اپنی لگو گی۔“

”اب بھیا مجھے مسکہ لگا رہے ہیں۔“ حیا آلود لہجے میں کہتے ہوئے وہ راحت خالہ کو آواز دینے لگی۔ ”خالہ جان، بھیا کے لیے ناشتا تو لے آئیں۔“

اور پاشا عقیدت بھری نظروں سے اسے گھورتا رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ”بھیا کی جان، بلاشبہ تم اس قابل ہو کہ تمھارے لیے بڑے رتبے، اعلا حیثیت اور اونچے مقام کو ٹھوکر مار دی جائے۔“

☆.....☆.....☆

گھر سے نکلے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اسے شہاب قصوری کی کال موصول ہوئی وہ ایک بجے خصوصی بیٹھک کا بتا رہا تھا۔

کبیر دادا نے کہا۔ ''میں خود یہی کہنے والا تھا بہتر ہے تم نے خود کال کر لی۔''

''ملتے ہیں پھر۔'' شہاب قصوری نے رابطہ منقطع کر دیا۔

خفیہ ٹھکانے پر پہنچتے ہی اس کا موبائل ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔ تناوش کی کال آ رہی تھی۔ کال کاٹ کر وہ ضروری کھاتے دیکھنے لگا۔

پیغام کی گھنٹی بجی۔ ''کبیر.....'' صرف اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

اگلا پیغام۔ ''یہ بھلا کیا بات ہوئی، کوئی ایسے خفا ہو کر جاتا ہے کیا۔''

''اچھا بات تو سنیں نا..... صرف ایک بات سن لیں۔'' اس پیغام کے ساتھ ہی دوبارہ کال آنے لگی۔ اس مرتبہ کال کاٹ کر اس نے موبائل فون ہی بند کر دیا تھا۔

ساڑھے بارہ بجے وہ شہاب قصوری کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ کار سے اترتے وقت اس کی نظر اپنی جانب بڑھتے ہوئے پاشا پر پڑی۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے وہ اس سے اعراض کرنے لگا۔ پاشا اس کے بالکل قریب پہنچ کر آہستگی سے بولا۔ ''معذرت خواہ ہوں دادا!..... مگر ایک چھوٹا سا پیغام دینا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ واپس مڑ گیا۔

خصوصی بیٹھک شروع ہونے والی تھی، مگر تناوش کے رونے کا سن کر اس سے رہا نہیں گیا تھا۔ فوراً موبائل آن کر کے وہ اسے کال کرنے لگا۔ کال وصول ہوتے ہی اس کی سماعتوں میں تناوش کی ہلکی ہلکی سسکیاں گونجیں اور وہ مسکرا پڑا۔

''رونا بند کرو، میں تھوڑا مصروف ہوں، فارغ ہوتے ہی کال کرتا ہوں۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے لہجے سے اب بھی ناراضی جھلک رہی ہے۔''

''خفا نہیں ہوں، تھوڑا غصہ آیا ہوا تھا اب وہ بھی نہیں رہا۔''

''پھر پیار سے بات کریں نا، یوں سنجیدہ لہجے میں کیوں بول رہے ہیں۔''

”گڑیا تنگ نہ کرو نا..... تمام میرے لیے بیٹھے ہیں۔“

”اب موڈ کچھ بہتر لگ رہا ہے، ٹھیک ہے میں انتظار کر رہی ہوں..... یا اللہ پاک جلدی سے میرے کبیر کو فرصت دے دے۔“

”بے وقوف۔“ اس کی دعا سن کر کبیر دادا سے ہنسی نہ روکی گئی۔

تمام گروپوں کے بڑے پہنچ چکے تھے۔ فصیح الدین کی کرسی پر تیمور علی نروس سا بیٹھا تھا۔ چونکہ بیٹھک کا مقصد ہی کبیر دادا کی زیادتی کو اجاگر کر کے اس سے جواب مانگنا تھا، اس لیے شہاب قصوری کی تمہید سے پہلے ہی اس نے بات شروع کر دی۔

”فصیح الدین کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس کی وجہ اگر آپ لوگوں کو معلوم نہیں تو میں بتا دیتا ہوں۔ اس نے میری بیوی کو اغواء کر کے اسے بے عزت کرنے کی کوشش کی، یقیناً اس کے بعد وہ ایسی ہی موت کا حق دار تھا۔ اور اس کے بعد اگر کسی نے ایسی حرکت کی تو وہ صرف قتل نہیں ہوگا، بلکہ میں ایسے شخص کے پیچھے کسی رونے والے کو باقی نہیں رہنے دوں گا۔ میری بات ختم ہوئی۔“

شہاب قصوری گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔ ”اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ آپ کی بیوی اغواء ہوئی تھی اور اسے اغواء کرنے والا فصیح الدین ہی تھا۔“

کبیر دادا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات مجھے اس بے غیرت کے خاص آدمی شکیل احمد نے بتائی تھی۔ اس سے پوچھ لو۔“

شہاب قصوری کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ”وہی شکیل احمد جسے آپ قتل کر کے وہیں پھینک آئے۔“

کبیر دادا چونکتے ہوئے بولا۔ ”سوائے اس کے کسی کو بھی قتل نہیں کیا۔ اور شکیل احمد تو وہاں موجود ہی نہیں تھا۔“

شہاب قصوری نے سوالیہ نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھا۔ وہ خفیف سا سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”مجھے جب اس حادثے کی اطلاع ملی اس وقت پولیس وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جا کر کیس اپنے ہاتھ میں لیا

۔موقع واردات پر فصیح الدین صاحب کے دو محافظ اور چوکیدار بے ہوش پڑے ملے تھے جبکہ ایک ملازمہ، شکیل احمد اور خود فصیح الدین صاحب زندہ نہیں تھے، ملازمہ اور شکیل کو گولی ماری گئی جبکہ فصیح الدین صاحب کو بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ویسے تو آپ لوگوں نے بھی موقع واردات کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے محافظوں اور چوکیدار سے معلوم ہوا کہ یہ سب کبیر دادا کا کام ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ فصیح الدین کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ اپنی مرضی سے وہاں پہنچی تھی۔ اگر اغواء کا معاملہ ہوتا تو اس کے محافظ اور تیمور علی صاحب اس بات سے بے خبر نہ ہوتے۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلا کہ وہ لڑکی خود غلط کردار کی ہے ایسی فاحشائیں....." یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھے اس کی چھاتی پر پاشا کی زبردست ٹھوکر لگی۔ وہ کرسی سمیت پیچھے کو الٹ گیا تھا۔

پاشا اچھل کر اس کے پاس پہنچا اور اس کے گریبان سے پکڑتے ہوئے چلایا۔ "گھٹیا انسان، اگر دوبارہ میری بہن کے بارے ایسے غلیظ الفاظ منہ سے نکالے تو تیرے گندے ہونٹوں سے نکلنے والے وہ آخری الفاظ ہوں گے۔"

تمام ہکا بکا رہ گئے تھے۔ کاشف راجپوت نے فوراً اٹھ کر پاشا کو پکڑ کر ایس پی کا گریبان چھڑایا....." پاشا، پاگل تو نہیں ہو گئے۔"

"پاگل میں نہیں ہوں یہ سٹھیا گیا ہے، اسے تمیز ہی نہیں ہے کسی عزت دار خاتون کا ذکر کرنے کی۔ اب اگر اس نے ایسا کچھ کہا تو اس کی ہانیہ کو کوٹھے پر بٹھا دوں گا۔" پاشا نے اس کی بیٹی کا نام لیا۔

"بہرام پاشا، تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" ایس پی دھاڑا۔

"میں یا تم۔" پاشا کی آواز اس سے کم بلند نہیں تھی۔ "گھر کی عزت پر بات آئی تو تمہیں تکلیف پہنچ گئی، ہماری کوئی عزت نہیں ہے۔"

"کاشف اسے باہر لے جاؤ۔" کبیر دادا، کاشف کو مخاطب ہوا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا پاشا کو کھینچ کر باہر لے گیا۔

"شہاب صاحب، آپ نے دیکھ لیا۔" ایس پی نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے بڑے عہدہ دار ہو کر آپ لوگوں سڑک چھاپ غنڈوں جیسی حرکتیں

کر رہے ہو۔"

ایس پی چیخا۔"جس کی غلطی ہے وہ اجاگر کرو۔"

"مسٹر اوڈھو!.....شکر کرو ابھی تک زندہ ہو۔تمھارا کام رپورٹ پیش کرنا تھا، نہ کہ میری بیوی کی کردار کشی یا اس کے بارے گھٹیا الفاظ بکنا۔جب اپنی بات تم غلاظت اگلے بغیر بھی بیان کر سکتے تھے تو یوں واہیات طرز گفتگو کا مطلب کیا ہے۔"

"میں فقط نے حقیقت کا اظہار کیا ہے اور یہ بتا رہا تھا کہ لڑکی کا کردار کیسا ہے۔"

"کسی کے گھر والوں کے کردار کے بارے بولنے کی اجازت تمھیں کس نے دی ہے۔اور جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے تو مس ہانیہ ضمیر اوڈھو درجنوں بار انسپکٹر صداقت خان کے ساتھ ایک فلیٹ میں کئی کئی گھنٹے تک بند رہی ہے۔اس بات سے یہاں بیٹھے ہوئے تمام ممبران واقف ہیں کبھی تمھارے سامنے یہ بات چھیڑی گئی۔

"کبیر دادا، تم میری بیٹی پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔"

"تمھیں آئینہ دکھا رہا ہوں اور میں قسم کھاتا ہوں تم خود بھی اس بات سے واقف ہو۔"

"وہ شادی کرنا چاہتے ہیں مسٹر کبیر....."

"واہ.....یہ صداقت ہی ہے جو ہونے والی بیوی کے ساتھ اکیلا نہیں ہوتا بلکہ اپنے دو تین دوست بھی ہمراہ رکھتا ہے۔"

"کبیر دادا پلیز....."شہاب قصوری ملتجی ہوا۔

"شہاب صاحب، مجھے کبیر دادا اور بہرام پاشا کے فعل کا جواب چاہیے۔فصیح الدین کا قتل ایک سوچی سمجھی سازش ہے، وہ لڑکی وہاں مرضی سے آئی تھی، اگر کبیر دادا کے پاس اغواء کا کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے۔باقی میری بیٹی پر اس نے جو کیچڑ اچھالا ہے اس کا جواب اسے جلد ہی مل جائے گا۔مجھے اجازت....."یہ کہتے ہی ایس پی وہاں سے باہر نکل گیا۔

نوشاد بولا۔"کبیر دادا اور پاشا نے زیادتی کی ہے۔"

"بالکل۔"نقیب اللہ اور اسد نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اخلاق حسین نے کہا۔ ”پاشا نے غلطی کی ہے، مگر ایس پی صاحب کا طرز گفتگو بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کم از کم اسے اتنا سوچنا چاہیے تھا کہ اس لڑکی کا شوہر یہاں بیٹھا ہے۔“

تیمور علی، بابر حیات اور شیر خان خاموش بیٹھے رہے تھے۔

دو تین منٹ خاموشی چھائی رہی جسے شہاب قصوری کی آواز نے توڑا۔ ”بابر حیات صاحب، اور شیر خان صاحب اس کیس کی تحقیق کریں گے۔ دو دن بعد دوبارہ تمام کو بلا کر آپ کی رپورٹ کو مدنظر رکھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے گا۔“

تمام سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر ایک ایک کر کے وہاں سے نکلنے لگے۔ سب سے آخر میں نوشاد آفریدی اور اخلاق حسین رہ گئے تھے۔ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔

”تو کیا خیال ہے۔“ اخلاق حسین نوشاد کی طرف متوجہ ہوا۔

نوشاد نے پوچھا۔ ”کس بارے؟“

”میرا خیال ہے اس سے مناسب موقع نہیں ملے گا۔“

نوشاد آفریدی چڑ کر بولا۔ ”وضاحت تو کرو یار۔“

”میرا مطلب، کبیر دادا کو انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ اب یہ کیا کہ اتنی سی بات پر ایس پی کا قتل کر دیا۔“

”کیا.....؟“ نوشاد آفریدی حیرانی سے چیخا۔

اخلاق حسین ہنسا۔ ”میرا کام ہوتا ہے سوچنا اور اسے انجام تک پہنچانا خان صاحب کا۔“

”مگر.....“ نوشاد آفریدی مخمصے میں پھنسا نظر آ رہا تھا۔

”اگر، مگر میں ایسا موقع ہاتھ سے گنوا دو گے۔ یقین مانو ایس پی کی موت بغیر کسی ثبوت کے کبیر دادا کے کھاتے میں جائے گی۔ اس کی موت کے ساتھ شمشیر دادا کو کال کر دیں گے۔

ایک دو دن میں کبیر دادا کا کانٹا بھی نکل جائے گا، بلکہ پاشا بھی کبیر دادا کو مرتے نہیں دیکھ سکے گا اور شمشیر دادا سے ٹکرا کر ہمارا کام مزید آسان کر دے گا، یوں بھی اس نے ہماری جان من کو بہن بنا لیا ہے اور محبوبہ کے وہ بھائی جو اس سے ملن کی راہ میں روڑے اٹکائیں سچ مانو تو مجھے بہت برے لگتے ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں بھائی مل کر

تمام کو اپنی انگلیوں پر نچائیں گے۔"

نوشاد آفریدی نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔"شاہ جی، تم اتنی دور تک کیسے سوچ لیتے ہو۔"

"یہ حکمرانی کے گر ہیں خان صاحب، تم ایک اچھے سپہ سالار تو بن سکتے ہو حکمرانی کے قابل نہیں ہو۔ اور جب میرا دماغ اور تمھارا جسم اکٹھا ہو جائے گا تو کراچی پر کس کا راج ہوگا.....؟"

"ہمارا....." پاشا کے ہونٹوں پر معنی خیز ہنسی ابھری۔"ویسے تم نے کبیر دادا کی طرف داری کیوں کی۔"

اخلاق حسین نے کہا۔"اس سوال کا جواب کل دوں گا۔ اور اب میں پہلا سوال دہراؤں گا.....تو کیا خیال ہے۔"

اور پاشا اس کے سوال کا جواب دیے بغیر موبائل فون نکال کر کسی کو کال کرنے لگا۔ وہ کال اخلاق حسین کے سوال کا عملی جواب تھا۔

☆.....☆.....☆

کاشف پاشا کو کھینچتا ہوا باہر لے آیا تھا۔ ڈرائیور کو دوسری کار میں آنے کا کہہ کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پاشا نے بھی اپنے محافظوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

شہاب قصوری کے ٹھکانے سے نکلتے ہی کاشف اس کی طرف متوجہ ہوا۔"اتنا جذباتی ہونے کی وجہ، کل تک تو وہ تمھیں فراڈن، ڈائن، کمینی اور جانے کیا کیا لگ رہی تھی۔"

"بکواس کر رہا تھا، سراسر غلطی پر تھا۔" پاشا نے اعتراف حقیقت میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

"پتا نہیں بکواس وہ تھی یا اب کر رہے ہو۔"

"آپ کا اندازہ ٹھیک تھا دادا، وہ نہایت شریف، گھریلو اور معصوم لڑکی ہے۔ دھوکے، فراڈ، کمینگی اور خود غرضی کی دنیا سے نہایت دور۔ اسے بس اپنے شوہر کی پروا ہے۔"

تمھارے جیسے خبطی سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس ڈائن کے قابو میں آجاؤ گے۔" یہ فقرہ کاشف نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ پاشا کے ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی نمودار ہوئی۔

"بتاؤ نا یہ تبدیلی آئی کیسے؟"

”آپ سے ملاقات کے اگلے دن میں کبیر دادا کی غیر موجودی میں اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ اتنے خلوص ،محبت اور تمیز داری سے ملی کہ مجھے بات کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا مافی الضمیر بیان کیا اور .....“ پاشا نے ساری تفصیل دہرادی۔

”ویسے ہو سکتا ہے، ایس پی ٹھیک کہہ رہا ہو اور تمھارا اندازہ غلط ہو کبھی کبھی معصوم چہروں کے پیچھے بھی مکروہ لوگ بستے ہیں۔“

”دادا پلیز، میں آپ سے مار نہیں کھانا چاہتا۔“ پاشا کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”کیا.....“ کاشف کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ”اس کے لیے مجھ سے جھگڑو گے۔“

پاشا دکھی دل سے بولا۔ ”دادا، وہ میری بہن ہے۔ اس نے مجھے اتنا مان دیا ہے، اس کے سر پر میں نے ہاتھ رکھا ہے۔ غنڈہ ضرور ہوں، بے غیرت نہیں ہوں۔“

کاشف نے قہقہہ لگایا۔ ”اچھا ٹھیک ہے یار معذرت۔“

”کبیر دادا کے سیکرٹری عظیم اور محافظ امتیاز سے میری تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت کبیر دادا کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے دروازے کے باہر سے گڑیا کی چیخیں سنی تھیں۔ وہ فاسی بے غیرت کو خدا کے واسطے ڈال رہی تھی ۔اور گڑیا کی چیخیں سن کر ہی کبیر دادا نے اس کی یہ حالت کی ہے۔ باقی یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اگر وہ اپنی مرضی سے وہاں گئی ہوتی تو واپس نہ آپاتی، اس معاملے میں کبیر دادا رعایت کا قائل نہیں ہے۔“

کاشف راجپوت نے اپنے ٹھکانے کی جانب کار موڑتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے ساتھ رکو گے؟“

پاشا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، میں چلوں گا۔“ اور کاشف نے اسے نیچے اتارنے کے لیے کار روک دی۔

☆.....☆.....☆

”کبیر دادا، آپ کہاں ہیں۔“ کبیر دادا نے شہاب قصوری کے ٹھکانے سے نکل کر گھر کا رخ کیا تھا۔ اس وقت وہ گھر کے قریب پہنچنے والا تھا جب اخلاق حسین کی کال موصول ہوئی۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”شاہ جی، میں تو گھر پہنچنے والا ہوں خیریت۔“

”دو تین باتیں کرنا تھیں، میرا خیال ہے پھر کبھی سہی۔“

''اگر کوئی ضروری بات ہے تو گھر پر آجاؤ۔''

''کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ بس آپ کو احتیاط کی تاکید کرنا چاہتا تھا۔''

کبیر دادا کے ہونٹوں سے قہقہہ برآمد ہوا۔ ''شاہ جی کیا باتیں لے کے بیٹھ گئے ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے وہ ٹٹ پونجیا ایس پی مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا کبیر دادا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایس پی ہے اور پولیس کی نوکری نے اسے کافی اختیار دیا ہوا۔'' اخلاق حسین نے کھسیاہٹ ظاہر کی۔

''شاہ جی، وہ کیا بھلی سی کہاوت ہے کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور پولیس والوں نے جب جان قربان کرنا ہو تو کبیر دادا کے متھے لگ جاتے ہیں۔''

''اچھا کبھی بیٹھ کر اس موضوع پر تفصیلی بات کریں گے فی الحال آپ، ہماری بھابی کے پاس جانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔'' اخلاق حسین نے جلدی سے بات سمیٹی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا مطمح نظر پورا ہو گیا ہو۔

''شکریہ شاہ جی۔'' کبیر دادا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ گاڑیاں کوٹھی میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس کی پیاسی نظروں کو مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اندرونی عمارت کے داخلی دروازے پر میٹھی مسکان ہونٹوں پر بکھیرے کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر کبیر دادا اردگرد کے مناظر سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ تو صبح اس سے ناراض ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ گو بعد میں اس نے کال پر اسے راضی تو کر لیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے اس کی جان بخشی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فوراً ہی چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اس نے تناوش سے نظریں پھیر لیں۔

''آپ ابھی تک خفا نظر آ رہے ہیں۔'' اس کے قریب پہنچتے ہی تناوش نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پریشانی ظاہر کی۔

وہ جواب دیے بغیر خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

''اے!..... بات تو سنیں ناں۔'' وہ اسے محبت سے پکارتی اپنی جانب متوجہ کرنے لگی۔

کبیر دادا یونہی موڈ بنائے صوفے پر بیٹھ گیا۔ فوراً دبیز قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے کبیر دادا کے گھٹنوں پر

تھوڑی ٹیکی۔ ”میں نے رونا شروع کر دینا ہے۔“ اس نے اس انداز میں کہا تھا کہ کبیر دادا ہنسی نہ روک سکا۔

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”پتا بھی ہے آپ ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں۔“

”اچھا جلدی سے تیار ہو جاؤ شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔“

”سچ۔“ وہ کھل اٹھی تھی۔ ”میں نے لسٹ بھی بنالی ہے۔“ اس نے میز پر پڑی کتاب سے ایک کاغذ نکال کر کبیر دادا کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر وہ مندرجات پر نظریں دوڑانے لگا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات کی طویل فہرست نے کبیر دادا کو دکھی کر دیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے پہلے دن ہی تناوش سے کیوں نہ پوچھا۔

”بس اتنا تھوڑا سا سامان۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”چار پانچ گھنٹوں میں بس یہی چند چیزیں یاد کی ہیں۔“

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“ اس نے منہ بسورا۔

وہ وارفتگی سے بولا۔ ”اپنی گڑیا کی قسم سنجیدہ ہوں۔“

”استاد جی کہتے تھے کہ غیر اللہ کی قسم نہیں کھانا چاہیے۔“ وہ اس کی تصحیح کرنے لگی۔

”یار، ان پڑھ سا بندہ ہوں اب پڑھی لکھی بیوی ملی تو آہستہ آہستہ سمجھ جاؤں گا۔“

”سچ بتائیں آپ کی تعلیم کتنی ہے، کلاس میں کون سی پوزیشن لیتے تھے۔ استادوں کی مار کھائی ہے کہ نہیں اور امی جان، ابو جان کیسے تھے۔ مجھے سب بتائیں نا کبیر، پلیز۔“ وہ ملتجی ہوئی۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ”ٹھیک ہے شاپنگ پر نہیں جاتے، باتیں کرتے ہیں۔“

”میں دو منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کی تیزی دیکھتے ہوئے کبیر دادا ہنس دیا تھا۔ ”اچھا، وہی کالج والے کپڑے پہنے ہیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، لیکن جب باہر نکلی تو کالج ہی کے کپڑوں میں تھی۔ اس کے کپڑے تبدیل کرنے کے دوران وہ عظیم کو ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ جب وہ تناوش کے ساتھ باہر نکلا تو اس کی کار تیار کھڑی تھی۔ عظیم کو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ خود ڈرائیو کرے گا، اس لیے عظیم ڈرائیور کی جانب والا دروازہ کھولے کھڑا تھا

۔کبیر دادا نے خود تناوش کے لیے دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔اس کے کہنے پر عظیم نے محافظوں کی ایک ہی جیپ تیار کی تھی۔

کار کے آگے بڑھتے ہی جیپ اس کے پیچھے چل پڑی۔امتیاز، بخش کو مخاطب ہوا۔

"کہتا تھا نا یہ نمازن، کبیر دادا کو کہیں کا نہیں چھوڑے گی، دیکھ لو کس طرح ناز نخرے اٹھا رہا ہے۔دروازہ صرف کھولا نہیں خود بند بھی کیا ہے۔"

بخش نے کہا۔"یہ تو بیوی کا حق بنتا ہے کہ اسے عزت دی جائے، آخر وہ بھی تو کبیر دادا کی خدمت کرتی ہو گی۔"

امتیاز صاف گوئی سے بولا۔"ہم سے تو زن مریدی نہیں ہوتی بھئی۔"

"جب تم خود اپنی بیوی کو عزت نہیں دے سکتے تو کسی دوسرے سے کیسے امید کر سکتے ہو کہ وہ تمھاری بیوی کی تکریم کرے گا۔"

امتیاز بگڑ کر بولا۔"یار فلسفے بیان نہ کرو، اس چھوکری کے لیے کبیر دادا یوں دروازہ کھولے، حد نہیں ہو گئی۔"

بخش فلسفیانہ لہجے میں بولا۔"وہ چھوکری کبیر دادا کی بیوی ہے، اس کی عزت و حرمت ہے کوئی بازاری لڑکی نہیں ہے۔کل کو اسی سے کبیر دادا کی نسل چلے گی۔اسے ملازمہ اور پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنے سے اولاد بھی نوکر جیسی جنے گی اور شہزادی بنا کر رکھے گا تو شہزادے پیدا کرے گی۔"

"میٹرک تو کر نہ سکے اور باتیں کر رہے ہو پروفیسروں جیسی۔"

"زندگی کا فلسفہ تعلیم نہیں تجربے کی مرہون منت ہوتا ہے۔"

امتیاز طنزیہ لہجے میں بولا۔"اتنے تجربہ کار ہوتے تو دو دفعہ شرط نہ ہارتے۔"

"شرط ہارنے کو چھوڑو، ابھی کبیر دادا اسے شاپنگ کے لیے لے جا رہا ہے تھوڑی دیر بعد تم اس کا خریدا ہوا سامان ہاتھوں میں اٹھا کر پھر رہے ہو گے۔تب میں پوچھوں گا کہ ایک چھوکری کا سامان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یار کوئی اور موضوع نہیں ہے تم دونوں کے پاس۔"ڈرائیور نے انھیں جھڑکا۔اور دونوں ہونٹ بھینچ کر چپ

ہو گئے۔

تناوش کی سوچ کے برعکس کبیر دادا نے سب سے پہلے ایک جیولر مارکیٹ میں کار روکی تھی۔ قیمتی زیورات کو دیکھتے ہوئے تناوش حیران ہو گئی تھی۔ جیولر، کبیر دادا کا جاننے والا تھا۔ بیٹھتے ہی جیولر نے ان کے سامنے مختلف زیورات کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ جڑاؤ کنگن، قیمتی موتیوں کا ہار، بندیا، ٹاپس، بندے، لاکٹ، انگوٹھیاں، نتھلی، بالیاں نیکلس، پازیب وغیرہ۔ کبیر دادا نے تناوش کے ناک، کان، گلے، ہاتھوں، پاؤں وغیرہ کے لیے دو دو تین تین زیور خریدے تھے۔ تناوش محجوب سی بیٹھی کبیر دادا کو خریداری کرتے دیکھتی رہی۔ بل دیکھ کر کبیر دادا نے لاکھوں روپے کا چیک کاٹ کر بے پروائی سے جیولر کی طرف بڑھا دیا۔ وہاں سے وہ اسے دوسری مارکیٹ میں لے آیا۔ میک اپ کا سامان اور پھر سینڈل وغیرہ خریدنے کے بعد وہ کپڑوں کی دکان میں پہنچے۔ تناوش شیشے کے سامنے کھڑی ٹخنوں تک آتی قمیص کو دیکھ رہی تھی اور کبیر دادا اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں ایک نسوانی آواز پڑی۔

''اسلام علیکم سر!'' ایک نوجوان لڑکی اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ کبیر دادا کو تھوڑی شناسا سی نظر آئی مگر اسے یاد نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھ چکا ہے۔

''جی میں۔'' وہ ذرا حیران ہوا۔

''سر، میرا خیال ہے آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ میں نے اس دن آپ کو کپڑوں کے انتخاب میں مدد دی تھی اور آپ نے مجھے ایک سوٹ تحفے میں دیا تھا۔''

''اوہ سوری۔'' کبیر دادا کو فوراً یاد آ گیا تھا۔

''کوئی بات نہیں سر۔'' کبیر دادا کے یاد نہ رکھنے پر اسے ہلکی سی مایوسی ہوئی تھی۔ شاید کبیر دادا کی طرف سے ملنے والے سوٹ کو اس نے کسی اور نظر سے دیکھا تھا۔

''اچھا، وہ سوٹ اس کے لیے لیا تھا۔'' کبیر دادا نے شیشے کے سامنے کھڑی تناوش کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھ لو جسمانی لحاظ سے آپ کی طرح لگتی ہے نا۔''

وہ لڑکی تناوش کی طرف گھوم گئی۔ اس نے بھی کبیر دادا کے ساتھ ایک لڑکی کو کھڑے دیکھ لیا تھا۔ ایک لحظے میں

اسے شاپنگ وغیرہ بھول گئی تھی۔ وہ بس اسی جانب گھورتی رہ گئی۔

کبیر دادا کو خطرہ محسوس ہوا اور وہ اس لڑکی کو بولا۔ ''آئیں آپ کا تعارف کرادوں۔''

''جی سر۔'' تناوش کو دیکھتے ہی وہ لڑکی مزید بجھ گئی تھی۔

''تناوش، اس لڑکی نے اس دن لباس خریدنے میں میری مدد کی تھی۔ مجھے تو تمھارا ناپ ہی معلوم نہیں تھا۔''

''ہونہہ!'' گہرا سانس لیتے ہوئے وہ لڑکی طرف متوجہ ہوئی۔ ''شکریہ باجی۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے کبیر دادا کو اتنی سخت نظروں سے گھورا کہ وہ بے ساختہ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

''اچھا سر، میں چلوں گی۔'' تناوش کو سر کے اشارے سے آداب کہتی ہوئی اس نے گویا کبیر دادا سے جانے کی اجازت مانگی۔

''شکریہ بہن۔'' کبیر دادا نے فوراً کہا۔ وہ کن انکھیوں سے تناوش کو بھی دیکھ رہا تھا۔

اس لڑکی کے جاتے ہی وہ بولی۔ ''بہتر ہوگا، یہاں میرے ساتھ کھڑے ہو کر کپڑے پسند کرنے میں میری مدد کریں۔''

''جی بیگم صاحب۔'' ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا وہ اس کے قریب ہو گیا۔

''زہر لگ رہی ہے یہ ہنسی۔'' تناوش کا موڈ اب تک بگڑا ہوا تھا۔

''ایسا بھی کیا کر دیا ہے یار۔''

''کچھ بھی نہیں خریدوں گی، میں بتا رہی ہوں۔'' تناوش رونے پر تیار ہو گئی تھی۔

''میں نے سب کے سامنے بانہوں میں بھر لینا ہے۔'' کبیر دادا نے دھمکی دی۔

''بانہوں میں بھر لینا ہے۔'' اسے چڑاتے ہوئے وہ دوبارہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''اچھا یہاں سے ہوٹل پر چلیں گے، رات کا کھانا باہر ہی کھا کر لوٹیں گے۔'' اسے خوش کرنے کے لیے کبیر دادا نے تجویز پیش کی۔

تناوش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، رات کا کھانا گھر میں کھائیں گے۔ آج ایک مہمان کو بھی بلایا ہے۔ اور راحت خالہ کو خصوصی کھانا تیار کرنے کا بتا کر آئی تھی۔''

"واہ، مہمان بھی بلانا شروع کر دیے۔"

"اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو منع کر دیتی ہوں۔"

"تم بہانے بہانے سے لڑنے کی راہ کیوں ڈھونڈ رہی ہو۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" کہہ کر وہ دوبارہ ہینگر میں لٹکے مختلف اقسام کے کپڑوں کی جانب متوجہ ہو گئی ۔خریداری کر کے وہ باہر نکل آئے۔کار کی عقبی نشست اور ڈگی سامان سے بھر گئی تھی۔

"تم خفا خفا سی لگ رہی ہو۔" اسے خاموش دیکھ کر کبیر دادا پوچھنے لگا۔

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔"اگر میرے بس میں ہو تو آپ کے چہرے پر تیزاب پھینک دوں۔"

"دماغ تو ٹھیک ہے۔" کبیر دادا حیران رہ گیا تھا۔

"مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ لڑکیاں یوں آپ کے آگے پیچھے گھومیں۔آپ کو محبت سے دیکھنے کا حق صرف اور صرف مجھے ہے۔"

وہ ہنسا۔"تو تیزاب سے تو میں تمھارے دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔"

وہ وارفتگی سے بولی۔"مجھے آپ ہر شکل، ہر حالت میں قبول ہیں۔"

"ویسے دوسرا دن ہے تمھارے تیور کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔"

وہ اطمینان سے بولی۔"اس کی وجہ بھی آپ ہیں۔"

"لو نیا الزام بھی آ گیا۔" کبیر دادا نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔"وضاحت کرنا پسند کریں گی۔"

"ہاں۔" کھسک کر تناوش نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔"جب ایک عورت کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا شوہر اس سے پیار کرتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے، اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا، اس کے سارے لاڈ اور ناز نخرے برداشت کرتا ہے۔تب عورت شوہر کے دل میں موجود اپنی اہمیت کو مدنظر رکھ کر کبھی کبھی ہٹ دھرمی اور بے جا ضد پر بھی اتر آتی ہے۔کیوں کہ وہ جانتی ہے اس کی ہٹ دھرمی اور بے جا ضد تسلیم کی جائے گی۔خواہ مخواہ غصہ بھی دکھاتی ہے اور اس کا مطلب شوہر کی شان میں گستاخی کرنا نہیں ہوتا ہے۔بلکہ وہ لاڈ کر رہی ہوتی ہے۔اپنے اختیارات کی آخری حد جان رہی ہوتی ہے۔"

ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ ویل سنبھالتے ہوئے کبیر دادا نے دوسرے ہاتھ سے اس کی ناک کی پھننگ کو مروڑا۔

''اُف..... پھر وہی حرکت۔'' تناوش نے اس کے ہاتھ پر آہستہ سے تھپڑ رسید کیا۔

''جتنی بڑی بڑی اور فلسفیانہ باتیں کر رہی ہو اتنی سیانی نظر تو نہیں آتی ہو۔'' کبیر دادا نے اسے چھیڑا۔

وہ مسکرائی۔ ''اگر سیانی نہ ہوتی تو کبیر کو چنتی۔''

''یہ بھی خوب رہی۔'' کہتے ہوئے کبیر دادا نے پھول بیچنے والے بچے کے پاس کار روک دی۔ تناوش کے لیے گجرے خرید کر اس کی ریشمی کلائیوں میں پہنائے اور آگے بڑھ گیا۔

گھر پہنچتے ہی کبیر دادا صوفے پر بیٹھ گیا۔ تناوش نے سب سے پہلے اس کے لیے چائے بنائی اور پھر تمام سامان کو الماریوں میں ترتیب سے رکھنے لگی۔ کبیر دادا اسے کام کرتے دیکھتے ہوئے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ سامان کی ترتیب سے فارغ ہونے تک شام کی آذان ہو گئی تھی۔ نماز پڑھ کر اس نے شیشے کی میز کے ساتھ دو تپائیاں ملا کر رکھیں اور راحت خالہ کے ساتھ مل کر میز پر کھانا لگانے لگی۔

''مہمان کو تو آنے دو۔'' کبیر دادا نے اسے ٹوکا۔

''مہمان بس پہنچنے ہی والا ہے۔'' وہ رکے بغیر کام میں لگی رہی۔ کھانا لگا کر وہ باہر نکلی اور چند منٹ لگا کر جب واپس آئی تو پاشا اس کے ہمراہ تھا۔

اسے دیکھتے ہی کبیر دادا کا موڈ بگڑ گیا تھا، وہ ایک دم کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے تم لوگ کھانا کھاؤ مجھے ضروری کام ہے۔''

''جہاں بھی جانا ہے کھانا کھا کر چلے جانا۔'' تناوش نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''تمھیں کہا نا ضد نہیں کرتے۔'' پاشا نے اسے ڈانٹا۔

''میں ضد کروں گی۔ اور خدا کی قسم آپ نے کھانا نہیں کھایا تو نہ تو کھانا کھاؤں گی اور نہ کبھی آپ کا تحفہ قبول کروں گی۔''

''تمھارا دماغ خراب ہوا ہے۔'' کبیر دادا جانے کا ارادہ موخر کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”آپ خواہ مخواہ بھیا سے خفا ہو رہے ہیں۔ انھوں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا تھا نا۔ کیا انھیں میری عزت عزیز نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ اس سے پہلے بھی میں گھر جا کر رہتی رہی ہوں کبھی کسی نے ایسی حرکت نہیں کی۔ اور یاد ہے نا شادی کے پہلے دن ہی مجھے خاور شیخ اغواء کر کے لے گیا تھا بتائیں اس وقت کس کی غلطی تھی۔“

کبیر دادا اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

تناوش پاشا کو آنکھ مارتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اچھا بھیا آپ انھیں معذرت بولیں۔“

پاشا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”ایسے رویہ دکھا رہا ہے گڑیا، تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔ اگر یہ دادا ہیں تو تمھارا بھائی بھی ایک گینگ کا سربراہ ہے۔ اور تمھارا بھائی کسی سے معافی نہیں مانگا کرتا۔“

”تیری تو.....“ کبیر دادا ایک دم اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔

”معافی، معذرت غلطی ہو گئی دادا۔“ پاشا نے فوراً کان پکڑ لیے تھے۔ ”پلیز اب میری چھوٹی بہن کے سامنے تو کچھ نہ کہیں۔“

اس کا انداز دیکھتے ہوئے تناوش کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”بڑے ڈھیٹ ہو۔“ کبیر دادا بھی ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ لیے بیٹھ گیا۔

”دیکھا، تمھیں کہا تھا نا اوپر اوپر سے رویہ دکھا رہے ہیں۔“ پاشا، تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔

”بھیا اب بیٹھ جائیں۔“ تناوش کبیر دادا کے پہلو ہی میں بیٹھ گئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ سبز چائے پی رہے تھے جب انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ پاس پڑے فون کا سپیکر پاشا نے آن کر دیا۔ عظیم بات کر رہا تھا۔ وہ ساحل والے اڈے پر کسی مسئلے کی بابت بتا رہا جس کے حل کے لیے کبیر دادا کا تھوڑی دیر کے لیے جانا ضروری تھا۔

بات ختم ہوتے ہی کبیر دادا پاشا کو مخاطب ہوا۔ ”یار، میرا خیال ہے تم جا کر دیکھ لو۔“

پاشا سے پہلے تناوش نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بھیا نہیں، آپ خود جائیں اور جلدی لوٹنا۔“

کبیر دادا کے چہرے پر تو جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا غصہ قابو کیا۔ پاشا کو بھی کبیر دادا کی حالت نظر آ گئی تھی، مگر تناوش ایسا کہہ کر برتن سمیٹنے لگی تھی اس لیے وہ کبیر دادا کی کیفیت سے بے خبر تھی

پاشا جلدی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے دادا میں چلا جاتا ہوں۔''

''نہیں، تم اپنا آرام مت خراب کرو میں جا رہا ہوں۔'' عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے کبیر دادا اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

تناوش نے حیرت بھری نظروں سے اس کی پشت کو گھورا اور پھر برتن چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ پڑی۔

''بات تو سنیں۔'' اس نے آواز دے کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکے بغیر چلتا گیا۔

''جلدی لوٹنا، آپ کے لیے سرپرائز ہے۔'' وہ اس کی بے رخی کو نظر انداز کیے بولتی رہی۔

گاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر اس کی کار گیٹ سے نکل گئی۔ اور وہ اس کی ناراضی کو سوچتی رہ گئی۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' پاشا کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''جی بھیا۔'' کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اس طرح نہیں کہتے بے وقوف۔'' اسے واپس لوٹتے دیکھ کر وہ خواب گاہ کے دروازے ہی پر رک گیا تھا۔

''مم..... میں نے کیا کہا ہے بھیا۔'' وہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔ کبیر دادا کی بے رخی وہ سہہ نہیں پا رہی تھی۔ نہ تو اس نے تناوش کو دعا پڑھنے کا موقع دیا تھا اور نہ اس کی کسی بات کا جواب دیا تھا۔

''جب وہ مجھے بھیج رہے تھے تو تمہیں اپنے بھیا کے آرام کی اتنی بھی فکر نہیں ہونا چاہیے تھی پگلی۔ اور اب رونے نہ بیٹھ جانا آ جائیں گے تھوڑی دیر تک۔'' اس کے سر پر ہلکی سی چپت مارتا ہوا وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا

وہ بجھے دل سے برتنوں کی طرف بڑھی اسی وقت راحت خالہ بھی باورچی خانے سے نکل کر اس کے پاس آئی اور برتن سمیٹنے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ برتن راحت خالہ کے پاس باورچی خانے میں چھوڑ کر وہ خواب گاہ میں لوٹ آئی۔ راحت خالہ کے ساتھ گپ شپ کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چند لمحے بیٹھ کر وہ اسے کال کرنے لگی۔ کال جاتے ہی صوفے پر پڑا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ وہ اپنا موبائل وہیں چھوڑ گیا تھا۔

''وضاحت کرنے کا موقع تو دیا کریں نا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی ابھری اور پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ مسکرانے لگی۔ ''دیکھ لینا واپس آ کر آپ کی ناراضی فوراً ہی ختم ہو جائے گی۔'' وہ پراعتماد انداز میں ڈریسنگ روم کی

طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

ساحل والے ٹھکانے تک وہ گویا آگ کے انگاروں پر لوٹتا ہوا گیا تھا۔ وہ تو اس کی قربت کے بہانے تلاشا کرتی تھی۔ اس کے گھر سے نہ نکلنے کی مناجات کیا کرتی۔ اور اب اپنے منہ بولے بھائی کے آرام کے لیے اس کی محبت کو ٹھوکر لگا دی۔

ساحل والے اڈے پر چھوٹا سا مسئلہ ہوا تھا۔ اڈہ انچارج کے ساتھ دو کارکنوں کا جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ اس کے احکام کو ماننے پر تیار نہیں تھے۔ دو تین اور آدمی بھی وہاں موجود تھے انھوں نے بیچ میں پڑ کر جھگڑا رکوا دیا تھا اور فوراً عظیم کو اطلاع کی تھی۔ اس طرح کے جھگڑے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔ کبیر دادا نے وہاں پہنچتے ہی دونوں فریقوں کی بات سنی غلطی اڈہ انچارج کی تھی۔ فوراً ہی اسے اڈہ انچارج کے عہدے سے معزول کر کے اس نے اندرون شہر ایک اور اڈے پر بھیج دیا اور اڈہ انچارج کسی دوسرے کو مقرر کر دیا۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا تھا لیکن وہ خواہ مخواہ وہاں پر موجود اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ باری باری تمام اڈوں پر چکر لگانے لگا۔ اس دوران اس نے کافی کام نمٹائے مگر بے دھیانی اور بے دلی سے۔ کوئی بھی چیز کوئی بھی کام اور کوئی بھی جگہ اس کے دل میں بھرے غصے کو ٹھنڈا نہیں کر پا رہی تھی۔ محبت ایک عجیب جذبہ، ایک انوکھا احساس ہے۔ چاہنے والے کی طرف سے تھوڑی سی بے توجہی، ذرا سی بے نیازی بھی انسان کو سخت بے چین کر دیتی ہے۔ تناوش نے اس پر کسی کو ترجیح دی تھی۔ چاہے دوسرے سے اس کے رشتے کی نوعیت کچھ بھی تھی لیکن یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ سب سے آخر میں وہ جوا خانے میں پہنچا تھا۔ وہاں سے نکلا تو گھڑی کی سوئیاں تین کے ہندسے کو چھو رہی تھیں۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے پختہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ تناوش کو قریب نہیں آنے دے گا۔

کار کے مخصوص جگہ پر رکتے ہی وہ نیچے اتر کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دروازے پر نہیں آئی تھی۔

''اب میرے بغیر اسے نیند بھی آ جاتی ہے۔'' وہ غصے میں کھولتا ہوا خواب گاہ کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ شاک کی کیفیت میں کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ سرخ گٹھری کی صورت بیڈ ریسٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ شاید اس کا انتظار کرتے کرتے اسے اونگھ آ گئی تھی۔ ایک دم اس پر حقیقت کا انکشاف ہوا اور اس کا دل ندامت

سے بھر گیا۔

''نہیں آپ خود جائیں اور جلدی لوٹنا.....آپ کے لیے سرپرائز ہے۔'' اس کے کانوں میں تناوش کی بے چینی بھری آواز گونجی۔ یقیناً وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے بھیج کر تیار ہونا چاہتی تھی۔ یوں شوہر کے سامنے تیار ہونے اور شوہر کے آتے ہی تیار بیٹھا ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ بوجھل قدموں سے بیڈ کی طرف بڑھا۔ ایک بار پھر وہ زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس کا دل توڑ بیٹھا تھا۔ اور اب یہ ناممکن تھا کہ وہ اس سے خفا نہ ہوتی۔

اسے بس اونگھ ہی آئی ہوئی تھی۔ کبیر دادا کے بیڈ پر ٹکتے ہی وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔ کبیر دادا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔ چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

''مجھے معاف کردو چندا، ناراضی سے بھرا ہوا گیا تھا اور اب ندامت سے لبریز ہوں۔ تمھارا کسی اور کے لیے فکرمند ہونا چاہے وہ تمھارا بھائی کیوں نہ ہو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اور قسم سے مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا بڑا انعام دینے کے لیے ایسا کہہ رہی تھیں۔ پلیز مجھے معاف کردو۔''

''منہ دکھائی لینے سے پہلے نہ تو میں اپنا چہرہ دکھا سکتی ہوں اور نہ آپ کی بات کا جواب دے سکتی ہوں۔'' تناوش کی آواز میں شامل شوخی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ذرا بھر بھی خفا نہیں تھی۔

''منہ دکھائی۔'' کبیر دادا گڑبڑا گیا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ تجوری کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی پر اس کے پاس ایک پرانا سا چاندی کا چھلا تھا۔

اس کا دایاں ہاتھ تھام کر انگوٹھی والی انگلی میں چھلا ڈالتے ہوئے وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''شاید تمھیں یہ تحفہ اپنے شایان شان نہ لگے، مگر یہ میرے لیے اپنے پاس موجود تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ کیوں کہ یہ میری ماں کی نشانی ہے۔''

''اتنے اونچے مقام کے قابل تو میں نہیں ہوں۔'' تناوش کی جذبات سے بوجھل آواز ابھری۔

''بھول ہے تمھاری۔'' کہتے ہوئے کبیر دادا نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ اس نے نے بے ساختہ نگاہیں

جھکائیں اور پھر پلکوں کی چلمن ہولے ہولے لرزتے ہوئے اٹھی۔ سیاہ آنکھوں کو کاجل کی ڈروی نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ قدرتی گلابی ہونٹوں کو سرخی نے مزید لال کر کے دیکھنے والے کو حواس کھونے کا بہانہ دے دیا تھا۔ اور پھر ناک کا چمکتا کوکا، کانوں میں نگینے جڑے ٹاپس، ماتھے پر بجی بندیا، گلے میں جھولتا سچے موتیوں کا ہار، کلائیوں میں کھنکھناتی کانچ کی چوڑیاں۔ وہ خالی ہاتھ اتنی خطرناک تھی اب تو وہ ہر قسم کے اسلحے سے لیس نظر آ رہی تھی۔ کبیر دادا بس مبہوت ہو کر دیکھتا رہ گیا تھا۔

''اب نظر ہی نہ لگا دینا۔'' کافی دیر تک بھی جب کبیر دادا کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا نہ ہوا تو حیا آلود لہجے میں بول پڑی تھی۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یقیناً میں بہت گناہ گار انسان ہوں اور میرے پلے کوئی نیکی بھی نہیں ہے پھر تم کس حساب میں مجھے ملی ہو۔''

''میں نہیں، آپ مجھے ملے ہیں جناب۔'' شوخی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ کھسکتے ہوئے اس کے قریب ہوئی اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے ہوئے بولی۔ ''کافی دیر کی بیٹھی ہوں، سخت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے میں تو سو رہی ہوں آپ بے شک بیٹھے رہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں تو بقیہ رات اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں گا۔''

وہ جذب کے عالم کہنے لگی۔ ''اور ہاں آپ جو سوچ رہے تھے نا کہ مجھے بھیا یا کوئی اور رشتہ آپ سے زیادہ عزیز ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ امی جان پیاری ہیں اتنی کہ شاید ہی کسی کو اپنی ماں اتنی پیاری ہو لیکن میں جب بھی اپنے دل میں موجود ان کی اور آپ کی محبت کو تولتی ہوں نا تو ہمیشہ آپ والا پلڑا جھک جاتا ہے۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ آپ مجھے پیارے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اپنی تقدیر سے شاکی رہی، خود کو سبز قدم اور بد بخت سمجھتی رہی۔ لیکن جب سے آپ نے محبت کا اعتراف کیا ہے یقین مانیں خود سے خوش قسمت پوری دنیا میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔''

''مگر مجھ سے تو خوش قسمت تو نہیں ہونا۔'' کبیر دادا اس کے چہرے پر جھکتا ہوا بولا۔

''ہوں..... ہوں..... ہوں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے تکرار کرنے لگی۔

اچانک صوفے پر پڑا اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ وہ اس طرف متوجہ ہوا۔

تناوش بولی۔ ''پہلے بھی کافی گھنٹیاں آچکی ہیں مگر میں نے وصول نہیں کیں۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' اس کا سر تکیے پر منتقل کرتا ہوا وہ موبائل فون کی جانب بڑھ گیا۔ بابر حیات کی طرف سے کال کی جارہی تھی۔ کال وصول کرتے ہی وہ بولا۔

''خیر تو ہے بابر صاحب۔''

''بالکل بھی خیر نہیں ہے کبیر دادا، ایس پی ضمیر حسین اوڈھو قتل ہو گیا ہے۔''

''کیا۔'' کبیر دادا حیران رہ گیا تھا۔ ''کب، کیسے اور کچھ پتا چلا کس کا کام ہے؟''

''گیارہ بجے، گولی ماری گئی ہے اور یہ کرنے والے کا نام کبیر دادا معلوم ہوا ہے۔'' بابر حیات نے اطمینان بھرے لہجے میں اس کے سوالوں کی ترتیب سے جواب پیش کیے۔

''ہوش میں ہونا۔'' کبیر دادا کے لہجے میں ناگواری تھی۔

اس کی ناگواری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بابر حیات تفصیل بتانے لگا۔ ''اخلاق حسین شاہ کے دو آدمی کسی کام سے ایس پی کے خفیہ ٹھکانے پر گئے تھے۔ اچانک وہاں کبیر دادا اپنے آدمیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ انھوں نے وہاں پر موجود تمام آدمیوں کو قتل کر دیا۔ بس اخلاق حسین کا ایک آدمی گولی لگنے کے باوجود بچ گیا۔ اور اس نے فوراً اخلاق حسین کو کال کر کے ساری بات بتا دی۔ اخلاق حسین شاہ اپنے آدمیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ ایس پی کو مردہ پا کر اس نے مقامی تھانیدار کو بلا کر آپ کے حملے کو پولیس کا چھاپہ ظاہر کیا۔ چھاپے کی قیادت ایس پی ضمیر حسین کے کھاتے میں ڈالی گئی جو اس کارروائی میں شہید ہو گئے۔ باقی مرنے والے یوں بھی سرکاری آدمی نہیں تھے۔ ایس پی سے متعلق تمام مواد وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ یہ کام کرتے ہی شاہ جی نے تمام گینگز کے بڑوں کو فی الفور شہاب صاحب کے ٹھکانے پر بلایا، سوائے کاشف راجپوت، بہرام پاشا اور آپ کے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ بیٹھک ختم ہوئی ہے۔ جس میں متفقہ طور پر اس مسئلے کے حل کے لیے شمشیر دادا کو بلانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ تمام نے مل کر شمشیر دادا کو کال کی اور ان سے فی الفور پاکستان آنے کی درخواست کی۔ کل شمشیر دادا پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ اور یہ ساری تفصیل بتلانے کا مقصد یہ ہے کہ اپنا کیس اچھے طریقے سے تیار کر لو۔ سارے ثبوت آپ کے

خلاف ہونے کے باوجود جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کو پھنسایا جا رہا ہے۔"

وہ ممنونیت سے بولا۔ "شکریہ بابر، میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"اور ہاں آپ کے خلاف بیان دینے والا زخمی آدمی ابھی تک زندہ ہے۔ اور اسے اخلاق حسین نے کسی مخصوص مقام پر چھپایا ہوا ہے۔ وقت آنے پر وہ اسے پیش کر دے گا۔ اس کے علاوہ آپ کی کال ریکارڈنگ بھی اس کے پاس ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ پولیس والوں کی جب موت آتی ہے تو وہ کبیر دادا سے پنگا لیتے ہیں۔"

"ہونہہ۔" کبیر دادا نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

"کبیر دادا، تمام کو خصوصی ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی بھی اس بیٹھک میں ہونے والا فیصلہ آپ تک نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے یاد رکھنا میری آج آپ سے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

کبیر دادا کی "ٹھیک ہے۔" سنتے ہی اس نے۔ "خدا حافظ۔" کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

موبائل فون کان سے ہٹاتے ہوئے وہ سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ اس ساری کارروائی میں اسے گہری سازش نظر آ رہی تھی۔ اس کی سوچوں میں تناوش کی آواز نے خلل ڈالا۔ وہ اس کے قریب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"خیر تو ہے، پریشان نظر آ رہے ہیں۔"

تناوش کی طرف دیکھتے ہی پریشان کن سوچیں کہیں غائب ہو گئی تھیں۔ سرخ لہنگے میں وہ حوروں کے وجود پر اس کے ایمان کو پختہ کر رہی تھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "جب تم میرے پاس ہو تو پریشانی کی جرات کہ قریب پھٹک سکے۔"

اس مسکراتا دیکھ کر تناوش کھل اٹھی تھی۔ کبیر دادا سارے اندیشوں کو دور جھٹکتا ہوا رب کی عطا کی ہوئی نعمت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

"اسے کہتے ہیں ایک تیر سے کئی شکار کرنا، سانپ کو مار کر لاٹھی نہ ٹوٹنے دینا، آم کھا کر گٹھلیوں کے دام کھرے کرنا اور لاٹھی والے کو بندوق دکھا کر بھینس چھین لینا۔" اخلاق حسین نے مختلف کہاوتوں کو اپنی چال بازی

کے ساتھ جوڑتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

''کوئی شک نہیں شاہ جی کہ آپ تمام گینگز کے سربراہ بننے کے لائق ہیں۔'' نوشاد آفریدی نے اسے سراہا۔

''میں اکیلا نہیں خان صاحب، تم میرا دایاں ہاتھ ہو۔ سچ کہوں تو تمھارے بن میں ادھورا ہی ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تم کبیر دادا پر ایس پی کے قتل کا الزام کیسے دھرو گے۔ یقین مانو ایسی کہانی جوڑی ہے کہ کبیر دادا خود بھی اپنی ذات پر شک کرنا شروع کر دے گا۔''

''اب بس شمشیر دادا کی آمد کا انتظار ہے، دیکھنا کیسے اس کے دماغ میں کبیر دادا کی رکھیل کے بارے غلط فہمی بھرتا ہوں۔ اور کبیر دادا بھی اسی صورت میں اس کے مقابل ہوگا کہ شمشیر دادا اس کی رکھیل پر ہاتھ ڈالے ورنہ تو وہ ہر سزا قبول کرلے گا۔''

نوشاد نے پوچھا۔ ''شمشیر دادا کس وقت تک پہنچ جائے گا؟''

''سمندری راستے سے آرہا ہے، مزید گھنٹا ڈیڑھ لگے گا۔''

''استقبال کے لیے چلنا ہے کہ نہیں۔''

اخلاق حسین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، شہاب قصوری کو سب کچھ سنبھالنے دو۔ ہم بعد میں ملاقات کرلیں گے۔''

نوشاد ندیدے پن سے بولا۔ ''آج کی رات تو سپنوں کی تکمیل کی رات ہے۔ امید ہے کل تک وہ رکھیل اپنے بستر تک پہنچ جائے گی۔''

''ویسے مجھے لگتا ہے پہلے نمبر کے حصول کی کوشش میں اپنے درمیان بھی جھگڑا ہونے والا ہے۔'' اخلاق حسین نے مکروہ لہجے میں ہنسا۔

''قرعہ اندازی شاہ جی، پرچی ڈالیں گے۔'' نوشاد نے فوراً جھگڑے کا حل پیش کیا۔

''اس بارے تو تمھارا دماغ خوب کام کرتا ہے۔''

''صحیح کہا، اس اپسرا کے خواب جانے کب سے دیکھ رہا ہوں۔''

''ویسے کبیر دادا کی موت پر بے چاری دکھی تو ہوگی، پھر شمشیر دادا بھی تو اسے ادھ موا کر کے ہی چھوڑے گا

۔'' اخلاق حسین نے دماغ میں بھری غلاظت اگلی۔

نوشاد فخریہ لہجے میں بولا۔ ''ایک بار خان کی محبت چکھ لی، پھر کسی کبیر دادا کی یاد اس کے دل میں باقی نہیں رہے گی۔ اور جہاں تک شمشیر دادا کا تعلق ہے تو اتنی دور سے آرہا ہے ایسا انعام اس کا حق بنتا ہے۔''

اخلاق حسین ہنسا۔ ''کبیر دادا بھی تو خان ہی ہے۔''

''کل تک ''ہے نہیں''۔ ''تھا'' ہو جائے گا۔'' نوشاد نے دانت پیسے۔

اخلاق حسین نے زوردار قہقہے کے ساتھ اس کی تائید کی تھی۔

''ایک خوف میرے دماغ میں اب تک بقایا ہے۔ کہیں وہ بے غیرت، شمشیر دادا کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک دے اور اپنی رکھیل ایک رات کے لیے اس کے حوالے نہ کر دے۔'' نوشاد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

اخلاق حسین اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ''یقیناً تم کبیر دادا کی فطرت سے ناواقفیت کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہو۔ ہزار مخالفت کے باوجود میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کبیر دادا ایک غیرت مند شخص ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس لڑکی کی محبت میں سرتاپا ڈوبا ہوا ہے۔ اس لیے یہ خیال تو دل سے نکال دو کہ وہ شمشیر دادا کے ڈر کی وجہ سے اپنی چھمک چھلو اس کے حوالے کرنے پر تیار ہوگا۔''

''کبیر دادا کی موت، اس کی چھمک چھلو کا اپنے قبضے میں آنا اور اگلے چند ماہ کے اندر تمام گینگز کی سربراہی پر پیشگی مبارک باد۔'' نوشاد آفریدی نے شراب کا جام ہوا میں بلند کر کے اخلاق حسین کی طرف بڑھایا۔ سامنے سے اخلاق حسین نے بھی اپنا جام اس کے جام سے ٹکرا کر ''خیر مبارک کہا۔'' اور دونوں نے گلاس کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے اخلاق حسین نے کہا۔ ''ایک خاص بات کا خیال ضرور کرنا۔''

''کیا؟'' نوشاد آفریدی نے سوالیہ نظریں اس کی جانب گھمائیں۔ اور اخلاق حسین اسے نئی ہدایات دینے لگا۔ نوشاد اس سے اتفاق کرنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ساری رات وہ گپیں ہانکتے رہے، تناوش کی بھولی بھالی معصوم باتیں، شوخی بھری شرارتیں ناز و ادا اور نخرے

کبیر دادا اس کی باتوں سے سیر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے قصے، کیسے کیسے واقعات اسے یاد آ رہے تھے۔ صبح کی آذان سن کر وہ وضو کرنے غسل خانے کی طرف بڑھی۔ مگر جاتے ہوئے۔ ''میری واپسی تک سونا نہیں۔'' کہہ کر گئی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ پھر اس کے قریب آ گئی۔

''ایک بات کہوں، خفا تو نہیں ہوں گے۔'' ٹھنڈا ہاتھ اس کے گالوں پر پھیرتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

کبیر دادا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہو بھی گیا تو تم نے کون سا خفا رہنے دینا ہے مس مصیبت کہیں کی۔''

مترنم قہقہے سے کبیر دادا کی سماعتوں میں رس گھولتے ہوئے وہ مزید قریب ہوئی اور جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔

''اگر میں کہوں آپ نماز پڑھا کریں۔''

''داڑھی رکھ کر کسی مسجد کی امامت سنبھالنے کے بارے تم کب کہنے والی ہو۔'' مسکراہٹ کبیر دادا کے ہونٹوں کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

''خفا ہو گئے نا۔'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''میرے اعمال کے بارے جانتی ہو نا۔ میں ایک گینگسٹر ہوں، شرابی قاتل اور پتا نہیں کیا کیا۔''

''نماز پھر بھی معاف تو نہیں ہو جاتی کیوں کہ مسلمان بھی تو ہو۔'' وہ بحث پر اتر آئی تھی۔

''تو جب آدمی جرم نہیں چھوڑ سکتا تو نماز کا فائدہ۔''

''نماز پڑھنا ایک مستقل حکم ہے اور جرم ایک علاحدہ مسئلہ۔ کیا کسی عالم سے یہ سنا ہے کہ مجرم کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ نماز پر پہنچنے والا ثواب نہیں ملے گا فرض تو ذمہ سے ساقط ہو جائے گا نا۔''

''کیا مجھے سونے کی اجازت دو گی یا میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں۔'' اس نے ناگواری کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

''اچھا اس بارے سوچنا ضرور۔ باقی آپ کو سلانے کے لیے کنیز موجود ہے نا۔'' مطمئن انداز میں کہتے ہوئے وہ دھیمی انداز میں گنگناتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ پتھر پر پہلی چوٹ لگا چکی تھی اب یہ پتھر کی سختی پر منحصر تھا کہ وہ کتنی چوٹیں سہ پاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ کافی دیر سے جاگے تھے دوپہر کے کھانے کا وقت تھا مگر اس کے باوجود اس نے ناشتے کے لوازمات ہی منگوائے تھے۔ان کے ناشتا کرنے دوران ہی پاشا دستک دے کر اندر آیا۔

''آئیں بھیا ناشتا کریں۔'' اسے دیکھتے ہی تناوش نے دعوت دی۔

''ناشتا کیا میں کھانا بھی کھا چکا ہوں، صرف چائے لوں گا۔'' نشست سنبھالتے ہوئے اس نے تھرماس سے اپنے لیے چائے انڈیلی اور کبیر دادا کی طرف متوجہ ہوا۔''کافی دیر سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔''

''مجھے رات ہی کو پتا چل گیا تھا۔'' پاشا کے انداز ہی سے اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ایس پی کی موت کا بتانے لگا ہے۔

''رات کو آپ کافی دیر سے لوٹے تھے۔''

''ہاں، دن کو کچھ کام رہ گئے تھے لگے ہاتھوں وہ بھی نمٹا دیے۔باقی اسے میں نے قتل نہیں کیا۔''

''جانتا ہوں، میں عظیم وغیرہ سے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا کون ہے؟''

''میری بلا سے کوئی بھی ہو۔'' کبیر دادا نے بے پروائی سے کہا۔

''شمشیر دادا تھوڑی دیر تک کراچی پہنچنے والا ہے۔'' پاشا کا انداز انکشاف کرنے والا تھا۔

ایک دم تناوش کی آنکھوں میں دیو نما حبشی کی شبیہ نمودار ہوئی جسے وڈیو میں کبیر دادا، شمیشر دادا کے نام سے پکار رہا تھا۔

''جانتا ہوں، مگر بلانے والوں کے پاس کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے۔''

''دیکھ لیں، آپ شمشیر دادا کی اکھڑ طبیعت سے تو واقف ہیں نا، اگر انھوں نے پہلے ہی سے اس کے کان بھر دیے تو.....''

''تو کیا ہوگا، دو تھپڑ ہی لگائے گا اور خون بہا ادا کرنے کا کہے گا اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔'' کبیر دادا اس مسئلے کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔

پاشا معنی خیز لہجے میں بولا۔''آپ اصل بات بھول گئے ہیں یا نظر انداز کرنے پر تلے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو۔'' کبیر دادا کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''پیاری بہنا، ایک پیالی کافی کی مل جائے گی۔'' پاشا، تناوش کی طرف متوجہ ہوا جو بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''ابھی لائی بھیا۔'' وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ لیکن اس کے دماغ میں بے چینی ضرور دوڑ گئی تھی۔ اتنی بچی نہیں تھی کہ پاشا کے مقصد کو نہ پہنچتی۔

تناوش کے کمرے سے نکلتے ہی وہ کبیر دادا کو مخاطب ہوا۔ ''اگر شمشیر دادا، تمام کے سامنے آپ کی توہین کرتا ہے، تھپڑ مارتا ہے پٹائی وغیرہ کرتا ہے۔ کیا آپ منہ کھولیں گے؟''

کبیر دادا کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ میرا استاد ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ کو پھینٹی لگا کر وہ چند کروڑ تاوان ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس پر آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟''

''بالکل ہی نہیں۔'' کبیر دادا کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

''تو جن لوگوں نے اتنی بڑی سازش تیار کی، دو سربراہوں کو قتل کرایا۔ کیا ان کا یہی منصوبہ ہوگا کہ شمشیر دادا آئے اور کبیر دادا کی پٹائی کر کے چلا جائے۔ جب کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کبیر دادا کو شمشیر دادا کے تھپڑ کھانے میں کوئی بے عزتی یا توہین کا احساس نہیں ہوتا۔''

کبیر دادا نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''میں تمھاری بات سمجھ نہیں پا رہا۔''

''کیوں کہ آپ کے دماغ میں گڑیا بسی ہے۔ میرے اندیشے بالکل ٹھیک تھے۔ گڑیا کی محبت نے آپ کے دماغ کو کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔''

کبیر دادا بیزاری بھرے لہجے میں بولا۔ ''بکواس نہ کرو یار۔''

''فصیح الدین کی موت کے ساتھ ہی میں نے اس سارے معاملے پر تحقیقات شروع کر دی تھیں۔ وہ واقعی بے قصور تھا۔ اس نے گڑیا کو اغواء نہیں کرایا تھا۔ اور جس نے بھی اغواء کرایا اس کا مقصد آپ کے ہاتھوں فاصی ہتھ چھٹ کو قتل کرانا تھا۔ گڑیا کو وہاں مخصوص نشہ دے کر پہنچایا گیا اور جس وقت فاصی وہاں پہنچا گڑیا اپنے حواسوں ہی

میں نہیں تھی اس بے چارے نے سمجھا کہ ہمیشہ کی طرح کوئی لڑکی وہاں لائی گئی ہے۔ میں نے گڑیا سے پوری تفصیل پوچھی ہے۔ اور اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فصیح الدین کو پھانسا گیا ہے۔ اس کا انداز گڑیا کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنی مرضی سے وہاں گئی ہو۔ پھر آپ اسے قتل کر کے وہاں سے باہر نکل آئے اور جس آدمی نے آپ کو اطلاع دی تھی اسے بھی قتل کر کے وہیں پھینک دیا گیا تا کہ آپ پر الزام لگایا جا سکے۔ اب یہ سوال کہ اس معاملے میں فاصی ہی کو کیوں چنا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شمشیر دادا کا رشتہ دار ہے اور اس کی وجہ سے شمشیر دادا کو زیادہ غصہ آنا تھا۔ اب ایس پی کے قتل کو لے لیں تو اس میں بھی گڑیا کا نام کسی نہ کسی کے حوالے سے آ گیا ہے۔ ایس پی نے گڑیا کی توہین کی کوشش کی اور اپنی عزت خراب کرا بیٹھا۔ لیکن منصوبہ بنانے والوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایس پی ہی کو کھڈے لائن لگا دیا۔"

"مان لیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں نوشاد آفریدی اور اخلاق حسین پیش پیش ہیں۔ لیکن وہ چاہتے کیا ہیں؟"

پاشا نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کی موت۔"

"گویا وہ شمشیر دادا کے ہاتھوں مجھے مروانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔" پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

کبیر دادا نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ "کم از کم اتنا مجھے یقین ہے کہ شمشیر دادا مجھے قتل نہیں کر سکتا۔"

پاشا نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "اگر آپ شمشیر دادا کے ساتھ لڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو کیا ایسا ہونا ناممکن ہو گا؟"

"میں شمشیر دادا کے مقابل آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"درست کہا، لیکن اگر اس نے گڑیا کے ساتھ کچھ ایسا ویسا کرنا چاہا تو آپ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ عورتوں کے بارے شمشیر دادا کی شہرت کتنی خراب ہے یہ بھی آپ جانتے ہوں گے۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ تمام گینگز کے سربراہ ابھی تک گڑیا کو آپ کی بیوی کا درجہ نہیں دیتے۔ اور اس کی وجہ ہے آپ کا شہاب قصوری کے سامنے یہ اعتراف کرنا کہ آپ نے یہ نکاح نظریہ ضرورت کے تحت پڑھایا ہے۔ یعنی نکاح کا مقصد بس گڑیا کو

.....'' آگے کا فقرہ پاشا ادا نہیں کر سکا تھا۔

لمحہ بھر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد کبیر دادا نے پر خیال لہجے میں تجزیہ کیا۔ ''شمشیر دادا، مجھے سزا دینے کے لیے اس سارے مسئلے کی جڑ، یعنی تناوش کا مطالبہ کرے گا۔ میں انکار کر دوں گا اور اس کے بعد دو جمع دو چار کی طرح ساری کہانی واضح ہے۔''

پاشا نے کہا۔ ''آپ حقیقت تک پہنچ گئے ہیں۔''

''حل بتاؤ۔'' کبیر دادا کے چہرے پر چھائی گھمبیرتا اس کی پریشانی کا اعلان کر رہی تھی۔

''بالکل آسان ہے۔ شمشیر دادا کی واپسی تک گڑیا کو منظر عام سے ہٹا دو۔''

''تمھارا دماغ کچھ زیادہ ہی کام نہیں کرنے لگا۔'' کبیر دادا کے چہرے پر موجود پریشانی خوشگوار مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''نوازش۔'' پاشا آداب کہنے کے انداز میں ماتھے کی طرف ہاتھ لے جانے لگا۔

''کہاں بھیجیں؟''

پاشا نے جواب دیا۔ ''کہیں بھی، دو تین محافظ ساتھ بھیج دیں۔ کسی ایسے مقام پر جہاں اسے ڈھونڈا نہ جا سکے۔''

''میرا خیال ہے باقر اور رخسار کو ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ باقر کا تعلق حیدر آباد سے ہے وہیں اس کے گھر دو تین دن رہ لے گی۔''

''اگر گفتگو کا موضوع میں ہوں تو یقیناً میرا جواب نہ میں ہوگا۔'' ٹرے میں کافی کی پیالیاں سجائے اندر آتی تناوش نے کبیر دادا کے الفاظ سن لیے تھے اور جواب دینے میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔

''جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان بیگ میں ڈال کر تیار ہو جاؤ۔ کوئی بحث تکرار نہیں سنوں گا۔ بس دو تین دن کی بات ہے پھر واپس آ جانا۔''

تناوش کی آنکھوں میں نمی ابھری اور وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے رونا شروع کر دینا ہے۔''

پاشا کافی کی پیالی اٹھا کر خواب گاہ سے باہر نکل گیا، یقیناً میاں بیوی تنہائی میں زیادہ کھل کر ایک دوسرے کو

قائل کر سکتے تھے۔

"قریب آؤ۔" کبیر دادا نے اسے پاس بلایا۔

فوراً اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے تناوش نے سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ "آپ کے بغیر میرا ایک پل بھی نہیں گزرتا، دو تین دن کیسے گزریں گے۔"

"تمھارے بنا ہر لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گزرتا ہے میری جان، مگر کبھی کبھی مجبوری کی حالت میں ایسے فیصلے کرنا پڑ جاتے ہیں۔ بس اتنا جان لو کہ تمھارا جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہمارا رشتہ باقی رہنا۔ اب نہ کوئی سوال، نہ تکرار اور نہ رونا دھونا۔ بس چپ چاپ مختصر سا سامان سمیٹو اگلے آدھے گھنٹے میں تم حیدر آباد جا رہی ہو۔"

"کبیر....." درد بھری سسکی تناوش کے منہ سے برآمد ہوئی۔

"کبیر کی جان، اگر تم نے ایک بھی آنسو بہایا تو خفا ہو جاؤں گا۔"

مگر آنسو اختیاری تو نہیں ہوتے کہ وہ روک لیتی۔

کبیر دادا نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ "اچھا پکا وعدہ رہا، جب تم واپس آؤ گی نا تو تمھارے ساتھ نماز پڑھا کروں گا۔"

تناوش کی رونی صورت پر حیرانی بھرا تبسم ابھرا۔ "پانچوں۔"

کبیر دادا نے نفی میں سر ہلایا۔ "جس جس نماز کے وقت تمھارے پاس ہوا بس وہ پڑھوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن رات کو کال پر بھی بات کریں گے۔"

وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "ہاں، ساری رات بات کروں گا۔ مجھے بھی تو نیند نہیں آئے گی اپنی دلھن کے بغیر۔"

اور تناوش گفتگو کا سہارا لیے بغیر دل میں مچلتے جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ اور جذبات کی شدت سے تو کبیر دادا کا دل بھی بھرا تھا۔ محبت کرنے والوں کے لیے سب سے مشکل گھڑی دور جانے کی ہوتی ہے۔ چاہے وہ دوری عارضی ہو یا دائمی۔

گھنٹا بھر بعد وہ ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ کار کی عقبی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ کالج کی یونیفارم میں

تھی۔ بیگ میں اس نے پرانے کپڑوں کے جوڑے ہی رکھے تھے۔ کیوں کہ جس کو دکھانے کے لیے وہ سجنا چاہتی تھی جب وہ ہی پاس نہیں تھا تو سنورے کا کیا فائدہ۔ کمرے سے نکلتے وقت جانے وہ کیا کیا پڑھ کر کبیر دادا پر پھونکتی رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر باقر اور اس کے ساتھ رخسار بیٹھا تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ وہ الٰہی بخش ڈرائیور والی سفید کار ساتھ لے جا رہے تھے۔ کوٹھی سے نکلنے تک کبیر دادا، تناوش کو دیکھتا رہا۔ اس کی سوگوار نظریں بھی کبیر دادا کے چہرے پر گڑی تھیں۔

تناوش کو رخصت کر کے وہ ڈرائینگ روم میں آ بیٹھا۔ پاشا اس کے ساتھ ہی تھا۔ اور پھر وہ وہیں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے جب شہاب قصوری کی گھنٹی آ گئی۔ وہ کبیر دادا کو رات کی دعوت پر مع فیملی مدعو کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ دعوت شمشیر دادا کی آمد پر دی جا رہی تھی۔

وہ خوش باشی سے بولا۔ ”ضرور قصوری صاحب، شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔“

کبیر دادا کے بعد شہاب قصوری کی کال پاشا کو بھی وہیں بیٹھے ملی تھی۔

پاشا کھانستا ہوا نحیف آواز میں بولا۔ ”قصوری صاحب، میں تو موسمی بخار کے قبضے میں ہوں شاید حاضر نہ ہو پاؤں۔ اگر میری معذرت قبول کر لیں تو مہربانی ہو گی۔“

”شمشیر دادا، کسی خاص مقصد سے تشریف لا رہے تھے، بہر حال زیادہ ضرورت پڑی تو آپ کو بعد میں بلوا لیں گے۔“

”شکریہ قصوری صاحب، میں کوشش کروں گا کہ کل صبح شمشیر دادا سے ملاقات کا شرف حاصل کر لوں۔“

اور قصوری نے رابطہ منقطع کر دیا۔ بات ختم ہوتے ہی کبیر دادا نے پوچھا۔ ”بہانہ کیوں کر رہے ہو۔“

”کیوں کہ مجھے آپ کی درگت بنتے دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ نے چپ چاپ شمشیر دادا کے تھپڑ کھاتے رہنا ہے اور میں غصے میں اپنا آدھا خون خشک کر لوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی اور بے وقوفی کر بیٹھوں۔ اور اس دیو کے سامنے آپ بھی آنکھ نہیں اٹھا سکتے میں تو شاید اس کے ایک تھپڑ ہی سے جان بر نہ ہو سکوں۔“

کبیر دادا کھل کھلا کر ہنسا۔ ”کافی سمجھ دار ہو گئے ہو۔“

☆.....☆.....☆

”سارے فساد کی جڑ وہی ہے دادا!.....اسی کی وجہ سے کبیر دادا نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ بلکہ اس کا نام لینے کی وجہ سے تو مجھے اور نوشاد آفریدی کو بھی کبیر دادا کے ہاتھوں بے عزت ہونا پڑا، اپنی رکھیل کو وہ اپنے سر پر چڑھاتا تو کوئی بات نہیں تھی، اس نے تو ہمیں اس کا چاکر سمجھ لیا ہے۔“ اخلاق حسین، فصیح الدین اور ایس پی کے قتل پر روشنی ڈال کر ان حادثات کی وجہ پر روشنی ڈال رہا تھا۔

”ہونہہ!.....“ نرم صوفے میں دھنسے سانڈ کی طرح پلے ہوئے شمشیر دادا نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے وجود سے تین سیٹر صوفہ بھی بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”وہ لڑکی اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی ہے۔ اور لگتا یہی ہے کہ جب تک وہ لڑکی موجود ہوگی کبیر دادا کسی اور کام کے قابل نہیں رہے گا۔“

”گویا اس مسئلے کا حل اس لڑکی کی موت ہے۔“ شمشیر دادا کی آواز بھی اس کے جثے کی طرح بھاری اور پر رعب تھی۔

مارنا ضروری نہیں ہے دادا، بس کبیر دادا سے اسے علاحدہ کر دینا ہی کافی ہوگا۔ شکل وصورت کی اچھی ہے یقیناً چند گھڑیاں آپ کو بھی لطف اندوز کرے گی، اس کے بعد تمام گینگز کے بڑوں کا حق بنتا ہے کہ اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیں۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے ہمیں اتنی تکلیف ہوئی اور آپ کو بھی زحمت دینا پڑی۔

شمشیر دادا نخوت بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیا اس قابل ہے کہ شمشیر دادا اسے اپنی رفاقت کا شرف بخش سکے۔“

اخلاق حسین نے موبائل فون کی سکرین پر تناوش کی تصویر سامنے لائی اور موبائل فون شمشیر دادا کی آنکھوں کے سامنے پکڑ لیا۔ تناوش کی یہ تصویر اس نے اپنے گھر تقریب کی رات بڑی ہوشیاری سے کھینچی تھی۔ تصویر میں وہ سرخ رنگ کا دوپٹا اوڑھے ترچھی آنکھوں سے کسی کو گھور رہی تھی۔ قیمتی موبائل کے طاقت ور کیمرے نے اس کے چہرے کی سرخی وسفیدی کو بھی اصل حالت میں قید کر لیا تھا۔ آنکھوں کی سیاہی اور ہونٹوں کی قدرتی گلابی رنگت نے شمشیر دادا کی آنکھوں میں ہوس کا الاؤ روشن کر دیا تھا۔

”ہونہہ!.....“ اپنا بھینسے جیسا سر اوپر نیچے ہلاتے ہوئے وہ ہوس ناک لہجے میں بولا۔ ”اس کے ساتھ تو

شاید ایک رات بھی کافی نہ ہو۔"

اخلاق حسین کے چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "شاید ساری زندگی فخر کرتی رہے کہ دنیا کے طاقت ور انسان کی رفاقت میں اسے ایک دو راتیں گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔"

"کبیر کو تاکید کر دو کہ اسے ساتھ ہی لائے۔" شمشیر دادا، شہاب قصوری کی طرف متوجہ ہوا۔

شہاب قصوری جلدی سے بولا۔ "بتا دیا ہے دادا۔ اور وہ آپ کو ملنے بھی آیا تھا، میں نے کہہ دیا، دادا اسے رات کو تقریب ہی میں ملیں گے۔"

شمشیر دادا بولا۔ "صحیح کہا۔ اور آج تو اس کی اچھی خبر لوں گا ایک چھوکری کے لیے باؤلا ہوتا پھر رہا ہے کنجر، اسی دن کے لیے اسے تربیت دی تھی کہ لڑکی کے پیچھے پڑ کر اپنے مقصد سے غافل ہو جائے، یہ لڑکیاں تو بس ایک دو رات ہی کے لیے برداشت کی جا سکتی ہیں۔ اور فصیح الدین کے قتل کے بدلے تو اسے کافی جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔"

خاموش بیٹھے نوشاد آفریدی نے لقمہ دیا۔ "دادا، ہمیں اس لڑکی یا کبیر دادا سے کوئی غرض نہیں، مگر کبیر دادا اس کی وجہ سے ہمارے کام میں بھی رخنہ انداز ہو رہا ہے۔ آج ہم یک جا اور مضبوط ہیں، اگر کبیر دادا کو فوراً لگام نہ ڈالی گئی تو سخت انتشار پھیل جائے گا۔ اور وہ سلطنت جس کی بنیاد آپ نے رکھی تھی منتشر اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔"

"فکر نہ کرو، اس کے بعد رخنہ انداز نہیں ہوگا۔ اسے اور اس کی رکھیل کو ایسا سبق پڑھا کر جاؤں گا کہ جو اتنی جلدی نہیں بھولا کرتا۔" شمشیر دادا کی بات پر اخلاق حسین اور نوشاد آفریدی کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ انھیں اپنی منزل بالکل قریب دکھائی دے رہی تھی۔

شہاب قصوری البتہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"دادا نے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔" کبیر دادا، پاشا کو مخاطب تھا۔ شہاب قصوری کی کوٹھی سے مڑ کر وہ سیدھا گھر ہی آیا تھا۔

پاشا نے خیال ظاہر کیا۔ ”وہ آپ پر سخت غصہ ہے اور ابھی ملنے میں یقیناً اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا اندیشہ تھا۔ جب کہ وہ تمام کے سامنے آپ کو سرزنش کرنا چاہتا ہے۔“

”چلو جتنا غصہ ہے اتارنے دو، ٹھنڈا ہونے کے بعد میں انھیں اصل بات بتا دوں گا۔ باقی مخالفین کی چال کا توڑ ہم یوں بھی کر چکے ہیں۔“

”گڑیا کے بارے پوچھنے پر کیا جواب دو گے؟“

”کر دوں گا کوئی بہانہ۔“ کبیر دادا کے لہجے میں اطمینان بھرا تھا۔ اگر تناوش محفوظ تھی تو اسے کوئی غم اور دکھ نہیں تھا۔ شمشیر دادا کے تھپڑ مکوں کا وہ یوں بھی عادی تھا۔

”کاشف دادا سے بات ہوئی تھی۔ انھیں میں نے تفصیلاً سارا قصہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے بھی گڑیا کو منظر سے ہٹانے کے فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔“

”ویسے تم، تناوش میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی نہیں لینے لگے۔ وہ پگلی بھی ہر وقت بھیا بھیا کرتی رہتی ہے۔“

”سچ کہوں تو مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ زبردستی بہن بن گئی اور کوئی ایسا منتر پڑھ کر پھونکا کہ لگتا ہے ماں جائی ہے۔ راحت خالہ تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہے۔ اور امید یہی ہے دو تین ماہ کے اندر اس گھر میں آپ سے زیادہ اس کا حکم مانا جائے گا اور وہ بھی بغیر ناگواری اور کوفت ظاہر کیے۔“

”وہ ایسی ہی ہے یار۔“ کبیر دادا کی آنکھوں میں تناوش کا معصوم چہرہ لہرانے لگا۔ ”مجھ سے تو اب اس کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں کیا جاتا۔ تمھاری بے غیرتی کی وجہ سے جو دو راتیں مجھ پر قیامت بن کر گزریں وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ اسے بے وفا، خود غرض اور دھوکے باز سمجھنے کے باوجود وہ اتنی ہی پیاری، اتنی ہی عزیز اور اتنی ہی اپنی لگ رہی تھی جتنا کہ پہلے تھی۔ وہ بھلی سی کہاوت ہے نا کہ کسی کے چلے جانے کے بعد اس کی اہمیت کا پتا چلتا ہے یا مر جانے کے بعد۔ تو یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔“

پاشا ہنسا۔ ”ویسے میری بہنا کہہ تو رہی تھی کہ میرے لیے خود کوئی لڑکی ڈھونڈے گی۔ اب پتا نہیں کب اپنے کہے پر عمل کرتی ہے۔“

کبیر دادا نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”رخسانہ بنتِ شہاب قصوری کا کیا ہوگا۔ بے چاری ہر تقریب میں

تمھارے آگے پیچھے پھر رہی ہوتی ہے۔"

"وہی جو فرحانہ بنت شاہ جی کا ہوا ہے۔اس نے تو اب تک ہمت نہیں ہاری۔نوشاد آفریدی کے گھر تقریب میں بار بار آپ کے بارے پوچھ رہی تھی۔آپ کی نسبت سے میں تو اسے کہتا بھی فرحانہ بھابی ہوں۔"

کبیر دادا مظلومانہ لہجے میں بولا۔"یقیناً تم اپنی بہن کے ہاتھوں میرا قتل کرانا چاہتے ہو۔"

اس کی بات پر پاشا کھل کھلا کر بولا۔"ویسے دادا، بڑی حیرانی ہوتی ہے جب وہ چھوٹی سی لڑکی کہتی ہے نا ،بات سنیں کبیر۔"

"جانتے ہو، وہ پہلے دن سے کبیر کہہ رہی ہے۔اور پہلے ہی دن سے اس کا رویہ ایسا ہے گویا ہم نے محبت کی شادی کی ہو۔نہ تو میرے غصے کو کوئی اہمیت دیتی تھی اور نہ ڈانٹنے کو۔البتہ چھوڑ دینے کی دھمکی پر اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان ذرا تھم جاتی تھی۔" کبیر دادا کے ہونٹوں پر تناوش کی شوخیوں اور شرارتوں بھری یاد خوب صورت مسکان لے آئی تھی۔"اور اس کی خدمت۔سچ کہوں تو اپنی ماں اور باجی کے بعد یہ پہلی ہستی ہے جو میرے کام اتنی محبت اور خوش دلی سے کرتی ہے۔میرے کھانے، پینے، پہننے، سونے، جاگنے ہر کام پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔گو میرے پاس ملازموں کی کمی نہیں تھی۔مگر اس کی طرح خدمت درجن بھر ملازم بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ابھی جا کر میرے لباس دیکھو کس نفاست سے دھلے اور ترتیب سے لٹکے ہوئے ہیں۔جرابیں تک دھلی دھلائی خوشبو میں بسی ہوئی ملیں گی۔اور جانتے ہو ٹائی باندھنا کبھی بھی مشکل یا دقت طلب نہیں۔ایک ہی تو گرہ لگائی جاتی ہے۔لیکن جب کوئی محبت سے تمھارے کالر سیدھے کر کے ٹائی کی گرہ لگائے۔کالروں کو دہرا کرے اور ڈھیر ساری دعائیں پڑھ کر چھاتی اور چہرے پر پھونک مارے تو انسان خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگتا ہے۔"

"دادا بس کریں یار، مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میری ساحرہ بہن نے آپ کو کسی قابل نہیں رکھا۔"

"وہ انمول ہے پاشا۔نہ جانے وہ کون سی خوش قسمت گھڑی تھی جب اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔مجھے خواب گاہ سے بلا کر اعتماد بھرے انداز میں معاہدہ کیا تھا۔اور جو دعویٰ کر کے گئی تھی اس پر ایک سو ایک فیصد پورا اتری۔"

پاشا نے گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب اٹھ جائیں تقریب میں جانے کی تیاری نہیں کرنا۔“ اور کبیر دادا سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔☆

☆.....☆.....☆

تقریب کا اہتمام کوٹھی کی اندرونی عمارت کے داخلی دروازے سے ملحق بڑے ہال میں کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ خصوصی تقریب تھی اس لیے اس میں مخصوص افراد ہی شامل ہوئے تھے۔ تمام گینگز کے بڑے اور ان کے گھر والے۔ کبیر دادا کو اکیلا دیکھ کر شہاب قصوری نے حیرت سے پوچھا۔

”بھابی نظر نہیں آ رہیں۔“

”کوئی کام تھا۔“ مجمل جواب دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ شمشیر دادا کے علاوہ سارے پہنچ گئے تھے۔ فرحانہ اخلاق حسب عادت کبیر دادا کو دیکھتے ہی اس کے قریب پہنچ گئی۔ ”آ گئے ہیں آپ۔“

”کیسی ہیں مس فرحانہ۔“ خوش دلی سے اس کے مصافحے والے ہاتھ کو تھامتے ہوئے اس نے کاشف کے ساتھ نشست سنبھال لی تھی۔

فرحانہ نے کہا۔ ”بالکل ٹھیک ہوں کبیر صاحب، آپ کی نئی نویلی دلھن نظر نہیں آ رہی۔“

”کیوں کہ پرانی ہو گئی ہے نا۔“ کبیر دادا نے قہقہہ لگایا۔ کاشف راجپوت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

فرحانہ معنی خیز لہجے میں کہنے لگی۔ ”تو کوئی نئی ڈھونڈ لیں۔“

کبیر دادا ترکی بہ ترکی بولا۔ ”پہلے والی کے مقدموں سے تو فارغ ہو لوں۔“ کاشف، کم گو کبیر دادا کو یوں بولتے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ تناوش کا ساتھ اس میں بتدریج تبدیلیاں لا رہا تھا۔

فرحانہ کھل کھلاتے ہوئے بولی۔ ”جلدی ختم کریں یہ مقدمے بازیاں کوئی بڑی شدت سے آپ کی فراغت کا منتظر ہے، یہ نہ ہو مایوس ہو جائے۔“

کبیر دادا خوش دلی سے بولا۔ ”کوشش کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔“

”اپنا تو دعاؤں سے اعتبار ہی اٹھنے لگا ہے۔“ فرحانہ نے مایوس لہجے میں کہا۔ ”بہر حال پھر سے کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔“

اسی وقت شمشیر دادا کی آمد ہوئی۔ ساڑھے چھے فٹ قد اور گینڈے کی طرح مضبوط جسم، وہ ڈبلیو، ڈبلیو، ای کا کوئی ریسلر لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تمام کھڑے ہو گئے تھے۔

سب سے بے نیاز وہ کبیر دادا کی طرف بڑھا۔ کبیر دادا بھی جلدی سے ہاتھ ملانے کے لیے اس کے قریب پہنچا مگر یہ قربت اسے مہنگی پڑی تھی۔ شمشیر دادا کا ہاتھ گھوما، چہرے پر پڑنے والے زوردار تھپڑ نے کبیر دادا کو چند دو گز دور اچھال دیا تھا۔

"بے غیرت، کنجر!..... کہاں ہے وہ رنڈی؟" شمشیر دادا غصے میں دھاڑا۔

"دادا، میری بات تو سنیں، صفائی کا موقع تو دیں مجھے۔" کبیر دادا اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے پھر اس کے قریب ہوا۔ لیکن اگلے تھپڑ نے اسے دوبارہ پیچھے اچھال دیا تھا۔

"دیتا ہوں موقع، پہلے اس فاحشہ کو سامنے لاؤ۔"

"وہ میری بیوی ہے دادا۔" کبیر دادا نے اٹھتے ہوئے اعتراض کیا۔

شمشیر دادا نے ایک ہاتھ اس کے گریبان میں ڈال کر اوپر اٹھایا اور دور پھینکتے ہوئے بولا۔ "بیوی نہیں رکھیل بولو۔"

"وہ کراچی میں نہیں ہے دادا، شہر سے باہر گئی ہے۔" اس مرتبہ کبیر دادا اس کے نزدیک ہونے کے بجائے دور رک گیا تھا۔

شمشیر دادا دھاڑا۔ "جب میں نے کہا تھا کہ اسے ساتھ لے کر آؤ گے پھر کیوں کہیں بھیجا ہے؟"

"کوئی مجبوری پیش آ گئی تھی دادا۔" شمشیر دادا کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر کبیر دادا الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا

"اسے فی الفور واپس بلاؤ۔" شمشیر دادا نے حکم دیا۔

"معذرت خواہ ہوں دادا، آپ نے جو سزا دینا ہے میں حاضر ہوں، مگر وہ نہیں آ سکتی۔ کم از کم آپ کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" شمشیر دادا نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے پھر ایک ہی ہاتھ سے اسے سر سے بلند کر لیا۔ "اسے لاتے ہو یا توڑوں گردن۔"

کبیر دادا پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ”توڑ دو دادا، وہ نہیں آئے گی۔“

الٹے ہاتھ کے دو تھپڑ اس کے چہرے پر جڑتے ہوئے شمشیر دادا نے اسے دوبارہ دور پھینک دیا۔ باچھوں سے رستا خون صاف کر کے کبیر دادا کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا تھوڑی دیر تک شمشیر دادا کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا اور اس کے بعد اس نے فوراً کبیر دادا کو معاف کر دینا تھا۔

باقی تمام چپ چاپ کھڑے ان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ فرحانہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شمشیر دادا کو کچا چبا ڈالتی۔ البتہ، فصیح الدین کی بیوی کرن، ایس پی کی بیوی سلطانہ اور بیٹی ہانیہ بڑے شوق سے کبیر دادا کی پٹائی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔

”تو تم نے نہیں بلانا۔“ شمشیر دادا کا غصہ سوا ہونے لگا۔

”وہ یہیں پر ہے شمشیر دادا۔“ یہ آواز نوشاد آفریدی کی تھی۔ ”آپ کی اجازت ہو تو اسے بلا لیتے ہیں۔“

”کہاں ہے۔“ شمشیر دادا نوشاد کی طرف مڑا۔

”لے آؤ اسے۔“ نوشاد آفریدی نے پکار کر کسی کو آواز دی۔ اسی وقت اندرونی کمرے سے ڈری سہمی تناوش برآمد ہوئی اس کے عقب میں دو مسلح افراد چل رہے تھے۔ کالج کی یونیفارم میں وہ چھوٹی سی لڑکی ہی نظر آ رہی تھی۔ سر پر اوڑھے ہوئے دوپٹے میں اس کا پرکشش چہرہ یوں دمک رہا تھا جیسے چودھویں کے چاند کے گرد بادلوں نے گھیرا ڈالا ہو۔ کبیر دادا پر نگاہ پڑتے ہی اس کے بے چین چہرے پر جیسے سکون اتر آیا تھا۔ ہر قسم کا ڈر اور خوف اس کے دل سے نکل گیا تھا، مگر کبیر دادا تو گویا ”کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔“ کی زندہ مثال بنا کھڑا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھی نہیں جھکڑ چل رہے تھے۔ اس کی ترکیب کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے اخلاق حسین نے کہا۔ ”ایک خاص بات کا خیال ضرور کرنا۔“

”کیا؟“ نوشاد آفریدی نے سوالیہ نظریں اس کی جانب گھمائیں۔

”اگر کبیر دادا میں ذرا بھی عقل ہوئی تو وہ اپنی رکھیل کو منظر سے غائب کر دے گا۔“

”کیا.....“ نوشاد آفریدی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اس طرح تو سارا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔“

''بالکل۔'' اخلاق حسین نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''اس کا مطلب ساری محنت ضائع گئی۔''

''محنت تو خیر میں ضائع نہیں جانے دیتا، بس تم نے ایک کام کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' نوشاد کے لہجے میں اشتیاق بھرا تھا۔

''جونہی وہ اسے کہیں بھیجنے کی کوشش کرے تم اسے رستے سے اغواء کر لینا۔''

نوشاد استہزائی لہجے میں بولا۔ ''اچھا مشورہ ہے، میں بالکل ایسے ہی کرتا اگر مجھے فاصی کا انجام بھول گیا ہوتا۔''

''یار میں تمھارے ساتھ ہوں۔''

''تو پھر دونوں کا وہی انجام ہوگا۔'' نوشاد آفریدی کے دل میں چھپا، کبیر دادا کا ڈر ہونٹوں تک پہنچ گیا تھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ شمشیر دادا یہاں موجود ہے اور ابھی موقع ہے من مانی کرنے کا۔ باقی ہم اسے اغواء کر کے عزت و احترام ہی سے رکھیں گے۔ اور رات کو شمشیر دادا کے سامنے پیش کر دیں گے۔ پھر کبیر جانے اور اس کا استاد شمشیر۔'' اخلاق حسین نے اسے حوصلہ دیا۔

''کیا پتا اسے اب تک کہیں بھیج دیا گیا ہو۔'' نوشاد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں خان صاحب مسلسل نگرانی کرا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں اپنے دس بارہ آدمیوں کو تیاری کا حکم دے دیتا ہوں۔'' نوشاد آفریدی طوعاً و کرہاً مان گیا تھا۔

اخلاق حسین غلیظ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے ساری تیاری مکمل کر لو سہ پہر کو شمشیر دادا کو ملنے جائیں گے۔ ابھی تک اس کے دل میں بھی چھمک چھلو کے حصول کی تمنا ابھارتی ہے۔''

''سالا کمینہ، تصویر دیکھتے ہی لٹو ہو جائے گا۔'' نوشاد نے شمشیر دادا کے خلاف دل میں موجود زہر اگلا۔

اخلاق حسین نے کہا۔ ''اور یہی ہم چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تھوڑی دیر بعد ملتے ہیں۔'' نوشاد آفریدی موبائل فون نکال کر اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات

دینے لگا۔

اخلاق حسین نے جاتے جاتے مشورہ دیا۔ ”ایس پی ضمیر حسین کے چند قریبی پولیس والوں کو بھی اس کام میں اپنے ساتھ رکھ لو آسانی رہے گی۔“

نوشاد نے فقط سر ہلا کر اس کی تائید کی اور موبائل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

روزانہ وہ کبیر دادا کو رخصت ہوتے دیکھا کرتی تھی آج کبیر دادا کار سے باہر کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا ۔وہ بھی دروازے تک حسرت بھری نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھتی رہی۔ جونہی کار دروازے سے باہر نکلی آنکھوں میں روکی ہوئی نمی باہر چھلک پڑی۔ جہاں کبیر دادا سے دور جانے کا غم اس کا دل چیر رہا تھا وہیں کسی انجانے خطرے سے وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔ جس طرح پاشا نے اسے بہانے سے کافی بنانے کے لیے بھیج دیا تھا، وہ اسے احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ کوئی ایسی بات تھی جو کبیر دادا کے چہرے پر بھی پریشانی پیدا کر سکتی تھی۔ رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں اس دیو نما حبشی کی تصویر ابھر آتی جسے اس نے وڈیو میں کبیر دادا کے ہمراہ دیکھا تھا۔ یقیناً وہ مکرانی قوم کا تھا تبھی تو اس کا رنگ اس قدر کالا تھا۔ گھر سے تھوڑی دور آتے ہی اس کا دل بے اختیار کبیر دادا سے بات کرنے کو کرنے لگا۔ مگر اپنا ارادہ موخر کرتی ہوئی وہ ایئر فون لگا کر کبیر دادا کی وڈیوز دیکھنے لگی۔ اب تو اس کے پاس اچھا موبائل فون موجود تھا اس نے اپنی اور کبیر دادا کی کافی ساری وڈیوز اور تصاویر جمع کر لی تھیں۔ وہ وڈیوز میں دیکھنے میں منہمک تھی کہ اچانک کار رک گئی۔ اس نے سکرین سے سر اٹھا کر دیکھا، پولیس کا ناکا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

دو باوردی سپاہی قریب آئے ایک ڈرائیور سیٹ کی طرف گھوما اور دوسرا رخسار والی جانب شیشے کے قریب ہوا ”ہم کبیر دادا.....“ رخسار تعارف کرا ہی رہا تھا کہ دونوں پولیس والوں نے ہاتھ میں پکڑی رائفلیں ایک ساتھ باقر اور رخسار کے سر سے لگا دیں۔

ان میں سے ایک سفاک لہجے میں بولا۔ ”ذرا سی حرکت کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تمھیں زندہ رکھنے کے بارے ہمیں کوئی ہدایت نہیں ملی ہے۔“

''کون ہو تم، جانتے بھی ہو کس سے پنگا لے رہے ہو۔'' باقر نے انھیں ڈرانا چاہا۔

''ہم تو جانتے ہیں، تمھیں نہیں معلوم۔'' پولیس والے کا لہجہ استہزائی تھا۔

''کبیر دادا کی بیوی کو روکنے کی جرات کی ہے تم لوگوں نے۔''

''کبیر دادا سے شمشیر دادا خود نبٹ لے گا۔'' ایک ہی پولیس والا بول رہا تھا۔

اسی دوران وہاں کالے شیشوں والی ایک کار آرکی، اس میں سے دو ہتھیار بردار باہر نکلے ایک عقبی نشست کا دروازہ کھول کر تناوش کو کہنے لگا۔ ''مسز کبیر، آپ کو اس کار میں بیٹھنا پڑے گا۔''

''کک..... کون ہیں آپ لوگ؟'' تناوش گھبرا گئی تھی کہ اس سے پہلے بھی وہ دو مرتبہ اغواء ہو چکی تھی اور وہ تجربہ اس کے لیے کوئی اچھا نہیں رہا تھا۔

وہ آدمی اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''دشمن نہیں ہیں اور نہ آپ کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔''

''پپ..... پلیز ہمیں جانے دیں۔'' وہ ہکلا گئی تھی۔

''مسز کبیر، پکا وعدہ آپ کو کوئی انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ اور یہ بھی وعدہ کہ ہم آپ کو کبیر دادا کے پاس ہی لے کے جائیں گے۔''

وہ لرزتی کانپتی کار سے اتر کر دوسری کار میں بیٹھ گئی۔ عقبی نشست پر اس کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''مسز کبیر، اپنا موبائل فون بند کر کے میرے حوالے کر دو بعد میں واپس مل جائے گا۔''

تناوش کے پاس اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس سے موبائل فون لے کر وہ پولیس والوں کو بولا۔ ''ان دونوں کو دس بجے تک حوالات میں رکھنا اور پھر چھوڑ دینا۔ چائے پانی کا بھی پوچھ لینا تھوڑے گھبرائے ہوئے ہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے عقب میں دو گاڑیاں اور بھی روانہ ہو گئی تھیں جن میں یقیناً انھی کے ساتھی سوار تھے۔

☆.....☆.....☆

''تو یہ ہے وہ، جس کی وجہ سے اپنا برخوردار پاگل ہوا پھر رہا ہے۔'' تناوش کو دیکھتے ہی شمشیر دادا نے پر ہوس

انداز میں بھدے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

کبیر دادا تھوک نگلتا ہوا بولا۔ ''دادا، یہ میری بیوی ہے۔''

''میں نے تو کچھ اور سنا ہے۔'' شمشیر دادا منہ بناتے ہوئے شہاب قصوری کی طرف مڑا۔ ''کیا کہا تھا کبیر نے اس کے بارے۔''

شہاب قصوری بغیر لگی لپٹے رکھے بولا۔ ''یہی کہ نکاح بس خانہ پری کے لیے ہے اور کبیر دادا لڑکی کو چند دن پاس رکھ کر واپس بھیج دے گا۔''

''کیا کہتے ہو کبیر، تمھارے چند دن کب تک گزریں گے۔ کسی اور کو بھی موقع دو گے یا ایک فاحشہ کے لیے قتل پر قتل کرتے جاؤ گے۔''

''میں نے ایس پی کو قتل نہیں کیا دادا۔'' کبیر دادا خود کو سخت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

''باقی سارے جھوٹ کہہ رہے ہیں۔'' شمشیر دادا نے صوفے پر نشست سنبھالی۔ اس کی پرہوس نگاہیں بار بار تناوش کی طرف اٹھ جاتیں جو وارفتگی سے کبیر دادا کو گھور رہی تھی۔ جبکہ فرحانہ کے غصے کا ہدف شمشیر دادا کے بجائے تناوش کا وجود ہو گیا تھا۔

شمشیر دادا کے بیٹھتے ہی باقی تمام بھی بیٹھ گئے تھے۔ صرف کبیر دادا مجرموں کے انداز میں کھڑا تھا اور تناوش جو کبیر دادا کو دیکھ کر اپنے دل سے سارے اندیشے اور خطرے نکال چکی تھی۔

''چلو ایس پی کا مسئلہ بعد میں زیر غور لاتے ہیں پہلے یہ بتا فاصی کو کیوں قتل کیا؟'' شمشیر دادا نے باقاعدہ مقدمہ چلانا شروع کر دیا۔

کبیر دادا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ''وجہ آپ کو معلوم ہے دادا۔''

''یہ ہے وجہ.....'' شمشیر دادا نے تناوش کی طرف اشارہ کیا۔

''دادا، اگر فاصی میری عزت کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں چپ تو نہیں بیٹھ سکتا۔''

''بند کرو بکواس۔'' شمشیر دادا دھاڑا۔ ''تمھاری عزت کو تو آج میں وہ عزت دوں گا کہ اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

”دادا، میری بیوی بے قصور ہے، یہ سارا کیا دھرا میرا ہے، آپ بے شک میرے لیے سزا تجویز کر سکتے ہیں۔“

”یاد ہے تم نے نوشاد کی رکھیل کو اٹھا کر تین دن تک اپنے پاس رکھا تھا۔“ شمشیر دادا نے اسے یاد دہانی کرائی

کبیر دادا جلدی سے بولا۔ ”اٹھایا نہیں تھا، وہ خود میرے پاس آئی تھی۔“

”تو یہ بھی تو خود چل کر فاصی کے پاس گئی تھی۔ اگر اس کے اغواء ہونے کا کوئی ثبوت ہے تمھارے پاس تو پیش کرو۔“

”میری بیوی جھوٹ تو نہیں کہے گی۔“ کبیر دادا گڑبڑا گیا تھا۔

شمشیر دادا زہر خند لہجے میں بولا۔ ”جو عورت کسی غیر مرد کے پاس چل کر جائے گی کیا وہ اپنے شوہر کے سامنے اقرار کرلے گی کہ ہاں وہ اپنی مرضی سے منہ کالا کرانے گئی تھی۔“

”مجھے گھر سے زبردستی لے گئے تھے۔“ اچانک تناوش کی گلوگیر آواز ابھری۔ ”میں قسم کھاتی ہوں میں کسی کے ساتھ مرضی سے نہیں گئی تھی۔“

”ہاہاہا۔“ شمشیر دادا کا قہقہہ ابھرا۔ ”یہ تو بولتی بھی ہے، میں نے سوچا صرف ناز دادا کے جلوے ہی دکھاتی ہو گی۔“

کبیر دادا تناوش کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے شمشیر دادا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ سچ کہہ رہی ہے دادا ،جس وقت میں فاصی کے بنگلے پر پہنچا وہ اس کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ اور اس بات کی گواہی میرے محافظ ،امتیاز، عظیم اور بخش بھی دیں گے۔“

شمشیر دادا بے پروائی سے بولا۔ ”تمھارے ملازموں کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”اگر یہ فاصی کے پاس اپنی مرضی سے گئی تھی تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ بدکردار ہے اور ایسی عورتیں کسی ایک پر اکتفا نہیں کرتیں، اسے فاصی کے علاوہ بھی تو کسی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ صرف فاصی ہی تو یوسف ثانی نہیں تھا۔“

”کبیر دادا کی رکھیل بننے سے پہلے یہ میرے آدمی دلاور شیخ کی رکھیل تھی۔ اور اس کی وساطت سے یہ

میرے گینگ کے قریباً درجن بھر آدمیوں کو تو نواز چکی تھی۔ بلکہ جس دن کبیر دادا نے اسے اپنی رکھیل بنایا اس رات بھی یہ میرے ایک اور آدمی خاور شیخ کے گھر موجود تھی۔ اسے وہیں سے پکڑ کر کبیر دادا گھر لے کے آیا تھا۔ اور اس فاحشہ کا غصہ اس نے بے چارے خاور شیخ پر نکالا اور اسے قتل کر دیا۔" اخلاق حسین نے جھوٹ گھڑتے ہوئے بہتانات کا طومار لگا دیا تھا۔

"جھوٹ بول رہا ہے، الزام لگا رہا ہے۔ اسے اللہ پاک کا بھی خوف نہیں ہے۔" تناوش رو پڑی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بھری محفل میں اس کی ذات پر اتنے گھناؤنے الزامات لگائے جائیں گے۔

اسے روتے دیکھ کر کبیر دادا تڑپ اٹھا تھا۔ بے اختیار وہ اس کے قریب ہوا۔ "روتے نہیں ہیں چندا، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں ہوں نا تمھاری پاکیزگی اور عصمت کی گواہی دینے والا۔" دبے لہجے میں اسے تسلی دیتے ہوئے کبیر دادا جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

فرحانہ یہ منظر دیکھ کر جل بھن گئی تھی۔

شمشیر دادا طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کبیر، تمھارا یہ عمل ثابت کر رہا ہے کہ ان لوگوں کی بات بالکل درست ہے، تم اس خوب صورت فاحشہ کے مکمل بس میں ہو اور یہ تمھیں اپنی مرضی سے چلاتی ہے۔"

کبیر دادا پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "دادا، یہ میری بیوی ہے، اسے نکاح پڑھا کر گھر لایا ہوں، اس کی عزت کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے اور میں ذمہ داریوں سے آنکھیں نہیں چرایا کرتا۔"

"اچھے مکالمے بول لیتے ہو مگر تمھیں یہ بھول گیا ہے کہ اس پر دو گروپوں کے بڑوں کے قتل کا الزام ہے۔ گو اس نے خود قتل نہیں کیا مگر اس کی وجہ سے قتل ہوئے ہیں اور اس کا حساب کتاب تو اسے دینا پڑے گا۔"

"فاصی کو میں نے قتل کیا ہے اور اگر آپ بہ ضد ہو کہ ایس پی کو بھی میں نے مارا ہے تو اصولاً مجھے سزا دینا بنتا ہے۔ آپ سزا کا اعلان کریں مجھے بغیر سنے ہر سزا قبول ہے۔ لیکن میری بیوی کو جانے دیا جائے۔"

"یہ لڑکی آج کی رات میرے ساتھ ہو گی اور اس کے بعد ایک ایک رات ہر گینگ کے بڑے کے ساتھ گزارے گی۔ تمام کو بھگتانے کے بعد اگر تم اسے رکھنا چاہو تو مرضی ورنہ کوئی نہ کوئی اسے رکھیل بنا ہی لے گا۔ ایس پی اور فاصی کی بیگمات کو پندرہ پندرہ کروڑ ہرجانہ دو گے اور ہاتھ باندھ کر ان سے معافی مانگو گے۔" شمشیر دادا نے

سزا کا اعلان کیا۔

''آپ زیادتی کر رہے ہیں دادا، میری بیوی سزا کا حصہ نہیں بنے گی۔ میں پندرہ کے بجائے بیس بیس کروڑ دونوں بیواؤں کو دوں گا۔ معافی بھی مانگوں گا، مگر میری بیوی کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔''

''تم میرے فیصلے سے انحراف کر رہے ہو کبیر۔'' شمشیر دادا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''ہاں، کیوں کہ آپ زیادتی کر رہے ہیں میرے ساتھ۔''

شمشیر دادا دھاڑا۔ ''تمھارے باغیانہ رویے کے پیچھے بھی اسی فاحشہ کا ہاتھ ہے اور اب تو میں اسے بالکل بھی معاف نہیں کر سکتا۔''

''میری زندگی میں تو اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' کبیر دادا کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

اخلاق حسین نے ساتھ بیٹھے نوشاد کے کان میں سرگوشی کی۔ ''کہا تھا نا یہ خبیث باؤلا ہوا ہے اس فاحشہ کے پیچھے۔''

''تم اپنے حواس میں نہیں لگتے۔'' شمشیر دادا کے لہجے میں غصے سے زیادہ حیرانی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبیر کسی لڑکی کی وجہ سے اسے یوں بھی مخاطب ہو سکتا ہے

''دادا، سزا کا حق دار میں ہوں، یہ معصوم نہیں۔ یہ پانچ وقت کی نمازی ہے، کیا آپ کو اس کے حلیے سے لگتا ہے کہ یہ اتنی گری ہوئی حرکت کرے گی۔ یہ بے چاری تو یہاں بیٹھے ہوئے افراد میں کسی کو جانتی تک نہیں۔ باقی اخلاق حسین کی بکواس کے بارے میں یہی کہوں گا کہ بیوی کی پارسائی کا گواہ اس کا شوہر ہوتا ہے اور میں اپنی بیوی کی پارسائی کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''مجھے مکالمہ بازی نہیں جواب چاہیے۔'' شمشیر دادا پر اس کی بات کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی تناوش کو دیکھنے کے بعد شمشیر دادا کے اندر کا شیطان جاگ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

''تو جواب یہ ہے شمشیر دادا کہ آپ کو ہمارے مسئلے میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ ہمارے انڈیا سے آئے ہوئے مہمان ہیں۔ یہاں سے جاتے وقت آپ شہاب قصوری کو بڑا بنا گئے تھے۔ آپ آج ہماری مہمان نوازی

سے لطف اندوز ہوں آپ کے جانے کے بعد اس معاملے کا فیصلہ شہاب قصوری صاحب کرے گا۔"

"ہاہاہا۔" شمشیر دادا کے منہ سے قہقہہ برآمد ہوا۔ "ہماری بلی ہمی کو میاؤں۔"

"دادا، کیا میری بات اصولاً غلط ہے۔" کبیر دادا حجت بازی پر اتر آیا۔

"بالکل بھی نہیں۔" شمشیر دادا طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم صحیح بکواس کر رہے ہو۔ باقی تم لوگوں سے تعلق جوڑنا کون سا مشکل ہے۔" یہ کہتے ہی وہ شہاب قصوری کی طرف متوجہ ہوا۔

"شہاب قصوری!..... میں تم سے تمام گینگز کی سربراہی لینے کے لیے مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ تم میدان میں آکر اپنے عہدے کا دفاع کر سکتے ہو۔"

شہاب قصوری نے کھڑے ہو کر سر جھکایا۔ "شمشیر دادا، میں آپ کے حق میں اس عہدے سے دست برداری کا اعلان کرتا ہوں۔ ابھی سے میں بس اپنے گینگ کا سربراہ ہوں۔ اور اپنے گینگ کا بڑا ہونے کے ناطے آپ سے وفادار رہنے کا حلف دیتا ہوں۔"

شمشیر دادا نے وہاں بیٹھے بقیہ بڑوں کی طرف نظر گھمائی۔ سب سے پہلے اخلاق حسین نے کھڑے ہو کر شمشیر دادا کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا، اس کے بعد نوشاد آفریدی اور پھر باری باری تمام نے حلف کے الفاظ دہرا دیے۔

شمشیر دادا نے استہزائی انداز میں کہا۔ "اب کیا کہتے ہو کبیر..... دا..... دا۔"

کبیر دادا اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "ایک ممبر رہ گیا ہے دادا۔"

"تو اسی ممبر سے پوچھ رہا ہوں۔" شمشیر دادا نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا تھا۔

"میں آپ کو تمام گینگز کا سربراہ ماننے سے انکار کرتا ہوں اور خود تمام گینگز کا بڑا بننے کا اعلان کرتا ہوں۔ اس ضمن میں اگر آپ کے علاوہ کسی کو اعتراض ہے تو مجھ سے مقابلہ کرنے کے لیے آسکتا ہے۔" کبیر دادا نے یہ کہتے ہی تمام پر سرسری نگاہ دوڑائی۔ مگر کسی نے باہر آنے کی کوشش نہیں تھی۔

"ہاں نوشاد خان آفریدی۔" کبیر دادا نے نوشاد آفریدی کی آنکھوں میں جھانکا، مگر وہ نظریں چرا گیا تھا۔

"اور تم اخلاق حسین شاہ۔" اس مرتبہ کبیر دادا نے اپنے دوسرے مخالف کو آواز دی مگر وہ بھی خاموش بیٹھا رہا

''اب فیصلہ آپ کے اور میرے درمیان ہوگا دادا۔'' کبیر دادا اس مرتبہ خود کو حیرانی سے گھورتے شمشیر دادا کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم اس چھوکری کے لیے جان دو گے۔'' شمشیر دادا اس کی للکار پر ششدر رہ گیا تھا۔

کبیر دادا اطمینان سے بولا۔ ''اس لڑکی کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں اس میں سب سے کم درجہ بات جان دینا ہے۔''

''اگر جینے سے تنگ آ گئے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' شمشیر دادا شہاب قصوری کی طرف متوجہ ہوا۔

''مقابلے کے لیے جگہ خالی کراؤ۔''

''کبیر دادا کے تابوت میں تو سمجھو آخری کیل ٹھک گئی۔'' اخلاق حسین نے مطمئن انداز میں ساتھ بیٹھے نوشاد کو کہا۔

نوشاد آفریدی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''ٹکر لینے چلا تھا شاہ جی اور آفریدی سے۔''

''ویسے میں آخری وقت میں اسے بتا تو دوں کہ وہ کس کی وجہ سے مرنے والا ہے۔'' اخلاق حسین اٹھ کر کبیر دادا کی طرف بڑھ گیا۔

کبیر دادا تناوش کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اخلاق حسین نے اس کے قریب پہنچتے ہی بغیر کسی تمہید کے دبے لہجے میں بات شروع کر دی

''کبیر دادا، یاد ہے نا اس لڑکی کی وجہ سے تم نے میری اور نوشاد کی توہین کی تھی میرے خاص خاص آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کے محلے میں میرے آدمیوں کا داخلہ بھی بند کرا دیا۔ تو تمہارا کیا خیال تھا میں خاموش بیٹھا رہتا۔ لے آج تمہارا بندوبست بھی ہو گیا۔ اور یہ بھی سن لے کہ تمہاری بلبل کو ہم نے اغواء کرا کر فاصی کے گھر پہنچایا تھا وہ واقعی بے قصور تھا۔ اور ایس پی کو بھی میں نے اور نوشاد نے قتل کرایا ہے۔ باقی بھابی کی فکر نہ کرنا، اسے سنبھالنے والے بہت ہیں یہاں پر۔''

''اخلاق حسین، اگر زندہ رہا تو تمہارا حساب ضرور چکتا کروں گا۔''

”زندہ رہے تو نا..... یوں بھی اب یہ ممکن نہیں رہا۔“ اخلاق حسین اسے یاد دہانی کراتا ہوا بولا۔ ”اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ شمشیر دادا تمھیں قتل نہیں کرے گا تو یاد رکھنا اس مقابلے میں ہارنے والے کو اگر جیتا ہوا شخص زندگی کی بھیک دے بھی دے تب بھی وہاں پر موجود کوئی بھی شخص اسے گولی مارنے کا حق رکھتا ہے اور یقیناً تمھارے سر میں گولی اتارتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ گھبرائی تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیا خیال ہے بھابی۔“

کبیر دادا نے اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ طنزیہ ہنسی ہونٹوں پر سجائے واپس مڑ گیا۔

”یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے، نہ میں آپ کی زندگی میں آتی اور نہ آپ پر یہ کڑا وقت آتا۔“

کبیر دادا چاہت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اس بے کار زندگی میں ایک تم ہی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر آئی ہو۔ چندا، تمھارے ساتھ گزارا ایک ہفتہ مجھے کئی صدیوں کی زندگی سے عزیز ہے۔“

وہ سسکی۔ ”کبیر، میں ڈری ہوئی ہوں، مجھے اپنی آغوش میں بھر کر یہاں سے کہیں دور لے جاؤ۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“

وہ اعتماد سے بولا۔ ”کبیر کی زندگی میں تو میری جان کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“

اس نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ”اور اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو؟“

کبیر دادا نے کوٹ اتار کر اس کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کوئی ضروری کارروائی کی اور کوٹ تناوش کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میرے بعد زندہ رہنا چاہو گی؟“

تناوش میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے اللہ پاک کی قسم نہیں، بالکل نہیں۔“

وہ زخمی لہجے میں بولا۔ ”کوٹ کی اندرونی جیب میں موجود پستول میں نے کاک کر دیا ہے۔ اگر میں زندہ نہ بچ پاؤں تو سر پر رکھ کر ٹریگر دبا دینا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ جو ہفتے بھر کا وقت ہم نے اکٹھے گزارا ہے اسے آپ بھلا دیں۔ یاد ہے وہ لڑکی جو ہمیں شاپنگ کرتے وقت ملی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میں نے آپ کے لیے بہت ساری محبت دیکھی تھی۔ آپ میرے بعد اس سے شادی کر لینا۔ اور سارے گندے کام چھوڑ دینا۔ اگر کبھی میری یاد زیادہ ستائے تو اس لڑکی

سے میری باتیں کرنا اور اسے بتانا کہ ایک اور لڑکی بھی تھی جو آپ کو پیار کرتی تھی اس جتنا تو نہیں بس تھوڑا سا ،ذرا سا....." اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "اسے سچ نہ بتانا ورنہ وہ خفا ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب۔" کبیر دادا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔

وہ نڈر انداز میں بولی۔ "اگر میں ابھی خود کو ختم کر لوں تو لازمی بات ہے سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

"تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی، جانتی ہو خودکشی حرام ہے۔ البتہ ایک عورت عزت بچانے کے لیے اپنی جان لے سکتی ہے اور ایسا تم اس وقت کر سکتی ہو جب میں باقی نہ رہا، یا لڑائی ہار گیا۔"

"کبیر....." اس کے ہونٹوں پر اذیت بھری سسکی ابھری۔

"تم مجھ سے پوچھتی تھی نا کہ میں کون ہوں۔ زیادہ تو نہیں لیکن اتنا بتا دوں کہ میں قرآن مجید کا حافظ ہو گزرا ہوں..... پانچ سال کی عمر سے لے کر پندرہ سال کی عمر تک کا وقت میں نے مدرسے اور مسجد میں گزارا ہے۔ اور پھر حافظ عبدالکبیر علی خان کو حالات نے کبیر دادا بننے پر مجبور کر دیا۔"

"میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔" اس کی پلکیں نے تھک کر اشکوں کے سیلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"تناوش میں بقائم ہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے میری موت یا ہار سے پہلے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، تو تمھیں میری طرف سے تین طلاق۔"

"کبیر....." اس کے منہ سے تیز سسکی نکلی تھی۔

"فکر نہ کرو میری جان یہ مشروط طلاق ہے۔ اگر تم نے میری موت یا ہار سے پہلے خود کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تو یہ طلاق واقع نہیں ہو گی۔"

"دوبارہ ایسا نہ کہنا ورنہ میری جان بغیر گولی لگے نکل جائے گی۔"

ادھر کاشف راجپوت، شمشیر دادا کے پاس پہنچ کر منت سماجت کر رہا تھا۔ "دادا، پلیز غصہ تھوک دیں۔ اس کا دماغ جگہ پر نہیں ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

شمشیر دادا اکھڑ لہجے میں بولا۔ "کاشی، میرا دماغ خراب نہ کرو۔"

"دادا، وہ آپ کا بچہ ہے۔ کیا اس پر ترس نہیں آئے گا۔"

"وہ حرام خور بے غیرت ہے۔ ایک لڑکی کے لیے اپنے استاد کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گیا ہے۔ اور اس سے بھلائی کی کیا امید رکھوں گا۔"

"دادا، وہ اس کی بیوی ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ رکھیل کبھی بیوی نہیں بن سکتی۔"

"دادا....."

شمشیر دادا نے کاشف کی بات سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ "دفع ہو جاؤ کاشی، یہ نہ ہو اس بے غیرت سے پہلے تمھارا نمبر لگا دوں۔ مجھے کسی کمینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کاشف دکھی دل سے کبیر دادا کی طرف بڑھ گیا۔ شہاب قصوری کے آدمیوں نے کھانے کی میزوں اور صوفوں وغیرہ کو دیواروں کے ساتھ لگا دیا تھا۔

ایس پی کی بیوی، اپنی بیٹی کو کہہ رہی تھی۔ "بس میری جان، تھوڑی دیر تک تمھارے باپ کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔"

فصیح الدین کی بیوی کرن سے اس کی گہری سہیلی ثمینہ مخاطب تھی۔ "بڑا دادا بنا پھر رہا تھا آج اس سے جان چھوٹ جائے گی۔"

کرن نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ "ہاں، میرے فاسی کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔"

کاشف، کبیر دادا کے قریب رکتا ہوا بولا۔ "کوئی ایسی صورت ہے جس سے یہ لڑائی روکی جا سکے۔"

"ہاں، میری بیوی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، مجھے ہر فیصلہ منظور ہے۔ چاہے موت ہی کی سزا کیوں نہ ہو۔"

تناوش سسکی۔ "کبیر نہیں۔"

"کبیر دادا، میں تم سے محبت کرتا ہوں یار! اگر تمھیں بچا سکتا تو کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرتا۔ مگر شمشیر دادا کے سامنے میں بے بس ہوں۔" یہ کہتے ہی کاشف سر جھکائے واپس مڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شہاب قصوری نے سربراہی کے دونوں دعوے داروں کو بڑے ہال کے درمیان میں آنے کی دعوت دی۔ باقی لوگ کونوں میں سمٹ گئے تھے۔ تناوش بے ساختہ کبیر دادا سے لپٹ گئی تھی۔

''کبیر، یاد رکھنا مجھے دنیا میں آپ سے پیارا کوئی نہیں ہے۔ اپنی گڑیا کو مایوس نہ کرنا۔ یہ شخص آپ سے جیت نہیں سکتا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''جانتا ہوں میری جان..... جانتا ہوں۔''

تناوش نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے چند دعائیں پڑھیں اور اس پر پھونک دیں۔

''یہی منتر پڑھ پڑھ کر اس جادوگرنی نے کبیر کو مجھ سے چھین لیا ہے۔'' فرحانہ ساتھ کھڑی، رخسانہ کو مخاطب تھی۔

رخسانہ ہنسی۔ ''اگر آپ سے چھینا ہے تو اس کے پاس بھی باقی نہیں رہے گا۔''

فرحانہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''پاپا کو کہہ کر اس فاحشہ کو تو میں کوٹھے پر بٹھاؤں گی۔ جہاں روزانہ درجن بھر گاہک اس کی حقیقت یاد دلایا کریں گے۔''

''پتا ہے میرے جند جانی نے اسے بہن بنا لیا ہے۔'' رخسانہ اسے پاشا کے بارے بتانے لگی۔ ''ویسے اچھا ہی کیا ہے ورنہ کبیر خان کی موت کے بعد وہ بھی اس بلا کے قابو میں آسکتا تھا۔''

فرحانہ نے پوچھا۔ ''نظر نہیں آرہا وہ۔''

''ابو جان کہہ رہے تھے کہ طبیعت ناساز ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں کل اس کے پاس چلی جاؤں۔ کبیر خان کی موت کی تعزیت بھی کرلوں گی اور اس کی طبیعت کا بھی پوچھ لوں گی۔''

فرحانہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''یار، بار بار اس کی موت کا ذکر کر کے مجھے دکھ تو نہ دو نا۔''

''لیں جی میں خاموش ہو جاتی ہوں۔'' رخسانہ سختی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے ہال کے وسط میں موجود آمنے سامنے کھڑے کبیر دادا اور شمشیر دادا کو دیکھنے لگی۔

شہاب قصوری کہہ رہا تھا۔ ''اگر کوئی مقابلے سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو ابھی شکست تسلیم کرسکتا ہے مقابلہ شروع ہو جانے کے بعد کسی کے شکست تسلیم کرنے کے باوجود مخالف اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہے۔''

دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شمشیر دادا سے تربیت حاصل کرتے وقت کبیر دادا کو سیکڑوں مرتبہ یوں شمشیر دادا کے سامنے کھڑا ہونے کا موقع ملا تھا مگر وہ مصنوعی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ ایسے مقابلوں میں کبیر دادا ہمیشہ ہی ہار جاتا تھا، لیکن اسے کبھی اپنی ہار کا دکھ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہمیشہ شمشیر دادا سے مقابلہ کرتے وقت اس کے دل میں لڑنے کے بجائے مار کھانے کی نیت ہوتی۔ اور یہ شمشیر دادا کی سخت تربیت اور پٹائی ہی کا اعجاز تھا کہ کبیر دادا کے سامنے کوئی لڑاکا دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر پاتا تھا۔ لیکن آج وہ مار کھانے کی نیت سے نہیں اپنے استاد کو مارنے کی نیت سے تیار کھڑا تھا۔

"کبیر، اب بھی وقت ہے اپنی جان بچالے۔ یہ نہ ہو بات میرے اختیار سے بھی نکل جائے۔ ہارنے کی صورت میں تمھیں کوئی بھی گولی مار کر ہلاک کر سکتا ہے۔"

کبیر دادا نے کئی دفعہ کہی ہوئی بات دہرائی۔ "آپ میری بیوی کو کچھ نہ کہنے کا وعدہ کریں مجھے اس کے علاوہ ہر سزا منظور ہے۔"

"جس فاحشہ کی وجہ سے تم نے مجھ سے بغاوت کی ہمت کی ہے اسے تو میں ایسا سبق پڑھاؤں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔ یہ شمشیر دادا کا تم سے وعدہ ہے۔"

کبیر دادا اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی چھا گئی تھی۔ شمشیر دادا کی دل سے قدر کرنے والے کے دل سے ایک دم وہ عزت و احترام رخصت ہو گیا تھا۔ جو شخص اس کی تناوش کی عزت کا دشمن ہو سکتا تھا وہ اسے قابل احترام نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"شروع کرو۔" شہاب قصوری آواز گویا طبل جنگ تھا کہ جس کے بعد فریقین ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے حق دار ہو گئے تھے۔ حاضرین میں فقط تناوش تھی جس کے لب مسلسل مناجات کے ورد میں مصروف تھے۔ چند گھنٹے پہلے وہ عارضی جدائی پر رو رہی تھی اور اب دائمی جدائی سر پر آن کھڑی تھی۔

"یا اللہ پاک، تو نے ہمیشہ میرے پیاروں کو چھینا ہے۔ میں نے گلے بھی کیے، شکوے شکایت بھی کی کہ تیری بارگاہ کے علاوہ کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں شنوائی ہو سکتی ہو۔ مگر میری دعائیں رد گئیں، اے اللہ آج میری دعا کو رد نہ کرنا۔ اے اللہ پاک میں جانتی ہوں تیری بے نیاز ذات کو کسی کی پروا نہیں، لیکن عاجزوں کی دعا بھی تو فقط تو ہی

سنتا ہے۔ تیرے ہی قبضہ قدرت میں ساری طاقتیں اور ساری قوتیں ہیں۔ میرے مالک ساری بڑائیاں تجھے ہی سزاوار ہیں۔ اے قوتوں، طاقتوں اور بڑائیوں کے مالک اے اکبر، اے کبیر ذات میں اپنے عبدالکبیر کے لیے جھولی پھیلا رہی ہوں، میری جھولی کو خالی نہ لوٹانا۔ اے اللہ پاک مجھ سے سب کچھ چھین لے مگر میرا عبدالکبیر میری خالی جھولی میں ڈال دے۔ اے اللہ پاک تو سنتا ہے، تو جانتا ہے، تو تو دلوں کے حال سے واقف ہے نا۔ میرے دکھی دل کی پکار سن لے۔ میں جانتی ہوں میرا عبدالکبیر بہت گناہ گار ہے، خطا کار ہے لیکن میں وعدہ کرتی ہوں اسے تیرا فرماں بردار بندہ بناؤں گی۔ اس سے سارے ناجائز کام چھڑا دوں گی۔ اے اللہ پاک ایک موقع تو دے دے، مجھے تھوڑی سی مہلت تو دے دے۔ سنا ہے تو رونے والوں کو جلدی دیتا ہے، دیکھ لے میں رو رہی ہوں۔ سنا ہے تو دکھی دلوں کی پکار خالی نہیں لوٹاتا، میرے مالک میرا دل دکھ سے بھرا ہوا۔ اے سب کی سننے والے میری دعا قبول کر لے، اے دینے والے مجھے میرا عبدالکبیر دے دے۔ یا اللہ پاک.....'' وہ لرزتے ہونٹوں، سسکتے لہجے، آنکھوں میں آنسو اور دکھی دل کے ساتھ اپنے مالک کے ساتھ ہمکلام رہی۔ اس کی دھندلائی ہوئی نظریں مضبوط جسامت والے لمبے تڑنگے کبیر دادا پر گڑی تھیں جو شمشیر دادا کے سامنے بچہ نظر آ رہا تھا۔

اس وقت کاشف راجپوت، بہرام پاشا کو پیغام لکھ رہا تھا۔ ''پاشا، اگر اپنے استاد کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ شمشیر دادا اور وہ آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اس کی وجہ وہی ہے یعنی تمہاری چھوٹی بہن۔ شاید یہ جاننا بھی تمہارے لیے باعث اذیت ہو کہ اسے نوشاد آفریدی پارٹی پکڑ کر یہیں لے آئے ہیں۔''

اس نے پیغام بھیجنے کا بٹن دبایا اور اس وقت شمشیر دادا نے اپنا لمبا بازو گھماتے ہوئے کبیر دادا پر حملہ کر دیا تھا۔ بھاری بھرکم جسامت کے باوجود وہ کسی چیتے کی طرح پھرتیلا تھا۔ یہی لڑنے کی صلاحیت ہی تو تھی جس کی بدولت اس نے بمبئی جیسے شہر میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے مسلسل اس کے تھپڑ کھانے والے کبیر دادا نے ایک دم جھک کر اس کا وار خطا کیا اور اپنا دایاں مکا زوردار انداز میں اس کی پسلیوں کے نیچے پیٹ میں رسید کر دیا۔ مگر اس کا پیٹ شاید فولاد کا بنا تھا۔ کبیر دادا کو یقین تھا کہ اگر وہ مکا کسی دوسرے آدمی کے پیٹ میں اسی شدت سے پڑا ہوتا تو، مضروب کی جان لینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن شمشیر دادا ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

مکا مارنے کے ساتھ کبیر دادا رکا نہیں تھا بلکہ اس نے تیز رفتاری سے تین چار مکے اسی جگہ پر جڑ دیے تھے ۔اس کے مکوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے شمشیر دادا نے دوبارہ ہاتھ گھمایا۔اور اس دفعہ کبیر دادا بچ نہیں پایا تھا ۔چھاتی میں لگنے والے مکے نے اسے فرش پر اچھال دیا تھا۔اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر شمشیر دادا نے اس سے پہلے فٹ بال کو لات مارنے کے انداز میں اس کے دائیں پہلو کو ٹھوکر کا نشانہ بنایا اور وہ تین چار گز دور جا گرا۔اس کے پہلو میں شدید درد شروع ہو گیا تھا۔مگر وہیں پڑے رہنے کا نتیجہ اسے دوسری ناقابل برداشت چوٹ کی صورت میں مل سکتا تھا۔

شمشیر دادا کے قریب پہنچنے سے پہلے وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔اس وقت شمشیر دادا قریب پہنچ گیا تھا۔اس کے سر کی بھرپور ٹکر کبیر دادا کی چھاتی میں لگی اور وہ اچھل کر دیوار کی جڑ میں جا گرا۔اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔سر جھٹکتے ہوئے وہ اٹھا اس وقت تک شمشیر دادا نے قریب پہنچ کر اسے ایک ہی ہاتھ سے اٹھا کر سر سے بلند کر کے دیوار سے اس کی پیٹھ لگا دی تھی۔کبیر دادا جانتا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر بھی اسی طرح ہوا میں لٹکتا رہ گیا تو اس کی قوت ختم ہو جائے گی۔اپنی ٹانگ گھٹنے سے موڑ کر اس نے شمشیر دادا کی ٹھوڑی پر وار کرنا چاہا۔جسے شمشیر دادا نے دوسرے ہاتھ سے روک دیا۔لیکن اس دوران کبیر دادا دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اپنا گلا اس کی جناتی گرفت سے چھڑا چکا تھا۔پاؤں نیچے لگتے ہی کبیر دادا نے سر کی زوردار ٹکر شمشیر دادا کی چھاتی میں رسید کی۔وہ بے اختیار پیچھے ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی زوردار کک نے کبیر دادا کو دوبارہ دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر دیا۔شمشیر دادا نے اس ایک کک پر اکتفا نہیں کیا تھا۔کبیر دادا کے سنبھلنے تک وہ اس پر مکوں کی بارش برسا چکا تھا۔بڑی مشکل سے کبیر دادا نے نیچے بیٹھ کر ان مشینی مکوں سے جان چھڑائی اور زقند لگا کر دیوار سے دور ہو گیا۔مگر اب شمشیر دادا کا پارہ بلند ہو چکا تھا۔کبیر دادا کو ایک مکے کے جواب میں تین مکے کھانا پڑتے۔مسلسل مار کھا کر کبیر دادا لہولہان ہو چکا تھا۔اس کے چہرے اور جسم سے رستا ہوا خون تناوش کو اس کی دعاؤں کے رد جانے کی بری خبر سنا رہا تھا۔باپ اور بھائی کی موت کے بعد شاید شوہر کی موت کا دکھ دیکھنا بھی اس کے نصیب میں لکھا تھا۔کبیر دادا کو لگنے والی ہر چوٹ اس کے دل پر لگ رہی تھی۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کبیر دادا سے پہلے اس کا سانس نکل جائے گا۔اس کے باوجود اس کے لرزتے ہونٹوں پر مناجات جاری رہیں۔

اور پھر شمشیر دادا کی زبردست ٹھوکر سے کبیر دادا دیوار سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا اس کی چھاتی سے شمشیر دادا کا ہاتھی جیسا پاؤں دوبارہ آن ٹکرایا۔ اس کے سر کی پشت کا زوردار انداز میں دیوار سے اتصال ہوا اور اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے لہرانے لگے تھے۔ وہ اسی طرح پھسلتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔

شمشیر دادا نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا اور اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کرنے لگا۔ تھپڑ کھا کر کبیر دادا کے رہے سہے اوسان بھی رخصت ہونے لگے۔

تین چار تھپڑ لگا کر شمشیر دادا نے اسے گریبان سے پکڑ کر تناوش کی طرف اچھال دیا۔

''یہ گیا تیرا خصم!'' وہ پیلی پڑتی تناوش کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دھاڑا۔

کبیر دادا نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کر تناوش کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی، لرز رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت، دکھ، پریشانی اور نہ جانے جانے کون کون سی کیفیات ثبت ہو چکی تھیں۔

شمشیر دادا کی آواز بلند ہوئی۔ ''یہ وہ نمک حرام، بے غیرت اور احسان فراموش ہے جسے میں نے سہارا دیا، پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا، دشمنوں سے بدلہ لینے کے گر سکھائے، عزت سے جینا اور سر اٹھا کے چلنا سکھایا۔ آج یہ گھٹیا انسان ایک چھوکری، ایک رکھیل اور ایک فاحشہ کی خاطر میرے مقابل آ گیا ہے۔ کچھ لوگ شاید سوچ رہے ہوں کہ میں اس کی جان بخشی کر دوں گا تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ لیکن مرنے سے پہلے میں اسے ،اس کی رکھیل کا تماشا ضرور دکھاؤں گا۔ تم لوگ آج تک گندی فلموں میں ایسے سین دیکھتے رہے ہو آج تمھارے سامنے زندہ شو چلے گا۔'' یہ کہتے ہی شمشیر دادا لرزتی کانپتی تناوش کی طرف بڑھا۔

کبیر دادا نے ملتجی نظریں تناوش کی طرف اٹھائیں اور لرزتی آواز میں بولا۔ ''میں ہار گیا تناوش، تمھیں اجازت ہے۔ شاید پہلے تمھارا جانا بنتا تھا۔''

تناوش کا سر نفی میں ہلا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا کبیر دادا کا کوٹ جس کی جیب میں پستول پڑا تھا ایک جانب پڑے صوفے کی طرف اچھال دیا۔ کبیر دادا کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ ہکا بکا اسے گھورتا رہ گیا۔ جانے تناوش کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔

''تت..... تناوش پلیز۔'' وہ منمنایا۔

''نہیں۔'' اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی، مگر کبیر دادا کو یوں صاف سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اس کے کانوں میں بول رہی ہو۔ ''حفاظت کا وعدہ کیا تھا نا، تو پورا کریں۔ آپ کی دلھن، آپ کی گڑیا، آپ کی چندا، صرف اور صرف آپ کی تناوش کو آپ کی ضرورت ہے۔ اگر حفاظت نہیں کر سکتے تو اس کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے جائیں۔''

اسی وقت شمشیر دادا نخوت سے چلتا ہوا تناوش کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی طرف توجہ دیے بغیر وہ کبیر دادا کو گھورتی رہی۔ اسے بازو سے پکڑ کر شمشیر دادا نے اوپر اٹھایا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی اس دیو کے سامنے نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔

''یہ ہے وہ فاحشہ، جس کی وجہ سے یہ سب کھٹ راگ پھیلا ہے۔'' شمشیر دادا کے لہجے میں غصہ اور نفرت ابل رہی تھی۔ تناوش کی وجہ سے کبیر دادا کا خود سے مقابلہ کرنا اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ''بڑی آئی دوپٹے والی۔'' اس نے ایک ہاتھ سے تناوش کے سر پر اوڑھا دوپٹا کھینچ کر اتارا اور دور اچھال دیا۔ اس کے کالے سیاہ بال بکھر کر رہ گئے تھے۔

''لے بھئی، اس اپسرا کو مکمل دیکھنے کا خواب تو ابھی پورا ہو جائے گا۔'' نوشاد نے اخلاق حسین کی طرف جھکتے ہوئے غلیظ زبان کھولی۔

''شرم کرو، تمھاری محبوبہ کو شمشیر دادا یوں بے عزت کر رہا ہے۔'' اخلاق حسین نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا نوشاد فکرمندی سے بولا۔ ''یار، کہیں مار ہی نہ دے بے چاری کو، باقی تو خیر ہے میرے جشن منانے کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوتا فاحشہ کو۔'' نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر اخلاق حسین وہ دل پسند تماشا دیکھنے لگا۔

تناوش منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر کبیر دادا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی رونا پیٹنا اور نہ شمشیر دادا سے بچنے کی کوشش کرنا۔ اس کا مان، اس کا ہیرو، اس کا محافظ زمین پر لہولہان پڑا تھا تو وہ کمزور، نرم و نازک لڑکی کیا کر سکتی تھی۔ اور پھر کبیر دادا کے جسم کے اندر ایک انجانی قوت نے سر ابھارا۔ ایک ایسی قوت جس کا تعلق جسمانی طاقت سے نہیں ہوتا۔ یہ جان بچانے کی جبلت سے بھی کوئی آگے کی چیز تھی۔ چھاتی کے سامنے بازو ٹیکتے ہوئے وہ

لرزتے ہوئے اٹھا، مگر جب کھڑا ہوا تو اس کے جسم میں لرزش ختم ہو گئی تھی۔

شمشیر دادا کا ہاتھ تناوش کے گریبان کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے زوردار آواز میں پکارا۔

"شمشیر علی!.....لڑائی ختم نہیں ہوئی۔"

شمشیر دادا کو حیرت کا جھٹکا لگا، زندگی میں پہلی بار کبیر دادا، اسے یوں میں مخاطب ہوا تھا۔

تناوش کا بازو چھوڑ کر وہ غضب ناک انداز میں اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کی اس کا ہتھوڑا نما مکا پوری قوت سے کبیر دادا کے چہرے کی طرف بڑھا۔ مکے اور چہرے کا اتصال ہو جاتا تو شاید کبیر دادا کا چہرہ پہچان کے قابل ہی نہ رہتا۔ لیکن کبیر دادا نے بجلی کی سی سرعت سے اپنا چہرہ چند انچ ایک جانب ہٹایا اور پھر اس سے پہلے کہ شمشیر دادا کا ہاتھ واپس لوٹتا، اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ کر ہاتھ کو پیچھے جانے سے روک دیا ایسا کرتے ہوئے کبیر دادا ذرا سا لڑکھڑایا بھی تھا۔ لیکن پھر اپنے قدم زمین پر جماتے ہوئے اس نے بائیں سے شمشیر دادا کی کلائی تھامتے ہوئے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پوری قوت سے شمشیر دادا کی کہنی کے جوڑ کے نیچے رسید کی۔ یہ اس کا پسندیدہ داؤ تھا۔ "کٹاک۔" کی آواز کے ساتھ شمشیر دادا کی کہنی کا جوڑ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے تیز کراہ خارج ہوئی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا تھا۔ کبیر دادا کی حرکت رکی نہیں تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ چھوڑ کر بایاں ہاتھ پکڑتے ہوئے کبیر دادا نے چکر کاٹتے ہوئے اس کا بازو مروڑا اور اچھل کر اپنے دونوں پاؤں اس کی پیٹھ پر ٹیکتے ہوئے اس نے زوردار جھٹکے سے شمشیر دادا کا بازو پیچھے کھینچا۔ اس طرح زور لگانے کی وجہ سے دونوں بازوؤں کے ساتھ اس کے پورے جسم کی طاقت بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس مرتبہ شمشیر دادا اپنی چیخ نہیں روک سکا تھا۔ اس کا بازو کندھے سے نکل گیا تھا۔ اس کا پورا جسم لرزنا شروع ہو گیا۔ کبیر دادا اس کے بازو کو کھینچنے کی وجہ سے پیچھے گرا تھا۔ وہ اٹھ کر شمشیر دادا کے سامنے آیا۔ شمشیر دادا گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اور اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے مسخ ہو گیا تھا۔

اسی وقت پاشا کی کار شہاب قصوری کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ کار روک کر وہ دروازہ بند کیے بغیر بھاگتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر گھستے ہی اسے کبیر دادا، شمشیر دادا کے سامنے کھڑا نظر آیا اس کے قدم آہستہ ہوئے اور وہ دھیرے قدموں سے اس طرف بڑھنے لگا۔

کبیر دادا کو سامنے کھڑا دیکھ کر شمشیر دادا کے چہرے پر اذیت بھری ہنسی نمودار ہوئی۔ ''تم جیت گئے کبیر۔''

کبیر دادا کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ ''اگر صرف میری جان کو خطرہ ہوتا تو شاید نہ جیتتا دادا۔''

''تم نے یہ داؤ پہلے تو کبھی نہیں آزمایا برخوردار۔'' شمشیر دادا کا پر اذیت لہجہ تحسین سے بھرا تھا۔

''یہ داؤ دوستانہ لڑائی کے لیے نہیں ہے دادا، یہ صرف دشمنوں کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔''

شمشیر دادا نے پوچھا۔ ''کیا مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟''

کبیر دادا آنکھوں میں نمی لیے اس کے قریب ہوا دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھام کر اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور اس کی پشت کی جانب گھوم کر اس نے شمشیر دادا کے کان میں سرگوشی کی۔

''کاش میں آپ کو زندہ چھوڑ سکتا، آپ نے تناوش کا دوپٹا اتارا ہے اور یاد ہے میں نے کیا کہا تھا کہ اس کے لیے میں کم سے کم اپنی جان دے سکتا ہوں اور زیادہ یہ کہ اپنے استاد کی جان بھی لے سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے ایک ہاتھ شمشیر دادا کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور دوسرا ہاتھ سر پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو مخالف جانب جھٹکا دیا۔ ''کڑکڑ'' کی زوردار آواز ابھری اور شمشیر دادا نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

کبیر دادا سیدھا ہوا ایک دم نقاہت اس پر حملہ آور ہوئی اور اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ اسی وقت ہکا بکا ساکت کھڑی تناوش کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بھاگ کر کبیر دادا کی طرف بڑھی۔

کبیر دادا نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بازو کھولے اور وہ اس کے بازوؤں میں سما گئی تھی۔

''میرے عبدالکبیر.....'' تناوش کے ہونٹوں سے سسکنے کے انداز میں نکلا اور وہ کبیر دادا کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس کے حواس نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کبیر دادا میں اتنی ہمت مفقود تھی کہ اسے اٹھا کر صوفے کی طرف جا سکتا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں پاشا کی آواز گونجی۔

''دادا آپ ٹھیک ہیں۔''

کبیر دادا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''پاشا، اپنی بہن کو صوفے پر لٹا دو، یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔''

پاشا اس کی گود سے تناوش کو اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ کاشف راجپوت نے قریب پہنچ کر اسے سہارا دیا اور صوفے پر جا کر بٹھا دیا۔ تمام گینگسٹرز کے چہروں پر حیرت جیسے ثبت ہو گئی تھی۔ وہ تو کبیر دادا پر فاتحہ پڑھ

چکے تھے اور ایک دم مرنے والا زندہ ہو گیا تھا۔

''مبارک ہو۔'' رخسانہ نے فرحانہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''خاک مبارک۔'' فرحانہ نے منہ بنایا۔ ''اس کمینی کی ڈراما بازی دیکھی ہے۔''

رخسانہ نے متبسم ہو کر کہا۔ ''وہ اس کی بیوی ہے یار!''

''زیادہ عرصہ نہیں رہے گی۔'' فرحانہ کا لہجہ اعتماد سے پر تھا۔

''سارے قریب قریب آ جائیں۔'' کبیر دادا نے صوفے پر بیٹھتے ہی تمام کو پاس بلایا۔

تمام کبیر دادا کے دائیں بائیں پڑے صوفوں پر آن بیٹھے تھے۔

''تم دونوں کھڑے ہو جاؤ۔'' کبیر دادا نے نوشاد اور اخلاق کو اشارہ کیا جو اپنے خشک ہوتے ہونٹوں کو بار بار تر کر رہے تھے۔

تھوک نگلتے ہوئے دونوں کھڑے ہو گئے تھے۔ اسی وقت تناوش آنکھیں کھولتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ سر پر دوپٹا لپیٹ کر وہ بھاگ کر کبیر دادا کے قریب پہنچی اور بے باکی سے اس سے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ کبیر دادا اس کی طرف توجہ دیے بغیر اخلاق حسین اور نوشاد کی طرف متوجہ رہا۔

''مسٹر اخلاق حسین شاہ!..... اب ذرا تفصیل سے تمام واقعے پر روشنی ڈالیں۔''

''وہ..... کک..... کبیر دادا، میں نے تو بس.....'' اس نے ہکلا کے کوئی بہانہ گھڑنا چاہا مگر اس کی بدقسمتی کہ وہ تھوڑی دیر پہلے خود اعتراف کر چکا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبیر دادا بچ جائے گا۔ ان کی امیدوں کے مرکز شمشیر دادا کی لاش کو، شہاب قصوری کے آدمی اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے۔

تناوش نے میز پر پڑے پانی کے جگ سے اپنے دوپٹے کا پلو گیلا کیا اور کبیر دادا کے ماتھے، گالوں اور کانوں پر لگا خون صاف کرنے لگی۔ اسے نہ تو وہاں پر موجود عورتوں سے کوئی شرم محسوس ہو رہی تھی اور نہ مردوں ہی کی کوئی پروا تھی۔ کبیر دادا نے بھی اسے روکنے، ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جس جذباتی دھچکے سے گزری تھی اس کے بعد وہ روایتی شرم و حیا کو بھول گئی تھی۔

''اخلاق حسین!..... مجھے اگلوانے کے کئی طریقے معلوم ہیں اور یقیناً تم اس بات سے اچھی طرح واقف

بھی ہو۔"

گہرا سانس لے کر اخلاق حسین نے غیر ہوتی حالت کو سنبھالا اور پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "ایس پی ضمیر حسین کو میں نے اور نوشاد آفریدی نے قتل کرایا ہے اور قتل کا الزام آپ کے سر ڈال دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

کبیر دادا سرد لہجے میں بولا۔ "فصیح الدین کے قتل کی حقیقت بھی اگلو۔"

"ایس پی ضمیر حسین نے مسز کبیر دادا کو اغواء کرا کے فصیح الدین کی بے خبری میں اس کی کوٹھی میں پہنچایا اور اسے ایسے نشے کا ٹیکہ لگایا جس سے وہ بہ ظاہر ہوش میں لگتے ہوئے بھی ہوش میں نہیں تھی۔ اس وجہ سے فصیح الدین کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی ہے یا اسے اغواء کر کے وہاں پہنچایا گیا ہے۔ اور جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا ایس پی کے ایک آدمی نے کبیر دادا کو فون کر دیا۔ اور کبیر دادا نے یہ سمجھا کہ اس کی بیوی کو فاصی نے اغواء کرایا ہے۔"

"یقیناً آپ دونوں کو حقیقت واضح ہو گئی ہو گی۔" کبیر دادا نے فصیح الدین کی بیوی کرن اور سلطانہ کو ایک ساتھ مخاطب ہوا تھا۔ دونوں کے چہروں پر خجالت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ کہاں تو وہ کبیر دادا کو اپنے شوہر کا قاتل سمجھ کر بددعاؤں اور کوسنوں سے نواز رہی تھیں اور حقیقت کھلتے ہی ان پر ندامت حملہ آور ہو گئی تھی۔

کرن کی آواز ابھری۔ "ہمیں انصاف چاہیے۔"

"ملے گا۔" کبیر دادا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تمام پر سرسری نگاہ دوڑائی اس کی نظریں فرحانہ پر آ کر رک گئی تھیں جو نفی میں سر ہلاتے ہوئے گویا باپ کی معافی کی طلب گار تھی۔ اپنے بارے اس کے دل میں چھپے جذبات سے بھی کبیر دادا اچھی طرح واقف تھا۔

اس کے زخموں کو صاف کرتی تناوش نے اچانک اس کے کان سے منہ لگا کر کہا۔ "مزید کوئی قتل نہیں ہو گا۔"

کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ "تھوڑی دیر پہلے ان دونوں حضرات کا قتل میرے سر لگا تھا اور شمشیر دادا نے فیصلہ کیا تھا کہ میں دونوں بیواؤں کو پندرہ کروڑ روپیا ادا کر کے معافی مانگوں گا۔ وہ فیصلہ میں تم دونوں پر بھی لاگو کرتا ہوں۔ تم دونوں اپنی اپنی جگہ پندرہ پندرہ کروڑ دونوں بیواؤں کو دو گے اور ہاتھ باندھ کر

معافی مانگو گے۔کیا تمھیں یہ منظور ہے۔"

ان کے چہروں پر اطمینان ابھرا اور وہ بیک زبان بولے۔"منظور ہے۔"

"یہ تو تھا ناجائز قتل ہونے والوں کا فیصلہ اب جو سازش میرے خلاف تیار کی گئی تھی،اس کے لیے بھی وہی فیصلہ ہوگا جو شمشیر دادا نے کیا تھا۔آج کی رات فرحانہ میرے ساتھ گزارے گی اور کل نغمہ بیگم،اس پر کوئی اعتراض؟"

کبیر دادا کی بات پر فرحانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔اس نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔جبکہ اخلاق حسین اور نوشاد کے چہروں پر بارہ بجنے لگے تھے۔

اخلاق حسین ہکلایا۔"ہم معافی چاہتے ہیں کبیر دادا،ہم سے غلطی ہوئی۔کوئی اور سزا تجویز کردیں۔"

کبیر دادا زہر خند لہجے میں بولا۔"جب یہ سزا شمشیر دادا نے میری بیوی کے لیے تجویز کی تھی اس وقت تو تم خاموش بیٹھے رہے۔"

کبیر دادا کی بات پر دونوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کرنے والے اور انھیں اب آرام کریں۔"تناوش اس بات پر کہاں راضی ہوسکتی تھی ۔فوراً کھڑے ہوکر کبیر دادا کا بازو کھینچنے لگی۔

"چلتے ہیں نا۔"کبیر دادا نے اسے منع کرنا چاہا۔

"کہہ دیا نا انھیں۔"تناوش کا لہجہ کسی اکھڑ مزاج بیوی کا سا تھا۔

"اخلاق حسین اور نوشاد آفریدی،میں ضرور ایسا ہی کرتا،مگر دعا دو اس کو جس کے خلاف تم کھڈا کھودتے رہے ہو۔"کبیر دادا آہستہ آہستہ کھڑا ہوگیا۔

"بھیا!"تناوش نے پاشا کو پکارا۔اور پاشا نے فوراً آگے بڑھ کر کبیر دادا کو سہارا دے دیا۔

"کمینی۔"فرحانہ نے رخسانہ کے کان میں سرگوشی کی۔"کتنا اچھا موقع مل رہا تھا۔سچ میں اسے صبح تک شادی کے لیے راضی کرلیتی۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو بے وقوف۔"رخسانہ اسے ڈانٹے بنا نہیں رہ سکی تھی۔کبیر دادا کے جانے کے بعد باقی

بھی وہاں سے رخصت ہونے لگے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نے کبیر دادا کے زخموں پر لگانے کے لیے پائیوڈین دی اور کھانے کے لیے درد کش اور سکون آور گولیاں دے کر رخصت ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کبیر دادا کے گینگ کا حصہ ہی تھا۔

تناوش دودھ گرم کر کے لے آئی۔ اس کے گولیاں لیتے ہی پاشا کھڑا ہو گیا۔

''اب آپ آرام کریں۔'' اور کبیر دادا کے سر ہلانے پر وہ کمرے سے نکل گیا۔

دودھ کا خالی گلاس کبیر دادا کے ہاتھوں سے لے کر تناوش نے تپائی پر رکھا اور سر کے نیچے دو تکیے رکھ کر اسے سہارا دے کر لٹانے لگی۔

''درد تو نہیں ہو رہا۔'' اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے وہ چاہت سے پوچھنے لگی۔

کبیر دادا متبسم ہوا۔ ''اگر ہو رہا ہو، تو تم کیا کرو گی۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''پھر میں تکیے کے بجائے آپ کا سر اپنی گود میں رکھ لوں گی اور درد ختم ہو جائے گا۔''

''جب یہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے مسکراتا ہوا موجود ہو نا تو مجھے گردن کٹ جانے پر بھی تکلیف نہیں ہو گی۔''

وہ ناز سے مسکرائی۔ ''جھوٹا۔''

''جھوٹا کسے کہا؟'' کبیر دادا نے مصنوعی غصہ ظاہر کیا۔

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''جھوٹے کو۔''

کبیر دادا چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے دونوں بازو وا کیے۔ وہ فوراً اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں لڑائی کا منظر جاگا اور وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''میں ڈر گئی تھی کبیر!..... مجھے لگا میں آپ کو کھو دوں گی۔''

اس کی ریشمی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کبیر دادا کہنے لگا۔ ''تمھاری دعائیں میرے ساتھ تھیں نا، مجھے بھلا کیا ہو سکتا تھا۔''

اسے ربّ سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور وہ کہنے لگی۔ ''ایک بات مانیں گے۔''

''کبھی ٹالی بھی ہے۔''

''یہ سارے کام چھوڑو، کہیں دور چلے جاتے ہیں، ایک چھوٹا سا گھر جہاں بس میں اور آپ ہوں گے۔ کوئی خوف، کوئی ڈر، کوئی قتل و غارت، کوئی سازش نہیں ہوگی۔'' وہ جیسے سپنوں میں کھو گئی تھی۔

''تو تمھارا خیال ہے یہ اتنا آسان ہے۔''

''کیوں؟'' اس نے سر اٹھا کر کبیر دادا کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

''اس راستے پر کوئی یوٹرن موجود نہیں ہے میری جان۔ یہ سارے گینگسٹر میری جان کے دشمن بن جائیں گے۔''

''مگر کس لیے؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ کبیر دادا سے ہر بات آسانی سے منوا لے گی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ کبیر دادا مجبور بھی ہو سکتا ہے۔ اور جس کام میں کبیر دادا کی جان کو کوئی خطرہ ہوتا اس کے تو وہ قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ کبیر دادا اس کے لیے کتنا اہم تھا اس بارے اسے صحیح اندازہ تب ہوا تھا جب کبیر دادا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

''کیوں کہ میں تمام کے راز جانتا ہوں۔ زیر زمین دنیا کے کام کے طریقہ کار سے مکمل واقفیت رکھتا ہوں۔ اور میرے علاحدہ ہو جانے کی صورت میں انھیں ہمیشہ یہ خطرہ رہے گا کہ میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مخبری نہ کر دوں میرا وجود ان کے سر پر لٹکتی ہوئی ننگی تلوار کی مانند ہوگا۔ وہ ہر قیمت پر میری جان لینا چاہیں گے۔ اور یہی اس دنیا کا اصول ہے۔ یہاں ہر کسی کو بڑی آسانی سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ آنے والے کے لیے کئی دروازے کھلے ہیں۔ لیکن واپسی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے موت۔''

''تو آپ کو کس نے کہا تھا غنڈہ بننے کو۔ محنت مزدوری کرتے، کوئی سبزی کی ریڑھی ہی لگا لیتے۔ مجھے تو آپ کے ساتھ جھونپڑی میں رہنا بھی قبول تھا۔''

''پگلی، تم مجھے گینگسٹر ہونے کی وجہ سے تو ملی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شرارتی انداز میں ہنسا۔ ''مزدور ہوتا تو تم نے میری جانب دیکھنا بھی نہیں تھا۔ یوں بھی اب تک کئی بچوں کا باپ بن گیا ہوتا۔''

”میں آپ کی دوسری بیوی بن جاتی۔“ وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی۔ ”آپ کی پہلی بیوی کی بھی خدمت کرتی وہ ضرور مجھے قبول کر لیتی۔“

کبیر دادا نے کہا۔ ”مطلب میرے لیے دوسری شادی کا دروازہ کھلا ہے۔“

”میں اپنی جان لے لوں گی۔“ روہانسا ہو کر اس نے کبیر دادا کی چھاتی پر تھپڑ مارا۔ کبیر دادا کے چہرے پر تکلیف ابھرتی دیکھ کر وہ فوراً اس کی چھاتی سہلانے لگی۔

سوری میری جان، مجھے یاد نہیں رہا تھا۔“

کبیر دادا نے قہقہہ لگایا۔ ”مذاق کر رہا تھا پگلی۔ ان ملائم ہاتھوں سے بھی چوٹ لگ سکتی ہے بھلا۔“ اس نے تناوش کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”تو ڈرایا کیوں؟“ اس نے منہ بسورا۔ ”اور خبردار اگر دوسری شادی کا نام لیا، سچ میں کچھ کھا کر جان دے دوں گی پھر روتے رہنا۔“

”یار ہر وقت دھمکیاں دینا اچھا تو نہیں ہوتا۔“

”اس کے علاوہ آپ سدھرتے بھی نہیں ہیں نا۔“ مسکراتے ہوئے وہ اٹھی۔ ”اچھا میں نماز پڑھ لوں۔ اور یاد ہے نا آپ نے بھی وعدہ کیا تھا۔“

”وہ اس صورت میں کہ تم تین دن حیدر آباد گزارو گی۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے میں بہرام بھیا کو کہہ دیتی ہوں مجھے امی کے گھر چھوڑ دے۔ چار دنوں بعد لوٹ آؤں گی۔“

”جاؤ.....“ کبیر دادا نے بے پروائی سے کہا۔ ”اگر واپسی پر تمھیں زندہ ملا تو ضرور شرط پوری کروں گا۔“

”یوں مرنے کا ذکر کر کے مجھے تکلیف دیتے ہوئے مزہ آتا ہے شاید۔“ ناراضی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گئی۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کی خواب گاہ سے نکل کر پاشا پارکنگ کی طرف بڑھا۔ اپنے محافظوں کو اس نے کال کر کے تیار

ہونے کا بتا دیا تھا۔ ملازموں کے کوارٹر کے سامنے اسے باقر اور رخسار پریشان بیٹھے نظر آئے۔ پاشا کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف بڑھے۔

رخسار نے کہا۔ ''دادا، ہم آپ کے پاس ہی آنے والے تھے۔''

''کیوں خیریت؟'' اس نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دادا، ہم بے خبری میں مار کھا گئے۔ انھوں نے پولیس کی وردیوں میں قریب آ کر ایک دم ہی ہمارے سروں پر رائفلیں تان لی تھیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، جو ہوا سو ہوا۔ اب پریشانی کیا ہے؟''

''کبیر دادا، تو یہ نہیں کہیں گے کہ جو ہوا سو ہوا..... انھوں نے تو رخصت کرتے وقت ہمیں ہوشیار رہنے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ اور اب یقیناً وہ ہماری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ پلیز دادا ہماری سفارش کر دیں۔'' دونوں کی شکل رونے والی ہو گئی تھی۔

''یار، ابھی تو میں جا رہا ہوں شہاب قصوری کی کوٹھی میں وہاں شمشیر دادا کی لاش کا کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ میری واپسی تک کبیر دادا سو جائیں گے۔ البتہ کل ان سے ضرور بات کر لوں گا۔''

''اگر اس سے پہلے انھوں نے ہمیں طلب کر لیا تو۔'' باقر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

اچانک ایک خیال آنے پر پاشا مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ایک حل ہے، تمھیں تھوڑی سی ہمت کرنا پڑے گی۔ اس کے بعد یقین مانو باز پرس تو چھوڑو کبیر دادا اس واقعے کا ذکر بھی تم دونوں کے سامنے نہیں کرے گا۔''

''آپ حل بتائیں دادا، ہمت ہم میں بہت ہے۔'' دونوں حل جاننے کے لیے بے تاب نظر آنے لگے۔

''ایسا کرو گڑیا کو جا کر اپنی پریشانی بتا دو، پھر وہ جانے اور کبیر دادا۔ تم دونوں کو کوئی اُف تک نہیں کرے گا۔''

''گڑیا؟'' وہ بیک زبان سوالیہ لہجے میں بولے۔

''یار بیگم صاحبہ کی بات کر رہا ہوں۔'' پاشا نے وضاحت کی۔

''ان سے کیسے بات ہو سکے گی اس وقت۔'' رخسار نے حیرانی سے پوچھا۔ ''خواب گاہ کے دروازے پر دستک دینے سے تو رہے۔''

''اس نے عشاء کی نماز اب تک نہیں پڑھی۔اور وہ نماز خواب گاہ کے ساتھ والے کمرے میں پڑھتی ہے ۔شاید اب تک وضو کر کے نکل آئی ہو یا تھوڑی دیر تک نکلے گی، تم بس ڈرائینگ روم میں اس کا انتظار کرنا۔'' یہ کہتے ہی پاشا نے کار آگے بڑھا دی۔اس کے محافظوں کی جیپ اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

''کیا کریں؟'' پاشا کے جاتے ہی باقر نے پوچھا۔

''کوشش کرتے ہیں۔'' رخسار نے ہمت کرتے ہوئے ڈرائینگ روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔باقر بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

وہ ڈرے ڈرے خواب گاہ کے باہر کھڑے ہو گئے۔انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔پندرہ بیس منٹ بعد ہی تناوش سر پر دوپٹا لپیٹے کمرے سے باہر نکلی۔اس کا تازہ دھلا چہرہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ وضو کر کے آ رہی ہے ۔ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک اس کی نظر ان دونوں کی جانب اٹھی۔ایک دم رکتے ہوئے وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ارے، آپ لوگ آ گئے۔ٹھیک تو ہو نا، کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی۔''

''ہم بالکل ٹھیک ہیں باجی صاحبہ.....مم میرا مطلب ہے بیگم صاحبہ۔'' باقر جلدی میں بیگم کی جگہ باجی کہہ گیا تھا۔

تناوش کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''آپ مجھے باجی کہا کرو، اچھا لگتا ہے۔''

باقر نے کہا۔''شکریہ باجی۔''

''اچھا، آپ لوگ آرام کرو، میں نماز پڑھنے لگی ہوں۔'' وہ کمرے کی طرف مڑی۔

رخسار نے جلدی سے کہا۔''باجی، ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔''

''کیوں خیریت؟'' وہ حیرانی سے ان کی طرف مڑی۔

رخسار نے کہا۔''باجی، آپ جانتی ہیں ہم بے قصور ہیں انھوں نے ایک دم ہی ہمارے سروں پر ہتھیار تان لیے تھے۔ہم چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔''

''بالکل۔'' تناوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

رخسار نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”باجی، یہ بات کبیر دادا کو کون سمجھائے گا وہ تو اسے غفلت جانتے ہوئے ہماری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔“

تناوش کے نقرئی قہقہے نے ان کے دلوں کی ڈھارس بندھائی۔ وہ خوش کن لہجے میں بولی۔ ”ارے اتنی چھوٹی سی بات پر پریشان ہیں آپ دونوں۔ جائیں کبیر آپ سے اس واقعے کا ذکر بھی نہیں کریں گے۔ یہ تو میرا اور میرے بھائیوں کا معاملہ تھا۔“

اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے وہ بیک زبان بولے۔ ”شکریہ باجی۔“

”شادی کی ہے آپ لوگوں نے؟“

”جی باجی۔“ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا ایسا کرو، عظیم کے پاس چلے جاؤ اور اسے میری طرف سے کہو کہ آپ دونوں کو بیس بیس ہزار روپے دے دے۔ ان پیسوں سے آپ دونوں نے اپنی بیگمات کو شاپنگ کرانا ہے۔“

”جی باجی، شکریہ باجی۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

تناوش مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھ گئے۔

”اللہ پاک نے جیسی صورت دی ہے اس سے زیادہ اخلاق دیے ہیں۔“ باقر متاثر کن لہجے میں بولا۔ ”ہمیں بھائی اور آپ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔“

رخسار بولا۔ ”امید نہیں تھی کہ یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ اور بجائے پٹائی کے انعام ملے گا۔“

”شکر ہے پاشا دادا کی بات مان لی تھی۔“ باقر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس وقت وہ دونوں ملازموں کے کوارٹرز کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عظیم کے کمرے میں روشنی جلتے دیکھ کر وہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر گھس گئے۔ وہ اس وقت ٹی وی پر کوئی انگلش فلم دیکھ رہا تھا۔

”آئیں جناب۔“ انھیں دیکھتے ہی وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”سنا ہے کافی کارنامے سرانجام دیے ہیں تم دونوں نے۔“

''اس میں شک ہی کیا ہے عظیم صاحب۔'' باقر نے فخریہ انداز میں سینہ چوڑا کیا۔

''یہ تو صبح کبیر دادا بتائیں گے کہ اس کارنامے پر کتنا انعام دینا بنتا ہے۔''

رخسار نے کہا۔ ''کبیر دادا کا تو کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ باجی نے بتا دیا کہ آپ سے بیس بیس ہزار روپے لے لیں۔''

''باجی، کون باجی اور کوئی باجی میرا کیسے بتا سکتی ہے؟'' عظیم حیران رہ گیا تھا۔

باقر نے جواب دیا۔ ''باجی ہیں، مسز کبیر دادا۔ اور اب آپ نے تصدیق کرنا ہے تو جائیں کر لیں، ہم ابھی ان سے مل کر آ رہے ہیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو۔'' عظیم اب تک حیران تھا۔

رخسار نے پوچھا۔ ''کیا ایسا جھوٹ ہم بول سکتے ہیں۔ باقی آپ بے شک تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''تصدیق کیسی جی، اس باجی کی وجہ سے تو آج شمشیر دادا جیسے گینگسٹر کی گردن سلامت نہ رہی۔ تصدیق کر کے میں نے کبیر دادا کا تھپڑ کھانا ہے۔'' عظیم کو تناوش کی وجہ سے کبیر دادا کا لگنے والا تھپڑ اب تک بھولا نہیں تھا۔ تکیے کے نیچے سے چابی نکال کر وہ لوہے کے سیف کی جانب بڑھ گیا جس میں ضرورت کے لیے چند لاکھ کی ہر رقم ہر وقت موجود رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے تین چار دن اس نے کبیر دادا کو بستر سے اٹھنے نہیں دیا تھا۔ گو کبیر دادا دوسرے دن ہی خود کو تندرست سمجھنے لگا تھا۔ یوں بھی مار کٹائی اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ مگر تناوش کا حکم ٹالنا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ بھی صبح سویرے نماز کے بعد نئے کپڑے پہن کر مکمل میک اپ کرتی اور سارا دن کبیر دادا کی خدمت میں لگی رہتی۔ ایسی تیمار دار کے ہوتے کس کم بخت کا دل بستر چھوڑنے کو کرتا۔ ایک رات وہ اس کی کہانی سننے پر مصر ہوئی۔

''آپ نے کہا تھا کہ آپ حافظ ہیں، مجھے اپنے بارے بتائیں نا کبیر.....''

''زخم کریدنے سے تکلیف ہی ملتی ہے گڑیا۔'' کبیر دادا دکھی ہو گیا تھا۔

''میں ہوں نا آپ کے تمام زخموں کا مرہم۔'' وہ لاڈ سے بولی۔ ''کیا نہیں ہوں۔''

کبیر دادا اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہیں سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ چند لمحے گہری سوچ میں کھوئے رہنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”ابو جان کا نام مولوی عمر علی خان تھا۔ وہ امام مسجد تھے اور مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی بنا رکھا تھا جہاں بچوں کو حفظ کرانے کے ساتھ عالم کا مختصر کورس بھی کراتے تھے۔ ابو جان کے ساتھ مدرسے میں دو اور استاد بھی تھے۔ پانچ سال کا تھا جب ابو جان نے مجھے اسکول میں داخل کرایا اور اس کے ساتھ میرا نورانی قاعدہ بھی شروع کرا دیا۔ صبح کی نماز میں وہ مجھے ساتھ لے جاتے اور پھر اسکول کا وقت ہوتے ہی میں وہیں سے اسکول چلا جاتا۔ مجھ سے تین سال بڑی بہن اسماء میرا ناشتا مدرسے ہی لے آیا کرتی تھی۔ آٹھویں کلاس میں تھا جب میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس دن ابو جان خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ امی جان نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی۔ باجی اسماء کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ بہت پیار کرتی تھیں وہ مجھ سے۔ ہم دونوں سے چھوٹی رقیہ گڑیا تھی۔ وہ مجھ سے چھے سال چھوٹی تھی۔ قرآن مجید کی دہرائی کے بعد ابو جان نے مجھے صرف و نحو پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ مجھے عالم بنانا چاہتے تھے۔ شاید ان کے خوابوں کی تکمیل ہو جاتی کیوں کہ مجھے بھی دینی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر ابو جان کی خواہش، امی جان اور باجی کی دعاؤں اور میری کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ ہمارے گھرانے کو پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی تھی۔ تبھی تو ابو جان نے وہ واقعہ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ دن دھاڑے ہونے والے قتل کی ایک واردات تھی۔ ابو جان گھر سے مدرسے کو آ رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی درجنوں افراد نے وہ منظر دیکھا تھا۔ قاتل ایک نامی گرامی بدمعاش تھا تو مقتول اچھے خاصے متمول خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مقتول کے خاندان والوں کی کوشش سے وہ بدمعاش گرفتار تو ہو گیا، مگر اس کے ڈر سے کوئی عینی شاہد گواہی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مقتول کے خاندان والوں کو ابو جان کے بارے سن گن ملی اور اس کے ورثاء ابو جان سے ملنے مدرسے میں پہنچ گئے۔ ابو جان بغیر کسی ہچکچاہٹ کے گواہی دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور وہی ہماری بدبختی کی شروعات تھی۔ میں شام کی نماز پڑھ کر مدرسے میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ابو جان شام کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لے جاتے اور کھانا وغیرہ کھا کر عشاء کی نماز کو لوٹتے۔ میری روزمرہ عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھانے کی تھی۔ امی جان اور اسماء باجی میرے انتظار میں بیٹھی ہوتیں۔ امی جان ہمیشہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھیں۔ جس دن ابو جان نے عدالت جا کر گواہی دی اس سے اگلے دن مغرب کی نماز

کے تھوڑی دیر بعد چند غنڈے ہمارے گھر پہنچ گئے۔ان کی تعداد پانچ تھی۔انھوں نے جاتے ہی امی جان ،ابو جان اور رقیہ گڑیا کے سامنے اسماء باجی کی عزت خراب کی اور پھر خنجر سے تمام گھر والوں کو قتل کر کے گھر کو آگ لگا دی۔کوئی محلے والا، کوئی راہگیر انھیں بچانے کی جرات نہ کر سکا۔اس دن بھی میں نے عشاء کی آذان دی جو عموماً میں ہی دیا کرتا تھا، کیوں کہ ابو جان میری آذان کو بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔اس دن جانے کیوں میں نے بہت محبت، محنت اور تجوید وقرات کے تمام اصولوں کی رعایت رکھتے ہوئے آذان دی تھی۔ایک ایسی آذان جس کی نماز ادا کرنے کی سعادت سے میں محروم رہ گیا تھا اور اس کے بعد میں کبھی نماز نہ پڑھ سکا، کبھی آذان نہ دے سکا اور کبھی تلاوت نہ کر سکا۔میں اس دن جیسے ہی آذان دے کر اسپیکر کے سامنے سے ہٹا اسی وقت ایک جاننے والا وہاں پہنچ گیا۔اس نے میرے گھر میں بیتنے والی قیامت سے آگاہ کیا۔میں دیوانگی کے عالم میں بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔ آگ نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔شاید میں اسی دیوانگی میں آگ کے اندر گھس جاتا، مگر لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔میں خالی ذہن تمام کی باتیں سنتا رہا۔اپنے پیاروں کی صورت دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا تھا۔نہ ابو جان کی نورانی شکل نظر آئی، نہ امی جان کی شفیق صورت، نہ اسماء بہن کی مقدس شکل اور نہ رقیہ کی معصوم صورت، تمام جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔" کبیر دادا کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے بے اختیار پانی بہنے لگا۔تناوش تڑپ کر آگے بڑھی اور اس کے اشکوں کو اپنے لبوں سے چننے لگی۔

"میں ہوں نا کبیر، میں آپ کے پاس ہوں نا۔میری طرف دیکھیں، روتے کیوں ہیں، بس مجھے نہیں سننا آپ کی کہانی، آپ روتے کیوں ہیں؟" وہ وارفتگی سے اسے تسلی دیتی رہی۔لیکن اس کی اپنی آنکھوں سے بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔اپنے کبیر کے غم نے اسے بھی رلا دیا تھا۔چند گہرے سانس لے کر کبیر دادا نے اپنی حالت سنبھالی اور پھر اس کی بات جاری رہی۔

"گھر والوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد میں وہاں رکا نہیں تھا بلکہ اس غنڈے صغیر عرف خنجر شاہ کی تلاش میں بھاگ پڑا۔مجھے اس کا ٹھکانہ وغیرہ معلوم نہیں تھا لیکن عقل نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔بس بے فائدہ بھاگ رہا تھا۔اسی طرح بھاگتے ہوئے سڑک عبور کرنے کی کوشش میں ایک کار سے ٹکرا گیا۔اور وہ کار شمشیر دادا کی تھی۔مجھے اتنی زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں لیکن حواس گم کر بیٹھا تھا۔اور اس حالت میں بھی میں خنجر شاہ کو جان سے

مارنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ شمشیر دادا کو میری حالت پر حیرانی ہوئی اور وہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ دو دن انھوں نے مجھے نیند کی گولیاں دے کر سلائے رکھا۔ جاگنے پر میرے حواس کام کر رہے تھے۔ شمشیر دادا نے میری کہانی سن کر مجھے تسلی دی اور ساتھ ہی کہا کہ خنجر شاہ کو مارنے کے لیے مجھے اس قابل بننا پڑے گا کہ اسے ہلاک کر سکوں ورنہ تو وہ ایک تھپڑ سے مجھے والدین کے پاس پہنچا دے گا۔ اور اس دن کے بعد میں شمشیر دادا کا ہو کر رہ گیا۔ اس نے مجھے سخت تربیت دی۔ دو تین سال کے اندر گینگ میں سوائے شمشیر دادا کے کوئی میرے سامنے ٹک نہیں پاتا تھا۔ وہیں میری ملاقات کاشف راجپوت سے بھی ہوئی۔ وہ یتیم خانے سے بھاگ کر شمشیر دادا کے گینگ میں شامل ہوا تھا۔ اور پھر ایک دن مجھے شمشیر دادا نے انتقام لینے کی اجازت دے دی۔ خنجر شاہ جو ابو جان کے مرنے کے بعد بڑی آسانی سے چھوٹ گیا تھا۔ میں اس کے اڈے پر پہنچ گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں توڑ کر میں نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔ اور اسی سے معلوم کر کے اس کے ان پانچوں آدمیوں کو جو میرے گھر پر ہونے والے حملے میں ملوث تھے ان کا بھی وہی حشر کیا، جو اُن کے گرو خنجر شاہ کا کیا تھا۔ اور اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کسی کو قتل کرنا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسا مرغی فروش کے لیے مرغی ذبح کرنا۔ میں حافظ عبدالکبیر علی خان سے کبیر دادا بن گیا۔"

کبیر دادا نے رک کر گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی تناوش کو دیکھا۔ اس کے دکھی چہرے پر سکون بھرا تبسم ابھرا، تناوش کے کندھوں کے پیچھے سے اپنا بازو لپیٹتے ہوئے اس نے اپنے قریب کیا۔ ایک ہاتھ اس کی گھنے ریشمی بالوں میں گھسایا اور بات آگے بڑھائی۔ "اور پھر میری زندگی میں ایک پری، ایک اپسرا، ایک گڑیا، ایک پاکیزہ روح کی آمد ہوئی۔ شاید میرے سارے زخموں پر مرہم رکھنے لیے، میرے ساتھ ہونے والی ساری زیادتیوں کا ازالہ کرنے لیے، مجھ سے چھینی گئی نعمتوں کے بدل کے طور پر، میری روکھی پھیکی زندگی کو رونق دینے کے لیے۔ میری ننھی دلھن میری تناوش آ گئی۔"

"میں نے آپ کے زخموں کو کرید کر آپ کو اذیت دی ہے نا؟" وہ دکھی نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"اگر کوئی دوسرا یہ سوال کرتا تو میرا جواب ہاں میں ہوتا۔"

''اور میرے پوچھنے پر کیا جواب ہوگا۔''

''کہہ تو دیا ہے تمھیں پا کر میرے سارے دکھوں کا ازالہ ہو گیا ہے۔''

''میرے لیے آپ کے دکھ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کبیر، یہ وقت مجھ پر بھی بیت چکا ہے۔ بھیا کے بے گناہ قتل پر میری بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اور ان کے قتل کا دکھ اور غم ساری زندگی مجھے بے چین و بے قرار رکھتا، مگر پھر اللہ پاک نے میری جھولی میں آپ کو ڈال دیا۔''

''پتا ہے گڑیا، مجھے لگتا ہے میں بہت عرصے سے تمھیں جانتا ہوں۔ شاید اس وقت سے جب میں چھوٹا سا بچہ تھا۔''

''جی..... جی، اس وقت میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ باقی چھوٹے سے بچے تو آپ اب بھی ہیں۔''

اس کے انداز پر کبیر دادا مسکرا دیا۔

''ایک بات مانیں گے؟'' اس نے ملتجی نظروں سے اسے گھورا۔

''اگر بس میں ہوئی تو ضرور مانوں گا۔''

''آپ نے عشاء کی آذان دی تھی اور اس کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ اٹھیں اور اس دن جو نماز رہ گئی تھی اسے آج پورا کریں۔''

''تناوش.....'' اس نے انکار میں سر ہلانا چاہا۔

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''کبیر آپ کہتے ہیں نا، مجھے آپ کی قسمت میں لکھ کر اللہ پاک نے آپ کے سارے دکھوں کا ازالہ کر دیا ہے۔''

''ہاں۔''

''تو اٹھیں پھر، جب اللہ پاک نے آپ کے دکھوں کا مداوا کر دیا ہے پھر ناراضی کیسی، اب تو آپ بھی اس کی بارگاہ میں سر جھکا کر اپنی کمیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کر لیں۔ وہ بہت جلدی معاف کر دیتا ہے۔ اتنی جلدی کہ ندامت کا آنسو آنکھ سے نکل کر زمین نہیں چھو پاتا اس سے پہلے وہ فرما دیتا ہے اے میرے بندے میں نے معاف کر دیا۔''

کبیر دادا کی آنکھوں میں جوار بھاٹا اٹھا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ تناوش اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی محبت بھرے انداز میں کہتی رہی۔ ”بس اتنی سی تو بات تھی۔ معاف کر دیا نا میرے اللہ نے۔ اب اٹھیں نماز پڑھتے ہیں۔ پھر میں آپ کی قرأت سنوں گی۔“

تھوڑی دیر بعد کبیر دادا برسوں پہلے ٹوٹ جانے والے تعلق کی ڈوری کا سرا تھامے اپنے اللہ پاک کے سامنے سربسجود تھا۔ تناوش نے اس کے وضو کے لیے جاتے ہی دیواروں پر لگی شیر کی تصاویر اتار کر الٹی لٹکا دی تھیں۔ تاکہ وہاں اطمینان سے نماز ادا کی جا سکے۔

☆.....☆.....☆

ناشتے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے وہ کبیر دادا کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات کرنا تھی۔“

”جی فرمائیں۔“ اس کے انداز سے کبیر دادا سمجھ گیا تھا کہ وہ پھر کوئی الٹی سیدھی ہانکنے والی ہے۔

”وہ آپ کا محافظ امتیاز ہے نا، اسے ساحل والے اڈے کا انچارج لگا دیں۔ اس کا گھر بھی وہاں قریب ہے تو.....“ کبیر دادا کی ناراضی بھری نظروں کو دیکھتے ہوئے اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”یہ تمھیں اس الو کے پٹھے نے کہا ہے۔“ کبیر دادا کا لہجہ کافی تپا ہوا تھا۔ ”یہ ساروں نے تمھیں گینگ کا سردار سمجھ لیا ہے کیا۔“

”نن.....نہیں ایسی بات نہیں ہے.....“ تناوش نے صفائی دینا چاہی۔

”تمھیں پہلے بھی منع کیا ہے کہ ان معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔“ کبیر دادا نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

”جب کہہ دیا کہ ایسا ہوگا، تو بس ہوگا۔“ تناوش ایک دم ہٹ دھرمی پر اتر آئی۔

”یار، تمھاری سمجھ میں میری بات نہیں آ رہی۔“ اس مرتبہ کبیر دادا کا لہجہ کافی سخت تھا۔

”زیادہ ڈانٹنے کی ضرورت نہیں میں نے رونا شروع کر دینا ہے۔“ تناوش نے دھمکی دی۔

”ہر بات پر ضد ٹھیک ہوتی تناوش، تم ان معاملات کو نہیں جانتی ہو۔ میں پاگل یا بے وقوف نہیں ہوں جو اسے محافظ کی جگہ پر رکھا ہوا ہے۔“ کبیر دادا نے اسے سمجھانا چاہا۔

”ہاں یا ناں میں جواب دیں۔“ وہ سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

”نہیں، نہیں، نہیں۔“ کبیر دادا نے انکار میں سر ہلایا۔”اور اس کے بعد تم کاروباری معاملات میں بالکل دخل اندازی نہیں کرو گی۔“

اس مرتبہ تناوش نے کچھ کہے بغیر خاموشی اختیار کرتے ہوئے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”اب ناشتا کرنا کیوں چھوڑ دیا۔“

”آپ کریں، مجھے بھوک لگی تو بعد میں کھالوں گی۔“ ناراضی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے پیچھے ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ البتہ کبیر دادا سے دور ہٹنے کی کوشش اس نے نہیں کی تھی۔

چند لمحے اسے خفگی بھری نظروں سے گھورنے کے بعد کبیر دادا ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ چند نوالے لے سکا تھا۔ تناوش کا ناشتا چھوڑ دینا اسے تکلیف دے رہا تھا۔ جوس کا گلاس خالی کر کے وہ جانے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔ تناوش اٹھ کر اس کی ٹائی باندھنے لگی، مگر ایسا کرتے ہوئے وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ ٹائی باندھ کر اس نے حسب عادت کچھ پڑھ کر کبیر دادا پر پھونک ماری اور خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ کبیر دادا دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گاڑیاں اس کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ عظیم نے کار کا دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھنے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا تناوش دروازے پر کھڑی اسی کی جانب متوجہ تھی، لیکن اس کے مڑ کر دیکھتے ہی سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ اسے گھورنے کے بعد وہ عظیم کو۔”امتیاز کو میرے پاس کمرے میں بھیجو۔“ کہہ کر واپس مڑ گیا۔ تناوش نے خاموشی سے ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے صوفے پر بیٹھتے ہی امتیاز اجازت مانگ کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

”اوئے گدھے، یہ کیا تم لوگوں نے میری بیگم سے الٹی سیدھی سفارشات کرانا شروع کر دی ہیں۔“

”دد..... دادا..... وہ میں.....“

”بکواس بند کرو یار۔“ وہ اسے خاموش کراتا ہوا بولا۔”جاؤ آج کا دن اڈہ انچارج اسد سے سب کچھ سمجھ لو اور کل اسے اپنی جگہ پر بھیج دینا، تم وہیں مرو۔“

”شکریہ دادا۔“

''وہ اس کا ادا کرو۔'' کبیر دادا نے منہ پھلائے بیٹھی تناوش کی طرف اشارہ کیا۔

امتیاز جلدی سے بولا۔ ''شکریہ باجی۔''

تناوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اگر اس کے بعد کبیر آپ کو ڈانٹتے ہیں تو مجھے ضرور بتانا۔''

اس کی بات پر کبیر اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ جبکہ امتیاز سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''اب ٹھونسو ناشتا، ورنہ تھپڑ کھالو گی۔'' امتیاز کے نکلتے ہی کبیر دادا غصے میں بولا۔

''اپنے ہاتھ سے کرائیں گے تو کرلوں گی۔'' وہ لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

کبیر دادا نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی حالت کو قابو کیا اور پھر بے بسی بھرے انداز میں نوالہ توڑ کر اسے ناشتا کرانے لگا۔ وہ آنکھوں میں شوخی لیے اسے محبت بھرے انداز سے گھورتی رہی۔ صحیح کہتے ہیں طاقت ور سے طاقت ور مرد پر بھی عورت حکمرانی کرتی ہے۔ رکھیل بن کر آنے والی رانی کی طرح حکم جما رہی تھی۔

''اب چائے کی پیالی تھام لو گی یا وہ بھی اپنے ہاتھ سے پکڑ کر تمھارے ہونٹوں سے لگانا پڑے گی۔'' پراٹھا اور انڈہ ختم ہوتے ہی کبیر دادا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

تناوش نے منہ بسورا۔ ''آپ اب تک غصے میں ہیں۔ بتا رہی ہوں میں سچ میں رونا شروع کردوں گی۔''

''یار، تمھاری دھونس دینے کی عادت کب ختم ہوگی۔'' کبیر دادا بے بس انداز میں مسکرایا۔

تناوش اطمینان سے بولی۔ ''جب آپ کے دل میں میری محبت ختم ہوجائے گی۔''

کبیر دادا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''مطلب کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

''اچھا آپ جائیں، میں چائے پی لیتی ہوں اور جلدی لوٹ کر آنا۔'' کبیر دادا سر ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر خوب صورت مسکان لیے اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی تھی۔

''دیکھ لو یار، کبیر دادا سے ایک منٹ بھی اس کی ناراضی برداشت نہیں ہوئی۔'' باقر، رخسار کو مخاطب تھا۔

رخسار بولا۔ ''امتیاز کے تو مزے ہوگئے، جانے کب سے اس کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے کل مشورہ دیا کہ اگر کام کروانا ہے تو باجی کو بتادو۔ اور ابھی باجی ناشتا تیار کرنے نکلی تو محترم پہنچ گیا اور دیکھو کتنی آسانی سے اس کا

کام ہو گیا۔"

باقر نے کہا۔"سچ کہوں تو پہلے پہلے مجھے باجی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔اب تو اپنی سابقہ سوچ پر ندامت ہوتی ہے۔"

"صحیح کہہ رہے ہو یار، اتنی مخلص، اتنی عزت احترام دینے والی اور ہمدرد اسے بہت پہلے کبیر دادا کی زندگی میں آجانا چاہیے تھا۔" رخسار نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"پہلے کب آتی یار۔" باقر ہنسا۔"وہ تو اب کچھ پہلے ہی آگئی ہے، عمر دیکھی ہے چھوٹی سی گڑیا لگتی ہے۔"

رخسار نے کہا۔"چھوٹی ہے، مگر سمجھ دار بہت زیادہ ہے۔یاد ہے جس دن آئی تھی، کبیر دادا نے اسے اپنے ساتھ کمرے تک لے جانا گوارا نہیں کیا تھا حالانکہ پہلے دن کی دلھن تھی اور اب اس کے لیے خود کار کا دروازہ کھول کر بٹھاتا ہے۔ابھی کی بات لے لو جب پہلے کبیر دادا کو رخصت کرنے آئی تو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کبیر دادا سے خفا ہے۔لیکن خفا ہونے کے باوجود اس نے نہ شوہر کا خیال رکھنا چھوڑا اور نہ اپنی روزمرہ ترک کی۔اگر خفا ہو کر کمرے میں بیٹھی رہتی تو شاید کبیر دادا واپس نہ مڑتا۔ناراض رہ کر بھی شوہر پر اپنی توجہ نچھاور کرنے پر کبیر دادا کیسے بھاگ کر واپس گیا اور اس نے اپنی بات منوالی۔"

"یقیناً امتیاز کی وجہ سے وہ کبیر دادا سے ناراض تھی۔" باقر نے اندازہ لگایا۔

"اس کے علاوہ کیا بات ہو سکتی ہے۔" رخسار نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کو کبیر دادا کے سینے پر سر دھرے وہ چاہت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔"میرے لیے کیا قربان کر سکتے ہیں؟"

"تم جانتی ہو۔" کبیر دادا کا جواب حسبِ منشا تھا۔

"کیا یہ سارا ٹھاٹ باٹ، یہ گاڑیاں بنگلے، عیش و آرام کی زندگی یہ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں؟"

وہ بے بسی بھرے لہجے میں بولا۔"ہاں، مگر یہ زندگی ایک ایسا کمبل ہے جو چاہ کر بھی میں خود سے دور نہیں کر سکتا۔"

”جانتے ہیں، عیش و آرام کی زندگی ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ خوب صورت لباس، قیمتی زیورات، حکم ماننے کے لیے نوکروں کی قطار، سونے کو پر تعیش خواب گاہ، سفر کے لیے آرام دہ گاڑیاں یہ سپنوں کی دنیا ہے، زمین ہی پر جنت کے مزے دینے والی مراعات۔ مگر کبیر میری جان! حرام کی دولت پر یہ عیش و آرام ہم کب تک کر پائیں گے۔ ایک دن مرنا تو ہے۔ کیا ہمارے پاس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے کوئی جواز کوئی بہانہ موجود ہے۔“

کبیر ہنسا۔ ”لگتا ہے میری زندگی سے تنگ آ گئی ہو۔“

”اگر میں کہوں ہاں، میرے لیے کبیر دادا کو قتل کر دیں تو کیا جواب ملے گا؟“

اس کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”کم از کم ناں میں جواب نہیں ملے گا۔“

اس کا چہرہ ملائم ہاتھوں کے پیالے میں بھرتی ہوئی وہ وارفتگی سے بولی۔ ”اب پیچھے نہ ہٹنا۔“

وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ ”کیا کبیر دادا تمھیں پیچھے ہٹنے والا لگتا ہے۔“

”تو سنیں۔“ وہ اسے اپنا منصوبہ بتانے لگی۔

اس کی بات کے اختتام پر کبیر دادا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یاد ہے ایک دن عظیم کے بیگم صاحبہ کہنے پر تم نے کہا تھا کہ تمھیں تناوش دادی کہا کریں۔“

”ایسے ہی مسخری کر رہی تھی۔“ اس کے ہونٹوں پر حیا آلود مسکراہٹ ابھری۔ ”ویسے آپ تو کمرے میں گئے تھے پھر کس نے بتایا۔“

”خود سنا تھا اور بڑی مشکل سے قہقہہ روکا تھا۔“

تناوش وارفتگی سے بولی۔ ”اور پھر یاد بھی رکھا۔“

”تمھاری کوئی بات بھول سکتی ہے کیا۔“ کبیر دادا نے حسب عادت اس کی ناک کی پھننگ کو مروڑا۔

”ویسے ابھی کیوں یاد دلایا۔“

”تمھاری تجویز سن کر مجھے لگا تمھارے ساتھ تناوش دادی والا نام خوب جچے گا۔ گینگ کے ارکان یوں بھی تمھاری سفارش سے اپنے کام نکلوانے لگے ہیں۔“

”میں سب کی باجی ٹھیک ہوں۔خواہ مخواہ میرا مذاق نہ بنوائیں۔“

”باجی بھی تو بڑی بہن کو کہتے ہیں۔اور تم اتنی سی ہو۔“ کبیر دادا نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھ کر اشارہ کیا۔

”آپ مجھے تنگ نہ کریں اور یہ بتائیں کہ میری تجویز پسند آئی کہ نہیں۔“

”جو خود پسند ہو اس کی ہر بات ہی پسند ہوتی ہے۔“

”مطلب پکا ہو گیا۔“

”کہہ تو دیا ٹھیک ہے یار۔“ کبیر دادا نے کہا اور تناوش نے مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کے خفیہ ٹھکانے پر تمام موجود تھے۔اس نے پہلی بار تمام گینگز کے بڑوں کو اپنے پاس بلایا تھا۔تمام کے بیٹھتے ہی کبیر دادا نے گفتگو کی ابتداء کی۔

”پچھلے دنوں کچھ ناپسندیدہ اور برے واقعات کا سامنا رہا ہے۔جو کچھ ہوا اس کے بارے تمام کو معلوم ہے تفصیل دہرانا وقت کا ضیاع ہوگا۔غلطی کس کی تھی، قصوروار کون تھا ان سب باتوں کو ماضی کا قصہ سمجھیں۔ہماری کامیابی اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہنے میں ہے۔تمام گینگز کو ان کا علاقہ بانٹا ہوا ہے اور ہر ایک کو اس حد بندی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنا کام کرنا ہوگا۔باقی شمشیر دادا کے زمانے میں تمام گینگز اپنی کمائی کا مخصوص حصہ شمشیر دادا کے حوالے کرتے تھے جو شہاب قصوری صاحب کے اقتدار میں ختم ہو گیا تھا۔میں بھی شہاب قصوری صاحب کی طرح آپ لوگوں سے کوئی حصہ طلب نہیں کروں گا، مگر ایک بات دھیان میں رہے کہ اس کے بعد اگر کسی نے کوئی سازش وغیرہ کی تو مجھ سے خیر کی امید نہ رکھے۔کسی کو اگر کسی سے شکایت ہے تو مجھے بتائے، تمام مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکالیں گے۔یقین مانیں ہمارے آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں ہمیں کمزور کر دیں گی۔اب اگر کسی کو میری بات سے اختلاف ہے تو اپنا نقطہ نظر بیان کر سکتا ہے۔“

”کبیر دادا، آپ کی باتیں بجا ہیں، پچھلے دنوں جو واقعات ہوئے انھیں زیر بحث لائے بغیر صرف ایک عرض کروں گا کہ بات بڑھانے میں زیادہ کردار آپ کا رہا ہے۔ایک لڑکی، گو میں اسے اپنی بہن سمجھتا ہوں مگر اس

کے لیے کسی کو قتل کرتے وقت کم از کم صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا۔ایس پی نے اپنی کرنی کا پھل پایا ہے لیکن فاسی بے گناہ قتل ہوا ہے۔اگر آپ اپنی بیوی کے لیے یوں جذباتی نہ ہوتے تو شاید بات اتنا آگے نہ بڑھتی۔" پاشا کی بات نے تمام کو ششدر کر دیا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبیر دادا کو اس طرح مطعون بھی کر سکتا ہے۔

کبیر دادا اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔"اوئے گدھے، جب کہہ دیا کہ ماضی کو نہ کریدو تو پھر ایسی بکواس کا مقصد۔"

پاشا احتجاج کرتے ہوئے بولا۔"کبیر دادا، میں ایک گینگ کا بڑا ہوں، آپ کسی بیٹھک میں مجھے یوں مخاطب نہیں کر سکتے۔باقی آپ کا یہ کہنا کہ ماضی کو نہ کریدا جائے تو گستاخی معاف ماضی کی غلطیوں ہی سے آدمی سیکھتا ہے۔نوشاد آفریدی اور اخلاق حسین نے غلطی کی اور جرمانہ ادا کیا، آپ نے غلطی کی اس کا کیا؟ اگر آپ شمشیر دادا کی طرح کے بڑے نہیں ہیں تو جواب دیں۔"

"دیتا ہوں جواب۔" کبیر دادا، کرسی سے اٹھ کر جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرنا چاہا۔

پاشا نے فوراً اس کی کلائی تھام لی تھی۔

کبیر دادا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔"بیٹھک برخاست کی جاتی ہے۔" کہہ کر وہ لمبے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

"پاشا یہ کیا بے وقوفی ہے۔" کاشف راجپوت نے اسے ڈانٹا۔

"یہ بے وقوفی نہیں حقیقت ہے دادا۔" تلخ لہجے میں کہتے ہوئے پاشا بھی باہر نکل گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" پاشا کے باہر جاتے ہی شہاب قصوری نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"جہاں تک میں سمجھا ہوں اصل بات کوئی اور ہے۔" اخلاق حسین نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔باقی بھی اپنی اپنی رائے دینے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

''یار، پاشا مسئلہ کیا ہے؟'' نوشاد اور اخلاق حسین وہاں سے سیدھا پاشا کے خفیہ اڈے پر پہنچے تھے۔ دونوں کو پاشا کے رویے کی کرید لگی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں یار،'' پاشا گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگ یونہی پریشان ہو گئے ہو۔''

''پریشان تو ہوں گے نا یار۔'' اخلاق حسین مصنوعی پریشانی ظاہر کرتا ہوا بولا۔ ''مشکل سے پہلے والے جھگڑوں سے نبٹے ہیں، اب تازہ جھگڑا کھڑا ہو گا تو برا تو لگے گا نا۔''

پاشا کے چہرے پر کش مکش کے آثار ابھرے یوں جیسے وہ اصل بات کہنے نہ کہنے کے بارے متذبذب ہو اور پھر ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے وہ بولا۔ ''کبیر دادا زیادتی کر رہا ہے۔''

''کیسی زیادتی۔'' اخلاق حسن نے لہجے میں ہمدردی سموتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ ہم سے بات کریں شاید اس مسئلے کا کوئی بہتر حل نکل آئے۔''

''وہ مجھے گینگ ختم کر کے اپنے گینگ میں شامل ہونے کا حکم دے رہے ہیں۔ ایک گینگ کا سربراہ ہونے کے بعد میں نمبر دو کے درجے پر تنزلی کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔'' پاشا نے بادل نخواستہ ساری بات اگل دی تھی

''مگر اس نے تو بڑے شوق سے تمھیں اپنے گینگ سے علاحدہ کر کے دوسرا گینگ بنانے کی اجازت دی تھی، پھر اب کیا ہو گیا ہے؟'' اخلاق حسین نے حیرانی ظاہر کی۔

''شاہ جی صحیح کہہ رہا ہے۔'' نوشاد کے دماغ میں بھی وہی سوال اٹھا تھا۔

پاشا بیزاری سے بولا۔ ''اس کی وجہ بھی وہی مصیبت ہے جسے میں اپنی بہن بنا بیٹھا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' دونوں کے منھ سے بیک وقت ایک ہی سوال نکلا تھا۔

''گڑیا کی حفاظت کے لیے کبیر دادا مجھے واپس اپنے گینگ میں لا رہا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ میں گڑیا کا محافظ بن کر رہوں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے یار، بے شک وہ میری بہن جیسی ہے، مجھے عزیز بھی ہے۔ لیکن میں ایک گینگ کا سربراہ ہو کر کسی لڑکی کا محافظ بن کر تو نہیں رہ سکتا نا۔''

''بات تو صحیح ہے آپ کی۔'' اخلاق نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ نوشاد بھی اثبات میں سر ہلانے لگا تھا۔

پاشا نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا ''اب آپ مشورہ دیں کیا کرنا چاہیے؟''

اخلاق حسین نے گلا کھنکھار کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ویسے، کبیر دادا اور آپ کا رشتہ ایسا ہے کہ ہم کچھ کہتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔“

”بھاڑ میں گیا رشتہ یار، سب سے پہلے انسان کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ میں بے وقوف تھا جو کبیر دادا کے لیے جان دینے کی سوچا کرتا تھا۔ اور اس کے دل میں میری اتنی عزت ہے کہ اپنی بیوی کا محافظ بنا دیا۔ اور خود اس کا ظرف دیکھو ایک لڑکی کے لیے اپنے استاد کی گردن توڑ دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں سب کو اپنی پڑی ہے۔ ہر ایک کا اپنا فائدہ اور اپنا نقصان ہے۔ جھوٹے اخلاقیات، منافقانہ عزت و احترام میں ڈوب کر میں اپنا مستقبل نہیں گنوا سکتا۔ اگر کسی کو اپنے فائدے کے لیے دوسرے کی جان کی قربانی دینا پڑ جائے تو کون قدم پیچھے ہٹاتا ہے۔ نہ آپ نے اور نوشاد آفریدی نے اپنے فائدے کے لیے ایس پی کی جان کا خیال کیا اور نہ کبیر دادا نے اپنے فائدے کے لیے استاد کو بخشا۔ پھر میں کیوں جھوٹے خلوص اور نقلی عزت و احترام کی چادر اوڑھ کر خود کو استاد کا فرماں بردار بنائے پھرتا رہوں۔ کیا میری اپنی ذات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میری کوئی عزت احترام نہیں ہے۔“ پاشا نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔

”تم سو فیصد حق پر ہو پاشا۔“ اخلاق حسین نے چہرے پر منافقانہ ہمدردی سجاتے ہوئے کہا۔ ”کبیر دادا زیادتی کر رہا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ نوشاد کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ بڑی مشکل سے انھیں کبیر دادا کے خلاف اتنا مضبوط سہارا ملا تھا وہ یہ موقع ہاتھ سے کب گنوا سکتے تھے۔

”تو پھر کیا کروں، اگر بغاوت کرتا ہوں تو کبیر دادا سے تو مجھے بھلائی کی کوئی امید نہیں ہے، جس شخص نے اپنے استاد کو معاف نہ کیا وہ شاگرد کو کہاں بخشے گا۔“ پاشا کے لہجے میں خوف کی جھلک واضح تھی۔

اخلاق حسین نے کہا۔ ”ہم دونوں آپ کے ساتھ ہیں پاشا۔“

”اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کیا کروں۔ اور آپ دونوں کے سامنے میں نے اسی لیے کھل کر بات کی ہے کہ آپ دونوں کبیر دادا کی اصلیت جانتے ہو۔“ پاشا نے ان پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے انھیں کھل کر مشورہ دینے کی ترغیب دی۔

اخلاق حسین معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”ہمارا مشورہ تو یہی ہے کہ کبیر دادا کی بات مان کر اس کے گینگ میں شامل ہو جاؤ اور جو وہ کہتے ہیں اس پر عمل کرو۔ اس میں تمھارا فائدہ اور بھلائی ہے۔“

”کیا۔“ پاشا حیرانی سے چلایا۔ ”اس میں میرا فائدہ کہاں سے آ گیا۔“

”لازمی بات ہے اگر کبیر دادا کو کچھ ہو گیا تو گینگ کی سربراہی آپ کو ملے گی، بلکہ آپ تمام گینگز کے سربراہ بن جائیں گے۔“ اخلاق حسین اسے کوئی بات سمجھنے کا اشارہ دے رہا تھا۔

”مگر، کبیر دادا ٹھیک ٹھاک صحت مند ہے اسے کیا ہو سکتا ہے۔“ پاشا اب تک اخلاق حسین کے مقصد کو نہیں پہنچا تھا۔

”انسان کو کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ اللہ پاک کے کاموں کی کس کو خبر ہے۔“ اس مرتبہ اخلاق حسین نے پہلے سے بھی واضح اشارہ کیا۔

پاشا کے چہرے پر بشاشت نمودار ہوئی یقیناً اس کی سمجھ میں اخلاق حسین کے اشارے آ گئے تھے۔ ”صحیح کہہ رہے ہو شاہ جی، زندگی کا کیا بھروسا۔ وہ کیا کہتے ہیں انسان تو بس پانی کا بلبلہ ہے۔ اور موت تو ہر کسی کو آنا ہے کسی کو پہلے، کسی کو بعد میں، کسی کو بستر پر اور کسی کو حادثے کی صورت میں۔ بہ ہر حال شکریہ مجھے لگتا ہے کہ کبیر دادا کا حکم ٹالنا بری بات ہو گی۔ اور اپنی بہن کا محافظ بننے میں کون سی شرم۔ کبیر دادا کے گینگ کے لوگ تو مجھے پاشا دادا ہی کہتے ہیں نا اور میرا خیال ہے اتنی عزت کافی ہے۔“

اخلاق حسین اور نوشاد نے بناوٹی قہقہہ لگایا۔ اخلاق کہنے لگا۔ ”بس یہی بات ہم بھی آپ کو سمجھانا چاہتے تھے کہ اپنے استاد کی بات ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ استاد کی بات مان کر ہی مرتبہ اور عزت ملتی ہے۔“

پاشا نشست سے اٹھتا ہوا بولا۔ ”میرا خیال ہے مجھے جا کر کبیر دادا کو منانا چاہیے۔ اور آپ لوگوں سے مشورے لینے کے لیے کبھی کبھار زحمت دینے آتا رہوں گا۔“

اخلاق حسین چاپلوسانہ لہجے میں بولا۔ ”ہمارے لیے مستقبل کے سربراہ کو مشورہ دینا باعثِ سعادت ہو گا۔“ وہ دونوں پاشا کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کے پاس شہاب قصوری اور بابر حیات بیٹھے تھے جب پاشا وہاں پہنچا۔

اسے دیکھ کر کبیر دادا نے رخ پھیر لیا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں دادا!..... میں نے نازیبا کلمات منہ سے نکالے تھے۔ مگر بہ خدا میرا ارادہ آپ کی توہین کرنے کا نہیں تھا۔" پاشا نے وہاں جاتے ہی ندامت ظاہر کی۔

کبیر دادا اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

پاشا دوبارہ بولا۔ "میں نے اپنے گینگ کے تمام ارکان کو آپ کے گینگ کے ساتھ مل جانے کے احکامات دے دیے ہیں۔"

اس مرتبہ کبیر دادا کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "ٹھیک ہے جاؤ اپنی ذمہ داری سنبھال لو۔"

پاشا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شہاب قصوری پوچھنے لگا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کبیر دادا یہ کیا معاملہ ہے۔ پہلے آپ نے خود پاشا کو اپنا آدھا علاقہ دے کر علاحدہ کیا تھا اور اب دوبارہ اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔"

کبیر دادا تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ "یار!..... سچ کہوں تو پچھلے دنوں، جو کچھ اخلاق حسین اور نوشاد آفریدی نے کیا ہے اس کے بعد مجھے اپنی بیگم کے بارے احتیاط برتنا پڑ رہی ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس ذمہ داری کو اچھے طریقے سے سرانجام دے سکے اور اس کام کے لیے مجھے پاشا بہترین لگا، کیوں کہ ایک تو لڑائی بھڑائی کا ماہر ہے، دوسرا میرے ساتھ مخلص بھی ہے اور سب سے بڑھ کر میری بیگم کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہے۔ اس بات پر پاشا تھوڑا خفا تو تھا مگر اب لگتا ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

"ایک گینگ کے سربراہ کو اپنی بیوی کا محافظ مقرر کر دینا کچھ جچتا نہیں ہے دادا۔" بابر حیات کے لہجے میں تشویش جھلک رہی تھی۔

کبیر دادا بے پروائی سے بولا۔ "اپنا برخوردار ہے یار!..... سال ڈیڑھ کے بعد دوبارہ اسے گینگ بنا کر دے دوں گا۔"

"ویسے مجھے بھی پاشا کے تیور کچھ بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے۔" جہاں دیدہ شہاب قصوری اسے

تنبیہ کیے بغیر نہیں رہ پایا تھا۔

''عارضی اثر ہے کل پرسوں تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' کبیر دادا اپنے موقف پر قائم تھا۔ ان دونوں نے بھی زیادہ تکرار کی کوشش نہیں کی تھی کہ فائدہ نقصان میں وہ شامل نہیں تھے۔

وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اجازت لے کر چلے گئے۔ بعد میں کاشف راجپوت کی بھی کال آئی وہ پاشا کے رویے پر حیرانی کا اظہار کر رہا تھا۔ کبیر دادا نے اسے اصل بات بتا کر پاشا کے رویے کی توجیح کر دی۔ کاشف نے بھی کبیر دادا کو اپنے موقف سے رجوع کرنے کا کہا، مگر کبیر دادا تناوش کی حفاظت کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کبیر دادا کو رخصت کرتے وقت تناوش نے ماں کے گھر جانے کی اجازت مانگ لی تھی۔

''ٹھیک ہے، اپنے بھائی پاشا کو ساتھ لے کر چلی جانا۔'' کبیر دادا نے فوراً اجازت دے دی تھی۔ کبیر دادا کے رخصت ہونے کے بعد وہ پاشا کو ساتھ لے کر گھر چلی گئی۔ پاشا نے اس کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے وغیرہ پی اور پھر یہ کہہ کر وہاں سے نکل آیا کہ۔ ''جب ضرورت ہو مجھے بلا لینا۔''

پاشا کو رخصت کر کے وہ ماں سے راز و نیاز میں مصروف ہو گئی۔ ماں کے سامنے کبیر دادا کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔

بشریٰ بولی۔ ''ہم عورتیں ہوتی ہی بے وقوف اور احمق ہیں۔ شوہر نے ذرا سی توجہ کیا دی، خود کو دنیا کا خوش قسمت فرد سمجھنے لگتی ہیں اور شوہر کی بے توجہی دیکھتے ہی خود سے بڑا بدنصیب کوئی نہیں لگتا۔''

''آپ کو میری خوشی اچھی نہیں لگتی یا میرے شوہر۔'' تناوش بگڑ گئی تھی۔

بشریٰ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''یہ بھی خوب کہی، میری شہزادی کی خوشی اگر مجھے عزیز نہیں ہو گی تو اور کسے ہو گی۔''

''اور میرے شوہر۔''

''اگر اس کے اعمال کو نظر انداز کر دوں تو بہت اچھے ہیں۔''

''آپ سیاسی جواب دے رہی ہیں۔'' تناوش لڑائی پر آمادہ تھی۔

بشریٰ نے پوچھا۔ ''اچھا تمھیں اس کے کام اچھے لگتے ہیں؟''

وہ بے باکی سے بولی۔ ”ان کی ذات کے آگے کچھ نظر آئے تو کہوں نا۔“

”تم تو ہو ہی پاگل۔“ وہ بیٹی کی دیوانگی پر پھیکے انداز میں مسکرا پڑی تھی۔

”امی جان، جتنی محبت وہ مجھ سے کرتے ہیں شاید ہی کوئی اپنی بیوی سے کرتا ہوگا۔“

”تو پھر اسے کہہ دو نا کہ جرم کا راستہ چھوڑ دے۔ کوئی محنت مزدوری کرے۔ یا پھر تم بھی عیاشی کی زندگی گزارنے کی عادی ہوگئی ہو۔“

”اسی کوشش میں لگی ہوں، جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گی۔“

”کوشش کا کیا مطلب، جب اتنی محبت کرتا ہے تو فوراً مان جانا چاہیے تھا۔“

تناوش نے منہ بنایا۔ ”ماں جی، بات ان کے ماننے کی نہیں، اس دلدل سے صحیح سلامت نکلنے کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے وہ کوئی پرچون فروش ہے کہ میرے کہنے پر اپنی دکان بند کر کے آلو چھولے کی ریڑھی لگا لے گا۔“

”کیا مطلب؟“ بشریٰ نے حیرانی ظاہر کی۔

”مطلب یہ ہے میری بھولی امی جی، کہ وہ اکیلے اس کام میں ملوث نہیں ہیں، کئی بڑی بڑی شخصیات جرم کی دنیا میں ان کے ساتھ شامل ہیں۔ اب وہ اتنی آسانی سے تو انھیں یہ کام نہیں چھوڑنے دیں گے۔ آخر وہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے تمام خفیہ طریقہ کار اور راز جاننے والا ان کے دھندے سے نکل کر شرافت کی زندگی گزارنا شروع کر دے۔ ایسا آدمی ان کے لیے سر پر لٹکنے والی ننگی تلوار کی طرح ہوتا ہے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”تو صاف کہو نا، نہ وہ یہ کام چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ تمھیں ہی اس بات کی کوئی فکر ہے۔“

”مجھے آرام کرنے دیں ماں جی۔“ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ جب اس کا تکرار نہ کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ یونہی کیا کرتی تھی۔

بشریٰ اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے بیٹی کا سر دبانے لگی۔

☆.....☆.....☆

”تم تو تناوش کے ساتھ گئے تھے۔“ پاشا کو اڈے پر دیکھتے ہی کبیر دادا مستفسر ہوا تھا۔

پاشا نے کہا۔ ”اسے گھر چھوڑ آیا ہوں۔ واپس آنا ہوگا تو مجھے کال کر لے گی۔“

”تمھارا دماغ جگہ پر ہے احمق آدمی!“ کبیر دادا کا غصہ دیدنی تھا۔ ”تمھیں اس کی حفاظت کے لیے ساتھ رکھا ہے اور تم یہاں پھر رہے ہو اگر اس کے ساتھ پھر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو۔“

پاشا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سر جھکا لیا۔ یہ منظر دیکھنے والے کافی افراد وہاں موجود تھے۔

”فوراً وہاں دفع ہو جاؤ۔“ کبیر دادا نے اگلا حکم صادر کیا اور وہ سر جھکائے باہر نکل گیا۔

وہاں سے وہ اخلاق حسین کے پاس پہنچا۔ اخلاق حسین نے اس کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ آدھا گھنٹا اس سے ضروری گفتگو کر کے وہ اخلاق حسین سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خفیہ اڈے پر اپنے چار قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر نہایت ضروری بات کر رہا تھا۔ چاروں اس کے نہایت اعتماد کے ساتھی تھے اور پاشا کے لیے کچھ بھی کرنے پر تیار ہو سکتے تھے۔

وہ بہ مشکل ان سے بات چیت ختم کر پایا تھا کہ تناوش کی کال آنے لگی۔ بیزاری بھرے انداز میں کال وصول کرنے کا بٹن دبا کر اس نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔ لیکن بات کرتے وقت اس کے لہجے سے بیزاری عنقا تھی۔

”جی گڑیا۔“

”بھیا آ جائیں نا۔“ تناوش کے لہجے میں شامل مان کسی سگے بھائی سے بات کرنے کا سا تھا۔

”میں بس آدھے گھنٹے میں تمھارے پاس ہوں گا۔“ رابطہ منقطع کر کے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ۔تمام کو کارروائی کی ترتیب واضح ہے نا۔“

”جی دادا۔“ سارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور وہ تناوش کے پاس جانے کے ارادے سے اٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

”خان صاحب، خوش ہو جاؤ ایک دو دن میں ہمیں بہت بڑی خوش خبری ملنے والی ہے۔“ اخلاق حسین ،نوشاد آفریدی کو مخاطب تھا۔

”کچھ پتا بھی چلے۔“ نوشاد آفریدی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”پاشا کو مکمل طور پر سارا طریقہ کار سمجھا دیا ہے۔اب بس اس کے عمل کرنے کی دیری ہے۔اور اس کا انحصار کبیر دادا پر ہے کہ وہ کب کوئی بہتر موقع فراہم کرتا ہے۔“

”منصوبہ ناکام ہونے کی صورت میں کہیں ہم پر بات نہ آجائے۔“ نوشاد نے تشویش ظاہر کی۔

”اس بار میں محتاط ہوں، ناکامی کا نتیجہ پاشا ہی بھگتے گا۔اور سچ کہوں تو اس کی کامیابی اور ناکامی ہر دو صورتوں میں ہمیں تو فائدہ ہی پہنچے گا۔استاد اور شاگرد دونوں میں سے ایک کی کمی بھی ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہوگی۔“

نوشاد پریشانی سے بولا۔”لیکن شاہ جی، اصل مصیبت تو کبیر دادا ہے نا۔“

”یار امکانی بات کی ہے، فکر نہ کرو اصل مصیبت ہی سے جان چھوٹے گی۔“ اخلاق حسین نے پراعتماد لہجے میں اسے تسلی دی۔اور نوشاد آفریدی نے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

جینے کا فلسفہ بھی عجیب ہے ایک کی خواہشات کی تکمیل دوسرے کی تمناؤں کا گلا گھونٹ کر ہوتی ہے۔ہرن کی جان جاتی ہے اور شیر کا پیٹ بھرتا ہے، شیر زندگی کی بازی ہارتا ہے اور شکاری اپنے کیریئر میں ایک کارنامے کے اضافے کی خوشی مناتا ہے۔مرنے والے کے گھر صف ماتم بچھا ہوتا ہے تو مارنے والا خوشی کے شادیانے بجا رہا ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

پاشا کے گینگ کو کبیر دادا کے گینگ میں ضم ہوئے پانچواں دن تھا۔پاشا زیادہ تر وقت کبیر دادا کی کوٹھی ہی میں گزارتا تھا۔البتہ کبیر دادا کی گھر آمد کے بعد وہ آوارہ گردی کرنے نکل جاتا تھا۔ایک رات اپنی کار کے خراب ہونے کی وجہ سے وہ کبیر دادا کی کار ساتھ لے گیا تھا۔اس رات کو وہ خاصی دیر لگا کر واپس لوٹا تھا۔کار گیراج میں کھڑی کر کے وہ کمرے میں سونے چلا گیا۔رات گئے سونے کے بعد باوجود وہ صبح سویرے ہی جاگ گیا تھا۔کبیر دادا کے جانے کا وقت قریب آیا تو وہ باہر لان میں آگیا، مگر مقررہ وقت پر کبیر دادا باہر نہ نکلا تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ بے چین ہو کر کبیر دادا کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”آجاؤ۔“ کی آواز سنتے ہی وہ اندر داخل ہوا۔کبیر دادا شب خوابی کے لباس میں صوفے پر بیٹھا خبریں سن

رہا تھا۔اس کا موڈ کافی خوشگوار تھا۔تناوش اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

''آئیں بھیا۔'' پاشا کو دیکھتے ہی وہ محبت پاش لہجے میں بولی۔

''آج دیر سے جانے کا ارادہ ہے دادا۔'' پاشا نے نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔تناوش اس کے لیے تھرماس سے چائے انڈیلنے لگی تھی۔

کبیر دادا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''کہاں یار، تمھاری بہن کے نرالے منصوبے ہوتے ہیں۔آج جمعہ کا دن ہے اور پورا دن محترمہ نے میرے ساتھ گزارنا ہے۔''

''ایسے ضد تو نہیں کرتے گڑیا۔'' پاشا فوراً تناوش کو سمجھانے لگ گیا تھا۔

''ضد تو نہیں کی بھیا، آپ خود انصاف کریں ہفتے میں ایک دن تو میرا بھی بنتا ہے نا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' پاشا کے کچھ کہنے سے پہلے کبیر دادا نے کہا۔''اس کی بات مان لی، مگر اس نے کافی دن پہلے ایک وعدہ کیا تھا اب وہ پورا نہیں کر رہی۔''

''کوئی وعدہ وغیرہ نہیں کیا تھا۔'' تناوش نے انکار میں سر ہلایا۔اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

پاشا نے بادل نخواستہ پوچھا۔''کیسا وعدہ کچھ مجھے بھی پتا چلے۔''

''یاد ہے اخلاق حسین کے گھر تقریب میں محترمہ میرے ساتھ گئی تھی۔اس وقت اس نے مجھے موبائل فون پر پیغام بھیجا تھا کہ اسی وقت واپس گھر چلنے پر یہ کسی لونگ لاچی والے گانے پر مجھے رقص کر کے دکھائے گی۔کل ہی میں نے بخش کو موبائل میں یہ گانا سنتے دیکھا۔بس اسے کہا کہ میرے موبائل میں بھی وہ گانا ڈال دے۔اب صبح سے اسے وہی کہہ رہا ہوں کہ گانا میں لے کے آ گیا ہوں رقص اس نے کرنا ہے۔''

وہ حیا آلود لہجے میں بولی۔''بھیا، ایسے ہی تنگ کر رہے ہیں مجھے۔''

کبیر دادا ترنت بولا۔''کھاؤ قسم تم نے ایسا پیغام نہیں لکھا تھا۔''

''وہ تو.....وہ تو.....بس مذاق کیا تھا۔'' تناوش جواب دیتے ہوئے ہکلا گئی تھی۔

''یہ مسئلہ آپ لوگ خود نبٹائیں۔میں چلتا ہوں۔'' پاشا مایوس انداز میں وہاں سے باہر نکل آیا۔اسی دوران ڈرائیور شہزاد اس کے پاس پہنچ گیا۔

”دادا، کار کی چابی تو دیں، عظیم صاحب بتا رہا ہے کہ آج کبیر دادا نے کہیں نہیں جانا تو میں نے سوچا کار کی سروس ہی کرا لوں۔“

”کل وقت نکال کر کرا لینا فی الحال رہنے دو مجھے ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ پاشا نے چابی اس کے حوالے نہیں کی تھی۔

”وہ جی دادا۔“ کہہ کر واپس مڑ گیا۔

شام کو کبیر دادا، تناوش کو اس کی ماں سے ملوانے لے گیا۔ اس وقت پاشا ڈرائینگ روم ہی میں بیٹھا تھا۔ انھیں تیار ہو کر جاتے دیکھ کر پاشا فوراً کار کو گیراج سے نکال کر لے آیا تھا۔ کبیر دادا نے محافظوں کو ساتھ لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کے گھر سے نکلتے ہی پاشا بھی اپنی کار لے کے نکل آیا۔ پتا نہیں خراب کھڑی کار کیسے ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کا رخ ساحل والے اڈے کی طرف تھا۔ ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے موبائل فون نکال کر کبیر دادا کا نمبر ملایا۔

”کیا بات ہے پاشا؟“ اس نے کال وصول کرتے ہی پوچھا۔

وہ تیز تیز لہجے میں بولا۔ ”دادا، بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے آپ فوراً ساحل والے اڈے پر پہنچیں۔“

”مگر.....“

کبیر دادا کی بات کو کاٹتے ہوئے اس نے بے صبری کا اظہار کیا۔ ”آپ جلدی تشریف لائیں۔ پھر واپس چلے جانا، اب تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔“

”اچھا میں آ رہا ہوں۔“ کبیر دادا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد اسے دور سے کبیر دادا کی کار آتی دکھائی دی۔ اس جگہ لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ کبیر دادا کی کار لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ دوربین نکال کر اس نے کار میں کبیر دادا کے اکیلا ہونے کی تسلی کر لی تھی۔

اور پھر ہولناک دھماکے کی آواز دور دور تک سنی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کالے رنگ کی مرسڈیز کئی گز فضا میں اچھل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ کار میں موجود اکیلا وجود گوشت کے لوتھڑوں کی صورت میں کار کے ٹکڑوں

کے ساتھ ہی بکھر گیا تھا۔ پاشا نے افسردہ نظروں سے کار کو دیکھا اور موبائل فون نکال کر اخلاق حسین کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے کال وصول کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

"بہت افسوس ناک خبر ہے شاہ جی، کبیر دادا کی کار دھماکے سے اڑا دی گئی ہے اور بدقسمتی سے وہ اس وقت کار ہی میں موجود تھے۔ جیسے ہی یہ خبر آپ تک پہنچتی ہے فوراً میرے پاس آ کر مجھے بہ ذات خود مطلع کرنا۔"

"سچ۔" خوشی سے اخلاق حسین کی باچھیں کھل رہی تھیں۔

"ہاں شاہ جی، میرا سرپرست، میرا استاد اور میرا بڑا نہیں رہا۔" پاشا نے رابطہ منقطع کیا اور کار کا رخ مخصوص جانب موڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کی کوٹھی میں تمام گینگسٹرز اپنی بیگمات وغیرہ کے ساتھ جمع تھے۔ پاشا، تناوش کو بھی گھر سے لے آیا تھا۔ کبیر دادا کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ گم سم سی تھی۔ مختلف عورتوں نے تعزیت کے بہانے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی مگر کسی کی بات کا جواب دیے بغیر وہ خالی خالی نظروں سے تمام کو دیکھتی رہی۔ فرحانہ بھی مغموم صورت لیے وہیں موجود تھی زندگی میں پہلی بار اسے تناوش سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر اس سے رہا نہ گیا تناوش کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"فرحانہ باجی! یہ عورتیں پریشان کیوں نظر آ رہی ہیں۔" اس کے معصومیت بھرے سوال پر فرحانہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

"وہ والی باجی کہہ رہی تھی کبیر حادثے میں فوت ہو گئے ہیں۔ ہونہہ، اتنی بھولی ہیں انھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔" تناوش نے ایس پی کی بیوی سلطانہ کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔

"وہ سچ کہہ رہی ہیں پگلی۔" فرحانہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

مگر تناوش اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی لے میں شروع رہی۔ "نہیں ایسی بات نہیں ہے، آج پورا دن انھوں نے میرے ساتھ گزارا، شام کو ہم امی جان کی طرف سے گئے تھے وہیں پر انھیں کال موصول ہوئی اور

وہ تھوڑی دیر میں لوٹنے کا کہہ کر گئے ہیں، ابھی تک نہیں لوٹے۔ آج تو آنے دو بالکل بھی بات نہیں کروں گی، دیکھنا کیسے منتیں کریں گے۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" فرحانہ سسکی۔

"اتنے مہمان جمع ہیں اب تو انھیں آجانا چاہیے تھا۔" تناوش پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ "باجی یہ تمام ہماری شادی کی خوشی میں جمع ہوئے ہیں نا۔"

فرحانہ اس کی بات کا جواب نہیں دے سکی تھی۔ راحت خالہ کو شاید پاشا نے تمام کے لیے چائے بنانے کا کہا تھا۔ اسے باورچی خانے کی طرف بڑھتا دیکھ کر تناوش کہنے لگی۔

"راحت خالہ، سالن میں خود بناؤں گی، وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔ صبح ناشتے کے بعد سے انھوں نے کچھ نہیں کھایا۔"

پاشا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ "چلو گڑیا، تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔"

تناوش نے پریشانی ظاہر کی "مگر بھیا، وہ آکر خفا ہو جائیں گے کہ مہمان بیٹھے ہیں اور میں سونے کو لیٹ گئی ہوں۔"

"میں انھیں سمجھا دوں گا۔" پاشا اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے خواب گاہ میں لے گیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیند کی گولی نکال کر اس نے تناوش کو کھلائی اور خواب گاہ کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

نوشاد اس وقت اخلاق حسین کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ "اگر یہ نام نہاد بھائی نہ ہوتا تو چھوکری تو ہاتھ میں تھی۔"

اخلاق نے کہا۔ "چلو دیکھ لیتے ہیں پاشا اس کے لیے کیا کرتا ہے، پھر کوئی منصوبہ بندی سوچ لیں گے۔ فی الحال تو ٹھنڈر کھو غریب تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہے۔"

اسی وقت راحت خالہ تمام کے لیے چائے لے آئی تھی۔ زیادہ تر نے چائے پینے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پاشا تمام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں گھر واپس لوٹ کر آرام کا مشورہ دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کبیر دادا کی لاش انھیں نہیں ملی تھی۔ بس گوشت کے چند لوتھڑوں اور کپڑے کی کچھ دھجیوں کو لکڑی کے تابوت میں بند کر کے دفنا دیا گیا تھا۔ تناوش کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی حالت کے پیش نظر پاشا کو اسے ماں کے پاس بھیجنا پڑا۔ البتہ اس کی حفاظت کے لیے باقر اور رخسار کو بھی ساتھ بھیج دیا تھا۔

کبیر دادا کی موت کے تیسرے دن تمام گینگسٹرز کبیر دادا کے خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ سربراہی کی کرسی خالی پڑی تھی اور اس کرسی کی پشت کو پکڑ کر پاشا تمام کی طرف متوجہ تھا۔

"بیٹھک کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کرسی پر بیٹھنے کے لیے کسی ایک کا چناؤ کیا جائے۔ اس ضمن میں کاشف دادا کے علاوہ اگر کوئی بھی مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو سامنے آسکتا ہے۔ تاکہ بیٹھک کے آغاز سے پہلے مقابلہ کر لیا جائے۔" پاشا نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔

"کاشف دادا!..... اگر آپ یہاں آنا چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔" اس مرتبہ پاشا نے کاشف راجپوت کو دعوت دی۔

کاشف راجپوت کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "شکریہ پاشا، مگر میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں۔ آپ سے پہلے کبیر دادا نے بھی مجھے یہی دعوت دی تھی اور میں نے اسے بھی انکار کر دیا تھا۔"

"کیا آپ مجھے بیٹھنے کی اجازت دیں گے۔" بیٹھنے سے پہلے پاشا نے ایک مرتبہ پھر کاشف دادا سے اجازت طلب کی۔

کاشف نے کہا۔ "تم میری اجازت کے بغیر بھی بیٹھ سکتے تھے۔ بہر حال عزت افزائی کا شکریہ۔ پلیز تشریف رکھیں۔"

"پاشا سربراہی کی کرسی پر نشست سنبھالتا ہوا بولا۔ "ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا، شاید آپ لوگوں نے پہلے بھی سنا ہو کہ ایک شخص اپنے بوڑھے باپ سے جان چھڑانے کے لیے اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر پہاڑ پر لے گیا۔ اور جب وہ باپ کو نیچے پھینکنے لگا تو اس کے ساتھ موجود بیٹے نے کہا۔ "ابو جان رسی دادا کے ساتھ نیچے نہ پھینک دینا۔"

باپ نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹا۔“

تو کہا۔ ”جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو میں بغیر رسی کے آپ کو یہاں تک کیسے گھسیٹ کر لاؤں گا۔“

”پتا نہیں اس وقت یہ واقعہ میرے دماغ میں کیوں در آیا۔ خیر میں کہنے لگا تھا کہ کبیر دادا کا قاتل یا وہ لوگ جو اس کے قتل کی سازش میں شریک تھے میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ باقی چند دن پہلے کبیر دادا نے اس کرسی پر بیٹھ کر کچھ باتیں کی تھیں۔ وہ سب کو یاد ہوں گی اس لیے میں دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بس وہ احکامات اسی طرح جاری رہیں گے۔ اور سب سے آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کبیر دادا کی بیوی کو میں چھوٹی بہن نہیں سمجھتا بلکہ وہ حقیقت ہی میں میری چھوٹی بہن ہے۔ اگر اس کے خلاف کسی کے گندے دماغ میں کوئی غلیظ خیال رینگا، یقین مانو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ میں صرف متعلقہ شخص کو نہیں اس کے پورے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دوں گا مع دودھ پیتے بچوں کے۔ یہ میرا آخری اور واضح پیغام ہے۔ اور یقیناً عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میری باتوں سے اختلاف رکھنے والا اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔“

کسی نے بھی زبان کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین لمحے انتظار کے بعد پاشا نے کہا۔ ”تو، بیٹھک ختم ہوئی۔“ سارے ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ صرف کاشف راجپوت وہیں بیٹھا رہا۔ تمام کے باہر جاتے ہی وہ پاشا کو مخاطب ہوا۔

”پاشا، تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”صحیح کہہ رہے ہو دادا، کبیر دادا کو وداع کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا، لیکن کیا کرتا میں مجبور ہو گیا تھا۔ میرے پاس چناؤ کا اختیار ہی نہیں رہا تھا۔“

کاشف نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو اب تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔“

”آپ کی موجودگی کے سہارے نے مجھے حوصلہ دیا ورنہ میں اتنی ہمت نہ کر پاتا۔“

کاشف راجپوت چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہوشیار رہنا، کچھ لوگوں کو تم بہت زیادہ کھٹک رہے ہو۔“ یہ کہتے ہی وہ چل پڑا۔ اس نے پاشا کا جواب سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں بیٹھک کے اختتام پر اخلاق حسین کے ٹھکانے پر پہنچے تھے۔ ”یار، مجھے تو پاشا کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔“ بیٹھتے ساتھ اخلاق حسین نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

نوشاد آفریدی تپتا ہوا بولا۔ ”بھاڑ میں گئے تیور مجھے تو اس پھلجڑی کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ کبیر دادا جیسے سانپ کو مار کر بھی وہ خزانہ مجھے پہلے جتنا ہی دور دکھائی دے رہا ہے۔“

اخلاق حسین اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ”ہمیں انتظار کرنا پڑے گا، فی الحال وہ جذباتی ہو رہا ہے۔ تازہ تازہ اپنے استاد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے حرامی نے۔ اسے سنبھلنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔ آہستہ آہستہ بھول جائے گا اس حادثے کو بھی اور اپنی منہ بولی بہن کو بھی۔ تب کچھ کریں گے۔“

نوشاد نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”قسم سے میرا تو دل کر رہا ہے اس سے شادی کر لوں۔“

”بکواس نہ کرو، میں بھی اس حسینہ کا امیدوار ہوں۔“ اخلاق حسین اسے ڈانٹے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

نوشاد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چھوڑو یار، یونہی دماغ خراب کر دیا فاحشہ نے۔ جتنی بھی کوششیں کی ہیں اتنا ہی قابو سے باہر ہوتی گئی ہے۔ پتا نہیں اس خبیث کبیر دادا سے پہلے اس پر میری نظر کیوں نہیں پڑی تھی۔“

”ٹھیک کہا خان صاحب، فی الحال اس کے خیال کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ پاشا کی دھمکی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔“ اخلاق حسین نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

”تو اب تمھارا کیا ارادہ ہے۔“ پاشا اس وقت تناوش کے گھر میں ماں بیٹی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ رخسار اور کبیر بھی وہاں قریب ہی موجود تھے۔

تناوش نے کہا۔ ”ہم کراچی سے کہیں اور منتقل ہونا چاہتے ہیں بھیا!..... آپ بس ہمارے گھر کا سودا کروا دیں اور کسی دوسرے شہر میں سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ دیں۔“ حیرت انگیز طور پر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

وہ اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ”چند لاکھ کے گھر کی فکر کیوں کرتی ہو، تمھیں کبیر دادا کے ترکے میں چھوڑے ہوئے کروڑوں روپے ملیں گے۔“

”ایک پائی بھی نہیں لوں گی بھیا، بلکہ کبیر نے جو کچھ میرے لیے خریدا تھا وہ بھی یہیں چھوڑ جاؤں گی ۔سوائے چاندی کے اس چھلے کے۔“ اس نے انگلی میں پہنے ہوئے چھلے کو ہونٹوں سے لگایا۔

”مگر کیوں۔“ پاشا حیران رہ گیا تھا۔

”کیوں کہ ہمیں حرام کا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے بیٹا۔“ خاموش بیٹھی بشریٰ نے منہ کھولا۔

”جیسا آپ چاہیں ماں جی!“ پاشا، تناوش کی نسبت سے اسے ماں جی ہی کہنے لگا تھا۔

تناوش نے بے تابی سے پوچھا۔”تو کب تک ہو جائے گا۔“

”امید ہے پرسوں تک میں آپ دونوں کو بھجوا دوں گا۔“

تناوش نے کہا۔”میں بے چینی سے منتظر ہوں۔“

تناوش کی بے صبری پر پاشا مسکرا دیا تھا۔”گڑیا صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جہاں اتنا برداشت کر لیا وہاں دو دن اور سہی۔“

تناوش نے دکھی لہجے میں امید ظاہر کی۔”بھیا، شاید کبھی ایسا وقت آئے کہ آپ کو میری بے صبری کا ادراک ہو۔ مجھ پر جو بیت رہی ہے اس سے میں یا میرا رب ہی واقف ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ پاشا نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔”مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ آپ لوگوں کے جانے بعد میں کتنا اکیلا اور تنہا رہ جاؤں گا۔“

تناوش افسردگی سے مسکرائی۔”اس بارے ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔“

”صحیح کہہ رہی ہو۔“ کہہ کر پاشا نے بشریٰ کے سامنے سر جھکا دیا۔

بشریٰ نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔”جیتے رہو بیٹا۔“ اور پاشا وہاں سے باہر نکل گیا۔

رخسار اور باقر اس وقت دروازے پر کھڑے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

باقر نے کہا۔”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ کبیر دادا کے قتل میں پاشا دادا کا ہاتھ ہے۔ نہ جانے باجی کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی۔“

رخسارا سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''یار، چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اسے ان چال بازیوں کا کیا پتا۔ اور ویسے اسے معلوم ہو بھی جائے تو کیا کر لے گی۔''

باقر نے کہا۔ ''کم از کم پاشا کے چہرے پر موجود نقاب تو ہٹ جائے گی۔ کتنے خلوص اور معصومیت سے وہ اسے بھائی کا درجہ دیے ہوئے ہے۔ بے چاری کو اس منافقانہ رشتے سے تو نجات ملے گی۔''

رخسار نے مشورہ دیا۔ ''چھوڑو یار، پہلے ہی غریب کا بھائی قتل ہو گیا تھا۔ اس نے پاشا سے دل بہلایا ہوا ہے، رہنے دو یہ رشتہ اس کے پاس۔''

باقر نے کہا۔ ''میں اسے اشارے کنایے میں دو تین دفعہ اس طرف متوجہ کر چکا ہوں، مگر اتنی بھولی ہے اس کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا۔''

''تم نے ضرور مرنا ہے بے وقوف۔'' رخسار نے اسے ڈانٹا۔ ''آئندہ ایسی کوشش نہ کرنا۔''

اس وقت تو باقر خاموش رہا مگر اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ رات کو اسے تناوش سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ان دونوں میں سے آدھی رات تک ایک آدمی جاگ کر دروازے پر موجود رہتا جبکہ دوسرا صحن میں چارپائی بچھا کر لیٹ جاتا۔ تناوش اور اس کی ماں کمرے ہی میں سوتی تھیں۔ رات کے وقت تناوش عموماً صحن میں نکل کر گھومنا شروع کر دیتی۔ اس وقت بھی تناوش بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکلی اور صحن میں چکرانے لگی۔

باقر ہمت مجتمع کرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ باجی ایک بات کہنا تھی۔''

''کہو بھائی۔'' وہ چونکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ یہ بات آپ کے اور میرے درمیان راز رہے گی۔'' باقر نے اپنی حفاظت کی گنجائش باقی رکھنا چاہی۔

''شاید آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کبیر کی موت میں بھیا ملوث ہے، ہے نا؟'' نہ جانے اس نے کیسے اتنا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

وہ ہکلایا۔ ''جج..... جی باجی۔ یہی بات ہے۔''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''کبیر اس وقت یہیں میرے ہی گھر میں موجود تھے جب انھیں کال

وصول ہوئی کہ جلدی سے ساحل والے اڈے پر پہنچیں۔اور یہ کال بھیا نے کی تھی۔"

باقر نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔"تو آپ پہلے دن سے یہ جانتی ہیں۔"

"ہاں....."اس نے افسردہ انداز میں سر ہلا دیا۔

"پھر پاشا دادا کو باور کیوں نہیں کرایا۔"

"وہ جانتے ہیں، کہ مجھے اس بارے سب معلوم ہے۔لیکن مجھے وہ چھوٹی بہن ہی کی طرح چاہتے ہیں۔ان سے دشمنی مول کر میں کبیر کو تو واپس نہیں لا سکوں گی البتہ بھائی کو اور ان کی ہمدردیوں کو کھو دوں گی۔کیا آپ بھی چاہتے ہیں کہ میں مکمل طور پر بے آسرا رہ جاؤں۔"

"نن.....نہیں باجی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"باقر گڑبڑا گیا تھا۔

"بھائی، آپ کی ہمدردی پا کر اچھا لگا۔اور اگر میری خوشی عزیز ہے تو کبھی بھیا کے ساتھ غداری نہ کرنا۔"

باقر سر جھکا کر خفیف سا پیچھے ہٹ گیا۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ چھوٹی سی لڑکی اتنا کچھ جانتی ہوگی۔اس کے حوصلے اور ہمت سے بھی وہ خاصا متاثر ہوا تھا۔محبت کرنے والے شوہر کو کھو کر بھی اس اعصاب کسی جہاں دیدہ عورت کی طرح کام کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

تناوش سے ملاقات کے دوسرے دن رات کے دو بجے پاشا کو ایک گمنام نمبر سے کال وصول ہوئی۔اس کے "ہیلو۔" کہتے ہی دوسری جانب سے ایک شناسا آواز ابھری۔

"میں تین بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"میں منتظر ہوں۔"رابطہ منقطع کر کے وہ سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں تناوش کے گھر کی طرف روانہ تھا۔تناوش کے گھر کے سامنے کار رکتے ہی باقر نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔آٹومیٹک رائفل اس نے تیاری حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔مگر کار سے پاشا کو اترتا دیکھ کر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"رخسار کو اٹھاؤ اور دونوں واپس کوٹھی پر پہنچو۔"پاشا نے اندر گھستے ہی اسے حکم دیا۔

"جی دادا۔" کہہ کر وہ سوئے ہوئے رخسار کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش بھی ان کی آواز سن کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

"بھیا....." اس نے سوالیہ انداز میں پکارا۔

"ہاں گڑیا میں ہوں۔ امی جی کو بھی جگاؤ دو آپ لوگ ابھی یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

"جی بھیا۔" تناوش کے لہجے میں شامل خوشی باقر اور رخسار کو حیران کر گئی تھی۔ مگر وہ زیادہ سوچنے کی زحمت کیے بغیر گھر سے باہر نکل گئے۔ گلی سے نکلتے ہی انھیں خالی رکشا مل گیا تھا۔

ان دونوں کے غائب ہوتے ہی پاشا، ماں بیٹی کا ہاتھ بٹانے کے لیے کمرے میں داخل ہوا مگر وہ پہلے سے سارا سامان سمیٹ چکی تھیں۔ یہ کام وہ سر شام ہی سرانجام دے چکی تھیں۔

"کتنی دیر ہے بھیا۔" تناوش نے بے صبری سے پوچھا۔

"تین بجے تک تمھیں لینے گاڑی پہنچ جائے گی۔"

تناوش نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی سکرین روشن کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ تین بجنے میں چند منٹ ہی رہتے تھے۔ اور پھر اس کی سماعتوں نے گلی میں گاڑی کے رکنے کی آواز سنی۔ وہ بے صبری سے دروازے کی طرف بھاگی۔ پاشا اور بشریٰ اس کی حالت دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

دروازے پر پہنچ کر وہ رکی اسی وقت دروازے کو دھکیلتا ہوا شلوار قمیص میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ تناوش اس کی طرف یوں بڑھی جیسے لوہا مقناطیس کی طرف حرکت کرتا ہے اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھی۔

"کبیر....." تناوش کے لہجے میں محبت، بے صبری، بے تابی، خلوص اور نہ جانے کون کون سی کیفیات شامل تھیں۔

"کبیر کی جان۔" آنے والے نے محبت بھرے انداز میں اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور اس کے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ اسے سر سے بلند کر کے وہ ہنسا۔

"مجھے یاد کیا تھا۔"

تناوش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، بھولے ہی نہیں تھے یاد کیا کرتی۔''

''اچھا ابھی وقت نہیں ہے، ہم نے کافی لمبا سفر طے کرنا ہے۔'' اسے نیچے اتار کر وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پاشا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی وہ اس سے لپٹتے ہوئے رو پڑا۔

''ارے پاگل روتے کیوں ہو۔'' کبیر دادا نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

پاشا نے سسکی بھری۔ ''آپ نے میرے کبیر دادا کو مار دیا۔''

کبیر دادا آب دیدہ ہو کر بولا۔ ''ہاں، مگر اس کے بدلے تمھیں بڑے بھائی کا تحفہ بھی تو دیا ہے۔''

''بھیا، آپ لوگوں کی بہت یاد آئے گی۔'' زندگی میں پہلی بار اس نے کبیر دادا کو بھائی کہا تھا۔

کبیر دادا نے اس کے ماتھے پر بوسا دے کر علاحدہ کیا۔ ''خوب دیکھ بھال اور سمجھ داری سے وقت گزارنا۔''

''جی بھیا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو سامان گاڑی میں رکھو۔'' پاشا کو کہہ کر وہ بشریٰ کی جانب بڑھا۔ ''ماں جی، آپ تیار ہیں۔''

''ہاں بیٹا، پچھلے کئی دنوں سے منتظر تھی۔ اور اس پگلی سے تو ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اچھا ہے تمھارا نیا موبائل فون نمبر اس کے پاس نہیں تھا ورنہ ضرور بھانڈا پھوڑ دیتی۔''

''ماں جی، لگا لیں شکایتیں۔ دیکھ لوں گی آپ کو۔'' تناوش نے دھمکی دینے میں دیر نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ سوزوکی وین میں اپنا سامان منتقل کر چکے تھے۔ پاشا سے ایک بار پھر محبت بھرے انداز میں مل کر کبیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تناوش بھی بے ساختہ پاشا کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

''بھیا، اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''تم بھی۔'' اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر پاشا نے اس کے لیے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

آنکھوں میں نمی لیے وہ اچک کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بشریٰ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ الوداعی ہاتھ لہرا کر کبیر نے وین آگے بڑھا دی۔ پاشا وین کے موڑ مڑنے تک وہیں کھڑا وین کی عقبی بتیوں کو گھورتا رہا۔ اس کے دماغ میں ہفتہ بھر پہلے تناوش سے ہونے والی ملاقات کا منظر تازہ ہوا۔

''بھیا، آپ کہاں ہیں۔'' چائے پیتے ہوئے اسے تناوش کی کال موصول ہوئی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ”میں اپنے کمرے میں ہوں، کیا دادا چلے گئے ہیں؟“

”ہاں۔“ تناوش کا جواب اثبات میں تھا۔

”اچھا میں آرہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ اور پھر چائے کی پیالی ختم کیے بغیر اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس نے کھڑے ہو کر پاشا کو بڑے بھائی جیسا احترام پیش کیا اور پاشا کے نشست سنبھالتے ہی بیٹھ گئی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اب بولو، کیا بات ہے۔“

”بھیا، میں انھیں جرم کی دنیا سے نکالنا چاہتی ہوں۔“ تناوش نے بغیر کسی تمہید کے دل میں موجود بات اگل دی تھی۔

”کیا.....؟“ پاشا ششدر رہ گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہو۔ ایسا ہونا ناممکن ہے گڑیا۔“

”ناممکن تو کبیر کا شادی کرنا بھی تھا، ناممکن تو ان کا مجھے بیوی کا درجہ دینا بھی تھا، ناممکن تو محترم بہرام پاشا کا مجھے بہن بنانا بھی تھا، ناممکن تو شمشیر دادا کا شکست کھانا بھی تھا..... جب اتنے سارے ناممکن ہو سکتے ہیں تو یہ بھی ہو جائے گا۔“

پاشا نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس موضوع پر دادا سے بات کی ہے؟“

”ہاں، انھوں نے بھی یہی کہا جو آپ کہہ رہے ہیں۔“

”تو پھر تمھاری سمجھ میں آجانا چاہیے۔“

تناوش کے چہرے پر حسرت نمودار ہوئی۔ ”دل کو کیسے سمجھاؤں۔“

پاشا فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”دل کی ماننے والے گھاٹے میں رہتے ہیں۔“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”تب، جب دماغ دل کی مخالفت کر رہا ہو۔“

”اگر تمھیں خطرے کا اندازہ ہوتا تو یقیناً تم ایسا نہ سوچتیں۔“

”میری تجویز سننے کے بعد اگر آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو میں کبھی بھی کبیر کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔“

"بولو۔" پاشا کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بے دلی سے بولا۔

تھوڑا سا سوچ کر تناوش اپنا منصوبہ بیان کرنے لگی۔ جوں جوں اس کی بات آگے بڑھتی گئی پاشا کی دلچسپی سوا ہوتی گئی۔ بات کے اختتام پر پاشا نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا کبیر دادا کو اس بات پر راضی کر سکتی ہو۔"

وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ "میں انھیں زہر کا بھرا پیالہ پینے کو کہوں تو بھی مجھے ناں سننے کو نہیں ملے گی۔"

پاشا نے پوچھا۔ "وجہ۔"

"کیوں کہ ان کے لیے جان دینا مجھے اتنا آسان لگتا ہے جتنا باورچی خانے میں جا کر چائے بنانا۔ اور وہ مجھ سے بڑھ کر مجھے چاہتے ہیں۔"

پاشا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے انھیں تیار کرو۔"

اور تناوش نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

اور پھر پاشا اور کبیر دادا کی مصنوعی چپلقش ہوئی۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے پاشا نے اخلاق حسین اور نوشاد کا ساتھ ڈھونڈا۔ اور جب پاشا نے کبیر دادا کو ساحل والے اڈے کی جانب بلایا، اس وقت ایک ویران سڑک پر وہ کبیر دادا کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی کار کی ڈگی میں ایک لاش چھپائی ہوئی تھی۔ کبیر دادا اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ اپنی جیبوں میں موجود سامان اس نے لاش کے کپڑوں میں منتقل کر دیا تھا۔ ذرا دور جا کر انھوں نے ریموٹ کنٹرول بم سے کار اڑا دی۔ کبیر دادا کو بس اڈے پر اتار کر پاشا تناوش کو لینے اس کے گھر کی جانب بڑھ گیا اور کبیر دادا بس میں بیٹھ کر مانسہرہ روانہ ہو گیا جہاں ایک دور دراز گاؤں میں اس نے گھر وغیرہ خریدنا تھا۔ اس سارے منصوبے کی روح رواں تناوش ہی تھی۔ صرف نئے شہر کے بارے انھوں نے مل کر طے کیا تھا۔ آخر وہ اپنے کبیر کو جرم کی دنیا سے نکال کر لے گئی تھی۔

پاشا خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "گڑیا، میں تمھیں دیکھتے ہی جان گیا تھا کہ تم ایسا ہی کچھ کرو گی۔ جہاں رہو خوش رہو میری پیاری بہنا۔"

وہ اب تک وہیں کھڑا تھا۔ اچانک ایک کار گلی میں داخل ہوئی اور اس کے قریب آ کر رک گئی۔ دو آدمی باہر

نکلے۔ان میں سے ایک بولا۔

''کام ہوگیا دادا۔''

''چلو شروع ہو جاؤ۔'' اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

دونوں نے کار کی عقبی نشست سے دو عورتوں کی لاشیں نکالیں اور گھر کے اندر لے گئے۔تھوڑی دیر بعد واپس آ کر انھوں نے کار کی ڈگی سے پٹرول کے کین نکالے اور دوبارہ اندر گھس گئے۔چند منٹ بعد گھر میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔دونوں کاروں کے مکین آگ کا تماشا دیکھنے کے لیے رکے نہیں تھے۔

☆.....☆.....☆

رات کے اس وقت بھی اچھا خاصا ٹریفک نظر آ رہا تھا۔ایک بغلی سڑک پر دو موٹر سائیکل سوار ان کی وین سے ٹکراتے ٹکراتے بچے تھے۔دونوں نوجوان کافی بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''اندھا ہے کیا۔'' موٹر سائیکل چلانے والا۔کافی غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

''بتاتا ہوں تجھے۔'' کبیر دادا نے ہینڈ بریک کھینچ کر دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ان احمقوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کو مخاطب ہیں۔مگر اس سے پہلے کہ کبیر دروازہ کھول کر باہر نکلتا۔تناوش نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''کبیر۔'' اس کی محبت بھری سرگوشی کسی موٹی زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔وہ ایک دم اس کی جانب متوجہ ہوا۔تناوش کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکان ابھری۔

''اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں آپ۔''

کبیر نے بے بسی بھرے انداز میں سر جھکا لیا تھا۔تناوش کھڑکی سے چہرہ نکال کر ان لڑکوں کو مخاطب ہوئی۔

''بھائی، میں معذرت چاہتی ہوں غلطی ہماری ہے۔آپ میں کسی کو چوٹ تو نہیں لگی۔''

غصے میں لڑائی کے لیے تیار لڑکوں کے چہروں پر ہلکی سی ندامت ابھری کہ انھیں بھی اپنی غلطی کے بارے علم تھا۔موٹر سائیکل چلانے والا فوراً بولا۔

''کوئی بات نہیں بہن جی، بچت ہوگئی ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

''بس اتنی سی بات تھی۔'' اس کی طرف کھسکتے ہوئے تناوش نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔''میں ہوں نا

آپ کی ڈانٹ کھانے کے لیے۔ میرے کبیر کا غصہ اتنا سستا نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے پر لٹاتا رہے۔"

وہ ہنسا۔ "اتنی بڑی نہیں ہوں جتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہو۔"

وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "عورت کبھی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی جناب، وہ بے چاری تو ہمیشہ شوہر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ بادشاہ کی بیوی، وزیر اعظم کی بیوی، سپہ سالار کی بیوی، بھکاری کی بیوی وغیرہ وغیرہ۔ اور میں جس کی بیوی ہوں اس کا رتبہ تو بہت بڑا ہے نا اور اتنا ہی میرے لیے کافی ہے۔"

"رتبہ۔" کبیر نے قہقہہ لگایا۔ "یہ بھی خوب کہی۔ اب بھول جاؤ رتبے کو محترمہ۔"

وہ عقیدت مندی سے بولی۔ "اپنے رتبے اور مقام کو دیکھنے کے لیے میرے دل میں جھانکیں جی۔"

"ہونہہ! بات تمھاری نہیں، لوگوں کے سمجھنے کی ہے۔" اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

تناوش نے فوراً پوچھا۔ "آپ کے نزدیک میں اہم ہوں یا لوگ؟"

وہ محبت سے بولا۔ "جواب تمھیں معلوم ہے۔"

"تو پھر لوگوں کی فکر کیوں کرتے ہیں۔"

"اچھا دفع کرو لوگوں کو، یہ بتاؤ اس دن تمھارے لیے جو اتنی خریداری کی تھی کیا وہ سارا سامان وہیں چھوڑ دیا ہے؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"پاشا نے بتایا ہے۔"

وہ صاف گوئی سے بولی۔ "ہاں، میں نے حرام کی دولت سے خریدی ہوئی کوئی بھی چیز ساتھ نہیں لی۔ امی جان سے پیسے لے کر اس موبائل فون کی قیمت بھی پاشا بھائی کو ادا کر دی تھی۔ کیوں کہ نئی زندگی کی ابتداء میں حلال کے پیسے سے کرنا چاہتی ہوں اور یہی امی جان کی بھی منشا ہے۔"

کبیر نے عقبی شیشے پر نگاہ دوڑا کر سیٹ سے ٹیک لگا کر اونگھتی ساس پر نگاہ دوڑائی۔ نہ جانے اسے سچ مچ نیند آ رہی تھی یا وہ ان دونوں کو آزادی سے بات چیت کرنے کا موقع دینے کے لیے سوتی بنی ہوئی تھی۔ "تمھارا گھر بیچ کر جو رقم وصول ہوئی تھی، اس سے یہ گزارے لائق وین خریدی ہے اور وہاں گاؤں میں ایک کنال زمین خریدی ہے جس پر ابھی تک گھر بنانا ہے۔"

”کیا گھر بنانے کے لیے پیسے نہیں بچے۔“

”نہیں کچھ رقم بچ بھی گئی ہے، ان شاء اللہ گھر بن جائے گا۔“

”تو جب تک گھر نہیں بنے گا رہیں گے کہاں؟“

”جس سے زمین خریدی ہے اس کی ایک کمرے کی بیٹھک چند دنوں کے لیے مانگ لی ہے۔ کیا وہاں گزارا کرلوگی۔“

”میں آپ کے ساتھ کھلے میدان میں بھی رہ لوں گی۔ اور سچ کہوں چھوٹے گھر میں رہنا آپ کے لیے مسئلہ ہے ہم تو عادی ہیں۔“ اس کے مضبوط ہاتھ پر اپنا ملائم ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پیار بھرے انداز میں سہلانے لگی

☆.....☆.....☆

”بہت برا ہوا یار، پاشا اتنا نیچ، لالچی اور کمینہ نکلے گا یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ نوشاد کے چہرے پر سچ مچ پریشانی نظر آرہی تھی۔

اخلاق نے پھیکے لہجے میں کہا۔ ”وہ اپنی قسمت ہی میں نہیں تھی یار۔“

نوشاد خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”اس ظالم نے کبیر دادا کی دولت و جائیداد کے لیے منہ بولی بہن کو جلا دیا تو اور کسی کے ساتھ کیا اچھائی کرے گا۔ ابھی سنبھل کر رہنا ہوگا بھائی، یہ اور ذہن کا مالک ہے۔“

اخلاق نے کہا۔ ”صحیح کہہ رہے ہو خان صاحب، اب تو پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کبیر دادا کے بجائے اس کا پتا کاٹنا چاہیے تھا۔“

”شاہ جی، میرے ہاتھ تو کھڑے ہیں، ایسے ظالم کے خلاف کیا سازش کریں گے۔ اور جانتے ہو اس نے اس دن کی بیٹھک میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ کبیر دادا کے خلاف سازش کرنے والوں کو معاف نہیں کرے گا۔ اور یہ وہ ہمیں سنا رہا تھا کہ اب محتاط رہیں۔“

”اب محتاط ہی رہیں گے خان صاحب، یوں بھی ہمارے دل کی حسرتیں تو دل ہی میں رہ گئیں۔ اس شہزادی کے پھولوں جیسے بدن کو آگ لگاتے وقت دل بھی نہیں کانپا ظالم کا۔ اور جنازے پر بھی کس بے حیائی سے چہرے پر افسوس طاری کیا ہوا تھا بے غیرت نے۔“ اخلاق حسین نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

نوشاد آفریدی چہرے پر پریشانی لیے خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں نے تناوش کے حصول کی جتنی کوششیں کی تھیں تمام رائیگاں گئی تھیں۔ اور اب تو وہ کسی کوشش سے بھی رہ گئے تھے۔ جب وہ ہی نہیں رہی تھی تو کوشش کیا کرتے۔

☆.....☆.....☆

ابتدائی دو تین ماہ انھیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو بتدریج ختم ہوتی گئیں۔ کبیر نے پرانی زندگی کو اس طرح بھلا دیا تھا جیسے وہ کبھی غلط کاموں میں ملوث ہی نہ رہا ہو۔ تناوش کی محبت بھری توجہ نے اس کے دل میں کبھی عیش و آرام کی زندگی چھوڑنے کا ملال پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اپنے کبیر کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی اور اس کی اتنی خدمت کرتی کہ بعض اوقات وہ شرمندہ ہو جاتا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان کھولنے کے ساتھ وہ سوزکی وین پر گاؤں کے چند بچوں کو شہر کے اسکول لے جاتا لاتا بھی تھا۔ ان کی گزر اوقات بہت اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ تناوش کے زور دینے پر اس نے قرآن مجید دوبارہ حفظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ دیکھ کر وہ خود ہی حیران رہ گیا تھا کہ تین چار ماہ میں اسے پورا قرآن مجید دوبارہ یاد ہو گیا تھا۔ رمضان شریف میں تراویح کی امامت کراتے ہوئے جہاں اس کی خوش الحانی موضوع بحث بنی ہوتی وہیں اس رقیق القلبی کو بھی یاد کیا جاتا۔ دوران تلاوت وہ بے ساختہ رونا شروع ہو جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ تناوش نے اسے ایک خوب صورت بیٹی کا تحفہ بھی دیا تھا جس کا نام تناوش نے اس کی بہن اسماء کے نام پر رکھا تھا۔ تناوش بعض اوقات پاشا کو یاد کر کے رو پڑتی تھی۔ وہ اسے سچ مچ اپنے بھائی شاہ نواز کا نعم البدل لگتا تھا۔ اور پھر ایک دن تناوش کو پڑوسی عورت کی زبانی کراچی میں رینجرز کے آپریشن کے بارے پتا چلا۔ وہ سارا دن بے چین رہی تھی۔ رات کو لیٹتے وقت وہ کبیر سے اسے موضوع پر بات کرتی رہی۔

"دیکھو چندا، وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔ تم نے آتے وقت اس سے وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کام کو چھوڑ دے گا مگر جب وہ نہیں چھوڑنا چاہتا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

وہ سسکی۔ "ان کے لیے دعا تو کر سکتے ہو نا۔"

"تو کیا نہیں کرتا۔ پگلی!" اس کی ناک کی پھننگ مروڑتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔

اس کے بعد وہ دن کو روزانہ خبریں سننے پڑوسیوں کے گھر چلی جاتی۔ ایک دن اس نے اپنے کانوں سے

بہرام پاشا نامی گینگسٹر کی گرفتاری کی خبر سنی۔اس دن وہ بہت روئی تھی۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر رب کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے جانے کتنی دیر وہ مناجات میں مصروف رہی۔اپنے بھائی کی خیریت اور اس کے راہ راست پر لوٹنے کی دعائیں مانگتی رہی۔مگر شاید اس کی دعاؤں میں اثر ختم ہو گیا تھا یا وہ پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لے بیٹھی تھی۔کہ پاشا کی گرفتاری کے ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ اس کے پھانسی ہو جانے کی خبر سن رہی تھی۔رینجرز کے حکام نے بڑی سرعت اور تیزی سے گینگسٹرز کے خلاف کارروائیاں کی تھیں۔

چند دنوں میں بہرام پاشا کی پھانسی کی خبر پرانی ہو گئی تھی،مگر تناوش کے سینے میں لگنے والا یہ زخم اتنی جلدی نہیں بھر سکتا تھا۔پاشا کی پھانسی کو دو ماہ ہونے کو تھے ایک دن وہ گھر کے کام ختم کر کے اسماء کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

بشریٰ نے کہا۔"ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں ماں جی،آپ اسے پکڑیں،میں دیکھ لیتی ہوں۔"اسماء ماں کے حوالے کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"کون؟"دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے آواز دی۔

نسوانی آواز نے پوچھا۔"یہ کبیر صاحب کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔"اس نے دروازہ کھول دیا۔یوں تو کبیر کو تمام گاؤں والے حافظ صاحب ہی کہہ کر بلاتے تھے ،وہ عورت یقیناً مقامی نہیں تھی ورنہ اس انداز میں مخاطب نہ کرتی۔

دروازے پر کالا نقاب اوڑھے ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔

"اندر آجائیں بہن اس نے ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا،مگر اس کے پیچھے راحت خالہ کو دیکھتے ہی وہ چیخ پڑی تھی۔"راحت خالہ۔"وہ بری طرح اس سے لپٹی تھی۔

"چل ہٹ بے وفا۔"راحت خالہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔"پچھلے دو سال سے خالہ اپنی بیٹی کی موت کا سوگ منا رہی ہے۔اب آ کر پتا چلا کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"اچھا آئیں بیٹھیں تو سہی۔"ندامت بھری ہنسی سے وہ انھیں کھینچنے لگی۔

"ہمارے ساتھ میرا شوہر بھی ہے۔" جوان لڑکی اسے مخاطب ہوئی۔ نہ جانے کیوں تناوش کو وہ دیکھی بھالی ہوئی لگ رہی تھی۔

"اندر بلالو بہن۔" وہ سر پر دوپٹا درست کرنے لگی۔

"آجائیں جی۔" لڑکی نے آواز دی۔ اسی وقت چہرے پر مفلر لپیٹے ایک مرد دو بھاری بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کے مفلر لپٹے چہرے پر نظر پڑتے ہی تناوش کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے اسے کسی اپنے کی یاد دلادی تھی۔ اس کی نظریں اجنبی مرد کے چہرے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اس نے تناوش کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور اپنے چہرے پر لپٹا مفلر کھول دیا۔

"بھیا!" تناوش کی چیخ سے صحن گونج اٹھا تھا۔ اس سے لپٹتے ہوئے وہ بے ساختہ رو پڑی۔

"ارے پاگل روتی کیوں ہو۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "تھوڑی دیر ہوگئی ہے مگر وعدے کے مطابق آتو گیا ہوں۔"

"ہم نے آپ کے متعلق بڑی بری خبر سنی تھی۔" گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس سے علاحدہ ہوئی۔

"تو اچھی خبر نہیں سنی تھی۔" اس نے کالے نقاب میں ملبوس لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ اسی وقت لڑکی نے نقاب ہٹایا اور تناوش، رخسانہ بھابی کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ شہاب قصوری کی بیٹی تھی۔

"اچھا مجھے ساری بات بتائیں نا؟" رخسانہ سے ملتے ہی وہ پاشا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اس بارے بعد میں بات کرتے ہیں۔ پہلے میں ماں جی سے مل لوں۔" وہ بشریٰ کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش کبیر کو بلانے کے لیے کال کرنے لگی۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے وہ اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ رینجرز کا آپریشن شروع ہوتے ہی اس نے رینجرز فورس کو کمانڈ کرنے والے آئی جی رینجرز سے ملاقات کی اور وعدہ معاف گواہ بن کر تمام گینگسٹرز کو پکڑوانے کی آفر کردی۔ اس نے فوراً ہی اس کی آفر قبول کرلی تھی۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور وہیں سے تمام گینگسٹرز کی مخبری کرکے گرفتار کرواتا رہا۔ تاہم کاشف راجپوت کو اعتماد میں لے کر اس نے ساری بات بتائی اور اسے لندن فرار کروادیا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے منصوبے کے مطابق خود رینجرز کو گرفتاری دی۔ اپنے

تمام دھندوں کے ثبوت، بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات اور ہر چیز کے بارے اس نے آئی جی رینجرز کو بلا کم و کاست اطلاعات فراہم کر دی تھیں۔ اس سچائی، خلوص اور ایمانداری سے سرکار کا ساتھ دینے پر اسے معافی مل گئی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی پھانسی لگنے کا ڈراما رچایا تاکہ کوئی بچا ہوا دشمن انتقام وغیرہ کے لیے اسے ڈھونڈتا نہ رہے اور پھر آئی جی رینجرز ہی کی وساطت سے اسے ایک نئی شناخت مل گئی تھی۔

''جانتی ہو میرا نیا نام کیا ہے؟'' وہ تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کہہ سکتی ہوں بھیا۔'' اس نے لاعلمی کے انداز میں سر ہلایا۔

''اچھا اگر تمھیں، میرا نیا نام رکھنے کا کہا جاتا تو کیا رکھتیں؟''

''شاہ نواز۔'' تناوش نے بغیر سوچے دل کی بات ہونٹوں سے نکال دی۔

''اچھا یہ دیکھو۔'' اس نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ جس پر شاہ نواز ولد محمد رفیق لکھا ہوا تھا۔

''بھیا۔'' تناوش نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا تھا۔

''جانتی ہو اس شناختی کارڈ کا نمبر اور ساری تفصیلات، شاہ نواز بھائی ہی کی ہیں۔ آپ لوگوں کے کراچی سے آتے وقت میں نے امی جان سے شاہ نواز بھائی کا شناختی کارڈ مانگ لیا تھا۔ اور اب میں قانونی طور پر تمھارا بڑا بھائی ہوں۔ اس لیے خیال کرنا، غلطی کرنے پر سخت پٹائی ہو سکتی ہے۔''

کبیر نے پوچھا۔ ''اوے پٹائی والے بھائی صاحب، اپنے سسر صاحب کی تو خبر ہی نہیں بتائی۔ شہاب قصوری صاحب کا کیا ہوا۔''

''آپ لوگوں کے کراچی چھوڑنے کے تین ماہ بعد دل کے دورے سے وہ انتقال کر گئے تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ محترمہ میرے گلے پڑیں۔'' پاشا نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے ماحول میں چھائی اداسی دور کرنے کی کوشش کی۔

کبیر دادا صاف گوئی سے بولا۔ ''اچھا محترم، گھر میں تین کمرے ہیں ایک کمرہ میرے اور تناوش کے استعمال میں رہتا ہے، ایک میں اماں جی ہوتی ہیں اور اب راحت خالہ بھی ان کے ساتھ رہ لیں گی۔ تیسرے

کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے لیے صاف کر لینا اور جلد از جلد کوئی محنت مزدوری شروع کر دو پرانی عیاشیوں کو بھول جاؤ۔"

"کام کرتی ہے میری جوتی، اب بھی کروڑ پتی ہوں۔" پاشا نے فخر سے چھاتی چوڑی کی۔

"گویا حرام سے اب تک پیچھا نہیں چھڑا پائے۔" کبیر دادا نے اسے ملامتی نظروں سے گھورا۔ تناوش بھی افسوس بھرے انداز میں اسے تکنے لگی تھی۔

"اللہ نہ کرے بھائی، کیسی بات کر رہے ہیں۔" پاشا کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا بولا۔ "حکومت کی طرف سے دس کروڑ نقد انعام ملا ہے۔"

"بھیا!..... پازیب، بندیا، موتیوں کا ہار اور بندے لینے ہیں۔" تناوش فوراً اس کا بازو پکڑتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

کبیر دادا نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ہاں اسے لے کر دو تا کہ لونگ، لاچی والے گانے پر رقص کا وعدہ پورا کر سکے۔"

تناوش منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں لیتی۔" تمام کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

پاشا اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تمام زیور بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی میں بغیر کہے اپنی گڑیا کے لیے خرید کر لے آیا ہوں اور اس کے ساتھ بہت سارے کپڑوں کے سوٹ بھی ہیں۔"

"سچ۔" خوشی سے تناوش کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

پاشا نے کہا۔ "ہاں اور ایک نیا موبائل فون بھی خریدا ہے، پتا ہے اس میں کون سی وڈیو بھروائی ہے؟"

"کون سی بھیا؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"لونگ لاچی والے گانے کی وڈیو تا کہ میری گڑیا کو وعدہ پورا کرنے میں آسانی رہے۔"

تمام نے زوردار قہقہہ لگایا اور تناوش۔ "بھیا میں آپ سے بات ہی نہیں کرتی۔" کہتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

ختم شد